حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے
مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے
جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشرز۔ کراچی۔ پاکستان

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

جلد — ۸

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ مصر سے حج بیت اللہ شریف کے لیے حجاز پہنچے، روضۂ مبارک پر حاضری کے لئے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینۂ منورہ کے قیام کے ایام میں جامعہ مدینۂ منورہ کے سربراہوں نے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء (مولانا منت اللہ صاحب رحمانی وغیرہ) کو جامعہ میں تشریف آوری کی دعوت دی۔ جامعہ کے ایک خاص اجتماع میں حضرت موصوف نے یہ تحریر پیش کی جس میں دارالعلوم دیوبند کے ضروری تعارف کے ساتھ جامعہ مدینہ منورہ کا خیر مقدم فرمایا گیا ہے۔ ادارہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِىَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا."

اَمَّا بَعْدُ!

نعمت کبریٰ...... یہ ساعت بڑی ہی مبارک ہے کہ میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داران کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرا قلب جذباتِ تشکر و احسان سے معمور ہے۔ کیوں کہ آپ حضرات نے اپنی مخلصانہ دعوت کے ذریعہ مجھے اس عظیم الشان دینی ادارے میں شرفِ حاضری بخشا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج میری مسرت و شادمانی دوگنا ہوگئی ہے۔ کیوں کہ میں ایک عظیم اسلامی علوم کے مرکز سے چل کر قابلِ قدر دینی مرکز میں پہنچ گیا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی مچھلی پانی سے نکال کر دوبارہ پانی میں ڈال دی جائے تو اسے محض سرور و نشاط ہی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جسم میں ایک نئی روح کارفرما ہو جاتی ہے۔ میں بھی اس وقت اسی قسم کی تازگی اور نشاطِ روحانی محسوس کر رہا ہوں۔ جو فی الحقیقت ایک نعمتِ کبریٰ (بڑی نعمت) ہے جس کے لئے میں بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالاتا ہوں۔

مبارک احساس...... میں برِاعظم ایشیا کے ایک ممتاز اور زبردست اسلامی ادارے سے حاضر ہوا ہوں، جس کی تاسیس پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔

۱۲۴۸ھ میں انگریزی سامراج نے ہندوستان پر تسلط جمایا اور مغربی تہذیب کا طوفان ہندوستان کی ہر سمت

میں پھیلنے لگا، تو اس وقت علماءِ امّت نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا جو اس تہذیب کے نتیجہ میں امّت مسلمہ کو گھیر چکا تھا۔ چناں چہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو مغربی تہذیب کے اس خوفناک طوفان سے بچانے اور دین سے آشنا کرنے اور اس پر قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے دینی تعلیمی مرکز کے قیام کا احساس کیا۔ جو اپنی مخصوص تعلیم وتربیت کے ذریعے صالح اور غیرت مند علماء کی ایسی جماعتیں تیار کرتا رہے۔ جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر میدان میں مغربی تہذیب اور مذہب دشمن تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو کر (ڈٹ کر) امّتِ مسلمہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

چنانچہ اس غرض کی تکمیل کے لئے اس دور کے خدارسیدہ بزرگ اور عالم فاضل، شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کتاب وسنّت کے زبردست عالم اور امامِ وقت تھے۔ جو دارالعلوم میں سب سے پہلے مُحدّث ہوئے اور انہی کی سند پر دارالعلوم میں سلسلۂ روایت ودرایت حدیث جاری ہوا۔

اس وقت آپ کے تلمیذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین تھے، جن کے بعد اس مسند پر ہندوستان کی معروف شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ متمکن ہوئے۔ جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے تھے اور آپ کے ذریعے دارالعلوم میں درسِ حدیث نے نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا، اور آپ ہی نے اس دینی ادارہ کو علومِ ربّانیہ کی تعلیم کے ذریعہ استحکام عطاء فرمایا اور کتاب وسنّت کی تعلیم سے اس کے در ودیوار کو منور کیا۔

دارالعلوم کا امتیاز...... اس دارالعلوم کا طرۂ امتیاز (امتیازی شان) یہ ہے کہ اس کے تمام شیوخ واساتذہ مدرسین وطلبہ، کتاب وسنّت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور کتاب وسنّت ہی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ وہ ایسے احکام وامور کی تاویلات نہیں کرتے جو مخالفِ کتاب وسنّت ہوں۔ اسی بناء پر اہلِ بدعت ہمیشہ اس ادارے اور اس کے شیوخ کے خلاف معاندانہ محاذ بنائے رہے۔ لیکن ان کی اس مخاصمانہ روش کے باوجود اس ادارے کے شیوخ وعلماء نے کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کے علوم کی ترویج واشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت (نظر انداز) نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ کتاب وسنّت کی اشاعت اور امر بالمعروف اور نہی عنِ المنکر کو اپنا شعار اور وظیفۂ حیات بنائے رکھا جس پر آج پورا برّ اعظم ایشیا شاہد (گواہ) ہے۔

دارالعلوم کا تعارف...... اِس وقت اس ادارے میں مختلف ممالک کے ڈیڑھ ہزار سے زائد طلبہ جو ہندوستان، افغانستان، پاکستان، انڈونیشیا، برما، جنوبی افریقہ، روس، ترکستان اور چین وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، زیرِ تعلیم ہیں۔

اس ادارے میں بنیادی علوم جن کی تعلیم دی جاتی ہے، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علومِ عقلیہ ونقلیہ (قدیم وجدید) کی تعلیم دی جاتی ہے، ساٹھ مدرسین تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں جو سب اسی ادارے کے فیض یافتہ ہیں۔

دار العلوم کا انتظام وانصرام ۲۲ شعبوں پر منقسم ہے جن میں اہم شعبہ جات یہ ہیں: تعلیم، محاسبی اوقاف، مطبخ، صفائی، بجلی، تعمیرات، نشر واشاعت اور کتب خانہ۔ اس کے علاوہ دار العلوم میں فضلاءِ قدیم کا بھی ایک شعبہ ہے جو ان کے ساتھ روابط رکھتا ہے اور مختلف امور میں ان کی معاونت وراہنمائی کرتا ہے۔

دار العلوم اپنے حسنِ کارکردگی اور عظیم الشان علمی ودینی خدمات کی بدولت ایشیاء میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے حتیٰ کہ اسے ''ازہر الہند'' کہا جانے لگا۔ پوری ایک صدی میں اس دار العلوم سے بیس ہزار سے زائد علماء پیدا ہو چکے ہیں جن میں مفسّر بھی ہوئے ہیں اور محدث بھی مفتی وفقیہ بھی ہوئے اور واعظ ومرشد بھی۔ جنہوں نے ہندو بیرونِ ہند میں ہر جگہ کتاب وسنّت کے چراغ روشن کئے اور لاکھوں انسانوں نے ان کے ذریعے اپنی رشد و ہدایت کا سامان فراہم کیا۔

حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ...... میں اس عظیم دینی ادارے کے ایک خادم کی حیثیت سے آپ کی جامعہ اسلامیہ میں حاضر ہوکر سرور وانبساط کی ایسی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ جس کا اظہار نہ زبان سے ممکن ہے نہ قلم سے۔ کیوں کہ الفاظ خواہ کتنے ہی معنی خیز و پرشوکت کیوں نہ ہوں، وہ صحیح جذبات اور مسرت آفریں احساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ کا مدینۂ منورہ میں قیام ایک ایسا مبارک اقدام ہے جس کی خبر تمام علمی حلقوں بالخصوص حلقۂ دار العلوم میں انتہائی فرحت ومسرت کے ساتھ سنی گئی۔ کیوں کہ اس مبارک سرزمین میں صدیوں کے بعد ایسے دار العلوم کا قیام عمل میں آیا۔

بلاشبہ حکومت سعودیہ نے جہاں حجّاج کی راحت وآرام کے لئے تمام ضروری سہولتیں مہیا کیں اور حج کی تمام راہیں آسان بنائیں اور سعودی مملکت کو اقتصادی اور تعمیری، ہر اعتبار سے ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا، اسی کے ساتھ تاسیسِ (قیام وبنیاد) جامعہ اسلامیہ بھی اس کا قابلِ قدر اور تاریخی کارنامہ ہے۔

حقیقتاً مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جو ان زریں کارناموں کی انجام دہی کے لئے مناسب ہو سکتا ہے اور یہی خطۂ ارض وراثتِ نبوی کی اشاعت کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہیں سے علومِ نبوت کے چشمے پھوٹے اور یہیں وہ علوم پروان چڑھے اور اسی سرزمین سے خلافتِ راشدہ کی شعاعیں نکلیں۔ اسی لئے مسلمانانِ عالم کے لئے یہ مبارک شہر ہمیشہ پرکشش رہا اور اسی کے خزانہائے علومِ شریعت سے وہ مالا مال ہوتے رہے۔ جس طرح مکہ کے پہاڑوں سے نداءِ ابراہیمی کی گونج چہار دانگِ عالم (اطراف عالم) میں پھیلی، تو مسلمانوں کے دل اس کی طرف مائل ہوئے اور ان کے قافلے اس نداء پر لبیک کہتے ہوئے سرزمینِ پاک کی طرف ہر چہار سمت سے رواں دواں نظر آنے لگے۔ اسی طرح جب مدینۂ منوّرہ کی وادیوں سے علومِ نبوت اور تعلیماتِ الٰہی کی صدائیں بلند ہوں گی تو کون ہے جو اس طرف رواں دواں نظر نہ آئے گا اور اس صدائے علم پر لبیک نہ کہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے قیام کا ہندوستان کے تمام علمی اور دینی اداروں میں دلّی خیر مقدم کیا گیا ہے۔
اسی بناء پر انہوں نے اپنے فرزندانِ علم کو اس جامعہ میں بھیج کر اپنے لئے سعادت محسوس کی اور بلاشبہ ان فرزندان علم کا جامعہ کے سرچشمہ ہائے علم سے فیض یاب ہونا، ان کے لئے مرتبہ سعادت وخوش نصیبی کا باعث ہوگا۔

مستحکم رابطہ..... حضرات! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس جامعہ اسلامیہ کا ہندوستان کے تمام مدارسِ دینیہ، بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے ایک قدرتی اور طبعی رابطہ ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی تعلق دیرپا اور مستحکم ہوسکتا ہے تو وہ صرف علمی تعلق ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقتصادی اور سیاسی تعلقات محدود اور وقتی ہوتے ہیں، اس لئے میری خواہش ہے کہ جامعہ اور دارالعلوم کا یہ علمی اور دینی رابطہ زیادہ سے زیادہ پائیدار اور مستحکم ہو، جو دونوں اداروں کے درمیان طلبہ اور اساتذہ کے تبادلے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔

اخیر میں میں آپ حضرات کے جذبۂ اخوت اور اخلاقِ کریمانہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتری اور راست روی کی توفیق عطاء فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مؤتمرِ اسلامی قاہرہ میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ کا بصیرت افروز مقالہ

ذیل میں ہم وہ مقالہ درج کرتے ہیں جو حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے مؤتمر اسلامی قاہرہ میں پیش فرمایا۔اصل مقالہ عربی میں ہے جس کا اردو ترجمہ ہم پیش کررہے ہیں۔اس مقالہ میں حضرت حکیم السلام رحمۃ اللہ علیہ نے ان دینی اور فقہی مسائل پر ابتدائی بحث فرمائی ہے، جن پر علماءِ اسلام کو متحدہ غور وفکر کے بعد اپنا ایک فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مقالہ ہندو پاکستان کے علماءِ اسلام کو بھی زمانۂ حال کے مسائل کی طرف متوجہ کرے گا اور یہ حضرات زمانۂ حال کی ان طبعی ضرورتوں پر شرعی رہنمائی فراہم کرسکیں گے۔ (ادارہ)

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا .

أَمَّا بَعْدُ !

جامعہ ازہر کی خوش نصیبی...... بزرگانِ محترم!الحمدللہ: آج ہم علماءِ کرام کے ایسے اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کررہے ہیں جو صدرِ جمہوریہ عربیہ، السید جمال عبدالناصر کے عہد میں جامعہ ازہر میں ادارۂ بحوثِ اسلامیہ کی دعوت پر مختلف ممالک سے بعض اہم عصری مسائل پر غور وخوض کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بلاشبہ یہ عظیم الشان اجتماع جو درحقیقت زبردست اسلامی یکتائی کا نمونہ پیش کررہا ہے، ایسے وقت میں جبکہ دشمنانِ اسلام، ملّتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے کی ہر ممکن سعی کررہے ہیں۔ جامعہ ازہر کی خوش نصیبی اور عظیم کامیابی ہے جو اسے السید جمال عبدالناصر کے عہد میں حاصل ہوئی ہے۔اس لئے ہم بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے دشمنان اسلام کی تمام مساعی کو ناکام بناکر ہم خادمانِ دین کو جسمانی وروحانی یکتائی کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے باہمی ملاقات کا یہ زرّیں موقع عنایت فرمایا۔

مصر، اسلام کا نشانِ قوت...... بزرگانِ محترم!سرزمین مصر جہاں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہورہا ہے محض سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی لحاظ سے ہی اہم نہیں ہے، بلکہ اسے زبردست دینی اہمیت بھی حاصل ہے جس کے باعث

مسلمانانِ عالم کا آپس میں ہمیشہ ایک قلبی رابطہ رہا ہے اور مصر کی اس دینی اہمیت کا اندازہ حدیثِ نبوی سے بھی کیا جاسکتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اسلام نے حجازِ مقدس کو دین کا مرکز، ملک شام کو اسلام کا نشانِ عظمت اور ملکِ مصر کو اسلام کا نشانِ قوت قرار دیا''۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حجاز کو عبادت کا مرکز بنایا اور شام کو اسلامی شان وشوکت کا مظہر اور مصر کو افواجِ اسلامیہ کا مستقر (چھاؤنی) اور حلقہ بگوشانِ اسلام کی طاقت کا مظہر قرار دیا۔

حجاز۔مقدس مرکز عبادت...... چوں کہ حرم مکہ مرکزِ عبادت تھا اس لئے اسے بلدِ مامون بنایا گیا تا کہ اس میں عبادت کرنے والے پورے سکون واطمینان کے ساتھ مصروفِ عبادت رہیں اور کسی قسم کا نزاع وفساد اور قتل وقتال اس کی فضاءِ عبادت کو مکدر نہ بنائے۔ اس لئے اس بلدِ مامون (پرامن شہر) میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:۔

''بے شک مجھ سے پہلے اس (حرم) میں کسی کو قتال کی اجازت نہیں ملی صرف میرے لئے دن کے ایک مخصوص وقت میں قتال کی اجازت دی گئی تھی سو وہ اب بھی بدستورِ سابق خدا کا حرم ہی ہے۔ نہ اس کے درخت کاٹے جائیں اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے اور نہ اس کا شکار بھگایا جائے''۔ (اَوْ کَمَاقَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) ①

شام...... عظمتِ اسلامی کا مظہر...... اور شام چوں کہ عظمتِ اسلامی کا مظہر تھا اس لئے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ''اے شام تو میری شمشیرِ غضب اور میرا دردِ عذاب ہے، تو ہی منتشر کرنے والا اور تو ہی یکجا کرنے والا ہے''۔ ② اور شام ہی کے بارے میں دوسری حدیث ہے: ''میری امت میں ایک جماعت ایسی ہوگی جو دمشق، نواحِ دمشق اور بیت المقدس کے دروازوں پر برابر قتال کرتی رہے گی، اسے کسی کی رسوا کن کوششیں رسوا نہ کر سکے گی''۔ ③

دوسری روایت میں ہے: ''کسی کی مخالفت اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی، وہ دشمنانِ خدا سے برابر قتال کرتی رہے گی ایک لڑائی ختم ہوگی تو دوسری شروع ہو جائے گی''۔ ④ معلوم ہوا کہ ملکِ شام کفّار کے لئے غذاب کا کوڑا اور عتاب (غصہ) کی تلوار بنا رہے گا جب تک کہ اہل شام اس کی امتیازی خصوصیت کو ختم نہ کریں۔

استحکام مصر عالم عرب کے امن کا ضامن ہے...... اور مصر چوں کہ فوجی مرکز ہے اس لئے اس کے بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''جب خدا تم کو مصر پر فتح عطا فرمائے تو تم اس میں زیادہ سے زیادہ فوج بنانا کیوں کہ وہ فوج روئے زمین کی

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب الاذخر والحشیش فی القبر ج:۵، ص:۲۳۱.

② کنز العمال، ج:۱۲، ص:۲۸۰، رقم ۳۵۰۴۳. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد باب ماجاء فی فضل الشام ج:۴ ص:۳۴۹. ③ کنز العمال، ج:۱۲، ص:۲۸۳، رقم:۳۵۰۵۰. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب ماجاء فی فضل الشام ج:۴ ص:۳۵۰.

④ سنن ابن ماجه، باب اتباع سنة رسول الله ﷺ، ج:۱، ص:۱۲.

تمام افواج سے بہتر ہوگی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! یہ کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لئے کہ وہ اوران کی ازواج قیامت تک حفظ وامان میں رہیں گے"۔ ①

معلوم ہوا کہ امن کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلامی عظمت وشوکت قائم نہ ہواور یہ عظمت و شوکت فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خطۂ عرب کا امن وامان مصر کے استحکام اوراس کی فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں اور وہی تنہا ملک ہے جو حجاز وشام کا دفاع کرسکتا ہے۔ اس لئے ان تینوں ملکوں حجاز، شام اور مصر کا اتحاد ہی فی الحقیقت اسلام اور مسلمانانِ عالم کی طاقت وقوت کا نشان بن سکتا ہے۔

اس بارے میں صدر متحدۂ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر جو مخلصانہ سعی کررہے ہیں وہ یقیناً لائقِ استحسان اور قابلِ ستائش ہیں اور سب سے زیادہ حوصلہ افزا اور لائقِ آفرین بات یہ ہے کہ وہ جہاں عربوں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے علماءِ اسلام کو ایک نقطہ پر جمع کرنے اور موجودہ دور کے مسائل دینیہ کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے، وہ یقیناً باعث مسرت اور لائق امتنان ہے۔

جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی ماخذ...... بزرگانِ محترم! مؤتمر کے اجتماعات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان میں بعض تو وہ ہیں جو قواعد کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے مسئلہ اجتہاد اور مسئلہ تلفیق اور بعض علمی وعملی ہیں، جن پر ان کے اصحابِ نگارش یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے مسائل ومباحث جو زمانۂ ماضی میں تنقیح وتحقیق کی مختلف راہوں سے گزر چکے ہیں، وہ اپنی علمی اور تحقیقی اہمیت کے باوجود موجودہ ضروریات کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہے جو روز بروز دنیا کی مادی ترقیات کے باعث نت نئی شکلوں میں ہمارے سامنے آرہے ہیں اور جن کا حل کرنا ہمارے لیے اسی طرح ضروری ہے کہ جس طرح آج سے پہلے ہر دور میں علماء ومفکرین امت نے اپنے عمومی مسائل کو حل کیا اور جس طرح کہ فقہاءِ امت نے اپنے اپنے ملکوں میں پیش آمدہ واقعات (پیش آنے والے واقعات) کے تحت اپنے فتاویٰ اور فقہی مسائل کے ذریعے امتِ مسلمہ کی رہنمائی کی۔ بلاشبہ آج ضرورت ہے کہ ایسے فقہی اصول کلیہ پر غور وخوص کیا جائے جن کے ذریعے کتاب وسنّت کی روشنی میں امّتِ مسلمہ کو پیش آمدہ نئے مسائل کا حل کرنا آسان ہو اور اصول وقواعد جن دلائل کے ذریعہ مرتب کئے جائیں وہ بھی قرآن وحدیث سے مستفاد ہوں۔ تاکہ امّتِ مسلمہ کے سامنے اسلامی شریعت کی راہ آسان ہو جائے اور کسی کے لئے عملی میدان میں عذر کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی یہ حجت "قرآنِ کریم جو ہر چیز کے لئے ایک واضح بیان ہے" بندوں کے لئے پوری ہو جائے۔

---

① کنزل العمال، ج:۱۴، ص:۱۶۸، رقم: ۳۸۲۶۲. علامہ متقی الھندی فرماتے ہیں: ابن عبدالحکم فی فتوح مصر، کر وفیہ ابن لھیعة عن الاسود بن مالک الحمیری عن بحر بن داخر المعافری، ولم ار له الترجمة الاان ابن حبان ذکر فی الثقات انه یروی عن بحربن داخر ووثق بحراً.

منصب نبوت کا بیان کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں سے وہ احکام بیان فرمادیں جو ان کے لئے نازل کیے گئے ہیں''۔ ①

نیز بارگاہِ خداوندی میں مقبول بندوں کی اتباع کے سلسلے میں ارشاد فرمایا: ''آپ ان لوگوں کے راستے پر چلیں جنہوں نے میری طرف رجوع کیا''۔ ② اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے لوگوں پر اہل علم اور اہل فتویٰ کی اتباع لازم قرار دی۔ پس ان تین بنیادی امور کے پیش نظر ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اس میدان میں قدم اٹھائیں اور چوں کہ ہمارے تیار کردہ حل اور مرتّب کردہ اصول وقواعد کی بنیاد یہی تین ماخذ ہوں گے اس لئے لامحالہ ہر شخص ان پر عمل کرنے کا پابند ہوگا اور اس بحث کا دروازہ خود بخود بند ہوجائے گا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے؟ اسی طرح اجتہادِ کلی اور اجتہادِ جزئی کی بحث بھی بند ہوجائے گی۔ خلاصہ یہ کہ موجودہ مسائل ومشکلاتِ حیات کو شریعت کے ساتھ علمی اور عملی طور پر منطبق کرنے کے سعی کی جانی چاہیے۔

اسلامی تہذیب وثقافت اپنانے کی ضرورت...... بزرگانِ محترم! ہمارے اسلاف کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی ملک یا شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں کی تہذیب وتمدّن، ادب، معاشرت اور زبان وعلم پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ خود غالب ہوئے اور دوسروں کو مغلوب بنایا۔ اس طرح انہوں نے دین کی روح اور اسلام کے جوہر کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھا، بلکہ ہر اس چیز کا استیصال کرڈالا جو روحِ اسلام کے منافی نظر آئی۔ چنانچہ اس پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ واقعہ شاہد ہے کہ جب انہیں دریائے نیل میں ایک نوجوان لڑکی کو بھینٹ چڑھانے کی جاہلانہ رسم کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے متاثر ہوئے بغیر اس بھینٹ کے جاہلانہ اور بے بنیاد عقیدے کا استیصال کرکے اسلام کے صحیح عقیدے کا تحفظ فرمایا (کہ کسی دریا کا جاری ہونا یا نہ ہونا محض خدا کے ہاتھ میں ہے، لڑکی کی بھینٹ کو دریا کی روانی کا مدار بنانا غیر اسلامی اور جاہلانہ عقیدہ ہے)۔

اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ گرا تو انہوں نے فوراً اٹھالیا، اس پر ان کے فارسی غلام نے اسے معیوب سمجھتے ہوئے کہا کہ: ہمارے یہاں یہ بات معیوب اور نامناسب ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: کیا میں اپنے حبیب کی سنّت ان احمقوں کی خاطر ترک کردوں؟

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر کبھی بھی دوسروں کی معاشرت اور طور طریق سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اپنی قوتِ علم سے دوسروں کی معاشرت پر اپنی معاشرت کو غالب کیا۔ اس لئے اگر ہم اسلام کی صاف ستھری اور بے داغ ثقافت وتہذیب کو دل سے اپنالیں اور دنیا کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے لگیں تو لوگ ہماری تقلید و اتباع پر مجبور ہوں گے اور اگر بالفرض ہم مذکورہ تمام اوصاف پر عمل کرنے سے عاجز ہوچکے ہیں تو کم از کم اتنا ضرور

① ② پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۴۸.

ہونا چاہئے کہ غیروں کی تہذیب وثقافت سے صرف وہی اصول اپنائیں جو تعلیمات اسلام اس کی روح اور مزاج کے خلاف نہ ہوں اور ان کے ساتھ ہمارا تعامل انہی حدود میں ہو جو مخالفِ اسلام نہ ہوں نہ یہ کہ ہم ہر میدان اور ہر معاملہ میں انہی کے دوش بدوش اور انہی کے قدم بہ قدم چلتے رہیں۔

مقصدِ اجتہاد......اور اپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل تلاش کرنے کا (غیر صحیح) اجتہاد کریں کہ جس کا مقصد اپنے افعال پر قواعد واصولِ دین کو منطبق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا اجتہاد محض خدمتِ دین ہو نہ کہ دنیا کو دین سے منطبق ثابت کرنے کی کوشش۔ جو شخص اپنا دین تباہ کر کے دنیا سنوارنے کی کوشش کرتا ہے دین اس کے پاس نہیں رہتا اور نہ اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔

بزرگانِ محترم! اس میں شک نہیں کہ دین کا دامن نہ تنگ ہے اور نہ اس میں دنیا سے بالکلیہ لاتعلق بنانے والی رہبانیت ہے۔ لیکن علمی اور عملی زندگی میں اس کی کچھ خصوصیات ہیں جن کا مقتضیٰ (غرض) ہے کہ وہ ہمیشہ ہر میدان میں واضح اور نمایاں رہیں۔ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فی الحقیقت ایسے تمام آداب واصول اور تعلیمات جامع ہے کہ جن کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے عہدِ نبوت میں بعض مشرکین نے کہا: ''کیا تمہارا نبی تم کو ہر بات کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کی بھی؟''۔ ①

اس طرح انہوں نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے واضح نہ کر دیا ہو اور ایسے اصول عطا فرمائے کہ جن کی روشنی میں تمام معاملات کے حسن وقبح (بدصورتی) کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ادارۂ بحوثِ اسلامیہ نے حقیقتاً علماء اسلام کو عصری مسائل پر غور وخوض کرنے کی دعوت دے کر ایک عظیم الشان دینی وملّی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے ہم اس ادارہ اور جامعہ ازہر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے شکر گزار ہیں۔ اس سلسلہ میں چند اہم تجاویز ادارے کے سامنے پیش کرتا ہوں، جو امید ہے کہ ادارے کے مقاصد میں معاون ثابت ہوں گی۔

تجاویز...... 1 ضرورت ہے کہ ایسے مسائل کو مرتّب کیا جائے جو ہماری سوسائٹی اور معاشرے کا ایک جزو بن چکے ہیں اور ان کے بغیر زندگی گزارنا آج کے دور میں مشکل نظر آتا ہے، جیسے بینکوں کا سود، انشورنس اور بیمہ کے مسائل، مال کی درآمد وبرآمد وغیرہ کے مسائل۔ یہ سب مسائل واقعاتی شکل ورنگ میں مرتّب کئے جانے چاہئیں۔ ان کے لئے فرضی احتمالات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

2 اس قسم کے سوالات مختلف ممالک کی نمائندگی کرنے والے علماء میں تقسیم کئے جانے چاہئیں۔ تاکہ وہ ان پر کتاب وسنّت کی روشنی میں غور وخوض کرنے کے بعد جوابات اور تحقیقی مقالات پیش کریں، پھر جب تمام علماء کسی ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں اور پوری بصیرت کے ساتھ وہ مقالات وجوابات مرتب ہو جائیں تو مجمع البحوث

① الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب الاستطابه، ج: ٢، ص: ٧٦.

الاسلامیہ ان علماء کے دستخطوں سے تمام ممالک میں امّتِ مسلمہ کے افادہ کے لئے ان جوابات و مقالات کو شائع کرے۔اس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک متفقہ اور قابلِ قبول حل سامنے آسکے گا۔

3 ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت مادی وسائلِ حیات نے تمام دنیا کے ممالک پر اپنا تسلّط جما کر انہیں ایک نقطہ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے اور مہذب ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک شہر معلوم ہونے لگے ہیں اور تمام لوگ وحدتِ نظام کی پوری جدوجہد کرتے نظر آرہے ہیں۔اس لئے کیوں نہ ہم بھی ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس دینی اور روحانی نظام وحدت کے قیام کی عملی کوشش کریں کہ جو اپنے معتدل مزاج کی بدولت بلا امتیاز رنگ و نسل زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہو کر مساویانہ برتاؤ کرتا رہے۔وہ جس طرح جمود تقشّف (غربیی) سے دور ہے، ایسے ہی تہذیب کی مادیت سے بھی پاک ہے۔

اسلام کے تین مرکزی نقاط...... حضرات! اسلام کے تین مرکزی نقاط ہیں۔اول: قرآنِ کریم جو کتاب آسمانی ہے اور دوئم: جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور سوئم: خانہ کعبہ جو قبلہ عبادت اور امّت مسلمہ کا ذریعہ وحدتِ نظام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا ﴿ذِكْرَىٰ لِلْعٰلَمِيْنَ.﴾ ① ''سب جہانوں کے لئے ذریعۂ نصیحت''۔اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② ''سب مخلوقات کے لئے باعث رحمت''، ﴿لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ ③ ''سب مخلوقات کو انجام سے ڈرانے والا''، اور خانۂ کعبہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ④ ''سب جہانوں کے لئے ذریعۂ ہدایت''

اسی طرح گویا اسلام نے ایک عالمی بلکہ عالمین امّت کو ان تین بنیادوں پر قائم کرنے کے بعد اسے تمام انسانوں کے لئے ظاہر کیا اور اسی لئے اس وقت کے اجماع کو (دین میں) حجت قرار دیا گیا۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میری امّت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی''۔

پس جبکہ اس امّت کی بنیاد ان مہتم بالشان امور پر ہے جو ہر قسم کے مادی، وطنی، قومی اور رنگ و نسل کے امتیازات سے بلند و بالا ہیں تو ضرورت ہے کہ عام لوگوں میں ان کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

امید ہے کہ اس ضرورت کے لئے مجمع البحوثِ الاسلامیہ اپنا دائرہ کار وسیع تر کرے گا اور اس کام کے لئے مختلف ممالک میں عیسائی مبلغوں اور مشنریوں کی طرح وہ بھی اپنے دعوتی اور تبلیغی مشن اور وفود روانہ کرتا رہے گا۔

توقع ہے کہ ہر ملک کے مسلمان نہ صرف یہ کہ ان تبلیغی وفود کا خیر مقدم کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اس دعوت و تبلیغ میں مخلصانہ تعاون بھی کریں گے اور اس دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۹۰. ② پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۱۰۷.

③ پارہ: ۱۸، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۱. ④ پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۹۶.

اسلامی تعلیمات اور اسلامی رسم ورواج، مغربی تہذیب سے مس کئے بغیر رچ بس جائیں گے۔

ارشادِ خداوندی ہے: ''تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں بہترین نمونہ زندگی ہے'' ①

اسلام کا اجتماعی دفاع...... حضرات! ہماری دلی تمنا اور دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ کی سرگرمیاں اسلام کے دفاع اور اس کے تحفظ میں تیز ہوں اور مستشرقین اور وہ دشمنانِ اسلام کے اعتراضات و جوابات کے لئے سرگرم عمل ہوں، نیز ہماری دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ اور ان حضرات مندوبین کے درمیان ایک دائمی اور مستحکم رابطہ قائم رہے اور اسلام پر مخالفین کی طرف سے کئے جانے والے شبہات و اعتراضات ان تمام حضرات کے پاس بھی روانہ کئے جائیں تاکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جوابات تحریر کر کے ادارے کو روانہ کریں اور وہ ان کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس طرح اسلام کا یہ دفاع یقیناً اجتماعی اور مضبوط ترین ہوگا۔

مناسب ہوگا کہ اگر تمام مندوبین حضرات میں سے بعض افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی جائے جو اس قسم کے مسائل پر غور وخوض کرنے کی مکلّف ہو اور پھر اس کمیٹی کی وساطت سے وہ سوالات ادارہ کو بھیجے جائیں تو اسلام کا یہ ایک شاندار عالمی نظام ہو جائے گا۔

ادائے فرض...... بہرحال ہمیں توقع ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ ایسے مسائل کا ایک عمومی ادارہ ہوگا اور ان شاء اللہ اسلامی تہذیب وثقافت کے موضوع پر مفید تالیفات مختلف زبانوں میں شائع کرے گا۔

یہ چند خیالات مختصر الفاظ میں ذمہ دارانِ ادارہ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد میں سب سے پہلے صدر متحدہ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد رئیسِ اجتماعاتِ مؤتمر اور جناب ڈاکٹر محمود حسب اللہ صاحب جنرل سیکرٹری مؤتمر کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

---

① پارۃ: ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہند کے دلی جذبات کا اظہار

حضرت حکیم الاسلام نوّر اللہ مرقدہٗ کی ایک تحریر

ذیل کی تجویز وتحریر حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے غزہ (مصر) میں پیش فرمائی جس میں فلسطین کی ناجائز تقسیم اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار اور اسرائیل کے جارحانہ حملوں کے سلسلہ میں مصر اور دوسری اسلامی ریاستوں سے مسلمانانِ ہند کی دلی ہمدردی اور اپنے سرگرم تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔ وحدتِ اسلامی کا تقاضا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ ان کے جسم چاہے کروڑوں، اربوں سے متجاوز ہوں مگر روح ایک ہی ہو۔ امید ہے کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی یہ تحریر وحدت اور اخوتِ اسلامی کی دعوت کو بھی زندہ کر سکے گی۔

(ادارہ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

بزرگانِ محترم...... مسلمانانِ عالم بالخصوص ممالکِ اسلامیہ کے لئے وہ حادثہ بڑا ہی المناک تھا، جب کہ حکومت برطانیہ نے یہود کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے فلسطین کے حصّے بخرے کر دیئے اور یہود کے لیے یہودی وطن کا خواب پورا کر دیا۔ برطانیہ کی اس حرکت کے خلاف ہر ملک کے مسلمانوں نے صداءِ احتجاج بلند کی۔

حتیٰ کہ ان ممالک کے مسلمانوں نے بھی جو برطانیہ کے زیرِ تسلط تھے۔ برطانیہ کے خلاف احتجاجی جلسے اور کانفرنسیں منعقد کیں اور برطانیہ کی ناگواریوں کے باوجود احتجاجی ریزولیشن پاس کئے۔ چنانچہ اسی ذیل میں بمبئی میں بھی ایک عظیم الشان جلسہ میری صدارت میں منعقد ہوا۔

میں نے اس اجتماع میں کہا تھا کہ مسلمان تقسیم فلسطین کو کسی صورت بھی منظور نہیں کر سکتے۔ نہ دینی حیثیت سے، نہ جغرافیائی اور نہ تاریخی اعتبار سے بھی۔ اب یہ بات اسی طرح درست ثابت ہو رہی ہے۔ کیوں کہ تاریخ نے دوسری بار اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ ایک طاقت اور ایک ملّت ہیں کہ جس کی وحدت کو وطن

اور انسان کا اختلاف ختم نہیں کر سکتا۔ اس لئے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ مسئلہ فلسطین صرف عربوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک اسلامی مسئلہ ہے جس کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔

حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ پر جو سہ طاقتی جارحانہ حملہ ہوا، وہ درحقیقت دشمنانِ اسلام کے مخفی ارادوں کا انکشاف اور ''کفر ملتِ واحدہ ہے'' کا اظہار تھا۔

اس حملہ کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ عرب ممالک پر دوبارہ اقتدار حاصل کیا جائے۔ وہ عربی اور اسلامی ممالک کو نو آبادیات بنانے کی اور اسرائیل کے لئے راستے صاف کرنے کی ایک نئی سامراجی چال تھی۔

لیکن خداوندی نصرت و تائید نے السید جمال عبدالناصر کو اس سہ طاقتی حملہ کے مقابلہ میں بے مثال اور عظیم الشان کامیابی عطاء فرمائی اور دشمنانِ اسلام کو ایسی رسوائی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

اس حادثہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے امتِ مسلمہ عربیہ کو اس کی غفلت سے چونکا دیا اور اس نے بخوبی سمجھ لیا کہ فلسطین اور ایسے ہی دیگر اسلامی معاملات کا دفاع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سب مسلمان اس سلسلہ میں متحدہ و متفق نہ ہوں۔

میں ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ ''دارالعلوم دیوبند'' کے مہتمم کی حیثیت سے اور میرے رفقاء مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا منت اللہ رحمانی امیرِ شریعت صوبۂ بہار، ہم تینوں مسلمانانِ ہند کی جانب سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب مسئلہ فلسطین کی جدوجہد میں اخلاقی، مادی اور روحانی ہر قسم کی ممکنہ معاونت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

عمید دارالعلوم دیوبند (نزیل فلسطین غزہ)

عالمی مؤتمرِ اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب

ہم نظری طور پر اپنے لئے منصبِ اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا زورصرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کردیں۔ تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں اور ان کے قبول وعدمِ قبول کا فیصلہ کیا جاسکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ !

احوال واقعی...... حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۶ مارچ ۱۹۶۴ء کو سفرِ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں سے حجازِ مقدس ہوتے ہوئے بعد فراغت حج ۱۹ مئی ۱۹۶۴ء کو ورود فرمائے دیوبند ہوئے۔ اسٹیشن دیوبند پر بسلسلۂ استقبال طلبہ، اساتذہ کارکنان دفاتر اور اہلِ شہر کا ہجوم تھا۔ طلبہ خوشی کے نعرے بلند کررہے تھے۔ ملاقات، مصافحہ اور دعاء کے لئے خاص نظم قائم کیا گیا تھا جو حضرات اساتذہ کی نگرانی میں عمل آیا۔ طلبائے دارالعلوم کی درخواست پر ایک عظیم الشان جلسہ میں، جو دارالحدیث میں منعقد ہوا تھا اور حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، حضرت ممدوح نے خطاب فرمانا منظور کرلیا۔

جلسہ کی صدارت حضرت مولانا فخر الحسن صاحب استاذِ دارالعلوم نے فرمائی۔ ابتداء میں طلباء اور بعض اہل شہر کی طرف سے خیر مقدم کی نظمیں پڑھی گئیں۔ جن میں شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری کی نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا مجمع پر کافی اثر پڑا۔ آخر میں حضرت ممدوح نے نعروں کی گونج میں ایک بلیغ اور جامع تقریر شروع فرمائی جو تقریباً دو اڑھائی گھنٹہ جاری رہی، آپ نے اس شاندار خیر مقدم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفرِ مصر وحجاز کے تاثرات اور عالمی مؤتمرِ اسلامی قاہرہ اور اجتماع مدینہ یونیورسٹی کے احوال وکوائف پر روشنی ڈالی۔

مؤتمر کے اغراض ومقاصد...... آپ نے فرمایا کہ: قاہرہ کی اس عالمی مؤتمر کے اغراض ومقاصد کی کوئی تفصیل

اس دعوت نامہ میں نہ تھی، اجمالی طور پر دعوت کا مقصد جدید تمدُّن سے پیدا شدہ مسائل کی شرعی تنقیح و تحقیق اور اس سلسلہ سے علماءِ عالمِ اسلامی کا ربط باہمی ظاہر کیا گیا۔ جس سے اتحاد بین المسلمین کا جذبہ مفہوم ہوتا تھا، نیز مصر کے مرکزی شہروں کی سیر۔ البتہ مؤتمر کے اجلاس اور رفتارِ عمل سے جو اغراض و مقاصد ہمارا ذہن اخذ کر سکا، ان کا خلاصہ یہ تھا:

1 ...... نئے تمدن اور جدید اکتشافات سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اصولی طور پر جامعہٗ از ہر کا موقف علماء کے سامنے رکھ کر ان کی فکر سے اس میں استفادہ۔

2 ...... بلادِ مختلفہ کے علماء اور دینی حلقوں میں بین الاقوامی رابطہ کے ساتھ ساتھ مؤتمر سے ان کی علمی وابستگی ہوتا کہ وہ پورے عالمِ اسلام کے عوامی اتحاد کا ذریعہ ثابت ہو۔

3 ...... جامعہٗ از ہر کی نئی تعمیر کا سنگ بنیاد اور اس کی ہزار سالہ خدمت و عظمت کا تعارف

4 ...... حکومتِ مصر کے بعض اہم دینی اقدامات کا اعلان و تبشیر۔

5 ...... فلسطین کی ناجائز تقسیم کی مذمّت اور مغصوبہ فلسطین کی عربوں کے حق میں بازیابی کے لئے ایک عالمی تجویز کی منظوری۔

6 ...... مصر کی جدید ترقیات اور مصری قوم کے شعورِ بیداری کا مطالعہ۔

7 ...... ان مقاصد کے ساتھ مؤتمر کا اجلاس مبنی محافظہ القاہرہ کے فلک بوس قصر میں شروع ہوا۔ جس میں ۳۸ ملکوں کے ستر نمائندہ علماء نے شرکت کی، مصری علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ مجموعی طور پر سوا سو علمی نمائندے شریکِ جلسہ ہوئے۔ ہندو پاکستان کے نمائندے سب کے سب فضلائے دیو بند تھے، اجلاس کی کارروائی نہایت منضبط اور باقاعدہ تھی۔ پہلے ہی دن آرٹ پیپر کا ایک خوش نما کتابچہ برنامج (پروگرام) کے نام سے طبع شدہ، مندوبین کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ جس میں پہلے دن سے لے کر آخری دن کا نظامِ عمل بقیدِ گھنٹہ و منٹ پیش کر دیا گیا تھا، اس کے مطابق کانفرنس چلی اور چلتی رہی۔ ہر روز کی کارروائی اور خواندہ مقالات و مباحث طبع ہو کر اگلے روز مندوبین کے سامنے آجاتے تھے جس سے رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

مؤتمر کے زیرِ بحث مسائل ...... پہلے نمبر کے تحت مؤتمر میں جن مسائل کو بذیلِ برنامج اہمیت دی گئی اور ان پر حضراتِ خطباء نے خطاب کیا وہ یہ تھے:

1 ...... اسلام میں مالیات کا نظامِ تقسیم۔

2 ...... عرب اور اسلام کے عالم گیر نفوذ کے طبعی اسباب۔

3 ...... اسلام میں اراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔

4 ...... اَغنیاء کے مال میں غریبوں کے حصہ کی نوعیت۔

5 ...... اسلام میں حسبت (احتساب) یعنی امر بالمعروف و نہی عنِ المنکر کا نظام

6 ......اسلام میں اجتہاد کا ماضی و حال۔

7 ......اسلام میں دولتی علاقے۔

تقریباً ان سب ہی عنوانوں پر مقالے پڑھے گئے اور زبانی خطابات بھی ہوئے۔

مسئلۂ اجتہاد...... لیکن نئے حوادث و مسائل و غور فکر کے سلسلے میں چھٹے نمبر (مسئلۂ اجتہاد) پر زیادہ زور دیا گیا جو باوجود چھٹا نمبر ہونے کے، پہلے ہی دن کے سامنے آ گیا تھا اور اس کی بحث میں کانفرنس کی پوری مدت کا دو تہائی حصہ صرف ہوا۔ فکر یہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اس وقت تک وقت کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہو سکیں گے۔ کیوں کہ آج کی صورتِ حال جدید اکتشافات کی وجہ سے بالکل نئی ہے۔ پچھلا نقشِ قدم اس کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

اس موضوع پر اجتہاد کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے بطور تحریک الاستاذ علی عبدالرحمٰن ازہری وزیر سوڈان نے ایک پر مغز اور طویل مقالے سے اس کی ابتداء کی اور اس کے بعد اجتہاد، تقلید اور تلفیق سے متعلق مقالے اور مناقشات سامنے آنے شروع ہو گئے اور انہوں نے اتنا وقت لیا کہ کانفرنس کا زیادہ تر وقت اسی مسئلہ میں لگ گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا کانفرنس کا بنیادی موضوع یہی ایک مسئلہ ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ناظمِ جامعہ اسلامیہ کراچی فاضل دارالعلوم و رئیسِ وفدِ پاکستان کا جوابی مقالہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے جو نہایت پر مغز اور محققانہ تھا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: دسویں دن (۱۲ مارچ ۶۴ء) کو ان کا نام پکارا گیا اور مقالہ پڑھنے کی خواہش کی گئی۔ یہ مقالہ تقریباً بیس منٹ میں پڑھا گیا۔ یہی وہ بیان تھا جو مؤتمر میں آپ نے ذمہ دارانہ طریقے پر بطور نمائندۂ دارالعلوم دیا اور مصری اخبارات نے اس کے اقتباسات ''خطاب رئیس الوفد الہندی'' کے عنوان سے شائع کئے۔

آپ نے فرمایا کہ اس مقالہ میں، میں نے امکانی حد تک تمام پیش شدہ مسائل کے بارے میں اجمالی اور اصولی طور پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ اس وقت مقالہ سنانے کا موقع نہیں ہے، وہ اپنے موقع پر شائع ہو جائے گا۔ مگر میں اس میں پیش شدہ امور آپ کے سامنے عرض کئے دیتا ہوں، گو اختلافِ لغت و الفاظ سے عنوان اور اسلوبِ بیان کچھ مختلف ہو جائیگا اور اجمال و تفصیل کا بھی فرق پڑ جانا ممکن ہے، لیکن روح مقالہ کی قائم رہے گی۔

مجتہد فیہ مسائل کا حل قوّتِ فکر و عمل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے...... آپ نے اس مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: اس میں عرض کیا کہ اس وقت اجتہاد و تقلید کی بحث میرے خیال میں موضوع سے متعلق نہیں ہے، گو اس سلسلہ میں خواندہ مقالات نہایت قیمتی اور پر از معلومات ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کہ اس وقت یہ بحث اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی کیوں کہ

اجتہاد کا دروازہ بند ہو یا کھلا ہوا ہو۔ اور کھلے ہونے کی صورت میں یہ باب مفتوح اجتہادِ مطلق کا ہو یا اجتہاد خاص کا ،ضرورت اس بات کی ہے کہ آج جو مسائل مسلمانوں کو درپیش ہیں اور انہیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے ان کے ضمن میں ہر وہ شخص جو کوئی اجتہادی قوت رکھتا ہے، اسے عملاً پیش کرے تا کہ ارباب فکر ونظر اس قوت کو پرکھ کر کوئی فیصلہ دے سکیں۔ کیوں کہ اجتہادِ مُطلق ہو یا اجتہاد فی المذہب، ہر ایک کی شرائط کتبِ فن میں محفوظ ہیں جو اجتہاد کی صحت وسقم کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اگر کوئی اجتہاد فی الواقع اپنی ساری شرائط کے ساتھ کسی شخص کے پاس موجود ہے اور وہ مسائل کے ضمن میں سامنے آ جائے جو مسائل کے اجتہادی حل میں اصول وتفقُّہ کے مطابق ہوگا تو کون جانتے بوجھتے اس سے انکار کر سکے گا اور اگر شرائط ہی نہ پائی گئیں تو کون اس کے اعتراف وتسلیم پر مجبور کیا جا سکے گا؟

اس لئے بجائے اس کے کہ ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا پورا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں۔ تا کہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آ جائیں اور ان کے قبول وعدمِ قبول کا فیصلہ کیا جا سکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسے مسائل کے تنقیحی سوالات، واقعاتی سلسلوں سے مرتب کر کے کافی مدت پہلے سے مندوبین کے پاس بھیج دیئے جاتے یا اب بھیج دیئے جائیں۔ اگر مسائل کا مجوزہ تصفیہ پیش نظر ہے تا کہ متعلقہ مواد فراہم کر کے ہر شخص علیٰ وجہِ البصیرت بحث وتنقیح میں حصہ لے سکے اور مؤتمر کے بنیادی فیصلہ تک پہنچ جائے۔

ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور ان کا حل پیش کیا جاتا رہا...... حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنے خطاب کا یہ حصہ بھی پیش کیا جو مؤتمر میں پڑھا گیا۔ نئے حوادث اور ان سے ابھرنے والے نئے مسائل کچھ اسی دور کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور نئے نظریات وافکار نئے واقعات واحوال کی وجہ سے سامنے آتے رہے ہیں اور ہر دور میں مفکر علماء اور مبصر مفتی اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصولِ فقہ اور منضبط مسالکِ فقہیہ کی روشنی میں ان کے فیصلے دیتے رہے اور امّت انہیں قبول کرتی رہی ہے۔ چناں چہ ہر دور کے فتاویٰ کا ذخیرہ اس کا شاہد عدل ہے، آج بھی نئے حوادث ومسائل کی تنقیح وافتاء میں علماء امّت نے کوتاہی نہیں کی۔ ''حوادث الفتاوی'' اور ''آلات جدیدہ'' کے شرعی احکام کے نام سے مستقل کتابیں بھی منضبط کر کے شائع کر دیں۔ جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں، نیز جزئی مسائل پر الگ الگ مقالات و رسائل بھی مرتب کر کے شائع کئے جو امّت کے زیرِ عمل ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

فکر وعمل کی یکسانی وحدتِ امّت کا موجب ہے...... البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی، کہ اب ایسے احکام کی اشاعت اور تنقیح مزید عالمی پیمانے پر ہو اور یہ اشاعت وتنقیح بجائے مقامی ہونے کے بین الاقوامی انداز میں سامنے لائی جائے۔ کیوں کہ وسائل نقل وحمل کی آسانیوں کی وجہ سے پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کی مانند

ہوگئی ہے۔اس لئے آج کی ایک پورے ملک کی جماعتی بات بھی پوری دنیا کی نسبت سے شخصی اور انفرادی ہی بات کہلائی جارہی ہے اور جب تک وہ بین الاقوامی نہ ہو جائے جماعتی نہیں بنتی۔اس لئے موزوں ہوگا کہ ان جدید فتاویٰ کا مؤقف خواہ وہ کسی بھی ملک کے ہوں، پورے عالمِ اسلام کے سامنے آجائے اور عالمی فکر و نظر سے یہ احکام عالمی انداز سے امّت کے سامنے پیش ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس کام کو مجمع البحوث الاسلامیہ سے بہتر اور کون انجام دے سکتا ہے۔وہی اپنے عالمگیر اثرات سے ملک کے جدید فتاویٰ، مقالات اور کتب کے ذخیرے فراہم کر کے، بذریعہ تراجم، اعضاءِ مؤتمر کے سامنے رکھ سکتی ہے۔تاکہ فکر میں عالمیت اور یکسانی پیدا ہو کر امّت کے عمل میں بھی یکسانی کی جھلک آجائے جو وحدت امّت کے لئے ایک مؤثر ترین وسیلہ کا کام دے سکتی ہے اور یہی وہ عالم اسلامی کا مضبوط اتحاد ہوگا جو پائیدار بنیادوں پر قائم ہو کر پائیدار ثابت ہو سکے گا۔

انسانیت کو عالمی دین کی تلاش...... آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: میں نے مقالہ میں یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ ہی جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ نفس اسلام سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔جبکہ آج کی کائنات پسند دنیا ایک فطری اور جامع دین و دنیا مذہب کی تلاش میں خود بھی سرگرداں اور متلاشی ہے اور جبکہ وسائلِ نقل وحمل کی وسعت وسہولت کی وجہ سے پوری دنیا ایک خاندان کی مانند ہوگئی ہے جس کے تمام تمدّنی امور میں یکسانی آتی جارہی ہے،ملکوں کی مقامی خصوصیات مٹتی جارہی ہیں اور اشتراک کی ایک وسیع فضا پیدا ہو رہی ہے جس سے دنیا کا پلیٹ فارم بھی ایک ہوتا جارہا ہے اور جذبات کی رو اس طرف آرہی ہے کہ تمدّن وتہذیب سب کا ایک ہو، معاشرت ایک انداز کی ہو، حتیٰ کہ سیاست بھی سب کی ایک رنگ کی ہو اور ایک ہی پلیٹ فارم سے چلے اور آگے بڑھے۔چنانچہ عملاً ایسا ہوتا جارہا ہے اور پوری دنیا ایک ہی عالمگیر تمدن اور ہمہ گیر معاشرت اختیار کرتی جارہی ہے۔

اس اشتراکِ فکر کی وجہ سے طبعاً دنیا کے جذبات ادھر بھی آرہے ہیں کہ مذہب اور دین بھی سب کا ایک ہو، دینی پلیٹ فارم بھی سب کا ایک ہو اور اسے کوئی ایسا عالمگیر دین ہاتھ آجائے جس میں نہ وطنی حد بندیاں ہوں، نہ قومی نسلی اور وطنی تحدیدیں ہوں اور نہ لونی (رنگ کی) تخصیصات۔بلکہ وہ نفسِ انسانیت کا مصلح ہو اور انسانیت کا نام لے کر پوری ہی دنیا کو آواز دیتا ہو۔ظاہر ہے کہ ایسا مذہب اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا جس نے یہی عالمگیر نعرۂ اخوّت ومساوات لگایا اور دنیا کو دین میں پیوست کر دیا ہے اس لئے دنیا دوسرے لفظوں میں اسلام کو پکار رہی ہے اور اس کی خواہاں ہے۔اس صورت میں ہمارا فرض ہے اصل اسلام کو ان عالمگیر وسائل سے پورے عالم کا دین بنانے کی ہمت لے کر اٹھیں۔

ظاہر ہے کہ اس اہم ترین مقصد کے لئے جس قوت اور جن وسائل کی ضرورت ہے وہ مجمع البحوث کے پاس موجود ہیں اور غیر موجود کو باآسانی فراہم بھی کرسکتی ہے، جس کے لئے سارا عالمِ اسلام اس کے ساتھ تعاون کرنا

اپنا فرضِ منصبی سمجھے گا۔

اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالۂ شبہات......آپ نے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: اس سلسلہ میں جیسے اس مثبت پہلو پر کام کرنا ضروری ہے ایسے ہی منفی انداز میں یہ بھی ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ اسلام سے بے خبر یا باخبر معاندین خواہ وہ مستشرقینِ یورپ ہوں یا مستغربینِ ایشیا، جو شکوک وشبہات یا اعتراضات اسلام کے بارے میں پھیلا کر قلوب کو تشویش وتذبذب اور منافرت کا شکار بناتے رہتے ہیں ان کو بھی عالمی پیمانہ پر ہی دفع کیا جائے۔ جبکہ وہ شکوک کی رو بھی عالمی انداز میں بہا رہے ہیں۔ بلاشبہ علماءِ ازہر نے اس سلسلہ میں شاندار اور وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن وہ لسان کی اجنبیت کی وجہ سے سب کے سامنے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب یہ خدمت بھی بین الاقوامی ہی رنگ سے ہو جس میں پورے عالمِ اسلامی کے علماء کے فکریات شامل ہوں اور جس طرح مختلف ممالک کے مسیحی مبشرین ان شکوک کو عالمگیر انداز میں پھیلا رہے ہیں اسی طرح مختلف بلاد کے علماء کی طرف سے ان کے جوابات بھی عالمگیر ہی انداز میں سامنے آئیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت پورے عالم میں اسلام اور مسیحیت کی یہ نظریاتی اور فکری جنگ ہے، اس لئے اس کا مقابلہ بھی برابر ہی کے ہتھیاروں سے ہونا چاہئے جب ہی وہ مؤثر اور کارآمد ثابت ہوگا۔ اس لئے مجمع البحوث کے برنامج میں یہ نمبر بھی مقصدی حیثیت سے شامل رہنا چاہئے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے فکر واجتہاد کا دائرہ صرف فقہیات وجزئیاتِ مسائل تک محدود نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ پوری دنیا کو سامنے رکھ کر پورے اسلام کی تعلیمات کی توسیع واشاعت کا فرض ادا کرنا چاہئے۔

دائرۂ اجتہاد میں اتباعِ اسلاف......حضرتِ ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اور مقالے کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ: ہم میں اجتہاد کی کچھ نہ کچھ قوتیں ہماری بساط کے مطابق آج بھی موجود ہیں۔ وہ نہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتویٰ دینا اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا، اس لئے موجودہ اجتہاد کو استعمال کر کے اضافہ کا منتظر رہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہمیں اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہئے کہ ہم آج کے مغربی تمدن اور اس کی مصنوعی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کرلیں اور پھر قرآن وحدیث سے ان کے مؤیدات تلاش کر کے ان کو حدودِ جواز میں لانے کی فکر کریں۔ جو آج ایک عالمگیر وباء کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ کتاب وسنّت کا اتباع نہیں۔ بلکہ کتاب وسنّت سے اپنا اتباع کرانا ہے جو علاوہ بے ادبی کے، ایک مہلک اور خطرناک حرکت بھی ہے۔

ہمارے لئے اس فکر ونظر یا طریقِ استنباط میں جہاں اصول وقواعدِ فن کی پابندی ضروری ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی کے ساتھ ان کے ترکہ سے پہنچا ہوا وہی ذوق تھامے رہنا بھی ضروری ہے جو انہوں نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا اور بطورِ توریث (وراثت) ہم تک پہنچایا۔ ورنہ اس کے بغیر دین کا وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو

"وَيُزَكِّيهِمْ" کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بخشا۔اس لئے طبعاً ہم اجتہاد کے دائرہ میں رہ کر بھی اتباعِ سلف کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے۔تا آنکہ ایک ایک سنّت اور ایک ایک اسوۂ سلف ہمارے جہد واجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہیے۔اس پر حضرت ممدوح نے مقالہ کی چند مثالیں بھی نقل فرمائیں جو مقالہ میں آپ پڑھ سکیں گے۔

عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت ......تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: بلادِ مختلفہ کے علماء کے جمع ہونے سے قدرتی طور پر ربط واتحاد کا ایک مظاہرہ ہوا جو خوش آئند تھا اور ساتھ ہی مؤتمر کے مقاصد میں بھی داخل تھا۔آپ نے اتحادِ عالمِ اسلامی کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے زیادہ تر عرب اتحاد اور اس میں بھی خصوصیت سے مصر، شام اور حجاز کے اتحاد پر اہمیت کے ساتھ زور دیا۔اس سلسلہ میں آپ نے شرعی اشارات سے مصر وشام اور حجاز کی خصوصیات بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم ان تین مرکزی ملکوں کو محض سیاسی یا جغرافیائی حیثیت سے اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ دینی اور مذہبی حیثیت سے اہم اور مقدس جانتے ہیں۔شریعت نے حجاز کو مرکزِ عبادت بتایا ہے شام کو مرکز شوکت کہا ہے اور مصر کو مرکزِ عسکریت فرمایا ہے۔حجاز مرکزِ امن اس لئے رکھا گیا کہ عبادت بغیر امن کے نہیں ہوسکتی، شام کو مرکز جنگ ودفاع اس لئے رکھا گیا کہ شوکت بغیر مدافعت وہجوم کے قائم نہیں ہوسکتی اور مصر کو مرکزِ عسکریت اس لئے رکھا گیا کہ مشرق میں مغرب کے سیاسی اقدامات کی روک تھام بغیر عسکری قوت کے نہیں ہوسکتی۔اس لئے یہ تین ملک تین اقسام کی مخصوص مرکزیتوں کے حامل ثابت ہوئے۔اس صورت میں ان کے باہمی ربط کی صورتِ حال خود بخود کھل جاتی ہے اور وہ یہ کہ امن عبادت کے لئے شوکت ضروری ہے اور شوکت کی بقاء کے لئے عسکریت ضروری ہے۔تو منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حجاز کا تحفظ بلادِ شام کی شوکت کے بغیر ممکن نہیں اور شام کی شوکت کی برقراری مصر کی عسکری قوت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے جب تک مصر کی فوجی طاقت مضبوط نہ ہو اور شام وحجاز سے ان کا اتحاد نہ ہو، نہ شام وحجاز کا تحفّظ ہوسکتا، نہ خود مصر کا۔

اور جب کہ یہ تمام نقاط خود احادیث میں دکھائے گئے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام نقاطِ بحث محض سیاسی یا جغرافیائی نہیں بلکہ دینی ہیں۔اس لئے ہم مصر وشام اور حجاز کا باہمی اتحاد دینی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں۔ اندریں صورت اگر آپ عالمِ اسلام کا اتحاد چاہتے ہیں تو اس کے لئے عرب اتحاد پہلا زینہ ہے اور عرب اتحاد کا پہلا قدم مصر وشام اور حجاز کا اتحاد ہے، آج جبکہ صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ السید جمال عبدالناصر نے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر عرب اتحاد کا نعرہ لگایا ہے اور بالفاظ دیگر اسلامی اتحاد کا پرداز ڈالا ہے تو ہمیں ان کے اس نعرے کی قدر کرنی چاہیے اور اس کے لئے یہ مؤتمر بلاشبہ ایک مبارک قدم ہے۔

مصر کی صنعتی ترقی......آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: مؤتمر کے ان جلسوں کے دوران ہی دو تین دن کے بعد مصر کے مختلف مرکزی شہروں کے سفر کا پروگرام رکھا گیا تھا موٹر کاروں سے اور کہیں ہوائی جہاز کے ذریعے۔

سب سے پہلا سفر " اَلْمَحَلَّةُ الْكُبْرٰى "کا ہوا جو مصر کا صنعتی مرکز ہے اور اس میں پارچہ بافی اور قالین بافی

وغیرہ کی مل اور فیکٹریاں ہیں۔ دوسرا سفر "طنطا" کا ہوا جو مصر کا ایک بڑا صنعتی شہر ہے، تیسرا سفر نہر سوئیز اور فلسطین کا ہوا جو مصر کی فوجی قوت کا مرکز ہے۔ اس سفر میں اولاً عریش آیا جو نہر سوئیز کے کنارے ایک پرفضا شہر ہے اور اس سے ایک میل آگے بڑھ کر نہر سوئیز ہے جس کے کناروں پر چلتی پھرتی گودیوں کا انتظام ہے۔ نہر سوئیز مصر کی ایک عالمگیر شوکت کا قدرتی نشان ہے۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد اس سمندری نہر سے یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے جہاز گزرتے ہیں جن کا کسٹم لیا جاتا ہے اور تلاشی لینے کے بعد ڈیوٹی بھی وصول کی جاتی ہے۔

نہر سوئیز سے گزر کر صحرائے سینا آیا جس سے گزرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے گزرنے کا تصور بندھا رہا اور اس مقدس وادی کی برکات سے قلب و روح متاثر ہوتے رہے۔ اس کے بعد غزّہ آیا جو فلسطین کا آخری سرحدی شہر اور فوجی حیثیت سے ایک اہم مقام ہے۔ یہی شہر امام شافعی رحمتہ اللہ کا مولد و منشاء (جوان ہونے کی جگہ) بھی ہے۔ چنانچہ ہمیں وہ بلڈنگ دکھلائی گئی جو آج حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکانِ ولادت پر بنی کھڑی ہے۔

غزہ میں فلسطینی عربوں نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ شب میں ہم وہاں پہنچے تو غزہ کے ایک پرتکلف اور وسیع ہوٹل میں طعام و قیام کا انتظام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک مختصر سا استقبالیہ جلسہ اسی ہوٹل میں ہوا۔ صبح کو ہم نے کئی لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی جھونپڑیاں دیکھیں جن میں فلسطین کے تباہ حال عرب عسرت و تنگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پھر فلسطینی عربوں کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ان عالمی علماء کو "مرحبا" کہا گیا، خیر مقدمی نعرے لگائے گئے، تقریریں ہوئیں اور آخر میں تقسیم فلسطین کے خلاف ایک عالمی تجویز پاس ہوئی۔

واپسی پر مؤتمر کے دو تین اجلاسوں کے بعد پھر ہوائی جہاز سے اسوان کا سفر ہوا، جہاں دریائے نیل پر بند باندھا جا رہا ہے اور جدید اسوان شہر کی تعمیر کی جا رہی ہے، جس سے مصر کی ٹیکنیکل ترقی کا پروگرام سامنے آیا اور ہم نے دیکھا کہ پندرہ بیس میل کی حدود میں لوہے اور سیمنٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے وسیع پیمانے پر تعمیر ہو رہے ہیں۔

اس سفر سے واپسی کے بعد "مُدِیْرِیَۃُ التَّحْرِیْرِ" کا سفر ہوا جو مصر کی زراعتی ترقیات کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں فوجی دستہ نے مہمانوں کو خیر مقدمی سلامی دی، بچوں نے فوجی کرتب دکھلائے اور ورزشی کھیلوں کا مظاہرہ کیا، مہمانوں کو عطر کی شیشیاں پیش کیں اور یہ اجتماع چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ شام تک وہاں سے واپسی ہوئی اور صبح سے پھر بدستور مؤتمر کے اجلاس جاری رہے۔

دار القرآن کا سنگِ بنیاد...... اعضاءِ مؤتمر کے اس مبارک اجتماع کے موقع پر قاہرہ میں دو اہم اور عظیم الشان عوامی جلسے بھی منعقد کیے گئے، ایک دار القرآن کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے جو جامعہ ازہر سے متعلق ہے اور اسے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے، تا کہ قرآنِ کریم کی تعلیم ذیلی اور ضمنی نہ رہے بلکہ ایک مستقل نصب العین کی حیثیت

سے سامنے آئے۔ اس جلسہ کی صدارت نائب صدر جمہوریہ السید حسین شافعی نے فرمائی۔ تلاوت، اور تاسیس کے بعد اس جلسہ میں تمام مہمانوں کو مصر کے مطبوعہ قرآن شریف بطورِ ہدیہ پیش کئے گئے۔

مدینۃ الازہر...... دوسرا عظیم الشان جلسہ جامعہ ازہر کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے مدینۃ النصر میں منعقد ہوا جس کا پنڈال غیر معمولی طور پر وسیع اور پر شوکت بنایا گیا تھا اور اس میں تقریباً بیس سے پچیس ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ یہ پنڈال جھنڈیوں اور کتبوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر مندوب علماء کی کرسیاں تھیں۔ اسٹیج کے نیچے ایک طرف مصری زعماء و علماء بٹھلائے گئے تھے اور دوسری جانب سفراءِ دول (ممالک کے سفیروں) کی نشستیں تھیں، صدارت کے لئے اعلان صدر جمہوریہ عربیہ متّحدہ السید جمال عبدالناصر کا تھا لیکن وہ بعض ہنگامی مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکے، تو ان کے امر سے سید حسین شافعی نائب صدر جمہوریہ نے ان کی نیابت کی اور جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کے لئے سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ ایک پورا شہر مدینۃ الازہر کے نام سے تعمیر کیا جارہا ہے۔ جس میں جامعہ ازہر کے تمام کالج، مدارس، دارالاقامے اور دفاتر یکجا ہوں گے جو اب منتشر ہیں اور جامعہ ازہر نے سولہ کروڑ روپیہ کا تخمینہ اس کے لئے منظور کیا ہے۔

ہزار سالہ علمی عظمت...... اس اجتماع میں اجمالاً جامعہ ازہر کی ہزار سالہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی جس کا سب نے اعتراف کیا کہ اس ہزار سالہ جامعہ نے بلاشبہ بڑے بڑے ائمۂ علوم وفنون پیدا کئے۔

ظاہر ہے کہ جب اس کے فضلاء اور فارغین میں جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے ائمۂ علم وہدایت ہوں تو اس کی زرّین خدمات سے کون انکار کرسکتا تھا۔

صدر ناصر خدمات اور کردار...... اسی دوران ملک میں الیکشن کا ہنگامہ بھی برپا ہوا۔ نئی پارلیمنٹ چنی گئی اور اس میں السید جمال عبدالناصر صدرِ مملکت چنے گئے۔

نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس نئے صدرِ منتخب (السید جمال عبدالناصر) کی صدارت میں ہوا جس میں صدر مملکت نے تقریباً تین گھنٹے تقریر کی اور اس میں مصر کے جدید دور کی ﴿جو شاہیت کے خاتمہ کے بعد کا ہے﴾ ترقیات کا مفصل تذکرہ کیا اور قوم نے بے پناہ محبت اور تالیوں کی گونج میں صدر کا خطاب سنا اور اس سے متاثر ہوئی۔

مصری قوم اپنے موجودہ صدر سے کافی محبت رکھتی ہے۔ اولاً صدر کی خدمات کی وجہ سے، جن میں سے عظیم ترین خدمت اتحادِ ثلاثی (اسرائیل، برطانیہ، فرانس) کے حملہ سے مصر کو بچانا اور اندرونی طور پر مصر کو مہلک قسم کی سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نجات دلانا، نیز پوری قوم کو یکسانی کے ساتھ ہر ممکنہ ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور مصر کو صنعتی، زراعی اور علمی ترقیات کے راستہ پر ڈال دینا وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے صدر کے ذاتی کردار کی پختگی اور سادگی کا مصر والوں پر خاص اثر ہے کہ جمال عبدالناصر نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے آج تک کوئی سرکاری عمارت استعمال نہیں کی اور جاہ وجلال کی رسمی نمائش سے الگ تھلگ رہے بلکہ ابھی تک وہ اپنے ہی قدیم ذاتی مکان میں رہائش رکھتے ہیں۔ جو شہر میں اور مکانوں کے ساتھ ایک عام

مکان کی حیثیت رکھتا ہے، ان کی اولاد اور بچوں کے لئے اسکول وغیرہ جانے میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ عام بچوں کی طرح یہ بچے بھی سائیکلوں پر اسکول جاتے آتے ہیں۔ اسکولوں کا عام قانون ان پر بھی اسی طرح چلتا ہے جس طرح قوم کے دوسرے بچوں پر۔

صدرِ مملکت خصوصیت سے جمعہ کی نماز نوبت بہ نوبت شہر کی مختلف جامع مساجد میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں نہ کوئی جگہ مخصوص ہوتی ہے اور نہ پولیس کے ذریعے کوئی انتظام کیا جاتا ہے جہاں جگہ ملتی ہے آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور نماز ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ پنج وقتہ نمازوں کی بھی پابندی کرتے ہیں۔

مصر کی عمومی مذہبی حالت...... اس ملک میں ہر شہر کی مسجدیں عمومی طور پر نہایت شاندار اور کافی آباد ہیں۔ قاہرہ، طنطا، اسکندریہ اور غزہ وغیرہ شہروں کی مسجدیں دیکھنے کی نوبت آئی، مساجد کے نقشے نہایت پرشوکت اور تعمیریں معیاری ہیں، ساتھ ہی ان مساجد میں صف بوریہ کے بجائے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے۔ ائمہ و موذنین حکومت کی طرف سے تنخواہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ نمازوں کے وقت مسجدیں معمور ہوتی ہیں اور ہر وقت کی نماز میں نمازی جوق در جوق آتے ہیں اور مساجد بھری رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا کہ مغرب کی نماز کے بعد ائمہ مساجد آدھ پون گھنٹہ وعظ بھی کہتے ہیں۔

مصری قوم میں ملنساری اور محبّت کا مضمون کافی ہے، جب تک زبان وغیرہ کی اجنبیت رہتی ہے، بیگانگی سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور ضمائر سامنے آتے ہیں اور زبان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی تو یہ مصری مصری کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔

اکرامِ ضَیف...... اکرامِ ضیف تو بہر حال مسلم قوم کا مزاج ہی ہے۔ جس میں عرب امتیازی شان رکھتے ہیں مصریوں میں بھی عام عربوں کی طرح یہ خُو طبیعتِ ثانیہ ہے۔ اعضاء مؤتمر کی مدارات وضیافت میں بھی مصر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وزراء، امراء اور انجمنوں کی طرف سے دعوتیں عموماً ہوٹلوں میں دی جاتی تھیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ دعوتوں کے سلسلے میں ہوٹلوں کا انتخاب اور ترتیب خاص سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ ہر اگلے دن کا ہوٹل پچھلے ہوٹل سے زیادہ عظیم اور عالی شان ہوتا تھا، ہر پہلا ہوٹل دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ اس سے بہتر ہوٹل دوسرا نہ ہوگا۔ لیکن اگلے دن کا دوسرا ہوٹل نگاہوں میں پہلے کو گرد بنا دیتا تھا۔ شخصی طور پر بھی متعدد علماء وفضلاء کے لئے دعوتیں ہوئیں مگر سلیقہ مندی ہر حرکت سے محسوس ہوتی تھی۔ کاموں میں مستعدی اور ادائےِ فرائض میں چُستی نمایاں نظر آتی تھی۔ قوم کا علمی شعور عام طور پر بیدار ہے۔

مصر کا سرکاری مذہب...... سیاسی سوجھ بوجھ انفرادی حد تک نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی ہے، قومی الیکشن کے سلسلہ میں جن امور کی خاص طور پر مؤتمر کے اجلاس میں مندوبین کو بشارت دی گئی وہ یہ ہے کہ دستورِ مملکت میں مستقل دفعہ رکھدی گئی ہے کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے، اور سرکاری زبان عربی ہوگی۔

اشتراکیت کا پروپیگنڈہ...... یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کر لی گئی ہے اور وہ کمیونزم کے حامی ہیں۔ اول تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظِ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں، ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کی بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں۔ جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہوگا لیکن کمیونزم کا نہیں ہوگا۔ اس لئے ایسی اشتراکیت وعمومیت جو اسلام کی حدود میں ہے، کمیونزم نہیں کہلائی جا سکتی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی اور خوبی کی بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لی گئی ہے۔ خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کی ناقص فکر اور جذباتی رو کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کر دیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

قاہرہ میں میرے کانوں میں پڑا کہ قاہرہ کا ایک چوتھائی حصّہ جسے مصرِ جدید کہتے ہیں اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی کا حصہ ہے، وہ کم وبیش صرف ایک البانی عورت کی ملکیت تھا جسے جمال عبدالناصر نے نیشنلائز کر دیا تو کون اس اقدام کو غلط کہہ کر اس پر کمیونزم کا طعنہ دے سکتا ہے۔

بہر حال شخصی املاک کی افراط کو جو اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان کا بڑا اثر قوم کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو، ختم کر کے حدودِ اعتدال میں لے آنا قابلِ ملامت نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابلِ ستائش کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال مؤتمر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔

مصری قوم کی قرآنِ کریم سے والہانہ محبت...... یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن صرف قرآنِ کریم کی تلاوت کے لئے منظور کیا گیا ہے جس میں روزانہ بارہ گھنٹے تلاوت قرآن ہوا کرے گی اور بعد میں قرآنی مطالب کی تفہیم کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ چناں چہ یہ اسٹیشن ہم لوگوں کی موجودگی میں کھولا جا چکا تھا، قاری محمد خسری نے جو مصر کے مشہور مجود (تجوید کے ماہر قاری) ہیں یہ تلاوت شروع بھی کر دی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ کریم کے ساتھ مصری قوم کو صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق اور شغف ہے۔ پڑھتے بھی لطف سے ہیں اور سنتے بھی لطف سے ہیں۔ جمعہ کے دن ہر جامع مسجد میں لازمی معمول ہے کہ خطبہ کی اذان سے قبل ایک گھنٹہ ایک مشہور مُجوِّد جو اس مسجد کے لئے معین طریقہ پر مقرر ہے قرأت کرتا ہے۔ وہی خطبہ کی اذان بھی دیتا ہے اور وہی امام کے ساتھ نماز کی تکبیرات بھی پکارتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ازہر کی جامع مسجد میں شیخ مصطفیٰ اسمٰعیل، جامعہ شافعیہ میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور جامعہ زینت میں دوسرے ایک مشہور مجود اس عمل کے پابند ہیں۔ اسی طرح اور تمام جوامع کا یہی دستور ہے۔ سماعِ قرآن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم سے یہ عمومی شغف کسی دوسرے عربی ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حتّٰی کہ ایک سپاہی جو سڑک کے چوراہے پر پہرہ دے رہا ہے اسے بھی ذرا فرصت ملتی ہے تو گلے میں سے ٹرانسسٹر نکال کر قرأت سننے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

جامعہ ازہر میں ہر مدرّس کے انتخاب میں حافظِ قرآن ہونے کی شرط رکھی گئی ہے۔ دار القرآن کا سنگِ بنیاد ہی مستقلاً حفظ کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظ کی جو کثرت مصر میں دیکھنے میں آئی ہے وہ دوسرے عربی ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

حفاظتِ قرآنِ کریم کے لئے مصری حکومت کا سنہری کارنامہ...... پھر نہ صرف تلاوتِ قرآن بلکہ حفاظتِ قرآن کے ساتھ بھی قوم میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ یہود بے بہبود نے اپنی روایتی تلبیس کاری اور عیاری سے افریقہ میں جو مصریوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز ہے، ایک قرآن شریف تحریف کر کے طبع کرایا اور پھیلا دیا جس میں سے کئی سورتیں خارج کر دیں۔ کتنی ہی آیتیں بدل دیں اور کتنے ہی مضحکہ خیز جملے اپنی طرف سے بڑھا دیئے تا کہ افریقہ میں اسلام کی پھیلتی ہوئی رو رک جائے اور جو مسلمان ہوں وہ غلط اور مخالفِ اسلام عقائد واعمال کے حامل داعی ہوں تا کہ اسلام کی تعلیمات کو سن کر تو میں ہنسیں اور اسلام کم از کم افریقہ میں غیر مقبول ہو جائے۔

یہ شرارت مصری حکومت کے علم میں آئی تو اس نے اُسی دم لاکھوں پونڈ کا بجٹ منظور کر کے صحیح قرآنِ کریم چھپوایا اور اس کے سرِ ورق پر یہود کی شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور نہ صرف یہی بلکہ افریقہ بھر میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر مسلمانوں کے گھروں سے وہ غلط قرآن نکلوائے اور انہیں دریابُرد کر کے یہ صحیح طبع شدہ قرآن گھر گھر مفت پہنچا دیا۔ جس سے عظیم فتنہ ختم ہوا اور قرآن کے بارے میں موعودہ حفاظت خداوندی کھل کر نمایاں ہو گئی۔

مصری حکومت کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلم ملک کے اقدامات میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میرا یقین ہے کہ مصر اور مصری قوم کو اس قرآنی شغف ہی نے تیرا رکھا ہے جس سے یہ قوم اپنی بعض بنیادی کمزوریوں کے باوجود تھمی ہوئی ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

بہر حال مؤتمر کے اجلاس میں بطور بشارت یہ سنایا گیا کہ حکومت کا مذہب قرآن ہے، حکومت کی زبان لسان قرآن ہے، حکومت کا نصب العین اشاعتِ قرآن ہے اور اس کا منصوبہ حفاظتِ قرآن ہے۔ جس سے دنیا کے ممالک کے یہ مندوب علماء متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردیاں پہلے سے زائد مصر کے ساتھ قائم ہو گئیں۔

مغربیت سے مرعوبیت...... مگر اس کے ساتھ ہی جو چیز ہم لوگوں کے لئے ان ساری مسرّتوں کے ہجوم میں کوفت اور سوہانِ روح کا سبب بنی وہ مصری قوم کا مغربی تمدن میں ڈوب جانا اور غرق ہو جانا ہے، جب تک ان کے ضمائر اور مافی الضمیر کا اندازہ نہ ہو، ظاہر طور پر قاہرہ و پیرس اور لندن کی معاشرت میں کوئی فرق محسوس کرنا مشکل ہے۔ جہاں مساجد نمازوں سے بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ وہاں سو میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کا چہرہ مہرہ شرعی دکھائی نہ دے گا۔ نمازیں بھی پڑھیں گے تو اکثر و بیشتر ننگے سر، آدابِ شرعیہ کی عملی رعایت تقریباً مفقود ہے۔

اکثریت کے ساتھ شہروں میں عورتیں نہ صرف بے حجاب ہی ہیں بلکہ بے ستر بھی ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط یا شرعی انداز میں تجسس و تحقیق کا کوئی دستور نہیں ہے۔ عورت مرد کا اختلاط عام ہے، جلسوں بازاروں اور دفتروں حتیٰ کے مذہبی رنگ کے جلسوں میں بھی عورتیں کھلم کھلا شریک ہوتی ہیں۔

جامع ازہر کی تاسیس کے عظیم اجتماع میں عورتوں کا مستقلِ حلقہ تھا۔ جس میں وہ کھلے منہ شریک ہوئیں اور تقریباً ہر منظرِ عام پر عورتیں پوری آرائش کے ساتھ ملی جلی دکھائی دیں گی۔

اغیار کا تمدن گو بظاہر تو عمل کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے مگر اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر آنا لازمی ہے، اسی لئے شریعت نے اصولی طور پر کسی غیر مسلم تمدن میں ڈھل جانے سے یہ یا غرق ہو جانے سے روکا ہے۔

تمدن کے اس طبعی اثر سے مصر بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ مغربی تمدن کی یہ باتیں کی ہی نہیں جاتیں بلکہ جائز بھی سمجھی جاتی ہیں۔ اس بارے میں تاویلات کا دروازہ تفسیرات سے زیادہ کھلا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اجتہاد اور جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت اسی لئے محسوس کی جارہی ہے۔ کیوں کہ قدیم فقہ یقیناً بہت سی جدید جزئیات پر قید و بند عائد کرتا ہے تو سعات میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے، اس لئے اس کا علاج ترمیمات ہی ہو سکتی ہیں جن کا عنوان تقاضائے وقت رکھا گیا ہے۔ اس میں فکری غلطی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت اور اقتدار میں تضاد باور کر لیا گیا ہے حالاں کہ یہ واقعات اور تاریخ کی رو سے غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ صاف بات مغربیت سے مرعوبیت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔

ممکن الزّوال خرابیاں...... ان فکری اور عملی بے راہ رویوں کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ علماء پر عائد ہوتی ہے۔ یہ توسعات درحقیقت فکر کی آزادی سے چلتے ہیں:

چو نیم بیضہ کہ سلطان ستم روادارد　　　زنند لشکر یانش ہزار مرغ بہ سیخ

کا معاملہ سامنے آیا ہوا ہے، اس لئے جائزات کی تلاش بلکہ جائزات سازی کی کثرت ہے اور عوام کی حد تک کوئی ممنوع و مکروہ ناجائز کی حدود میں نظر نہیں آتا۔

گو اس میں امید کی کرن یہ ضرور نظر آتی ہے کہ اوپر کی ذکر کردہ خوبیاں اصلی ہیں اور یہ خرابیاں یورپ اور یورپیوں سے ہمہ وقتی قرب اور غلط ماحول کا نتیجہ اور اس کا رسوخ تنبیہ و اصلاح کی کوتاہی کا ثمرہ ہے۔ سمجھانے پر قلوب متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور رفتار کے بدل جانے کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے مقالات و خطابات میں ان امور پر شائستہ انداز میں نکیر و ملامت کی۔ جس پر کسی بیزاری نظر نہیں آئی، بجائے ہمیں شرمساری محسوس ہوئی۔ اس لئے اصلاح اور مصلح کے لیے یقیناً گنجائشیں ہیں۔ مگر مصلح کی کامیابی صرف صحیح عمل کی نشاندہی سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ استدلالی قوت سے صحیح فکر کی نشاندہی نہ کی جائے اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کوئی علمی رنگ کا اقدام نہ کیا جائے اور وہ بھی مسلسل جب تک کچھ اہلِ دل خواص ان کے پیچھے نہ لگ لیں اور استدلال و

نظر کے ساتھ اپنے عمل وتقویٰ کا نمونہ ان کے سامنے نہ رکھتے رہیں، اصلاح وتعدیل مشکل ہے۔

بہرحال جیسے دنیا کی ہر قوم میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں، اسی طرح مصری قوم میں بھی کچھ خوبیاں ہیں جو کافی حد تک ہیں اور کچھ خرابیاں ہیں مگر ممکن الزوال مؤتمر کے عالمی رابطہ کو اس میں استعمال کیا جائے۔

بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت...... حضرت محترم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: بہرحال میں نے مصر پہنچ کر اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ سفر کر کے جو کچھ اندازہ لگایا، میں سمجھتا ہوں کہ خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ پھر مغربی تمدن کا یہ غلبہ کچھ مصر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، اس غلبہ سے تقریباً ہر مسلم ملک اور خصوصیت سے ہر عربی ملک متاثر ومغلوب ہو چکا ہے، کہیں پس پردہ اور کہیں بے پردہ۔ لیکن پھر بھی مصریوں کا عمومی شعور جو ہاں کی عمومی اور مفت تعلیم کا ثمرہ ہے اور اسی کے ساتھ ان کی عمومی صحت مندی اور تندرستی جو وہاں کی قدرتی آب وہوا کا نتیجہ ہے، دونوں کی مضبوطی نے انہیں استحکام اور قیادت کے راستے پر ڈال دیا ہے اور وہ ﴿زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ کے مصداق ہو کر (اَحَقُّ بِالْمُلْکِ) کے حق دار بن گئے ہیں، اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح بڑھ رہے ہیں تو ان کا اثر ورسوخ ہر اسلامی ملک میں عام سے عام تر ہوتا چلا جائے گا اور بالخصوص مڈیسٹ کے ممالک کو ان کی اٹھائی ہوئی وحدت سے علیحدہ رہنے کا کوئی جائز عذر باقی نہیں رہے گا۔

ان حالات میں قاہرہ میں اس عالمی مؤتمر کا اس شان سے انعقاد اور بین الاسلامی رابطہ کی یہ عملی دعوت بلا شبہ ان کے حسن تدبُّر کی قابلِ ستائش مثال ہے۔

حضرت ممدوح نے اس تقریر میں مصر کے احوال ومشاہدات پر تفصیلی روشنی ڈالی، اس بارے میں چونکہ حضرت موصوف کے مشاہدات مصر وحجاز سے آئے ہوئے خطوط میں شائع بھی ہو چکے ہیں اس لئے مشاہدات کے بجائے اس تحریر میں تأثرات اور مقالات کو جمع کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جن میں بنیادی چیز آپ کا وہ مقالہ ہے جو آپ نے مؤتمر میں پڑھ کر سنایا۔

اس تقریر میں آپ نے اپنے اس مقالہ کے بُنیادی نکات کی ضروری حد تک نشاندہی اور مزید تفصیل فرما دی مگر پھر بھی مقالہ میں جو تعمیری تجویزیں اور ضروری نکات مؤتمر کے سامنے رکھے گئے تھے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت ممدوح ہی کے اصل عربی الفاظ میں مع ترجمہ کے پیش کر دیا جائے تا کہ اس متن کے ساتھ، زبانی بیان کردہ حالات ومشاہدات اس کی شرح کی حیثیت سے سامنے آجائیں۔

اس عربی بیان کا سلیس ترجمہ ہمارے دارالعلوم کے صفِ عربی کے استاذ مولانا وحید الزمان صاحب نے کیا ہے جس میں اصل مقالہ کی رُوح کو پوری طرح باقی رکھا گیا ہے۔ (مقالہ رسالۂ دارالعلوم کے اسی شمارے میں شامل ہے)

اس سلسلہ میں فلسطین اور غزہ کے سفر میں آپ نے تقسیمِ فلسطین کے خلاف بھی اپنی رائے بذیلِ تحریر منضبط

فرمائی تھی۔ لیکن جبکہ فلسطین سے متعلق تجویز کے سلسلے میں وہ سب امور موجود تھے جو اس مقالہ میں درج کئے گئے تھے اور اس تجویز پر حضرت ممدوح کے دستخط بھی ہوئے، اس لئے مقالہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم اس بارے میں حضرت موصوف کا زاویۂ نگاہ واضح کرنے کے لئے یہ مقالہ بھی مع ترجمہ کے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ (جسے خطبات کے صفحہ: ۷۷ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔)

سفر حجاز...... یکم اپریل ۶۴ء کو حضرت موصوف قاہرہ سے بقصد حج بیت اللہ حجاز مقدس روانہ ہوئے اور اس تاریخ میں براہ جدہ ہوائی جہاز سے اولاً مدینہ طیبہ پہنچے اور وہاں چودہ دن قیام کے کر کے ۱۶ اپریل کو مکہ مکرمہ پہنچے اور ۲۱/ اپریل کو ادئیگی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اس تقریر میں آپ نے مدینۂ طیبہ اور مکۂ مکرّمہ کے اجتماعات کا بھی ذکر فرمایا جن کا اجمالی خلاصہ علمی دنیا کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ: مدینۂ منورہ کے قیام کے دوران اس دفعہ خصوصیت سے جامعہ اسلامیہ مدینۂ منورہ کے متعدد اساتذہ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے اور وسعت اخلاق کے ساتھ ملے۔

دوسرے روز مدینہ یونیورسٹی کے رجسٹرار الاستاذ الشیخ عبود بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور بغایت کرم وعنایت پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں انہوں نے یونیورسٹی کی طرف سے دعوت پیش کی اور فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ خیر مقدم کے طور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہوں اور آپ کچھ خطاب بھی کریں، حضرت ممدوح نے یہ کہہ کر کہ میں تو خود ہی جامعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا، اس دعوت کو بصد شکریہ قبول فرمالیا۔

مقرّرہ وقت پر کاریں آگئیں اور آپ اپنے رفقاءِ سفر خصوصیت سے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت صوبۂ بہار، صاحبزادہ محترم مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالحق صاحب پیش کار اہتمام دارالعلوم کو ساتھ لے کر یونیورسٹی روانہ ہوگئے۔ یونیورسٹی کے وسیع صحن اور چمن میں الاستاذ عبود اور دوسرے حضرات نے خوش آمدید کہا اور یونیورسٹی کے نائب الرئیس الشیخ بن باز کے دفتر میں پہنچایا جو ایک متبحر عالم اور قادر الکلام خطیب ہیں۔

شیخ بکمال شفقت وعنایت پیش آئے۔ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھڑا، حضرت مہتمم صاحب حالات بیان کرتے رہے جس سے شیخ متاثر ہوئے۔ شیخ بن باز نے متعدد قیمتی کتابوں کے ہدایا حضرت ممدوح اور ان کے تمام رفقاء کو عنایت فرمائے۔

پھر شیخ عبود نے یونیورسٹی کا معائنہ کرایا اور آخر میں یونیورسٹی ہال میں لے گئے جہاں تمام طلبہ، اساتذہ اور الشیخ بن باز پہلے پہنچ چکے تھے، اولاً شیخ بن باز نے تقریباً نصف گھنٹہ تقریر فرمائی اور فرمایا کہ: میرا ارادہ تھا کہ میں اس خطاب میں مناسکِ حج پر روشنی ڈالوں۔ لیکن اس وقت ہمارے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ رئیس دارالعلوم دیوبند ہم میں موجود ہیں۔ ہم بہ صد طوع ورغبت، ان کے افکار وخیالات سننے کے آرزو مند ہیں۔ اس تقریر کے بعد صدرِ جلسہ نے حضرت مہتمم صاحب کا تعارف کرایا اور تقریر کے لیے ایماء کیا۔

مدینہ یونیورسٹی میں خطاب...... حضرت ممدوح نے اسٹیج پر اپنا مقالہ پڑھا جس میں شکریۂ اربابِ جامعہ کے بعد دیوبند کے حالات، تعلیمات، مسلک اور دینی رُخ وغیرہ پر روشنی ڈالی اور آخر میں جامعہ مدینہ منورہ کے بارے میں ستائش کے وہ کلمات فرمائے جو اس مقدس یونیورسٹی کی شایان شان تھے۔

دارالعلوم کے حالات، معاملات اور مسلک کی تفاصیل کے جملوں پر اکثر اسٹیج اور طلبہ کی طرف سے ماشاءاللہ اور الحمدللہ کے کلمات بلند ہوتے رہے۔ یہ مقالہ بھی دارالعلوم کے اسی شمارہ میں شامل کیا جارہا ہے (جسے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)

بے اصل بات...... اس مقالہ کے اختتام پر صدرِ جلسہ حضرت ممدوح کے شکریہ اور کلماتِ خطاب کی تحسین کے لئے اٹھے مگر خطاب شروع کرنے سے پیشتر اسٹیج پر اتر کر حضرت مہتمم صاحب کی کرسی کے پاس آئے جو شیخ بن باز کے پاس بچھی ہوئی تھی، اور جھک کر اپنی ایک پُرچی یادداشت کو سامنے رکھ کر استفساری لہجہ میں فرمایا: ''کیا یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اہلِ حدیث طلبہ کا داخلہ ممنوع ہے اور کوئی داخل ہوتا ہے تو اسے خارج کردیا جاتا ہے چنانچہ ایک سال اس کا کھلا مظاہرہ بھی ہوا کہ آٹھ دس طلبۂ اہلِ حدیث دارالعلوم سے خارج کردیئے گئے۔ یہاں یہ پروپیگنڈہ عام ہے، کیا اس کی کوئی اصلیت ہے''؟ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے فرمایا: ''یہ بے اصل بات ہے جو جناب کے کانوں میں ڈالی گئی ہے، مسلک کے اختلاف کی بناء پر نہ کبھی اہلِ حدیث طلبہ کا داخلہ دارالعلوم میں روکا گیا ہے اور نہ کسی مسلک کے اختلاف کی وجہ سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔

جس واقعہ کی طرف جناب اشارہ فرما رہے ہیں اس کی اصلیت یہ ہے کہ اہلِ حدیث اور حنفی طلبہ میں مسلکی تنازعہ ہوا۔ نوبت ایک دوسرے کے بزرگوں کے حق میں سخت کلامی بلکہ بدکلامی کی آئی اور اس نزاع کا اثر دارالعلوم کے عام ڈسپلن پر پڑنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ یہ معاملہ عام ہنگامہ کی صورت اختیار کرلے۔ تو نظم (ڈسپلین) برقرار رکھنے کے لئے ان جھگڑالو طلبہ کو جھگڑے کی بناء پر خارج کیا گیا، جن میں اہلِ حدیث بھی تھے اور حنفی بھی۔ اگر مسلک کے تفاوت کی بناء پر یہ اخراج ہوتا تو حنفی کیوں خارج کئے جاتے اور اگر مسلک اختلاف کی بناء پر اہلِ حدیث خارج کئے جاتے تو انہیں داخل ہی کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ پھر خارج کرنے کا بار سر لیا جاتا۔ اور اگر یہ سب کچھ مسلک کے اختلاف کی بناء پر ہوتا تو جو اہل حدیث اس نزاع میں شریک نہیں تھے، انہیں بدستور دارالعلوم میں کیوں داخل رکھا جاتا؟ اس لئے یہ واقعہ سرتاپا غلط ہے کہ ان طلبہ کے اخراج کی وجہ تفاوتِ مسلک ہے''۔ اس سے صدرِ جلسہ بہت مطمئن ہوئے اور انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر اوّلاً حضرت مہتمم صاحب کے مقالہ کے بارے میں بھرپور تحسین کے کلمات فرمائے، پھر دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کیا اور آخر میں اس واقعہ کا ذکر کرکے فرمایا کہ:

''دارالعلوم دیوبند کے بارے میں جو یہ شہرت دی گئی اور بارہا کان میں پڑا کہ وہاں اہل حدیث کا داخلہ ممنوع ہے یا وہ اس بنا پر خارج کئے جاتے ہیں، غلط ہے ہم نے اسی وقت رئیس دارالعلوم سے اس کی تحقیق کی تو

شہرت بے اصل ثابت ہوئی۔ایسی افواہوں کا پھیلانا نامناسب ہے''۔

حضرت مہتمم صاحب نے جب یہ تفصیل اپنے اس خطاب میں ارشاد فرمائی تو مجمع میں اس سے خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور افسوس اس کا ہوا کہ لوگ غیر ممالک اور بالخصوص حجازِ مقدس پہنچ کر بھی اس قسم کے غلط پروپیگنڈوں سے احتراز نہیں کرتے۔

لیکن حق تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان غلط شہرتوں اور تشہیروں کا پردہ خود ذمہ دارِ دارالعلوم کی زبانی، ذمہ دارانِ مدینہ یونیورسٹی کے مواجہہ میں، خود مدینہ کی فضاء میں چاک کر دیا اور اصل حقیقت کھل گئی۔حضرت ممدوح کا وہ جامع مقالہ جو مدینہ یونیورسٹی میں پڑھا گیا، وہ بھی اسی شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اَلرَّابِطَةُ الْاِسْلَامِیَةُ کے اجلاس میں شرکت...... پھر آپ نے مکہ مکرمہ کے اس بین الاقوامی اجتماع کا ذکر فرمایا جو قصر الملک میں الرابطۃ الاسلامیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا کہ اس میں شرکت کی گئی اور رابطہ کے ذمہ داروں کے مقالات اور خطابات سنے گئے۔ جن میں خصوصیت سے قابل ذکر خطاب السید امین الحسینی مفتی فلسطین اور الاستاذ سعید رمضان کا ہے۔ نیز خصوصیت سے قابل ذکر عراق کے ایک بلیغ شاعر کا تاریخی قصیدہ ہے جس میں انہوں نے وقت کے حالات سنا کر عالم عرب کو بیداری کا پیغام دیا جس سے پورا مجمع متاثر ہوا۔

اجتماع کے بعد جدہ الرابطہ کے سیکرٹری صاحب سے ایک دعوت میں جو سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سیکریٹری سفارتخانۂ ہند کی طرف سے دی گئی تھی، ملاقات ہوئی۔ جس میں انہوں نے'' الرابطہ'' کے اغراض و مقاصد کے ضروری کاغذات اور اس کا دستور نامہ ایک ریشمی رومال میں رکھ کر عنایت فرمایا۔

دارالعلوم کا بین الاقوامی تعارف...... بہر حال مجموعی حیثیت سے حضرتِ ممدوح کا یہ سفر شاندار اور کامیاب رہا اور اس مُبارک سفر میں بین الاقوامی طور پر جو اہم کردار آپ نے ادا کیا وہ دارالعلوم دیوبند کا بین الاقوامی تعارف تھا۔ جو مڈیسٹ اور یورپین ممالک کے سر برآوردہ زعماء اور علماء کو کرایا گیا۔ آپ کے ساتھ دارالعلوم کی عمارتوں کے البم کے نسخے بھی تھے جو ممتاز اور مشاہیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

صومالی لینڈ، کینیڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز اکابر اس البم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے جس سے بہت سے خطوں میں دارالعلوم جانا پہچانا ہو گیا۔

دارالحدیث دیوبند کے اس جلسہ میں طلبہ اور شہر کے لوگوں نے حضرتِ ممدوح کے ان اقدامات پر نظم ونثر میں مبارک باد دی۔ اس لئے یہ جلسہ حج کی مبارک باد سے زیادہ غیر ممالک کے ان قلوب کو ہموار کرنے کی حج اکبر کی مبارک باد پر مشتمل تھا جو اس سفر میں دارالعلوم کے لئے ہموار ہوئے۔ جلسہ خیر وخوبی کے ساتھ تقریباً شب کے ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

مذہب اور سیاست

قرنِ اوّل کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علمِ نافع (حکمتِ نظری) خلقِ عادل (حکمتِ اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمتِ عملی) تھے۔ جنہوں نے قوم کے ظلم وجہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالَم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافتِ ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عِباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح ورشد، امن وسکون کا دنیا میں دوردورہ ہو گیا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

پیش لفظ...... پیش نظر خطبۂ صدارت حضرت فخر الامت، امیر البیان حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت صدرِ اجلاس جمعیت علماء صوبہ سندھ ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو سندھ کے تاریخی شہر حیدر آباد میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اجلاس میں صوبہ کے مستند اور بلند پایہ علماء بہت بڑی تعداد میں تشریف فرما تھے، ان کے علاوہ مجلسِ احرر مسلم لیگ اور جماعتِ خاکسار کے ارکان بھی موجود تھے۔ عام شرکاء میں ہر طبقہ، خیال کے افراد حاضر تھے مگر خطبہ کے گرانمایہ علمی، عرفانی، اصلاحی اور سیاسی مطالب سے سب کے سب یکساں طور پر متاثر تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ خطبہ پڑھنے کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا: ’’میں خطبۂ صدارت سننے ہی کے لئے شریکِ اجلاس ہوا تھا، اب میرا دل ٹھنڈا ہے۔ آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہنچا دیا‘‘۔

’’اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِیَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مخلصانہ شکریہ...... بزرگانِ محترم! اللہ کی حمد وسپاس، اللہ کے آخری نبی پر درود وسلام اور آپ سب حضرات کے

کرم فرمایانہ اعزاز پر جو صدارت کی صورت میں نالائق کو بخشا گیا ہے، مخلصانہ شکریہ کے بعد میں چند معروضات بطورِ یادداشت اس مقدس اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تا کہ اکابرِ قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد کو ان کے غور وفکر میں مدد دے سکوں۔

زمانۂ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں...... حضرات محترم! آج ہم تاریخ کے نازک ترین مرحلہ پر ایک تاریخی صوبہ میں جمع ہوئے۔ دنیا اپنے بنائے ہوئے جال میں الجھ رہی ہے، دنیا کے مدبر اپنی تدبیروں کو رو رہے ہیں۔ معمورۂ ارضی کے وہ حصے جنہوں نے اپنے آسودہ حال ہونے پر شیطان سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا، آج اس درجہ تباہ حال ہیں کہ ان پر انسانیت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انسانیت اپنے نشانِ مزار پر کھڑی ہوئی رو رہی ہے، اور انسان قیامت سے پہلے قیامت کے ہولناک نمونوں سے تھرا رہے ہیں۔ خدا نے اس دنیا کو اپنے بندوں کے لئے فردوسِ بندگی بنایا تھا، مگر شیطان اور اس کی ذریت نے اسے جنگِ غلامی کا جہنّم بنا دیا ہے۔

گزشتہ ایک سو سال میں اسی سیاست نے ایک عالمگیر جہنّم تیار کیا تھا، آج اس کے شیدا اس میں جل رہے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، بچے، بوڑھے، سب کراہ رہے ہیں، اور ان کی کراہ مذہب کی چہار دیواری کے اندر صاف سنی جا رہی ہے جو مذہبی رہنماؤں کی رُوح کو تڑپا رہی ہے۔

مذہب اور سیاست...... وہ لوگ جو اس پریشان حال دنیا کے رہنما بنے ہوئے ہیں اور جنہوں نے مذہب اور سیاست کے مقدمہ میں مذہب کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی، آج خدا سے آبِ حیات کا راستہ دریافت کر رہے ہیں اور جو لوگ خداوندِ عالم سے آسمان پر مقابلہ کا ارادہ اور پروگرام رکھتے تھے، زمین پر اس کی حقیر حقیر مخلوق کے مقابلہ میں ہار جیت کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی نسل کی تخصیص نہیں، بلکہ وہ تمام قومیں شامل ہیں جو خدا کی زمین پر اپنے غرور کا سکہ چلانا چاہتی ہیں۔

عصری سیاست کا قافلہ مذہب سے جدا ہو کر آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ آج جب اس کی واپسی عمل میں آ رہی ہے تو اس کے ساتھ کون ہے؟ آزادی کی جگہ غلامی، مساوات کی جگہ سیاسی اونچ نیچ اور جمہوریت کی جگہ جبرِ مطلق۔

جنگ کا آخری فیصلہ...... جنگ ہو رہی ہے، یہ جنگ کا پانچواں سال ہے۔ کوئی بھی حتیٰ کہ چرچل روز ویلٹ اور ہٹلر تو جو خود بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی، جنگ کی تباہ کاریاں صرف میدان جنگ تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا اس کے شعلوں سے سلگ رہی ہے۔ عباد ہی نہیں بلاد بھی تباہ ہو رہے ہیں، مجھے یاد ہے کہ برطانوی سلطنت کے مدبرِ اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں کہا تھا کہ: ”اگر جنگ ہوئی تو ہم ہی تباہ نہیں ہوں گے، ہماری سلطنت اور ہمارا تمدن بھی برباد ہو جائے گا۔“

واقعات سامنے رکھ کر دنیا اس قضیۂ شرطیہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ جنگ جاری ہے اور ابھی

جاری رہے گی۔ گوڈیلی میل نے اپنے مقالہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء میں لکھا ہے کہ: ''جنگ کے اچانک ختم ہوجانے کا امکان زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے''۔ اور بلاشبہ یہ الفاظ پوری انسانیت کے دل کی پکار بھی ہیں۔ مگر واقعات ان پیشین گوئیوں اور پکاروں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ کیوں کہ دنیا کے دو اب انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، دنیا کے مدبّرین ان کو بہم پہچانے سے قاصر رہے ہیں۔

آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیَّت...... دنیا کو عالمگیر آزادی کی ضرورت ہے جس کی رُو سے کسی کمزور قوم کی آزادی سلب نہ ہوسکے۔ دنیا کو کسی ایک ملک کی پارلیمنٹ کی بجائے عالمگیر پارلیمنٹ کی ضرورت ہے جو جمہوریت عامہ کی ترجمان ہو۔ دنیا کو اپنی ساری پیداوار کسی ایک ملک کی بجائے ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچانے کی ضرورت ہے جس سے سب مستحقین درجہ بدرجہ حصہ پاتے رہیں۔ دنیا کو استعمار اور شہنشاہیّت کی بجائے بین الاقوامی عدالت اور بین المللی قانون کی ضرورت ہے جو سب کو ایک رشتہ میں پرو سکے۔ اگر متحارب قومیں (لڑنے والی قومیں) ان نکتوں کو تسلیم نہیں کرتیں تو جنگ جاری رہے گی اور اگر آج جنگ ختم بھی ہوگئی تو یہ خاتمہ ایک اس سے بھی بڑی جنگ کا مقدّمہ ہوگا۔ ہاں! مگر جنگ کا فیصلہ دنیا کی حکومتیں نہیں خدا کی حکومت کرے گی اور اس کی ہمہ گیر حکومت ان چاروں نکتوں کو انسانیت سے منوا کر رہے گی۔

ہندوستان کی صورت حال...... ہندوستان کا حال دنیا کے اس عام حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اس ملک کی نہ ختم ہونے والی دردناک غلامی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک صدی سے بہانے تلاش کررہی ہے، دوسری طرف آزادی کی لہر ہے جس نے یہاں کی قوموں کو اپنے ہمہ گیر حصار میں لے لیا ہے اور پوری دنیا کی طرح وہ بھی ان چاروں نکات کے مطالبہ میں قوموں کی شریک ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہنگامہ دلخراش ہے جس نے ہمارے سیاسی تدبّر کو غلامی کی قوتوں کے سامنے مفلوج بنادیا ہے اور سب سے آخر میں انہی نکات کے بارہ میں وہ طوفانِ مصائبات ہے جو علماء کے سروں پر سے گزر رہا ہے۔ ان مرکّب مصائب کے آتشیں سایہ میں ہمیں یہاں جمع ہونے کا موقع میسر آیا ہے تا کہ ہم اس ہمہ گیر درد دکھ کا کوئی ہمہ گیر مداوا سوچیں اور اپنی شکستہ کشتی کو ان طوفانی تھپیڑوں سے نکال لے جائیں:

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفان ۔۔۔ کہ از طغیان موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟...... میں ایک سیاسی آدمی سے زائد ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے علم وفہم کے مطابق جہاں تک غور کرسکا ہوں، دنیا میں قوموں کے لئے مہلک ترین امراض جنہوں نے اقوام کو ہمیشہ الٹ پلٹ کیا اور گھن بن کر ان کی فلک بوس عمارتوں کو پیوند خاک بنایا ہے، اصولاً کل تین ہیں جن میں سے دو بنیادی ہیں اور ایک ان دو کا قدرتی ثمرہ۔ 1 جہل 2 ظلم 3 اور غلامی۔

جہل...... جہل سے حدودِ اشیا نامعلوم رہ جاتی ہیں۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی، کوئی قانونِ زندگی سامنے نہیں آتا اور انسان اپنے اس امتیازی فرق کو مٹا دیتا ہے جو خدائے حکیم نے اس میں اور جانوروں میں بطور حد فاصل کے

قائم فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ایک انسان بہائم میں مل جائے تو انسانی حلقوں میں اس کی کوئی پرسش نہیں ہو سکتی۔

ظلم ...... ظلم، عدل کی ضد ہے۔ اس سے میری مراد ظلمِ اخلاق یعنی اخلاق کا عدل و اعتدال پر قائم نہ ہونا اور جبلی افراط و تفریط ہے، جو ظلمت نفس ہے۔ چونکہ اخلاق ہی اعمال کی قوت ہیں۔ اس لئے ان غیر معتدل اخلاق سے غیر معتدل ہی افعال کا ظہور ہوتا ہے اور ان اخلاقی بے اعتدالیوں سے قومی کریکٹر تباہ ہو جاتا ہے، قوم کی ساکھ اکھڑ جاتی ہے۔ خدا اور بندوں کی نگاہ سے یہ قوم گر جاتی ہے اور بالآخر ان بد اخلاقیوں کے جراثیم سے پھر یہ قوم اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ باعزت اقوام کی صف میں اسے جگہ دی جا سکے۔

غلامی ...... غلامی کی تباہ کاریاں فوضویّت سے شروع ہوتی ہیں۔ فوضویت سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم میں نظم نہ ہو، مرکزیت نہ، ہو اس کا کوئی سرگروہ باقی نہ رہے۔ قوم کا ہر فرد مستقل حکمران بن بیٹھے۔ باہمی تعاون و تناصر ختم ہو جائے۔ اس سے اجتماعی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ طوائف الملو کی اور انتشار کی حالت میں جبکہ قوم میں اس جہل و ظلم کی بدولت جان نہیں رہتی تو دوسری طاقت ور اقوام اس پر خروج کر کے مسلط ہو جاتی ہیں اور اس فوضویت کا ثمرہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو ایک قوم کے لئے دنیا کا بدترین عذاب اور خدا کی طرف سے ایک انتہائی پھٹکار ہے اور پھر اس غلامی سے بالآخر یہ قوم اپنا قومی سرمایہ، کلچر، تہذیب، تمدن اور اپنے علم و عمل کی خصوصیات کھو بیٹھتی ہے اور انجام کار اس قومی اختلال اور طبقاتی انتشار کے جراثیم اس کے قومی وجود کو اس طرح نیست و نابود کر دیتے ہیں کہ بعد چندے دنیا میں کوئی اس کے نقشِ پا کا پتہ دینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔

قرآنِ حکیم کا فیصلہ ...... قرآنِ حکیم نے یہود کے مہلک ترین امراض کا خلاصہ یہی تین چیزیں قرار دی ہیں، جن میں سے ظلم و جہل کو اصل بتلایا اور غلامی کو ان کی فرع۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ.﴾ ①

''جم گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے وہ غضبِ الٰہی کے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ سے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان کہ لوگوں نے عصیان کیا اور حدود سے نکل نکل جاتے تھے''۔

ذلت و مسکنت کا فردِ کامل یہ تھا کہ ان سے قیامت تک کے لئے سلطنت چھین لی گئی اور مختلف سلاطین کی غلامی کے لئے ان کی زندگیاں مخصوص کر دی گئیں۔ کبھی یونانیوں اور کلدانیوں کے غلام، کبھی بخت نصر کے غلام، کبھی ایرانیوں اور مجوسیوں کے باج گزار، کبھی مسلمانوں کے زیرِ حکومت اور کبھی نصرانیوں کے۔ کہیں ہٹلر کے رحم و کرم پر اور کبھی امریکنوں کی لفظی ہمدردیوں پر۔

غرض دائمی غلامی ان کا قومی نشان قرار دی گئی۔ پھر جس قوم کے بھی غلام رہے اس نے کبھی ان کی کوئی ایسی بھی توقیر نہیں کی جو کم از کم آدمیت کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ آج جرمنی نے جس تذلیل کے ساتھ انہیں جلا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۱۔

وطن کیا ہے، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے، ایک ایک کا مال واسباب ضبط شہروں کے ہوٹلوں اور عام اجتماعات کے مواقع پر بورڈ چسپاں کیئے گئے کہ کتا اور یہودی یہاں داخل نہ ہونے پائے۔ برطانیہ نے انہیں پناہ ضرور دی۔ مگر ان کی کسی ادنی توقیر کا وہ بھی روادار نہیں۔ کیوں کہ برطانوی مدبروں کے انداز سے واضح ہے کہ وہ بھی اس قوم کو پرلے درجے کی ذلیل ورسوا قوم جانتے ہیں اور اسے دنیا کا خون چوسنے والی قوم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کا عمل ممکن ہے کہ ان کے ساتھ ہو، مگر کوئی اچھی رائے ان کے ساتھ نہیں۔ پس غلامی کے ساتھ انتہائی ذلت ومسکنت اور رسوائی بھی ان کے لئے قرآن نے مخصوص کردی ہے۔ اس ذلت آمیز غلامی کا ایک سبب قرآنِ حکیم نے عصیان بتلایا ہے جو عملی سیہ کاری ہے اور اس کا سبب اعتداء فرمایا گیا۔ جس کی حقیقت حدود سے تجاوز اور تعدی ہے اور یہی وہ ظلم اور اخلاقی بے اعتدالی ہے جس سے تمام ظالمانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود سے تجاوز اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ یا حدود کا علم ہی نہ ہو یا ہو تو معاملہ ان کے ساتھ لاعلمی کا کیا جاوئے اور یہی وہ جہل ہے، جس سے خیر وشر کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

پس یہود کی ذلت ومسکنت کی ترتیب اب یوں قائم ہوجاتی ہے کہ ان میں غلامی آئی بداعمالیوں سے اور بداعمالیوں کا منشاء ظلم اخلاق اور جہلِ نفس تھا۔ اس لئے وہ تینوں مہلک امراض جو کسی بڑی سے بڑی قوم کو برباد کرنے کے ضمانت دار ہیں، ظلم اور جہل اور غلامی نکلے اور تینوں کا ایک ہی آیت سے ثبوت بھی ہوگیا۔

دوسرے مواقع پر قرآنِ حکیم نے ان تینوں امراض کو الگ الگ مستقلاً بھی بیان فرمایا ہے، جس سے ان کی اصولی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ انسان کو امانت الٰہیہ کا حامل بناتے ہوئے اس کی بنیادی شرط ان دو چیزوں، ظلم وجہل کو قرار دیا ہے کہ انہیں کی اصلاح کے لئے اس جذبۂ امانت کی ضرورت پڑی اور انسان اس کے سبب ساری کائنات پر فائق ہوگیا۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا.﴾ ①

''ہم نے یہ امانت آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی، سوانہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا''۔ یعنی اس میں قوت علمیہ اور قوت عملیہ (اخلاقِ حسنہ) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت، اس میں علم اشیاء اور عدل اخلاق کی استعداد تھی جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔

ایک جگہ اس طبعی ظلم وجہل کو مٹانے اور اس علمی وعملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو دائر فرمایا۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ.﴾ ②

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۷۲. ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۸۳.

''یہ عالمِ آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک ثمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے''۔

ظاہر ہے علو و کبر ثمرۂ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیّت سے آدمی بے خبر ہو اور فساد ضد صلاح ہے اور صلاح و رشد کا فقدان وہی ظلم نفس ہے۔ خواہ علمی ہو، خواہ اخلاقی، پس آثارِ جہل و ظلم کو بتلا کر ان دونوں مہلکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ سمجھی جاسکتی ہے تو وہی اس کا جہل و ظلم ہے گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی و زیر دستی پیدا کرسکتی ہے تو یہی ظلم و جہالت۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل و ظالم طبیعت کو محسوس کر کے اس کی خلافت کے بارہ میں خلجان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ.﴾ (۱)

''اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگ جو فساد کریں گے اس میں اور خون ریزیاں کریں گے''۔

یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفا کی، حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے۔ پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ، بنیاد یہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں۔

غلامی کے متعلق قرآنِ مجید کا حکم...... ادھر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض میں غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو درحقیقت اسی ظلم و جہل کا ثمرہ ہے۔ بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ (۲)......

''اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتے رہیں گے''۔

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلّط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوءِ عذاب یعنی بدترین عذاب بتلایا ہے۔ بہر حال ان آیات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی و بربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں۔ ظلم و جہل اور غلامی اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تین مہلکوں سے پچھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

عرب اقوام چودہ صدی قبل...... آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم گھسے تو انہیں دنیا کی نگاہوں سے ایسا گرایا کہ وہ عالم کی کسی متمدن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی بھلی قوم میں

(۱) پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۳۰۔ (۲) پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۶۷۔

شمار کئے جانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کی تو بہ تو جہالت نے ان میں سے خیر و شر کی تمیز اٹھا دی اچھے برے کا فرق مٹا دیا۔ حدود و اشیاء ان کے قلوب پر مخفی ہو گئیں۔ وہ خالق و مخلوق تک کا فرق بھلا چکے تھے۔ مخلوقاتی صفات خدا میں اور خدائی خصوصیات بندوں میں مان کر انواع و اقسام کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد (جمع) ہو گیا تھا۔ کعبۃ اللہ سینکڑوں بتوں کا بت خانہ تھا جو انسانی زندگی کے مالک تصور کئے جاتے تھے، انہی سے مرادیں مانگی جاتی تھیں، ان ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ان کے سامنے سر عبودیت خم کیا جاتا تھا۔ وہ نبی اور اُمتی کا فرق مٹا چکے تھے، رسوم آباء کو سننِ انبیاء کا درجہ دے دیا تھا اور سنن انبیاء کو منکرات کا۔ دین اور غیرِ دین کی تمیز اٹھ چکی تھی۔ دین کو غیرِ دین سمجھ کر الحاد کا شکار تھے اور غیرِ دین کو دین جان کو بدعات و محدثات میں گرفتار۔

ادھر ظلمِ اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاقِ فاضلہ کا ان میں کوئی شمہ (کم مقدار) باقی نہ رہا تھا۔ اخلاقی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کی بدولت نہ ان میں حیا رہی تھی نہ غیرت، نہ ہمدردی تھی نہ مروت، نہ ایثار، نہ تواضع، نہ بے نفسی، نہ للّٰہیت، نہ صبر و شکر، نہ اعتماد نہ توکل۔ ہاں رات دن کا شیوہ تھا، تفاخر و اترا ہٹ، بے رحمی و قساوت، شیخی و رعونت، کبر و نخوت، سبعیت و بربریت، بے حجابی و بے باکی، ہوسناکی و خودستائی اور ان بداخلاقیوں سے جن بداعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا، وہ لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت، زنا و شراب، جوا اور قمار، قتل اولاد وغیرہ تھیں۔ جنہوں نے ان کی دینی و دنیوی زندگی کو تباہ کر ڈالا تھا۔

ادھر فوضویت کا یہ عالم تھا کہ نہ ان میں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہی، نہ قومی نظام تھا، نہ ملکی تمدن نہ شہریت تھی نہ شہری حقوق، نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ، پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا، جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا۔ بدویت و بربریت، طوائف الملوکی اور بدنظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انہیں اسی ذلت و خواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہنچا دیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں کے غلام، کبھی غیروں کے گرفتار اور کبھی خود اپنے شکار۔

غرض ظلم و جہل نے ان میں آثار نبوت مٹا دئے تھے اور فوضویّت و غلامی نے ان میں آثارِ سلطنت محو کر دیئے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی، نہ سیاست، جس کا خون انہی تین امراض، ظلم و جہل اور غلامی کے سر تھا۔

رحمتِ الٰہی کا ظہور علم نبوّت، مکارم اخلاق، اسوۂ حسنہ..... آخر کار رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل، تاریک پیکر، اور تاریک روش قوم پر ختم نبوت کا آفتابِ جہاں تاب چمکا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیر بہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تبیانی علم جس سے جہل کافور ہو۔ اپنا خلقِ عظیم جس سے ظلمت اخلاق دور ہو اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے۔ چناں چہ اپنی یہی تین شاخیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں۔ ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے

ہوئے ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا.'' ① ''میں بلاشبہ معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ.'' ② ''میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کردوں''۔ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد الٰہی ہوا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.﴾ ③ ''البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم واخلاق وعمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں''۔

اپنے علم قطعی کے ضمن میں آپ نے وہ قانون عمل پیش فرمایا جس سے عمل کی حدود وا شگاف ہوئیں، حرام و حلال جائز و ناجائز اور روا اور ناروا کا امتیاز ہوا۔ اپنے خلق عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے جائز اعمال کے دواعی دلوں میں ابھریں، عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گزرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمتِ حیات بخشی گئی ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اس علم کا اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت و استقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جس میں مرکزیّت کے ساتھ اس علم و اخلاق کی نشر و اشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار و شوکت، مادی و روحانی طاقت اور غلبہ و تسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کردے۔

بہرحال قرنِ اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علمِ نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمتِ اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمتِ عملی) جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈال دی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا' اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان تین طاقتوں کے ذریعے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد، امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

مسلمان بحیثیت فاتح عالم...... چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی مکہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارض یمن فتح ہو گئی۔ فارس کے علاقوں میں مجوس ہجر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراج لیا اور بعض اطراف شام تک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سلاطین عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہرقل شہنشاہ روم، مقوقس بادشاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبشہ اور ملوک عمان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدایا بھیج کر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا پھاٹک

---

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج: ١، ص: ٢٦٥.
② السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب آداب القاضي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها، ج: ١٠، ص: ١٩٢.
③ پارہ: ٢١، سورة الاحزاب، الآية: ٢١.

کھلا تو لسان نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کرلیا۔ دور صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر بہت سے بلاد فارس (ملک) ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر متعدد بلاد شام عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر کتنے ہی بلاد مصر فتح ہوئے۔ دور فاروقی (رضی اللہ عنہ) آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیار مصر، تمام اقلیم فارس اور روم وقسطنطنیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہوگیا اور اسلامی شعائر بلند ہوگئے، دولت عثمانی (رضی اللہ عنہ) کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت اختیار کرلی، زمین کے مشارق ومغارب تک یہ رو جا پہنچی۔

بلاد مغرب سے اقصاء اندلس، قبرص، قیروان، بلاد سبتہ اور بحر محیط تک۔ ادھر ناحیہ مشرق سے اقصائے بلاد چین۔ اقصائے ایران اور مدائن عراق وخراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہوگیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشن گوئی ارشاد فرمایا تھا کہ:

"اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَسَيَبْلُغُ مُلْكُ اُمَّتِيْ مَازُوِيَ لِيْ مِنْهَا." ①

"اللہ نے ساری زمین مجھے دکھلائی تو میں نے تمام مشرق ومغرب کو دیکھا اور عنقریب میری امّت کا ملک اس حد تک پہنچ کر رہے گا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں"۔

ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق ومغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا، بہت سے وہ ناحیئے کونے باقی رہ گئے جن تک نگاہ نبوت پہنچ چکی تھی، اس لئے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتح کا سیلاب بڑھتا رہا۔ چناں چہ ہندوستان، افغانستان، جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا اور کتنے ہی یورپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے۔ جن کے کلچر، تہذیب، تمدن اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم ازکم ان کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کردیا۔ لیکن پھر بھی نگاہ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت وبر اور مدر (خیمے اور مکان) میں اسلام کا کلمہ داخل ہوکر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں لے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا.﴾ ② ....."وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت کی اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے (باعتبار حجت ودلیل بھی اور بلحاظ شوکت وسلطنت بھی جس کا ظہور قرن اول میں ہوا "کَیْفًا" اور قرن آخر میں ہوگا "کَمًّا")"۔

بہرحال یہ سب مادی وروحانی برکات اسی مقدس قوم کے دست حق پرست پر ظاہر ہوئیں، جنہوں نے برکات نبوت سے متبرک ہوکر ہوا پنے ظلم کو عدل واخلاق سے، جہل کو علم نافع سے اور علم کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال

① مسند احمد، حدیث شدا دبن اوس رضی اللہ عنہ، ج:۳۴، ص: ۴۷۹. ② پارہ: ۲۶، سورة الفتح، الآیة: ۲۸.

سے متنیر (روشن) کیا۔

زمانۂ جاہلیت......آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیرہ صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہیں جس کا قبل از بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔

وفورِ جہل......وفور جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنۂ جہل سے لبریز ہے۔ اسباب علم جتنے بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی نسبت سے امّت کا جہل ترقی کرتا جا رہا ہے۔ آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنا دیا ہے۔ اصول اعتقادات تک میں شکوک وشبہات کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ کسی کو خدا کے وجود میں کلام ہے، کسی کو اس کی صفات میں، کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثار نبوت یعنی کلام الٰہی کے منزل من اللہ ہونے میں کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیت کے عدل وثقہ میں، کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے اور کوئی سرے ہی سے اسے دل کے بہلاوٴ کا سامان کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروعی اعتقادات اور اعمال کے سلسلے میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں ہیں۔ اس سے کوئی ناواقف نہیں، دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں اور پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں، قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اگر فی لاکھ ایک دو ان کی قدر کرتے ہیں تو فی صدی ۹۹، علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کیے ہوئے ہیں۔ کوئی انٹی ازم قائم کر کے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ کوئی مولوی کا غلط مذہب کہہ کر اس روش کو ہی اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنے کی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر کو اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کر رہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کر رہے ہیں۔ اس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم و اہل علم سے بیزاری، اس سے زیادہ مہلک مرض ہے جو مسلمانوں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس صورت حال میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ ان پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟ اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو اختلاف خیالات سے مسالک بھی اور مسلکوں کے سالک مختلف اور متصادم بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اس سے جماعتی واجتماعی طاقت میں روز بروز خلل اور اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔

فقدانِ اخلاق......ادھر اخلاقی بے مائگی علمی تہی دستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی تربیت گاہیں رسمی گدیاں اور تحصیل وصول (چندہ لینے) کی چوکیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لے کر لوگ نکلیں۔ سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائرِ دین سے برگشتہ کرنے کے دواعی لے کر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب وسنّت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھ جاتی ہے۔ سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے۔ عادت وعبادت کی بدعات ومحدثات میں طبائع الجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھ کر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ ان میں اخلاق ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال وکیفیات اور نہ مقامات واقوال جبلّی۔ پھر بداخلاقیاں، حسد وریا، کبر وحرص، اسراف وبخل، جبن ودوں ہمتی جاہ پرستی وجاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ نہ ان کی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل وتتمیم جو مقصد نبوت تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اصول کی بجائے نفسانی جذبات اور ان کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے۔ اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سر پھٹول اور نااتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا ہے، اور اس اخلاقی فتنہ سے انفرادی سر پھٹول، باہمی ناچاقی، ایک دوسرے سے بیزاری اور بے تعلقی پھیلتی رہتی ہے، آج امّت اس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص ان کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامہ قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع وجدال ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے، توافق اور توافق کی راہ میں غم خواری۔ دوسروں کی دل داری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کے لیے شفقت وایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

ثمراتِ غلامی......ادھر فوضویت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال وخودداری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے۔ نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت ہے۔ نہ معیشت، نہ تنظیم ہے، نہ قومی وحدت۔ طبقاتی انتشار دھوئیں کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق وتحزب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحاد مقصد کے محض طریقۂ عمل کا بھی اختلاف آ جاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع وجدال بنے بغیر نہیں رہتا۔ پھر یہ اختلاف کسی اصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء وقیاسیات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور فارمولا خود اسی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید بھی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعۂ نزاع وجدال بھی بن جاتا ہے۔

دیانت وسیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد......بہرحال قوم کا نظام علم واخلاق جو مجموعۂ دیانت ہے ایک طرف مختل ہے (درہم برہم) اور نظام آزادی جو خلاصہ سیاست ہے، دوسری طرف مضمحل (کمزور) ہے۔ اس لئے

آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست، دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار بدنمایاں ہونے چاہیے تھے، وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب و فساد مار دھاڑ اور جنگ نے دنیا کے کناروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے امن وسکون گھروں شہروں اور اقلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا (نایاب) ہو چکا ہے۔ بے چینی اور اضطراب و پریشانی چار دانگ عالم پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت حد درجہ ذلت وخواری اور پستی میں آ چکی ہے۔ جو چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلاد کی حیثیت سے مسلط ہیں اور جو چیزیں انسانوں نے اپنی راحت وعیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ آج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اسے آسمانی بم، زمینی گولیاں اور زہریلے گیس دم بھر نجات نہیں لینے دیتے۔ نہ اسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دار فولادی بارش سے اسے سنگوا لیتے ہیں۔ نہ اسے سمندروں کے جگر میں پناہ ہے کہ تارپیڈو تحت البحریاں اسے اور زیادہ تہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسمانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن توپیں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات، نباتات، حیوانات سب اس کی دشمنی پر کمر بستہ ہیں۔

پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا ہے تو طرح طرح کے امراض ومصائب اس کے سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعداء (دشمن) اور قسم قسم کے افکار و پراگندگی سے اسے نجات نہیں ملتی۔ غرض انسان کے لئے نہ آج انسان کار آمد ہے نہ غیر انسان، حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی کرتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جا رہے ہیں:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ ① "خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل ہی ہیں تا کہ اللہ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تا کہ وہ باز آ جائیں"۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ "اور جو کچھ بھی تمہیں دکھ پہنچتا ہے سو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب سے"۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا، تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے ہاں پناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے؟ اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے اور پورا خدائی کارخانہ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اس نے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔ ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ②

"اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے خدا کو بھلا دیا، سو اللہ نے خود ان کی جانوں سے انہیں بھول میں ڈال دیا یہی لوگ نافرمان ہیں"۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۱۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الحشر، الآیۃ: ۱۹۔

اور ظاہر ہے کہ ان تمام مہالک و مفاسد کی جڑ، بنیاد وہی تین غلطیاں نکلیں گی جو زمانۂ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل، ظلم اور غلامی اور دوسرے لفظوں میں بدیانتی اور بدسیاستی، اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کے لئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا، وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کر سکتا ہے۔ بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ: "لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" ① "اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی"۔

سو جب عرب جاہلیت کے ان امراض سہ گانہ جہل ظلم اور غلامی کو ان کی تین اضداد علم احکام عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سہ گانہ میں تین اجزا نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لئے انہیں تین اجزا کو قرآن نے مقصد بعثت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ ② ...... "وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے"۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال...... آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرما کر جس کا تعلق قرآن حکیم کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے امّت کی اصلاحی اسکیم کے تین تین بنیادی اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلہ تعلیم جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر امّت کے علم و فکر کی تکمیل و ترقی موقوف ہے۔

دوسرا مسئلہ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لا کر جن پر قلوب کی استقامت موقوف ہے، درست کیا جائے۔ تیسرا مسئلہ تلقین حکمت جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع (پیغمبر) کی مجموعی زندگی اسوۂ حسنہ امّت کے سامنے لے آنے کے ہیں، جس کے مجموعہ پر امّت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام...... پس، قرآن کریم کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اصول ہو گئے۔ ا۔ تعلیم احکام ۲۔ تہذیب اخلاق ۳۔ تنظیم اعمال۔ عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے، دوسرے کا طریقت اور تیسرے کا سیاست، گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں۔ جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت...... شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت (راستہ طے کرنا) کیسے

① تخریج گذر چکی ہے۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعہ، الآیۃ: ۲.

ممکن ہے؟ طریقت سے اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر راہ روی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں۔ اگر راستہ پرخار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت بھی کیا کام دے سکتی ہے۔ اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی پر صرف ہو کر رہ جائے گی، منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے، طریقت قوت راہ روی ہے اور سیاست تصفیہ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے۔ راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور و شغب بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ:

طریقت...... طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مبانی و اصول اور معانی و فروع کے لحاظ سے انسان کو طبعًا تخلی و خلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے۔ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے، اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح و فلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو انہیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے، بہر حال خلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور اداء حقوق پر ہے۔ ہدایت و ارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا، ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھس کر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے، شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے۔ وہاں "فرار عن الخلق" ہے اور یہاں "ذهاب اِلى الخَلْق"۔ پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو، بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر ان کی اصلاح کی فکر میں رہے گا۔ اسے درد ہوگا اپنے گھر پھر اپنے قبیلہ کا پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہوگا۔

سیاست...... ادھر سیاست کے دائرے میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید و مدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکل کر عباد تک آیا تھا اور یہاں سیاست میں عباد سے نکل کر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحراء و جبال، زمینوں اور ان کی پیداوار، دریاؤں اور ان کے بہاؤ، حیوانات اور ان کے منافع۔ غرض ساری کائنات کے اجزاء اور ان کی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظالم الگ۔ حدود و قصاص الگ ہے اور جہاد و جانبازی الگ، احراز غنائم الگ ہے اور اسارۃ محاربین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک کا جھنڈا بلند کرنا، مفسدوں کو دبانا اور مصلحوں کو سربلند کرنا۔ مبطلوں (باطل والوں) کا زور توڑنا اور محقوں (حق والوں) کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی و روحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلابات کر کے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈال کر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور خلوت کہاں؟

یہاں تو عباد سے گزر کر بلاد، انسانوں سے گزر کر حیوانات، حیوانات سے گزر کر نباتات اور سب سے گزر کر ایک ایک چپہ زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کی جاتی ہیں، جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں یکسوئی محض اور شریعت میں ایک خاص دائرہ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوت محض ہے۔ سیاست جلوت محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوت در انجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پر خلوت کا مخزن (طریقت) ہو اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع (سیاست) ہو۔ ورنہ خلوت در انجمن اور دل بیار دست بکار کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عنصروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ان کے باہمی امتزاج کے مخلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پر پڑ جائے گی۔

اگر طریقت محض رہ جائے جس میں شریعت و سیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور خجالت محض ہے۔ اگر شریعت محضہ ہو جس کے ساتھ طریقت و سیاست نہ ہو تو وہ شدت و جمود محض ہے۔ اگر سیاست کے ساتھ شریعت و طریقت نہ ہو تو وہ نخوت و تجبر محض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات کمال نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں کمال ہونے کی جامعیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے اور اسی لئے دین نے ان سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے، پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت و سیاست ہے۔ جن کی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے اور خلافت الٰہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر و قہر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر شریعت و طریقت کی کسمپرسی و بے بسی کا بدرقہ ہے سیاست: جس کی مادی شوکت ان دونوں کے لئے سرمایۂ عظمت و حفاظت بنتی ہے۔

پس جب ایک طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہو گئی۔ شریعت کے ذریعہ علم احکام اور تعلیم غیر کا جذبۂ شفقت قائم ہو گیا اور سیاست و قوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے تنفید کی قدرت پیدا ہو گئی تو اب سیاست میں سے تو نخوت و تجبر نکل کر وقار و خودداری اور شہامت (بہادری) آ جائے گی۔

طریقت میں سے رسم خلوت نکل کر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اور ادھر اتباع شریعت میں خشکی و جمود، تنگ نظری اور تقشف سے نکل کر وسعت نظر، جامعیت ہمہ گیر، تعاون باہمی اور اتحاد ذات البین کے جذبات ابھر آئیں گے جس سے قوم کے مادی و روحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائے گا، جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔

جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیک دم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کی جا رہی ہیں اور ان کے حامل الگ الگ مستقل طبقات گنے جا رہے

ہیں اور اس طرح شریعت وطریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفی اپنے تصوف کی تکمیل اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مدمقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین مستقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کہ مل کر کسی ایسی طاقت کے بالمقابل آئیں جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی طاقتیں اپنی ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں، جس سے تفرقہ انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں اور نہ صرف افراد ہی مل جائیں بلکہ ان کے یہ تینوں فنون اس طرح باہم امیختہ (یکجا) نہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص، صوفی، صافی اور سیاسی مخلص ہو جائے اس وقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کامیابی کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں...... وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جزو علم اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم واجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانت، اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اِک کٹ کھنا اور جور واستبداد کا ملک ہوگا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس بے بس اور علی شرف الزوال ہو جائے گی۔ قانون محض اور کوری سیاست سے دنیا کبھی امن وچین کا منہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی عالم بشریت کی اصلاح وتنظیم ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پر امن ہوتا۔ کیوں کہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں، کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینے وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کے لیے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روزانہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں۔ رقابتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسنا کی قانون کے دائرے میں رہ کر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم وستم خوب خوب سیکھتے جا رہے ہیں، اور یورپ کی ساری دنیا قتل و غارت اور ہوا وہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے۔ پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ ہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے۔ یعنی وہاں کی سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الٰہیہ کا علم ہے اور نہ ان کا کوئی نمونۂ عمل۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟

پس آج کی یورپین تباہ کاریاں اور عالم گیر سر پھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت وخواری فقدان

سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے، جب آدمی ایک بے شعور درندہ بن جائے تو محض سیاست اس کے دل ودماغ کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعۂ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم واخلاق بلا شوکت بے بس کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کر سکتے اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف آور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر واستہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں ان کی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ فساق وفجار طبیعتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں، ان حالات میں کھل کھیلتی ہیں اور اسی استہزاء وتمسخر کی سنّت سیۂ کو اور مضبوط بنا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقوی وتقدس کی طرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو، وہ بھی فجور کا غلبہ واستیلاء دیکھ کر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم واخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس بے بس رہ جاتا ہے۔ جن میں سے ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آ کر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کر دیتی ہے۔ غلامی اور محکومی کے منحوس آثار رفعت وشوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلا شرکت غیرے غالب آ جاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت وراست بازی کی کمی نہیں، بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے۔ لیکن اس کی دیانت بے یار ومددگار اور زیر تشنیع وملامت ہے۔

مولوی کا غلط مذہب، جذبات، اینٹی ملاازم، تکفیر اہل حق، ازالۂ اثرات علماء کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد وشرک، بدعات، محدثات، منکرات وفواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترعیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی، یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے کھول دے اور جب چاہے بند کر دے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہے کہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدان دیانت سے مادی مصائب موت ہلاکت، طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے، تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات الحاد، دہریت بے دینی شرک وبدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم واخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن وچین کا سانس نہیں لے سکتی۔

اس لئے اسلام نے یدین کی رہبانیت کو ختم کر کے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافت الٰہی کا جامہ پہنچایا، جس سے دیانت وسیاست کا ایک حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہوگئی اور سیاست کا جور واستبداد دیانت سے پامال ہوگیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ایک جگہ ارشاد ہے ''اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْاَمَان.'' ① ''ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے''۔ایک جگہ ارشاد ہے: ''بُعِثْتُ مَرْحَمَةً وَّمَلْحَمَةً.'' ② (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) ''میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ جو بنا کر بھی۔

ایک جگہ ارشاد ہے: ''اَنَا الضَّحُوْکُ الْقَتَّالُ'' ③ ''میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی''۔ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا: ''لَایَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ (اَیِ الدِّیْنِ) حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ. (اَیِ الْقِیٰمَةُ) ④ اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ.'' ⑤ ''میری اُمّت میں ہمیشہ ایک قوم تا قیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی (میری امّت میں) جہاد قیامت تک باقی رہے گا۔''

قرآن نے نبوّت کی بھی مدح سرائی کی، جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سرمنشا ہے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا وَّاٰتٰکُمْ مَّالَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ.﴾ ⑥

''اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے، یاد کرو جب کہ اللہ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں''۔

دین، سیاسی نظام کی حیثیت میں...... اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں کلمۂ توحید، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج پر رکھی ہے، ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے، جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، جہاد۔

اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس، انسانی ذات البین اور قلوب و ارواح کی اصلاح ہو اور اس سلسلہ میں عادات وعبادات، اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے۔ وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا جس سے بین الملی احوال درست ہوں۔ فتن کا استیصال اور قانون الٰہی کے رواج پذیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود و قصاص تعزیرات وکفارات، جہاد اور سدّ ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔

---

① علامہ صغانی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ الموضوعات للصغانی، ض: ۱، ص: ۲. ② حلیة الاولیاء، الجزء الرابع، وهب بن منبه، ج: ۲ ص: ۱۰۵ قال ابونعیم: هذا حدیث غریب من حدیث الثوری، تفرد به حسن.

③ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ کسی راہب کی حضور کے متعلق پیشن گوئی تھی دیکھئے۔ دلائل النبوۃ لابی نعیم، ج: ۲، ص: ۱۱. (ومن الانصار فی غزوة احد من الدلائل) ④ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب سوال المشرکین ان یریهم النبی ﷺ ج: ۱۱، ص: ۲۶۶. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الغزو مع ائمة الجور، ج: ۷، ص: ۶۳.

⑥ پارہ: ۶، سورة المائدة الآیة: ۲۰.

اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا منفذ، نگراں اور امام بنادیا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری، دیوانی، نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوٰۃ امامت جنائز، ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہوگا وہیں بمنزلہ باپ اور مربی واستاذ کے بھی ہوگا تاکہ ان کی دیانت وسیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیت اللہ، خوف الٰہی، طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کردیا ہے، تاکہ سیاسی الجھنوں میں پڑ کر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں۔ اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دنیا وآخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی ...... بہرحال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے، جنہوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات ولذائذ سے الگ کر کے خدا سے ملانے کی صورت رکھی ہے۔ ان میں ترک دنیا بایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات، تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کر کے گھربار، اولاد بنیاد عزیز واقارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کی جاسکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں۔ اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت ناتمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو، بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہ کر اداء حقوق ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیروؤں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا اور اسے رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی؟

پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہے اور مذہب اور سیاست کے الگ الگ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ مذہب اور سیاست کی یہ تفریق ایسے ہی غلط ہے جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ سائنس انہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی جنہوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیت دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق، تمدنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو، اسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی مدد ومعاون خادم ہے۔ ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے۔ البتہ اس سیاست کے معنی سیاست عصریہ کے نہیں، بلکہ سیاست شرعیہ کے

ہیں۔جس کی بنیاد علم واخلاق ،تقویٰ وطہارات اور فضائل اعمال پر ہے اور جو رذائل اخلاق واعمال کو مٹانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ ان کی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں۔

یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کی جاسکتی ،ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کی بقاء واستحکام کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیئے گئے مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں جیسے نبی اسرائیل ،وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ ،شاذ ونادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔مگر مقصودیت دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لاکر جمع کردی گئیں۔آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی ،مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور مرکز رہا۔یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء وترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہوتا ہے۔چنانچہ قرآن نے اس کی تصریح کی ہے:﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ﴾ [1] ’’یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے‘‘۔

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض وغایت دیانت کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے۔جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض وسماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا۔اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سد راہ ہوتا ہے۔یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔

علمی فتنہ کا نام فتنۂ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام فتنۂ شہوات ہے اور ظاہر ہے کہ فتنۂ شبہات جبکہ علم نافع میں مخل ہے ،تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا اور فتنۂ شہوات جبکہ عمل صالح میں مخل ہے ،تو وہ از قسم ظلم ہوگا۔اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم و جہل ہے اور امانت مجموعۂ علم واخلاق۔انبیاء کرام علیہم السلام کا مقصد چوں کہ امانت پھیلانا ہے ،جس کی راہ میں یہ

[1] پارہ:۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱۔

فتنہ خلل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا اور یہ فتنہ یعنی ظلم وجہل جبکہ انسان میں جبلی تھا، تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شبہات وشہوات سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ و پند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی، پس طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم و اخلاق نبوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا، تاکہ خلق خدا امن وسکون کے ساتھ اس علم وخلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت وعبادت الٰہی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق...... اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہوسکتا جو آج کی عصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین زر اور ذاتی اقتدار۔ آج اس کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چوں کہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہٰذا اسے ملنا چاہیے، یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہئے یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا انتداب قائم ہونا چاہئے، ورنہ پھر جنگ ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین، دوسری صورت میں زر اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے، جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کی دو ثلث آبادی انہیں تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ...... اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں بلکہ حرمت جنگ کی ہیں، کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین، کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور بے وزنی ہیں۔ اس کے نزدیک باہر کی زمین یا سرمایہ انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنے کا اسے حق ہو۔ زمین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: ﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ.﴾ ① ''بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے''۔ یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وارث حصہ پا سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً.﴾ ② ''میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں''۔

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی، یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اس کی طرف سے نائب ہے، اس کی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے، ذاتی طور پر نہیں۔ مال کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ.﴾ ③ ''اور لوگوں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا

---

① پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآية: ۱۲۸. ② پارہ: ۱، سورة البقرة، الآية: ۳۰.

③ پارہ: ۱۸، سورة النور، الآية: ۳۳.

ہے''۔ یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے، جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے۔ اللہ کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کرسکتا ہے، ذاتی موجبات سے نہیں۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ.﴾ ① ''اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا''۔

یہاں رازقیت اللہ کے لیے ثابت کی گئی ہے جو اس کی مالکیت کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونے کے دلیل ہے۔

حکومت الٰہی...... اسی طرح حکومت واقتدار اور انتداب کے بارے میں فرمایا گیا کہ۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ.﴾ ② ''حکم کا منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں''۔ اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا.﴾ ③ ...... ''اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں، کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا''۔

اس میں آمریت صرف اللہ کے لئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے بلکہ اوامر الٰہی کے بعد بندہ کے چون و چرا اور ''لِمَ و کَیْفَ'' کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے۔ یعنی امر الٰہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تأمل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔

قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت، آمریت، اور اقتدار، حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطہ ملکیت (ملکیتی حدود) میں آیا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو، ان اغراض کے لئے کسی سیاسی جدوجہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کریں گے یا کسی قوم پر ہجوم کریں گے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجہاد...... چنانچہ قرن اول (پہلی صدی) کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہئے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہئے ورنہ اعلان جنگ ہے، بلکہ کسی رقبہ زمین پر وجہ جواز جنگ کے لئے تین چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ یا خدا کا دین قبول کرلو۔ یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ جو مجموعہ دیانت و سیاست اور چشمۂ علم واخلاق ہے، یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کرلو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آ جاؤ اور یہ اقوام پر اس لئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب و

---

① پارہ:۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ:۲۵۴. ② پارہ:۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ:۴۰.

③ پارہ:۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ:۳۶.

سلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کر لو اور اپنے ملک میں آباد رہو۔ ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے نائبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

اسلامی جہاد کی غرض و غایت...... پس اسلامی جہاد اور اسلامی سیاست یا اس کے کسی سیاسی اقدام کی غرض و غایت زمین و سرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا، خود مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوانا، اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔

﴿لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ ①

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد، اشاعت دین الٰہی، اقامت حکومت الٰہی، حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کون سی دانشمند قوم اعراض کر سکتی ہے۔ اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اساس مقاصد ہے۔ گریز اگر ہوسکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے جبکہ انسان، انسان اور اقوام، اقوام سب برابر ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے یا اسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے۔ لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کر کے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی۔ بلکہ صرف اس لیے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو، اسے ملک گیری اور طمع جاہ و جلال سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ وہ ہزار ملک فتح کر کے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے۔ اس کا جنگی مقصد ہوس زر و جواہر نہیں بلکہ زہد و قناعت سے دنیا کو ہمکنار کرنا ہے۔ اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے۔

تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع و فساد بن سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کر دیا جائے۔

ایک لمحہ غور و فکر...... اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت، قومی اقتدار یا کسی خاص خطہ زمین پر مخصوص انتداب یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لے کر کھڑے ہوں گے، تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی مقاصد نہ ہوں، وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان و تسلی ہو تو ہر اقدام پر کیف اور پرسکون ہو جاتا ہے اور خود

① الصحیح للبخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب من قاتل لتکون کلمة الله... ج: ۱، ص: ۲۶۲ (الطاف سنز).

مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کر کے جو قرن اول کا تھا۔ یعنی قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت، اعزاز نظام دین جن کا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال یعنی اتباع اسوۂ حسنہ تو ہمارے ہر دعویٰ میں معنی بھی پیدا ہو جائیں گے اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گا۔ نیز کامیابی کی منزل بھی قریب تر آ جائے گی۔

خلافت راشدہ کے بعد...... میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قومی انحطاط و تنزل یا اقدامات میں جس قدر بھی ناکامی کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کا بنیادی سبب اکثر و بیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہ جانا یعنی فقدان جامعیت ہوا ہے۔ یعنی ناکامی، یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بعد (جو ان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا) مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رکیں، پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے، پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زیردستی کے ایام آنے لگے۔

یہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی، یا رہی تو راہ مقصود نامعلوم رہی یا راہ بھی معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت نہ رہی، اور یا وہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انہیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔ غرض ان تینوں عنصروں علمی قوت، اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنتا رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال...... تفصیلات کا موقع نہیں، لیکن اصولی طور پر اب اس کے مان لینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی باگ دوڑ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور فتاویٰ عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا، تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جہالت، ناتربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ...... ۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اٹھے بڑھے اور شہید بھی ہو گئے۔ مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعہ شکست بن گئے۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ...... ۱۸۵۷ء میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم

صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر پڑ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی، ناتجربہ کاری اور ناتیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم وتربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

عصر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ...... ۱۳۳۹ھ میں حضرت اقدس مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کھل کر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر تعلیم وتہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردۂ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن ومصائب بڑھتے ہی گئے اور آج جبکہ قدرتی انقلابات کے تحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم واخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

تحریص عمل...... اس سے انکار نہیں کہ جذبات وعواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے۔ رفتار زمانہ نے انہیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں۔ لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے اور گامزنی شروع نہ کر دی جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انہی عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے، مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی: تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تعمیل اسوۂ حسنہ۔ جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اشاعت دین الٰہی اقامت حکومت الٰہی تنظیم حیات انسانی۔

اشاعت دین الٰہی

تعلیم :.......اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے۔ جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کر سکیں۔ یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے، جس کا تکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے۔ ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم۔ کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے۔ اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھ کر مسلمان نونہالوں کو کتاب وسنّت اور اس کے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی مدافعت کر سکیں۔

قاسمی علوم اور فلسفہ......میں اس میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھ کر نئی ضروریات نظر انداز نہ کی جائیں اور انہیں سامنے رکھ کر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔ صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تا کہ پرانے دعاوی نئی دنیا کے دماغوں میں اتر سکیں۔

مرکز علوم دارالعلوم دیو بند......ہم اپنے تجربہ اور سالہا سال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلا دیا گیا ہو۔ اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانیٔ دارالعلوم دیو بند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللہ کی حکمتوں کا نچوڑ اور اس حکمت کو اگر قصر فرض کیا جائے، تو یہ اس میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ یہ فکر شریعت، طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چل کر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے۔ اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دارالعلوم دیو بند ہے۔ ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجت اللہ البالغہ اور تقریر دل پذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں۔

مستقبل کا تعلیمی پروگرام......اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکمت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم السیاست، مبادیات سائنس، سیاسیات حال کے اصول، اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کر دیئے جائیں تا کہ طلبہ اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرت پیدا کر کے صحیح طور سے ان پر رائے زنی کر سکیں۔

بہر حال یہ کام مدارس کا ہے۔ قوم کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تا کہ زیادہ سے زیادہ صحیح الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

مسجدی تعلیم...... مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارسی تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے، نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اس کی ضرورت بھی ہے۔ اس لئے مدارسی تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریات دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہنچ جائے۔ اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر ہر محلہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے، ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں میں ہوں، بلکہ دیہات میں بھی جابجا قائم ہونے ضروری ہیں۔ مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کر دیں جن میں قرانی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسالے داخل درس کر دیئے جائیں، جو ضروریات دین، عقائد فرائض، اخلاقیات، معاملات و معاشرات اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں۔

درس قرآن...... بہر حال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن عوام رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اس کی شکل مساجد میں درس قرآن حکیم کی ہے۔ جس میں قرآنِ کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بہ ذیل ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بموقعہ بیان کئے جائیں تا کہ عوام بھی غافل محض اور جاہل صرف نہ رہ جائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو۔

تبلیغ...... لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب و مساجد کی، بہر حال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لے کر جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لے کر نکلیں اور لوگوں کے کانوں تک کلمۂ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں۔ جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے۔

تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں...... تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت واکثریت کا فیصلہ کیا ہے۔ مکہ میں کلیت کفار کی تھی، تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی، پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی۔ مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی۔ ابتداءً جمرۂ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی، پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت۔ یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت واکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اس کا حل کر دیا۔

ایران میں فتوحات ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا ہو گئی۔ غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغ دین اور نشر و اشاعت اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان، مسلم و غیر مسلم

کشاکشی سے نجات پاگئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہوکر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھیں بند کرلی گئیں۔ جو تبلیغ سے ممکن تھیں، وہیں یہ کشمکش قائم ہے۔

مسلم سلاطین کا قصور...... اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت و اکثریت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں اور جنہوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں۔ بلکہ باہم مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کردی ہے۔

نقطہ اتحاد...... بہرحال اس کا حل بھی مسئلہ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آئے گا۔ اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے لے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مابہ الاتحاد بنالیں اور مل کر متحدانہ عمل شروع کردیں۔ بہرحال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہے جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہوسکتا، تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تمہید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انہیں بنالیا جائے اور اسی سے تنظیم ملت کا آغاز کردیا جائے، جو آئندہ دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈال دے گی۔

ان مبلغین دین کے لئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کردی جائیں تو وہ ان کی تبلیغ میں موثر ہوں گی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزو اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ: ﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.﴾ ① ''اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین پر ہے''۔

اس کے لئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کردیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سیکھ سکیں۔ جن کی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کرسکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اصول پر قائم کیا جائے اور اس کی تدریجی آمدنی میں اس کی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کرکے نکلے اور حاجت مند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اس اتنا سرمایہ بطور قرض دیا جائے، جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانے پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے۔ تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہوگی اور مبلغین کے وقار کے لئے محافظ بن جائے گی۔

طریق تبلیغ...... تبلیغ میں اسی اسوۂ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اسے اصولاً پیش کیا یعنی تبلیغ الاقرب فالاقرب (جو قریب سے قریب تر ہو) کے قاعدہ سے ہو۔ اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے پھر اپنے اہل بیت کو، پھر اہل قربت کو، پھر اہل شہر کو، پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔

یہ صورت حال اس طرح سہل ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۰۹.

تدریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تدریجی رفتار تبلیغ قائم ہو کر تبلیغ کو ہمہ گیر بنا دے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہئے بلکہ خاموش طریقہ پر عملی شکل میں۔

تذکیر...... اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض نہ کیا جائے یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاددہانی کریں۔ موعظت ونصیحت کا بازار گرم ہو کہ ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ.﴾ ①
''بار بار یاددہانی کرو۔ کیوں کہ یاددہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے''۔

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی، مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی۔ بہر صورت اس میں ایک جزو اہم اور لازمی رکھا جائے اور وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے باخبر کرنا اور ان کی شان دار روایات سلف سے انہیں آشنا بنانا، جس کا مرکز ومحور سیرت مقدسہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو صورتیں ان کے دل ودماغ اور روحوں میں انقلاب پیدا کر دیں گی اور ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ خود بخود ابھر جائے گا۔ بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متاثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزو جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم وتبلیغ اور درس وتذکیر میں سکھلایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ: ''دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا'' اور ''دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں''؟

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی، جن پر قابو پالینے کا راستہ بہ سہولت سامنے آسکے گا۔

عسکریت...... ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس ومکاتب وغیرہ میں ایک اہم جزو کی اشاعت وترویج بلکہ عملی مشق وریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے۔ مگر جسے آج کے عیش افزاء تمدن اور مخالف طاقتوں کی پالیسیوں نے سست اور مضمحل بنا دیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش، سپہ گری، لکڑی بازی، نیزہ بازی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ کھلائے جانے کی ضرورت ہے، وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کما حقہ مطلع ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ آج کل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈال کر صلح وجنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متاثر ہونے کی بجائے ان کی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کون سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کون سا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے اور وہ کس رخ پر مسلمانوں کو ڈالنا چاہتا ہے اور اس کا دفعیہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر ضرورت استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵.

ضرورت ہے۔ وہیں ان نظری فنون جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدعہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے، جس کی معلومات کم از کم معلمین، مبلغین، مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے۔ یہ تعلیمی نوعیتوں کا اجمالی نقشہ ہے جس سے قرآنی نظریات امّت میں پھیل سکتے ہیں۔ لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہے۔

تزکیہ نفوس اور اصلاح عالم...... اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں، اگر یہ طاقت مضمحل ہو تو علم بلا عمل کیا کارآمد ہوسکتا ہے؟

اس لئے اخلاقی تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت و مشاق کی حاجت ہے۔ جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدون ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لا سکتے ہیں، جبکہ ان کے اپنے قلوب مزکی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی تبلیغ، اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق وعفاف، للّٰہیت و بے نفسی، ایثار و تواضع اور معاملات کی صفائی دیکھ کر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے۔ آپ کا یہ سندھ ہندوستان میں اسلام لانے کا پہلا دروازہ ہے۔

صورت کا اثر سیرت پر...... مؤرخین لکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہ و تابعین جب سندھ کے بازاروں سے گزرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہوسکتے"۔

اس لئے اشاعت دین الٰہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔ ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیتوں میں سے غلامی نکل جائے تو باہر سے بھی دفع ہوجائے۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ﴾ ① "خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدلے"۔

خانقاہیں...... پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنی اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ و ریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل خانقاہیں باستثناء چند، عامۂ دوکانداری کے اصول پر قائم ہوگئی ہیں۔ رسمی گدیاں ہیں جن میں مریدوں سے تحصیل وصول (چندہ) کے سوا کسی تربیت کا کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کر کے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسمی مشائخ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان کے نذرانے بدستور قائم رکھ کر کہ بہرحال ان کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۱۱.

کہ ان کی اولاد کی خدمت کی جائے ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں۔ جو اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو انہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کر کے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت وارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں۔ ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ واستغفار کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح اپنا شعار بنائیں۔ اپنے اعمال کا تفقد اور نفوس کا محاسبہ کریں۔

علاوہ ازیں اغراض نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تاکہ قوم کی گاڑی آگے چلے۔ ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں، جاہ وجلال کی ہوس، نفاق تملق اور چاپلوسیوں کی خوئے بد نے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔

اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے۔ بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اسلامی فریضہ ہے لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے۔

یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقد اور تحفظ کرے، جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا رہے۔ خلاف شریعت امور دیکھ کر صبر نہ کرے بلکہ پیار ومحبت سے نصیحت کرے اور مخاطب کے دل کی راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزو اصلاح اخلاق ہے، ورنہ اس کی سیاست بھی اپنے حقیقی نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں (مصلح) نے سیاست کی بحثیں کیں اور وہ عملاً سیاست میں پڑے۔ انہوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد واخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ انہوں نے طریق اصلاح میں الہام کی بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے۔ پس سیاسی مساعی میں تہذیب نفس سے چارہ کار انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم...... بہرحال یہ ضروری شعبے اشاعت دین الٰہی کے عنوان کے نیچے آجاتے ہیں جن کی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔

قرآن نے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ سے تعلیم کی ضرورت ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ سے تبلیغ کی ضرورت ﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ① سے تذکیر کی ضرورت اور ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ② سے تعلیم عسکریت کی ضرورت اور ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ ③ اور ﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ﴾ ④ سے تعلیم صنعت وحرفت کی ضرورت جو آج کی سائنس کا عملی موضوع ہے۔ ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ⑤ سے تصفیۂ باطن کی ضرورت ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ⑥ سے خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت اور حدیث (اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ لِكُلِّ مُسْلِمٍ) ⑦ سے جزئی روک

---

① پارہ:۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ:۵۵. ② پارہ:۹، سورۃ الانفال، الآیۃ:۶۰. ③ پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ:۸۰. ④ پارہ:۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ:۱۳. ⑤ پارہ:۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ:۲. ⑥ پارہ:۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ:۱۷. ⑦ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ الدین النصیحۃ للہ ولرسولہ، ج:۱، ص:۲۵.

ٹوک اور نصیحت کی ضرورت کھلے الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے، جس پر صرف عمل ہی کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ پروگرام بنا بنایا موجود ہے، ہاں پروگرام کے لئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تا کہ قلوب کے لئے کوئی نظری مرکز پیدا ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر عملی دنیا میں آسکیں۔

اقامت حکومت الٰہی ......سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے۔ اس نظریہ سے اختلاف وہی کرسکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو۔ اس لئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع نقطہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تا کہ تمام قلوب سب سے کٹ کر اس ایک پر جمع ہو جائیں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کے لئے اپنا مرنا اور جینا متعین کر لے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اس سے متحد بن جائیں گے۔

ورنہ جس حد تک شرک آتا جائے گا اسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہے گی۔ کیوں کہ مرکز قلوب واحد نہ رہے گا۔ اس لئے اس کی واحد ذات، اسی کے واحد کلام، اسی کے واحد کعبہ، اسی کے واحد رسول کی طرف تمام امت کو علمی، اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے۔ تا کہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریت پر ایک اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ، حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا۔ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جس کی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الٰہی ''کتاب اللہ'' کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متخلق (اخلاق یافتہ) ہو کر اس قانون پر چلنا اور اسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے۔ کیوں کہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو، اس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہوسکتی اور نہ ہر شعبۂ زندگی میں وہ مشعل راہی بنایا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اس کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے۔ جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلّہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو۔ ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو، ہمارے روز مرہ کے نزاعات میں فیصلہ کردے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنا دیا ہو، آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمینان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہری کی پادوڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ مہم مسائل جو قوت کے بغیر طے نہ ہوسکیں، گورنمنٹ سے محکمۂ قضا کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جس کے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الٰہی اور قانون الٰہی ......کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الٰہی کو جو حکمت الٰہی کا مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ سے زیادہ نکاح وطلاق تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ اپنے گھر بار، جائداد و املاک اور عام معاشرتی واخلاقی سلسلوں میں بھی اس مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اس کے بالمقابل رواج

کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت الٰہی کے ادعاء کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع ورغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانون الٰہی سے بغاوت نہ رکھا جائے۔

پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو، وہ حکومت الٰہی کے عنوان کی دعویدار کس منہ سے ہو سکتی ہے؟

حکومت الٰہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں۔ ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھائے جاسکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو۔ مگر

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد

حفاظت نظام زندگی...... ''آزادی'' اس نصب العین (حکومت الٰہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گزارنے کا ہے۔ سو اس کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے، جو دلوں کے رگ وپے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیوں کہ غلامی کے جذبہ یا اس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد، ضمیر کو آزاد اور عمل کو ہر رسمی ماحول کے اثرات سے آزاد کردینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت الٰہی کا عملی نمونہ اور ایک کی غلامی کر کے سب سے آزادی حاصل کر لینے بلکہ سب پر آقا ہو جانے کا ایک مکمل نقشہ ہے۔ ساری آزادیاں اس میں پنہاں ہیں۔ آزادیٔ ضمیر اس کا پہلا قدم ہے کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ﴾ ① ﴿لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ﴾ ② ''یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ یہ سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے، پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔ (دشمنان حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یا لین محسوس نہ کریں)''۔ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ﴾ ③ ''کفار پر سخت اور آپس میں مہربان''۔

بہر حال صلہ رحمی، تعاون باہمی، ایثار مروت، ہمدردی ومحبت، غریبوں کی مدد، چھوٹوں پر رحمت، بڑوں کی توقیر، علماء سے حیا، ربانیوں کی تعظیم، اطعام طعام، تحیہ وسلام، عبادت الٰہی، شفقت علی الخلق، پڑوسیوں کی خبر گیری، یتامیٰ ومساکین کی اعانت، بیماروں کی عیادت، جنازوں کی مشایعت، مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کی بیخ کنی، اداء حقوق، دفع مظالم، سادگی بے تکلفی، قناعت وزہد، حب آخرت، طلب حق، انصاف وحق پرستی، امت مرحومہ کے

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۹. ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۵۴.

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

جماعتی مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ، وہ ابواب ہیں جو اسوۂ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں ہیں اور جن کا شیریں پھل آزادی وتنظیم ہے۔

اس اسوہ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی انتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کافور ہو جاتی ہے۔ آزادی مذہب، آزادی ضمیر اور آزادی علم وعمل حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امت ہی ہو سکتے ہیں اپنی جماعتی قوت سے امّت کو منظم کرنا چاہیں تو اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے لا کر با آسانی کر سکتے ہیں، کہ وہ اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں ''اشاعت دین الٰہی،، اور'' اقامت حکومت الٰہی'' کی عرض کردہ دفعات شامل کر لی جائیں تو قوم اسی طرح عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرون اولیٰ میں پہنچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اسے زیر نظر رکھا جائے۔

دفاع ملی......دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے ۱۹۱۹ء جب سے تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی آج تک مختلف قسم کے دفاعی پروگرام بنے اور ان پر عمل درآمد ہوا، جمعیت العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی راہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اس کے ربع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

جمعیت علماء ہند کے پچیس سال......اس دوران آج تک کون سی تحریک ہے جس میں جمعیت علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چاٹگام سے لے کر سرحد یاغستان تک پہنچا دیا۔ جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ چلایا۔ جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی۔ جس نے شدھی کی تحریک سنگھٹن کے ہنگاموں نہرو رپورٹ کی بے انصافیوں اور سارداایکٹ کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا؟ کیا وہ جماعت جمعیت علماء ہند ہی کی نہ تھی؟

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی، اس کا نصب العین مستقل، اس کا نظام عمل مستقل تھا۔ اس لئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر پرکھ کر اس نے رائے قائم کی۔ کسی ادارے سے اس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہو سکتی ہے۔ جو اصول شرعیہ پر پوری اترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے آمادہ ہے۔ جو اس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اس پرواز پر اس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کامیاب کام کیا اور اب بقدر استطاعت کر رہی ہے۔ جب کہ اس کے

کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جارہی ہیں۔

بہر حال جمعیت العلماء کوئی آج کی جمعیت نہیں ہے۔ اس کی تشکیلات بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کا قوام آج کے سارے سیاسی اداروں سے قدیم ہے۔

جمعیت علما ہند تاریخ کے آئینے میں...... جمعیت علما ہند دہلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز شاداب درخت کی مانند ہے، جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو "بعون اللہ" حیات تازہ ملتی ہے۔ اس جماعت کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رسمی تشکیلات سے پہلے کا ہے بالا کوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا اور شہادت کی رسم کہن کو زندہ کر کے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی۔ اسی جماعت کے اکابر تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آتشیں کے موقعہ پر اپنے سوز سے آپ پگھل گئے۔ خانماں برباد ہوئے اور اس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔ جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی یہ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے۔ کیوں کہ ماضی وحال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بزرگان دیوبند...... حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے ہجوم میں ہم بالاکوٹ کے اس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جہاں خاندان ولی الٰہی کی چشم و چراغ چند جانباز ہستیاں رداء شہادت اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔ نہ ہمیں وہ ویران بستیاں فراموش ہو سکتی ہیں، جہاں حجت الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانی دار العلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کے پرآشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔ نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جاسکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قید و بند سے دوچار رہے۔ نہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جاسکتی ہے۔ جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاری اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو آج جمعیت علماء ہند کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

۱۹۱۴ء کے مجاہدین...... ۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم وعمل میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے امین اسرار حضرت مولانا حبیب اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگاریں ہیں۔ جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر گواہ ہے۔ آپ حضرات کا ناز پروردہ دل کوٹھیوں میں بیٹھ کر ان مصائب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو ممدوح نے سرحد افغانستان سے لے کر متمدن یورپ اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے سنگریزوں پر سر رکھ کر اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج بھی کابل میں اپنی جلاوطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلوع ہونے کی امید میں گزار رہے ہیں۔ انہوں نے حجاز، افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا۔ روس کا انقلاب ماسکو پہنچ کر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ

انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی فوج میں صرف اس ایک سپاہی کا ایک لمحہ اس ساری سیاست کا جواب ہے جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما علماء کے وجود کو ختم کردینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ...... حضرت شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیت علماء ہند کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلہ میں آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہاں تلاش کررہی ہیں اور آپ کے قلوب ان کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج نینی تال جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کررہے ہیں۔ حضرت محترم اس وقت جمعیت العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلہ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔

حضرت ممدوح اس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہ مہاجر مکی کے مجاز، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ ان کے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں۔ ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے جذبۂ اخلاص وایثار سے ان کے مخالف بھی انکار نہیں کرسکتے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ...... اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں، حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم وتدبر کا روشن مینار ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہماری ہمتیں بلند ہوجاتی ہیں اور ہم ان کی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پالیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمعیت علماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقع ہے اور زمانہ ان کی خدمات پر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہرحال جمعیت علماء کی رسمی اور غیر رسمی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی ابتداء حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں اور انتہاء ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہرحال جمعیت علماء اور اس کے مقدس افراد کی جماعت اسی ساعت سے آزادی کے لئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے۔ جب سے مسلمانوں کی آزادی غلامی کی صورت میں تبدیل ہوئی، گو اس کی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب جدا جدا رہے۔ آج کے دور میں اس کی وہی جدوجہد عسکری رنگ کی بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک دفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمعیت العلماء کا یہ پچیس سالہ طرز عمل پیش کردوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمعیت کے سامنے پیش کرنے کے لئے۔ تاکہ ذمہ داران جمعیت اس پر غور وفکر کرکے مناسب اجزاء کا انتخاب کرسکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ...... اشاعت دین الٰہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص، تعلیم عوام اور شہرو

دیہات میں اس کی ہمہ گیری، درسِ قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سپہ گری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلہ تبلیغ، مسئلہ تذکیر و موعظت، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفوس، شخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الٰہی کے سلسلہ میں نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی و عملی، قانون الٰہی کی تنفیذ۔ فصل خصومات محکمۂ قضاء شرع، حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوہ حسنہ، توحید مطلب، عام شعب ایمان کی عملی ترویج جس سے بدنظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زمانہ لائے گا، لیکن اس کو چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہوسکتی ہے اور اتحاد اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگرام کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں، جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر علم و یقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہوسکتا ہے۔ چونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسری انسان کی رائے کا تزاحم ممکن ہے۔ لیکن الٰہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے، اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہوسکتے ہیں کہ وہاں ایجاد و اختراع کا کوئی دخل بھی نہیں۔ اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الٰہی پروگرام کو رکھا ہے۔ اس نے تمام بنیادی ازم مثلاً نیشنلزم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے، جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہوسکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں، قومیں سب برابر تھیں، اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہوسکتی تھی۔ نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان، انسان سب برابر تھے۔ پھر ان میں حاکم و محکوم کی تفریق کیسی؟ اور اگر کی جاتی تو وہ نوع و رعیت سے چل کیسے سکتی تھی۔ بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الٰہی کا اعلان کر دیا، جس کا قانون اسلام اور عرض کردہ پروگرام ہے۔ پس اس سے بہتر ذریعہ اتحاد مسلمانوں کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے؟

اس لئے اگر مسلمان خلوص دل سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوتوں کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں اور اختراعی اور دل آفریں نصب العین سامنے لا لا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں۔ لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کے چلانے کے لئے بہرحال جماعت اور اس کے ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیت العلماء پر۔

کانگریس اور لیگ...... کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا، اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا۔ خلافتی مسلمانوں اور سوراجی ہندوؤں کے اشتراک عمل سے اس کو پھل پھول لگے۔ گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر منقح آزادی کے سوا نیزہ تک پہنچایا اور بالآخر پنڈت

مالویہ اور سوامی شردھانند نے اسے فرقہ پرستی کے بحر ظلمات میں لے جا کر غرق کر دیا۔

کانگریس کی تاسیس...... کانگریس کا قیام درحقیقت ۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا، حکومت برطانیہ دولت عظمیٰ بننا چاہتی تھی اور اسے اس مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی، جو ہندوستان کے انقلابی رجحانات کا رخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کر دے۔ نتیجہ صحیح برآمد ہوا۔ چار کروڑ انسانوں کی سفید فام قوم (انگریز) چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہوگئی اور کانگریس ۱۹۱۴ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی۔

کانگریس ۱۹۱۶ء میں...... ۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اسے زندگی کا نصب العین دیا اور آزادی کا پرجوش ولولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہہ دیا جانا بے جا نہ ہوگا۔ مسلم لیگ ہندوستان کے سیاسی ترازو کا دوسرا پلہ تھا اور یہ اس کے موجد کا کمال تھا کہ اس کے دونوں پلے نصف صدی گذارنے اور سو بار پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لئے جو کچھ جدوجہد کی ہے اس کی سیاسی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلے میں جو نام پیدا کیا، مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔ لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایمری اس کا پھل کھا رہے ہیں اور ہندوستان والے اور پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑ رہے ہیں، مگر کما حقہ پھلوں کی فکر نہیں کرتے۔

ایک واقعاتی لطیفہ...... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہو کر دنیا سے لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست وگریبان ہے۔ یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑ رہے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجود بھی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلے میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنی یہ ہیں، ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں مخالف ہوا کے جھونکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں، دوسروں کے لئے اپنا پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہ جاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جس میں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف۔ آج یہ جھولا پاکستان پر آکر رکا ہوا ہے۔

مسئلہ پاکستان...... ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے الہام نہیں ہے۔

دنیا میں جب کوئی اسکیم ابھرتی ہے تو اس کو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کر دیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کر لی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب العین ہے اور بہت سے مسلم لیگی خلوص کے ساتھ اسے اپنے اندر لئے ہوئے ہیں، جن کا خلوص بہر صورت قابل قدر ہے۔ لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر منقح تصور ہے۔ جس کی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔

تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کروں گا کہ اس گول مول پاکستان کی شرح وتنقیح کی تکلیف گوارہ فرما کر اس کی تمام دفعات واضح کر دیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ لینے پر قناعت کریں۔ بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کنونشن) میں اسے غور و بحث کے لئے پیش کر دیں۔ تا کہ جن مسلمانانِ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے، وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اس کی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں۔

مخالفین پاکستان...... ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کروں گا کہ جب کہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نااتفاقی اور اختلاف ہے۔ جب تک تمام ہندوستان متحد نہ ہو جائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا انمول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاع گرانمایہ حاصل کر سکیں۔ اس پاکستان کے ماننے ہی سے مل سکتا ہے تو انہیں بلا کسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کر لینا چاہئے، فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائے گا اور اسے چلتا ہوا دیکھ کر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔

اور اگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جس کے نیچے معنی کا کوئی ذخیرہ نہیں، اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہوگی تو وہ خود ہی رہ جائے گا۔ محض آپ کے مان لینے سے اس کی کوئی ہستی قائم نہیں ہو جائے گی۔ جب تک کہ خود اس کی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔

بہر حال یا اس کی توضیح وتشریح سامنے آئے تا کہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جا سکے اور یا اس کے ابہام واجمال کے باوجود اس کی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کر کے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تا کہ منزل مقصود سامنے آئے اور اس کی حقیقت کو خود کھولنے کی بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھل کر یا دنیا کی سر آنکھوں پر آ جائے یا اس کے قدموں سے پامال ہو جائے۔ محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بنا کر آگے بڑھنے کا راستہ بند کر دیا جانا خواہ منوانے کی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ضد کے ساتھ، سوائے منزل کھوٹی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر عرض کروں گا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہر صورت مجوزین پاکستان

ہی عائد ہوگی۔ کیوں کہ اگر پاکستان کو اس ابہام کے ساتھ محض ان کی خاطر یا بوجہ الاتحاد قبول کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع وضرر کے وہ ہی ذمہ دار ہو سکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کر دیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بناء پر پھر بھی ذمہ داری انہیں پر ہے، جو نہ اسے واضح کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسے کھلی منڈی میں کھول کر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس کی صحت وسقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کرلے تو پھر بلا شبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک رہتی ہے جس کا الزام تنہا مجوزین پر عائد نہیں ہو سکے گا۔ ایسی صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھول دینے یا گول مول منوانے کے اصرار پر مزید غور وفکر کرلیں، مگر آزادی وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھ کر۔

لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہو جائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے۔ بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول وعدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا یا بالفاظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے، جس کو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کر سکتا۔

جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم......اس لئے ناگریز طریقہ پر اس شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کر سکتی ہے جو مسلم اقوام کی اسلامی تعمیر کی لائنوں سے ہمیشہ گزرتی رہی ہے۔ جس نے اس وقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلا کر عملی راہنمائی کی، جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس لئے آمادہ کیا کہ آزادی ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاد سے حاصل نہیں کی جا سکتی ہے تو سیاسی جہاد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیت العلماء کے اور کون ہے جو ان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو؟ اس لئے بھی کہ تجربہ اور عمل پیہم اس کے ساتھ ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب وسنّت کے سوا اور کسی ماخذ سے ماخوذ نہیں ہو سکتا اور کتاب وسنّت کے صحیح علم کے لئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ (حقیر کوشش) کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مستفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں۔ کہ وہ اس کے کھرے کھوٹے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو ان عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاحی پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کر دے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کر سکتی ہے۔ اس نے اب تک جس طرح دفاع ملی کی زریں خدمات انجام دی ہیں، جنہیں تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اب بلحاظ وقت ومصالح وہ تعمیری کاموں کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

جمعیت علماء ہند کی قدر وقیمت......ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب وسنّت کے اصول پر ہو

اور پھر اسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کی جائے۔ بلاشبہ ان تنظیمات کے سلسلہ میں موانع، دواعی سے زیادہ ہیں۔ لیکن جبکہ اس پرحوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے ہجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للّٰہیت و بےنفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھ کر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں۔ یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام و کامل دولت ہند، کو سندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیا خبر ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہو اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے۔ ﴿وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ﴾

آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے مقدس ارباب حل وعقد نے مجھ ناچیز کو اس کا موقع دیا کہ میں اپنے طالب علمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز سے ان کے سامنے رکھ سکوں۔

ورنہ کہاں میں اور کہاں مداوائے امّت کا علمی میدان۔ یہ محض ان کی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرہ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آ رہا ہے۔

گدا بہ تخت نشانند و بادشاہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص و للّٰہیت سے ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الٰہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

﴿فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖٓ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ. اَلَآ اِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ وَیَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْہِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ①

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۵ اپریل ۱۹۴۴ء

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۳، ۶۴.

مسلم پرسنل لاء

آج اگر سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو "اسلامی معاشرت،، ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے سارے مل کر اگر عمل کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل در آمد ہو اس کے اوپر۔ اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جا سکتی ہیں، مگر اس قانون پر آنچ نہیں آ سکتی۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ﴾ (1) .صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

حسن مقام...... بزرگان محترم! آپ کے اس عظیم الشان شہر میں جو اپنے حسن و خوبصورتی، فضا کی وسعت، آب و ہوا کے اعتدال اور مناظر کی خوبی کے لحاظ سے ہندوستان کے شہروں میں ایک ممتاز ترین شہر ہے اس کی طرف قدرتی طور پر قلوب اور طبائع کی کشش ہوتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر میں وزارت عظمی سے ریٹائرڈ ہوا تو بنگلور میں جا کر قیام کروں گا، اس سے بہتر ہندوستان میں دوسرا شہر نہیں ہے۔ بہر حال یہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک ممتاز شہر ہے۔

مرکز جہاد و شہادت...... سلطان ٹیپو کا یہ وطن ہے، ان کے مجاہدانہ کارناموں کا یہ مرکز رہا ہے۔ ان کی شہادت اسی مقام پر ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک سلطان وقت کی شہادت تنہا ایک کی شہادت نہیں ہوتی، معلوم نہیں کتنے

(1) پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۱۴.

افراد کوانہوں نے جام شہادت پلایا ہوگا اور کتنے لوگ یہاں شہید ہوئے ہوں گے۔ ان ہی شہداء کی اولاد آپ ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے جذبات آپ کے اندر نہ ہوں۔

وہ ولولہ، وہ جوش جہاد، وہ شہادت کا ذوق آبائی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے خواہ آپ کو احساس نہ ہو "الولد سر لابیہ" باپ کے جو جذبات ہوتے ہیں وہ قدرتی طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ تو اپنی معنویت کے لحاظ سے یہ زمین جوش اور جذبہ اور دینی ولولہ بھی رکھتی ہے۔

اکرام ضیف ...... اسی کے ساتھ ساتھ جو چیز ہم لوگوں کے سامنے آئی وہ آپ کے اخلاق کی وسعت ہے۔ ہم لوگ حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ مہمانوں کی مدارات میں، ضیافت میں، اکرام اور توقیر میں یہاں کے لوگوں نے جو جذبہ دکھلایا ہے، وہ ایک ممتاز قسم کا جذبہ ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ﴿مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ.﴾ (1) "جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے"۔ اس تعلیم نبوت کے ماتحت آپ نے مدارات میں انتہاء کی خوش سلیقگی کے ساتھ نظم کی خوبی کے ساتھ، مہمانوں کا قیام، ان کی آمد، ان کی توقیر، یہ ایک ممتاز صورت رہی ہے۔

یہاں اس سے بھی بڑھ کر عالی ظرفی کی بات یہ ہے کہ آنے والوں کا آپ شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں اور محض ظاہر داری کے طور پر نہیں بلکہ دلوں کے جذبہ سے حضرت مولانا ابوالسعود صاحب جو صدر استقبالیہ ہیں، انہوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں آپ کی طرف سے، اپنی طرف سے بھرپور الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ تو حیرت یہ ہے کہ مالی قربانیاں آپ نے دیں، جانی محنت آپ نے کی، مہمانوں کو راحت پہنچانے میں انتہاء آپ نے کی۔ اوپر سے شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں یہ عالی ظرفی اور قدرشناسی کی انتہاء ہے کہ آدمی سب کچھ کرے اور پھر یہ کہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔

ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ بادل وہ ہے جو برسے اور گرماوے یعنی برس کر گرماتا ہے کہ وہ پھر آمادہ ہے برسنے پر، اس کا جذبہ یہی ہے کہ میں مخلوق کو پانی دوں اور حیات بہم پہنچاؤں، دوسرا مصرعہ ہے کہ سخی وہ ہے جو دیوے اور شرماوے تو سب کچھ دے رہے ہیں اور شرما بھی رہے ہیں۔ ندامت کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے۔ لیکن ہمارا فریضہ بھی آپ ہی نے ادا کر دیا اب ہم سوچتے ہیں کہ ہم کیا چیز ادا کریں اور ادا کریں بھی تو واقعہ یہ ہے کہ جتنے جامع طریق پر آپ نے مہمان داری فرمائی، جلسہ کو کامیاب بنایا ہمارے پاس الفاظ اتنے جامع نہیں ہیں کہ جو حاوی ہو جاویں آپ کے شکریہ کے اوپر۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق شکر ...... لیکن شکریہ کا ایسا طریقہ کیا ہو کہ جب انعام اور نعمت تو ہو بے انتہاء اور شکریہ کے الفاظ ہوں محدود۔ ایسے موقع کے لئے خود شریعت نے ہمیں بتلا دیا کہ لامحدود شکریہ کس طرح ادا کر دیں۔

ایک طریقہ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بتلایا۔ حق تعالیٰ نے جب ارشاد فرمایا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ

---

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الادب، باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر، ج: ۱۸، ص: ۴۳۶.

شُكْرًا﴾ ① ''اے داؤد! میری نعمتوں کا شکر ادا کرو''۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ حقائق الٰہیہ کی جو سمجھ اور فہم انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں دی جاتی۔ بلکہ جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب ان کی ہی جوتیوں کے صدقے سے آتی ہیں اور ان ہی کی برکات سے آتی ہیں۔ تو داؤد علیہم السلام کو حکم دیا گیا کہ میرا شکر ادا کرو۔ انہوں نے عرض کیا، یا اللہ! کس طرح ادا کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ جب ہی تو شکر ادا کر سکوں گا۔ اس کی طاقت بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق دینا، طاقت دینا خود ایک مستقل نعمت ہوگئی پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا جب شکر ادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے تو پھر ایک نعمت پہلے نکل آئی، پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ تو ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں عاجز ہوں کہ شروع کس طرح سے کروں شکریہ کو اور ادا کس طرح سے کروں۔ ہر شکر سے پہلے ایک شکر اور ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو میں عاجز ہوں شکر ادا کرنے سے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اے داؤد! جب تم نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور تم شکر ادا کرنے سے عاجز ہو تو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے، کون ہے جو شکر کا حق ادا کر سکے۔ ②

نعمتیں لامحدود اور شکر ہمارا محدود، طاقتیں ہماری محدود، ممکن نہیں کہ اللہ کا شکر کما حقہ ادا کر سکیں۔ اس لئے صورت یہی ہے کہ اپنے عجز کا اظہار کرے اور اپنے قصور کا اعتراف کر لے کہ بھائی ہم شکر کو ادا نہیں کر سکتے، تو یہی ادائیگی شکر ہے۔ یہ تو طریقہ داؤدی ہے جو انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب شکر بہت سا لازم ہو جائے اور ادا کرنے سے عاجز ہو جائے تو اعتراف کو لو عجز کا کہ بھائی! عاجز ہیں۔ نہیں ادا کر سکتے شکر کو، یہی شکر کا قائم مقام ہو جائے گا۔

طریق شکر نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام)...... ایک طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر نعمتیں لامحدود ہوں تو تم بھی لامحدود شکریہ ادا کرو۔ مگر بندہ ہے محدود، وہ لامحدود شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ تو الفاظ ایسے ارشاد فرمائے کہ وہ لفظ اس شکر کو لامحدود بنا دیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور شکر ادا کیا کہ:

''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَآئِمًا مَّعَ دَوَامِکَ'' ''اے اللہ! تیرے لئے حمد ہے اور دائمی ہے جب تک کہ تو دائم ہے'' اور تیرے دوام کی کوئی حد نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی حد نہیں۔ اور فرمایا کہ: ''وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَّعَ خُلُوْدِکَ'' ③ (الحدیث) ''اور تیرے لئے حمد ہے جب تک کہ تو رہنے والا ہے اور تو ہمیشہ رہنے والا ہے'' ''تو میری حمد بھی ہمیشہ رہے گی تیرے ساتھ۔ اور فرمایا کہ: ''وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَّامُنْتَھٰی لَهٗ دُوْنَ مَشِیْئَتِکَ''۔ ''اور تیرے لئے حمد ہے ایسی حمد جو تیری مشیت کے ساتھ ساتھ چلے''۔ اور تیری مشیت کی کوئی

① پارہ: ۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳۔ ② تفسیر روح المعانی، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳، ج: ۱۶، ص: ۲۷۳۔
③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه محمد، ج: ۱۲، ص: ۲۷۴۔

انتہاء نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی انتہاء نہیں۔ تو آدمی جب پوری حمد اور پورا شکر ادا نہ کرسکے، تو اعتراف عجز کے بعد یہ بھی کہہ دے کہ یہ حمد دوامی ہے، تو اللہ ان لفظوں کو ہی دوامی بنا دیتے ہیں اور وہ شکر بھی دوامی بن جاتا ہے۔

اظہار تشکر...... اس لئے کہ اگر ہم آپ لوگوں کا اس مہمانداری پر شکریہ ادا کریں اس لیاقت پر اور اس جلسہ کو کامیاب بنانے پر، تو ایک تو یہ عرض کریں گے کہ ہم عاجز ہیں آپ کا شکر ادا کرنے سے۔ یہ تو ہے سنتِ داؤدی علیہ السلام اور ایک یہ عرض کریں گے کہ جب تک آپ باقی ہیں، آپ کی نسلیں باقی ہیں ہمارا شکریہ آپ کے ساتھ ہے، تو یہ دوامی شکر ہو گیا۔ اپنی طرف سے عجز کا اظہار بھی ہے اور دوامی شکریہ بھی ہے۔ پھر ان شاء اللہ دوامی طور پر ساتھ بھی رہے گا۔

پرسنل لاء کا مفہوم...... بہرحال اس عظیم الشان شہر میں جس کے اندر ظاہری اور باطنی خصوصیات ہیں، جس کے باشندوں کے اندر اخلاقی بلندیاں ہیں، اس عظیم الشان پنڈال میں یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جارہا ہے۔ جس کا موضوع ہے مسلم پرسنل لاء، یہ جلسہ ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کا میں ابھی اپنے بزرگوں سے پوچھ رہا تھا کہ پرسنل کے حقیقی معنی کیا ہے؟ اس لئے کہ لفظ انگریزی کا ہے، ہم تو پوری طرح انگریزی جانتے نہیں۔

تو میں نے تحقیق کی کہ پرسنل کے معنی کیا ہیں۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ مخصوص قانون جو کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہو، اسے پرسنل لاء کہتے ہیں۔ مگر کہا یہ گیا کہ پرسنل کے معنی ذاتی کے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذاتی قانون، مسلمانوں کا شخصی قانون۔ ان کے احوال شخصیہ کے بارے میں مذہبی ہدایات پر مبنی قانون اس میں ذاتی قانون آجاتا ہے، ذاتی افعال و احوال کے متعلق بھی باتیں آجاتی ہیں۔ خاندانی اور عائلی واقعات بھی آجاتے ہیں۔ نکاح ہو، طلاق ہو، ہبہ ہو، میراث ہو، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں تو مسلم پرسنل لاء کے معنی یہ نکلے کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین، ذاتی قوانین، خاندانی اور عائلی قوانین یہ ہیں جن کا تحفظ آپ کو مقصود ہے۔ یہ مسلمانوں کا قانون کہا جاتا ہے۔

دنیائے انسانیت کا قانون...... لیکن میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون ہی نہیں۔ قانون درحقیقت اسلام کا ہے، مسلم قوم کا کوئی قانون ہی نہیں، جو مان لے۔ اس کا نام مسلم ہے۔ جو نہ مانے اس کا نام غیر مسلم ہے۔ لیکن قانون خود مسلمانوں کا شخصی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی قانون وضع کیا ہے نہ ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ قانون اسلام کا ہے اور اسلام کا قانون پوری دنیائے انسانیت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی مخصوص قوم کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ یہ آپ کا قانون نہیں بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کا قانون ہے۔ ان لفظوں سے کہ ''مسلمانوں کا قانون'' ایک تعصب اور ایک حد بندی ٹپکتی ہے۔ تو غیر مسلم کہے گا کہ مجھے اس سے کیا تعلق یہ تو مسلمان کا قانون ہے۔ اس سے تعصب چلے گا، وہ غور کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کرے گا۔ چوں کہ مسلمانوں کا قانون ہے میرا قانون نہیں۔ مجھے اس پر غور و فکر کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہیں گے کہ مسلم قوم کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون نہیں، وہ تو خدا کا قانون ہے جیسے ہمارے لئے آیا ہے تمہارے لئے بھی آیا ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلٰى

النَّاسِ كَآفَّةً" ① ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ کسی پیغمبر کا دائرۂ عمل خاندان ہوتا تھا جیسے نبی اسرائیل کے انبیاء کہ وہ بنی اسرائیل کے خاندان کے لئے آتے تھے۔ غیر اسرائیلی سے انہیں تعلق نہیں تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: ''میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں، باقی دنیا سے مجھے کوئی تعلق نہیں نہ اور قوموں سے میری غرض ہے میں تو اسرائیلیوں کی اصلاح کے لئے آیا ہوں''۔ تو بعض انبیاء تو خاندان کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے اور بعض انبیاء وطنوں کی اصلاح کے لئے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام، کہ چار شہروں کی اصلاح ان کے سپرد فرمائی تھی۔ تو" كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً"

ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''وبعثت الى الناس كافة'' ''میں دنیا کی تمام اقوام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں''۔ اسی واسطے قرآن مجید میں جگہ جگہ جہاں عبادت عامہ کی ہدایت فرمائی یا ایمان لانے کی ہدایت فرمائی، تو اس جگہ انسانوں کا لفظ استعمال فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ ② ''اے دنیا کے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو''۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ ③ ''اے دنیا کے انسانو! جو آج موجود ہیں یا آئندہ جو تمہاری نسلیں آئیں گی ان سب کے لئے میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ تو آپ علیہ السلام کسی خاص نسل خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، کسی خاص وطن کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آئے ہیں۔

مبنائے تعصب...... اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں جو تعصبات ہیں اس کا مبنیٰ یہی ہے کہ ان کا دین و مذہب ہی اس قوم کے لئے مخصوص ہو کر آیا ہے۔ تو وہی خاندان اپنے دین کو لئے بیٹھا رہا ہے۔ دوسرے خاندان والوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا تعلق، ان کے وطن کا ایک قانون ہے۔ یہ اس پر عمل کریں، لیکن جب یہ اعلان کیا گیا کہ میں کسی خاص وطن یا خاص قوم کی طرف نہیں آیا، میں تو دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آیا ہوں، تو اب دنیا کی قوموں کو دعوت مل گئی فکر کی کہ جب ہمارے لئے بھی یہی قانون ہے تو ہم بھی اس میں فکر کریں اور اطاعت کریں۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کی محرومی ہوگی۔ پیغام اللہ کی طرف سے عام ہے دنیا کی تمام اقوام کو خواہ کوئی کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔

قانون فطرت...... بہر حال میں عرض کر رہا ہوں کہ مسلم پرسنل لاء کا اگر یہ مطلب ہے کہ شخصی قوانین، تو مسلمان کا من حیث القوم نہ کوئی شخصی قانون ہے اور نہ کوئی ذاتی قانون ہے۔ وہ خدا کا قانون ہے۔ ہم اس قانون کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں گے۔ مسلم پرسنل لاء کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ ہم اپنے قانون کو بچالے جائیں، نہیں

---

① السنن للنسائی، کتاب الغسل والتیمم، باب التیمم بالصعید، ج: ۲، ص: ۲۰۴۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ۲ ص: ۶۷ رقم: ۴۷۶۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۲۱۔
③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸۔

ہم اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دنیا کی قوموں کو بھی دعوت دیں گے کہ تم بھی اس پر عمل کرو خواہ وہ شخصی چیز ہو، خواہ خاندانی چیز ہو، اس لئے کہ وہ قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کے مطابق ہیں زبردستی کے قانون نہیں کہ عقل نہ مانتی ہو اور دل نہ مانتا ہو اور زبردستی اس کے اوپر ڈالا جائے، یہ بات نہیں بلکہ آدمی جب غور کرے گا، فطرت کے مطابق پائے گا۔ اس لئے ایک انسان کی زندگی اسی میں ہے۔ اس ماننے والے انسان کا نام ہے مسلمان اور مسلمان کی زندگی مہد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک اور اس کے درمیان میں جتنے اس کے افعال اور احوال ہیں، سب پر اسلام کا قانون لاگو ہے اور جتنی ہدایت ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ کوئی موضوع قانون نہیں کہ ہم نے بنالیا ہو۔

ذات انسان پر نفاذ قانون ...... افعال کو چھوڑ کر انسان کی ذات پر اس وقت سے اسلامی قانون لاگو ہو جاتا ہے کہ اسے عقل بھی نہیں شعور بھی نہیں، تمیز بھی نہیں۔ آج پیدا ہونے والا بچہ جو بالکل ہی مضغہ گوشت (گوشت کا لوتھڑا) ہے نہ اسے عقل ہے نہ تمیز، مگر اسلام کا قانون اس پر لاگو ہوا کہ پیدا ہوتے ہی نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان دو اور بائیں کان میں تکبیر کہو۔ سب سے پہلے اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچاؤ اور کہو کہ اللہ اکبر، اللہ ہی بڑا ہے اور کسی میں بڑائی نہیں ہے اس کے دل میں بٹھا دیا جاتا ہے کہ عظمت خداوندی یہ تیرا جوہر ہے۔

"اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ـ" "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" "اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ." "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں"۔ جب آدمی ان بنیادی عقیدوں پر آ گیا اور یہ بات ایک بچے کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب آگے عمل ہے، فرمایا کہ "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ" سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ عبادت خداوندی ادا کرو۔ جب یہ بھی اس کے دل میں جما دیا آپ نے، آگے عام زندگی کے بارے میں ہے "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" عام فلاح و بہبود کی طرف آؤ۔

ذات انسان پر نفاذ قانون کی حکمت ...... اب رہا یہ کہ وہ بچہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ آپ کو فائدہ کیا ہے کہ دائیں کان میں اذان کہیں اور بائیں کان میں تکبیر کہیں، یہ تو ایسا ہے جیسے آپ نے کسی دیوار کے سامنے وعظ کہہ دیا، وہ دیوار کیا سمجھے گی۔ لیکن یہ چیز غلط ہے، بے شک اس بچہ کو عقل نہیں شعور نہیں، لیکن اس بچہ کا قلب ایک سفید تختی کی مانند ہے، جو اس پر چھاپو گے وہی چھپ جائے گا اور جب ہوش سنبھالے گا تو وہی کلمات کہتا ہوا ابھرے گا۔ جو آپ نے اس کے دل پر چھاپ دیئے ہیں۔ تو اگرچہ عقل و شعور نہیں مگر استعداد قبولیت کی ہے، جو کلمہ اس کے کان میں ڈالیں گے وہ چھپ جائے گا اس کے دل کی سفید تختی پر، جیسے یہ ریکارڈنگ مشین ہے، ہم جو تقریر کر رہے ہیں وہ اس میں چھپتی جا رہی ہے۔ اسے نہ عقل ہے نہ شعور ہے۔ ایک جامد محض چیز ہے لیکن ساری تقریر اس میں جم جائے گی۔ جب آپ اس کی کل اینٹھیں گے وہ ساری اگل دے گی جو اس کے اندر بھری ہوئی ہے۔

تو کیا ایک انسان کے بچے کا دل اس مشین سے بھی گیا گزرا ہے۔ انسان نے اپنی عقل سے اس کی تخلیق کی

ہے تو وہ عقل خود کتنی بڑی ہوگی اور اس بچے میں عقل تو ہے مگر نشو ونما پائی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن جو ہر موجود ہے جو آپ اس کے کان میں ڈال دیں گے وہ اس کے دل میں چھپ جائے گا۔

دورِ تربیت...... اس سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ بچے کی تربیت کا زمانہ یہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ پانچ برس کا ہو تو مکتب میں بٹھادو، اب تربیت شروع ہوتی ہے۔ نہیں، فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ مخاطب نہیں بن سکتا ہے۔ مگر ماں باپ کا کام ہے کہ ڈالیں اس کے اندر ایسی چیزیں کہ جو حقی اور سچی ہوں۔

تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے کوئی برا کلمہ نہ کہیں، جو کلمہ کہیں گے وہی اس کے قلب میں چھپ جائے گا، وہی نشو ونما پا کر ابھرے گا اور وہی کہے گا۔ اس لئے جو بات بھی اس کے سامنے کریں وہ حقی اور سچی کریں، عمدہ کریں تا کہ اس کے دل میں وہی بات چھپ جائے، اسی طرح سے اس کی آنکھیں ایک آئینے کی مانند ہیں اس کے دل میں گو شعور واحساس نہیں لیکن آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔ تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ماں باپ بچے کے آگے کوئی بے حیائی کی حرکت نہ کریں۔ اگر بے حیائی کے کام کرتے ہیں تو وہی اس کی آنکھ کے راستے سے جا کر اس کے دل میں چھپ جائیں گے اور جب وہ ہوش پائے گا تو وہ بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں کرتا ہوا ابھرے گا۔ تو کان میں اچھی بات ڈالو اور آنکھ کے سامنے اچھے نقش پیش کرو۔ خیالات اس کے دل میں اچھے جماؤ تا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اچھا بنے۔ اقوال بھی اس کے اچھے ہوں، افعال بھی اس کے اچھے ہوں۔ تو تربیت کا زمانہ یہ نہیں کہ پانچ چھ برس کے بعد آتا ہے بلکہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون...... فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں مخاطب ہیں ماں باپ کیوں کہ اس بچے کے اندر مخاطب بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اسلامی قانون ایک انسان کے صرف افعال پر لاگو نہیں ہوتا، بلکہ ذات پر بھی لاگو ہے، اس لئے کہ یہ بچہ افعال ادا کرنے کے تو قابل نہیں مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔

اسلام کا قانون اس کی ذات پر آ گیا تو وہ قانون زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے اذان کہہ دی، تکبیر کہہ دی، اب نماز باقی رہ گئی۔ علماء لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ وہ نماز ہے اس نے اذان اور تکبیر کی۔ آج تو آپ نے تکبیر اور اذان کہی اور جاتے ہوئے اسے آپ نے نماز پڑھ کر رخصت کیا۔ تو ایک مسلمان کی زندگی اذان اور نماز کے درمیان میں ہے۔ گویا ابتداء میں بھی اسے اللہ کے نام نے گھیر رکھا ہے اور انتہاء بھی خدا کی عبادت پر جا کر ہوئی تو ابتداء کر و اس کی اذان اور تکبیر سے اور انتہاء کر و اس کی نماز کے اوپر، تو ساری زندگی اس کی دو چیزوں کے درمیان آ جائے گی، عظمت خداوندی، توحید خداوندی توحید الٰہی، اقرار رسالت اور نماز کا جذبہ اور ختم ہوگا وہ نماز کے اوپر تو ظاہر بات ہے کہ جنازہ کی نماز تو آپ ہی پڑھیں گے میت کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے وہ تو بیچارہ کفن پہنے لیٹا ہوا ہے مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔ نفس تو موجود ہے۔ تو اسلام کا قانون اس کی ذات پر لاگو ہوا۔ افعال تو بعد کی چیزیں

ہیں۔تو جو قانون ذات پر لاگو ہو وہ افعال پر کیوں لاگو نہ ہوگا۔ وہ اقوال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا۔ وہ اعمال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا تو انسان کی ذات اور افعال سب گھرے ہوئے ہیں اسلامی قانون کے تحت۔

تعلیم فطرت......ظاہر بات ہے کہ یہ قانون اگر غیر مسلم بلکہ سارے انسان تسلیم کریں تو کیا یہ کوئی برائی کی چیز ہے کہ ابتداء ہی میں خالق کی عظمت دل میں بیٹھ جائے۔ یہ تو ہر قوم کے غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ پیدا ہوتے ہی توحید الٰہی اور رسالت کی شہادت اس کے دل میں ڈال دو۔ ''حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ'' کہہ کر اسے عبادت خداوندی پر آمادہ کرو۔ معاذ اللہ یہ کوئی بری چیز ہے؟

غور کیا جائے تو یہ فطرت کے مطابق تعلیم ہے اور یہ تعلیم قوم مسلم کے ساتھ مخصوص نہیں یہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ہے۔ کوئی غور نہ کرے یہ اس کی محرومی کی بات ہے لیکن اسلام نے تو غور کا دروازہ کھول دیا ہے۔

مگر جب آپ یوں کہیں گے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور وہ ہمارا قانون ہے، میری قوم کا قانون الگ ہے اور جب آپ یہ کہیں گے کہ نہ ہمارا قانون نہ تمہارا قانون۔ یہ تو خدا کا قانون ہے جس کے مکلف ہم سب قرار دیئے گئے ہیں، اب موقع آئے گا ان کے غور وفکر کا کہ جب ہمیں بھی پیغام دیا گیا ہے تو بھی اس پر غور کریں۔

اسلامی پرسنل لاء......اس لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ماننے کے لحاظ سے یہ مسلم پرسنل لاء ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ اسلامی پرسنل لاء ہے، یہ خدا کا قانون ہے جو سب کے لئے عام ہے۔ بچپن سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر میدان حشر تک، اور میدان حشر سے لے کر جنت تک اور جنتوں میں داخل ہونے کے بعد ابدالآباد تک یہی قانون چلتا رہے گا اور اسی میں ترقی ہوتی رہے گی۔ حشر میں اور ہوگی، جنتوں میں جا کے کچھ اور ہوگی۔ مگر بنیادی طور پر یہی قانون رہے گا اور انسان کی ترقی اسی سے ہوتی رہے گی۔

پرسنل لاء کا تحفظ......بہرحال مسلم پرسنل لاء کا اصل مقصد یہ ہے کہ عائلی قوانین جو ان کی ذات پر لاگو ہیں ان کا تحفظ ہو، حقیقت یہ ہے کہ ہماری کسی سے بھی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہم کسی قوم سے لڑتے ہیں۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس قانون کو تم بھی اختیار کرو اور اگر نہیں اختیار کرتے تو کم سے کم ہم کو تو عمل کرنے دو، تم اس میں کیوں رکاوٹیں ڈالتے ہو؟

ان رکاوٹوں کا دور کرنا یہ ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہمیں عمل کرنے دو، اگر تم محروم رہنا چاہتے ہو اور نہیں عمل کرتے تو عمل کرنے والوں پر پابندیاں کیوں عائد کرتے ہو؟ کیوں اس میں رکاوٹ ڈالتے ہو تو مقصد اصلی ان قوانین کا تحفظ ہے۔

اب اگر اس تحفظ کے سلسلے میں آپ لفظوں سے دباؤ ڈال سکیں تو لفظوں سے دباؤ ڈالیں، کوئی اور تجویز ہو اثرات ڈالنے کی آپ اسے اختیار کریں، مگر مقصود اصلی حفاظت ہے اس قانون خداوندی کی تو اس کو ہم محسوس کریں اور اس کا احساس ہمیں ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قانون کوئی بت یا تصویر ہے، وہ رکھا ہوا اور آپ شور

مچائیں کہ صاحب! وہ ہے قانون پرسنل لاء کا، اس کی حفاظت آپ کریں۔

طریق تحفظ...... قانون کی حفاظت یہ ہے کہ آپ اس کو استعمال کرنا شروع کر دیں، پس وہ محفوظ ہو جائے گا اور تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے۔ لیکن شور مچاؤ کہ وہ رکھا ہوا ہے قانون، تو قانون کوئی بت ہے جس کی حفاظت کر رہے ہیں یا کوئی وہ تصویر ہے؟ سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ آپ اسے اپنے اندر رچالیں، اس پر عمل درآمد شروع کر دیں تو قانون مجسم بن جائیں گے۔

ذرائع حفاظت کی سعادت...... پرسنل لاء کوئی مٹنے والی چیز نہیں ہے، کوئی کتنا ہی مٹائے وہ خود مٹ سکتا ہے اس لئے کہ پرسنل لاء کے قانون کی جڑیں قرآن اور حدیث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود اسلام ہے اور اسلام دوامی زندگی لے کر آیا ہے مٹنے کے لئے نہیں آیا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے لی ہے۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ.﴾ ① ''ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ تو حفاظت ہوگی اللہ کی، اس میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا ہے۔ ہمارے لئے سعادت یہ ہے کہ ہم ذریعہ اور سبب بن جائیں اس کی حفاظت کا۔ حافظ حقیقی تو حق تعالیٰ ہیں لیکن اگر ہم وسیلہ بن گئے تو ہمیں سعادت حاصل ہو جائے گی ورنہ اگر ہم عمل نہ کریں اور نہ حفاظت کریں پھر بھی مٹنے والا نہیں ہے۔

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ.﴾ ② ''تم اگر سب مل کر اس دین کی حفاظت سے پھر گئے تو تمہیں نکال دیا جائے گا اس دین سے اور دوسری قومیں لا کھڑی کر دی جائیں گی''۔

وہ اس دین کی حفاظت کریں گی، اس لئے سعادت تو ہماری ہے اگر ہم سبب اور ذریعہ بنیں اس کی حفاظت کا۔ ہم خود حافظ نہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ حفاظت کرنے والا حفاظت کر رہا ہے۔

اس قانون کے خلاف کتنے کتنے مصائب، کتنے بڑے بڑے دشمن کھڑے ہوئے، لیکن آج ان دشمنوں کا نام ونشان نہیں اور قانون خداوندی پھر اسی شان سے موجود ہے، قرآن بھی محفوظ، حدیث بھی محفوظ، فقہ بھی محفوظ ساری چیزیں اپنی جگہ ہیں، انکار کرنے والے گزر گئے، آج کوئی نقش پا بھی ان کا پتہ بتلانے والا نہیں یہ قانون تو اپنی جگہ رہے گا حفاظت خداوندی سے، ہم اگر ذریعہ بن جاویں اس کی حفاظت کا ہمیں سعادت حاصل ہو جاوے گی۔ انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو جاویں گے ورنہ یہ تو محفوظ رہنے والی چیز ہے۔

ہم جو شور مچا رہے ہیں وہ درحقیقت اپنی حفاظت کے لئے، پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے نہیں، وہ تو محفوظ ہے ہم جتنا اسکا دامن پکڑلیں گے اتنا ہی محفوظ ہو جائیں گے کیوں کہ محفوظ کا دامن پکڑ کر آدمی خود محفوظ ہو جاتا ہے آپ سے پرسنل لاء کی حفاظت نہ ہوگی، بلکہ پرسنل لاء سے آپ کی حفاظت ہوگی تو ہم اپنی حفاظت کے لیے اسے دانتوں سے مضبوط پکڑیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس میں کوئی خلل انداز ہو۔ ابھی تو ہم مدمقابل سے لڑنے کو تیار

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: سورۃ محمد، الآیۃ: ۳۸۔

ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کے اندر کوئی خلل ڈالے۔ حکم خداوندی یہی ہے۔

تو واضح ہوگیا کہ پرسنل لاء کا قانون اسلامی قانون ہے کسی مخصوص قوم کا قانون نہیں، ماننے والے کا نام مسلم ہے تو وہ مسلم قانون کہلائے گا نہ ماننے والے کا نام غیر مسلم ہے۔ تو غیر مسلم کا قانون نہیں رہا اور نہ وہ حقیقت میں انسانی قانون ہے، انسان کی برتری اور اس کی حفاظت اور ان کی خوبی اور دنیا و آخرت کے بھلائی کے لئے یہ قانون بھیجا گیا۔

دین اور رسمی قوانین کا فرق...... اس قانون کا حاصل فقط یہی نہیں کہ آپ چند رسمیں ادا کرلیں۔ بلکہ قانون کی حفاظت اور تحفظ کا حاصل یہ ہے کہ اس پر عملدر آمد کر کے آپ ظاہرا افعال بھی ادا کریں، مگر ہر فعل میں قربت اور تعلق پیش نظر رہے، یہی فرق ہے دین میں اور رسمی قانون میں۔

رسمی قوانین جو سلطنتیں طے کرتی ہیں وہ صرف افعال پر لاگو ہوتے ہیں۔ لیکن خدائی قانون دلوں کے اوپر لاگو ہوتا ہے۔ اگر کسی کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا تو قانوناً اس کو سزا دیں گے۔ لیکن اس کے دل میں سے کوئی چوری کا جذبہ نکال دے۔ یہ کوئی دنیاوی قانون نہیں کرسکتا، جیل خانے میں جا کر بھی چور کا جذبہ یہی رہے گا کہ اب اگر چھ مہینے کے بعد چھوٹ جاؤں گا تو پھر اس سے بڑی چوری کروں گا۔ پھر چھ ماہ جیل میں رہوں گا۔ مگر اس کے بعد میں ایک اور زبردست ڈاکہ ڈالوں گا۔

تو بھائیو! دنیا کا قانون تو جذبات پر بھی لاگو نہیں ہوتا۔ ذات پر تو کیا ہو وہ تو اور بھی اوپر کی چیز ہے۔ صرف افعال پر لاگو ہوتا ہے۔ منظر عام پر وہ قانون چلتا ہے۔ لیکن دینی قانون اور انبیاء کا قانون وہ ہے کہ وہ فقط چوری ہی سے نہیں روکتا بلکہ چوری کی نفرت بھی دل کے اندر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ڈاکہ زنی ہی سے نہیں روکتا بلکہ ڈاکہ کی غلاظت اس کی سامنے ایسی آتی ہے جیسے پاخانہ کی غلاظت۔ تو جرائم کی نفرت بٹھا دینا، جرائم سے بیزار بنا دینا یہ قانون خداوندی کا کام ہے۔

مسلم پرسنل لاء کا منشاء..... مسلمانوں کا شخصی قانون ہو یا عائلی قانون ہو اس کا منشاء فی الحقیقت یہی ہے کہ ظاہر میں یہ عمل کرو اور باطن میں خدا کی طرف رجوع کرو۔ اس لئے کہ قانون دونوں چیزوں پر لاگو ہوتا ہے۔ تمہارے دلوں پر بھی، تمہاری زبانوں پر بھی، تمہارے ہاتھوں اور چہروں پر بھی۔ نہ فقط دل کی اصلاح، نہ فقط ہاتھ پیر کی اصلاح، نہ فقط زبان کی اصلاح بلکہ انسان کے مجموعے کی اصلاح پیش نظر ہے کہ اس کا ہاتھ پیر بھی درست ہو، اس کا قلب بھی درست ہو۔ ظاہر و باطن سے وہ اس پر عمل در آمد کرے، تو یہ شور مچانا محض اس لئے نہیں کہ چند رسمیں ہیں جنہیں ہم پورا کرنا چاہتے ہیں یا چند رسمی باتیں ہیں جن کی حفاظت کرنا ہمارا مقصود ہے نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جس کے پیش نظر انسان کی فلاح و بہبود ہے ہم اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ ہم اس کی حفاظت کر کے اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ موازنہ اور مقابلہ کر کے دیکھ لو، ذاتی زندگی ہو یا افعال کی زندگی ہو یہ زندگی

بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو تم تجویز کر رہے ہو۔ یہ بھی ہمارے مقاصد میں داخل ہے۔

مسلم پرسنل لاء کے لئے سر براہان مذاہب کا اتحاد......تو پرسنل لاء کے خلاف ایک شور اٹھا، اس سے لوگ پریشان ہوئے اور آل انڈیا مسلم بورڈ قائم کر دیا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ شور مضر نہیں ثابت ہوا گو وہ فی نفسہٖ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ جنہوں نے پرسنل لاء کی مخالفت کی واقعی انہوں نے سخت غلطی کی۔ گویا ایک شر اٹھا۔ مگر اس شر میں سے ہمارے لئے خیر نکل آئی۔

پہلی خیر تو یہ نکلی کہ سارے مسلمان متحد ہو گئے کہ ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ آج آپ کے سامنے یہ سر براہان مذاہب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کے علماء موجود ہیں، ہر تنظیم کے سر براہ موجود ہیں۔ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں، اس شر میں سے ہی تو یہ خیر نکلی ہے۔ اگر پرسنل لاء کے مخالف نہ کھڑے ہوتے تو ان کے دل میں یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوتا کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو اتحاد جیسی نعمت اس شر نے ہمیں بخشی، تو یہ شر ہمارے لئے مضر ثابت نہیں ہوا۔ ہم تو انہیں محسن سمجھتے ہیں جو ایک درجے میں پرسنل لاء کی مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہم میں جذبۂ اتحاد پیدا ہو گیا ؎

خدا شرے بر انگیزد کہ خیرے دراں باشد

بعض دفعہ شر اٹھتا ہے مگر اس شر میں سے خیر نکل آتی ہے۔ ہمارے لئے بھی اس میں سے خیر نکل آئی کہ ہم کو نعمتِ اتحاد ملی۔

یہ بات نہیں کہ رسمی طور پر ہم اتحاد کو اچھی بات سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ ایک نعمت خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی اسے نعمت فرمایا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ لڑتے تھے، آپس میں عداوتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، لڑائیاں ٹھنی ہوئی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر جنگیں اٹھتی تھیں۔ پانی پلانے پر جھگڑا، پہلے پانی کون پلائے، اس پر قبیلے لڑ پڑتے تھے اور یہ لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس جاری رہتی تھی، اور مرنے والے وصیت کر جاتے تھے کہ لڑائی بند نہ ہونے پائے، اسے جاری رکھنا ہمارے خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ باتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں مگر لڑائیاں بہت بڑی بڑی۔ عناد و دشمنی عام، آپس میں رقابتیں مزاج بن گیا تھا، اسلام نے آ کر انہیں متحد کر دیا۔ تو اس اتحاد کو حق تعالیٰ نے ایک آیت میں نعمت فرمایا ہے کہ:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ ''اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے، ایک دوسرے کے نام سے بیزار تھے''۔ ﴿فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا﴾ ① سو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ یہ اس کی دی ہوئی نعمت تھی کہ تم خود آپس میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳.

نعمت تالیف قلوب......تو اس اتحاد اور تالیف قلوب کو حق تعالیٰ نے انعام خداوندی فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے ساری تنظیمیں آپ اکھٹی کریں مگر دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کا کام ہے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کہ آپ کی تائید سے بڑھ کر اور کس کی تائید قومی ہو سکتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ:﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ.﴾ ① ''اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر زمین بھر کر بھی سونا خرچ کر دیتے تو دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے۔دلوں کا جوڑنا اللہ کا کام ہے''۔

یہ جو ہمارے بزرگ جو بیٹھے ہوئے مختلف مسالک، مختلف فرقوں کے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کندھے سے کندھا ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ دل بھی ان کے جڑے ہوئے ہیں۔دلی جذبہ بھی یہی ہے کہ واقعی ہم حفاظت کریں اپنے دین کی، تو تالیف قلوب یہ تو اللہ ہی کا کام تھا اور واقع جب ہوا، جب شر اٹھا اور پرسنل لاء کے مخالف کھڑے ہوئے، تو ہم کو اللہ نے اس شر سے ایک بڑی نعمت عطا کر دی اور اسلام کا شیوہ ہمیشہ رہا ہے کہ جب بھی وہ ابھرا ہے مخالفتوں میں ابھرا ہے۔اگر مخالفین نہ ہوں اور ان سے ٹکراؤ نہ ہو تو اس کی برکتیں نہیں کھل سکتیں، اس کے اندر جو خیر کے پہلو ہیں وہ نمایاں نہیں ہو سکتے تھے۔

مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد......غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ ترقی نام ہی ٹکراؤ کا ہے۔اگر دنیا میں ٹکراؤ نہ ہو تو ترقی نہیں ہو سکتی۔مثلاً پانی، ہے، ہزاروں برس سے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس میں کوئی ترقی نہیں کہ پہلے سمندر کی موجیں اٹھتی تھیں پہاڑوں کی شکل میں اور اب گلدستوں کی صورت میں آنے لگی ہوں، پھول بوٹے بن گئے ہوں۔ویسی ہیں موجیں ہیں جیسی دس ہزار برس پہلے اٹھتی تھیں، ویسے ہی ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔کوئی ترقی نہیں۔آگ ہے اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے لپٹ اٹھتی تھی ویسے ہی آج بھی لپٹ اٹھ رہی ہے۔وہ پھول بوٹے نہیں بناتی، زمین ہے اگر تنہا چھوڑ دو تو اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے پامال تھی ویسے ہی آج بھی پامال ہے۔آپ جیسے اسے روندتے ہیں روندی جاتی ہے۔لیکن پانی کو اگر آپ ملا دیں مٹی سے اور ٹکرا دیں تو گارا بنے گا اور گارا بننے کے بعد کہیں برتن بنیں گے، کہیں اینٹیں بنیں گی، کہیں سامان بنے گا۔بس ترقی شروع ہو گئی۔

تو آگ پانی کے ٹکراؤ سے ترقی ہوتی ہے، الگ الگ رہنے میں کوئی ترقی نہیں ہے۔آگ کو آپ ہوا سے ٹکرا دیں تو جو (فضا) کے عجائبات پیدا ہوں گے کہیں گرج ہو گی، کہیں بادل ہوں گے، کہیں بجلیاں چمکیں گی۔اگر ہوا اور آگ دونوں الگ الگ رہیں تو نہ بجلی نظر آئے گی نہ کڑک نظر آئے نہ بارش برسے گی۔تو بہر حال ٹکراؤ ہی میں ترقی ہے۔

ایک بہت بڑا عالم ہے وہ ہزار ہا مسائل جانتا ہے لیکن پھر اس کے اندر ترقی نہیں۔لیکن اگر اس کو کسی جاہل

---

① پارہ: ١٠، سورۃ الانفال، الآیۃ: ٦٣.

سے ٹکرادیا جائے اور وہ اعتراضات کرے، تو اعتراضات کے جواب میں نئی نئی چیزیں کھلیں گی اور نیا علم سامنے آئے گا۔اس طرح سے ایک عالم کے علم کی ترقی شروع ہو جائے گی۔

تو جہالت بھی ایک نعمت ہے بغیر اس کے ٹکراؤ کے علم کے اندر ترقی پیدا نہیں ہوتی۔ایک حکیم کا مقولہ ہے کہ:"اَلْقَلْبُ مَيِّتٌ وَّحَيَاتُهُ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَيِّتٌ وَحَيَاتُهُ بِالْمُنَاظَرَةِ" ''دل مردہ ہے اس کی زندگی ہے علم اور علم مردہ ہے اس کی زندگی بحث اور نظر اور ٹکراؤ سے ہے''۔

اور علم کی ٹکر جہالت ہی سے ہوگی۔علم تو علم سے ٹکراتا نہیں۔تو جتنا جاہل ٹکرائے گا عالم سے اتنا ہی اس کے علم میں وسعت شروع ہو جائے گی۔

ایک بہت زبردست پہلوان ہے، ہزاروں داؤ پیچ جانتا ہے جو اس کی جھولی میں محفوظ پڑے ہوئے ہیں، اگر کشتی لڑنے پر آ جائے تو داؤ پیچ میں ترقی ہوگی وہ اپنے بچانے کے لئے نئے نئے داؤ پیچ ایجاد کرے گا۔نئی نئی صورتیں پیدا کرے گا، تو جب تک دو پہلوانوں کی ترقی نہ ہو تو فن کی ترقی نہیں ہوتی۔ترقی درحقیقت نام ہی تصادم کا ہے۔اگر تصادم نہ ہو تو ترقی ناممکن ہے۔اس لئے حق تعالیٰ نے اسی تصادم کو بھی فضل خداوندی ظاہر فرمایا ہے اور فرمایا کہ:﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ.﴾ ① ''اگر اللہ ایک قوم کو دوسری قوم سے نہ ٹکرائے تو زمین فاسد ہو کر رہ جائے اور قومیں بیٹھ جائیں''۔

ان کی ترقی رک جائے،لیکن اللہ ٹکراتا ہے ٹکرانے کے بعد پھر نئے نئے عجائبات تمدن کے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی جنگ ہوتی ہے تو جنگ کے بعد نئے نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔تمدنی ترقی ہوتی ہے۔اگر کوئی قوم قوی ہے۔تو اس ٹکرانے سے اس کی نخوت (بھرم بازی) ٹوٹتی ہے۔

اور جو ضعیف ہے اس کی غفلت ٹوٹتی ہے۔تو دونوں فرقوں کی بھلائی ٹکرانے کے اندر ہوتی ہے۔ٹکریں نہ ہوں تو کوئی ترقی ممکن نہیں۔تو پرسنل لاء کو ٹکرایا، لوگوں نے مخالفت کی، اعتراضات کئے۔اس سے ہر فرقے کے علماء کھڑے ہوئے۔ ہر تنظیم کے سربراہ کھڑے ہو گئے، انہوں نے ان اعتراضات کے جواب دیئے۔اس سے مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ پھیل گیا اور اتنی شقوق کھل گئیں کہ اس سے پہلے ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے اندر اتنی شقوق ہیں۔آج سینکڑوں رسالے شائع ہو گئے،سینکڑوں مضامین چھپ گئے۔سارے پہلو کھول کر رکھ دیئے۔ پتہ نہیں تھا کہ اس پرسنل لاء میں اتنا علم بھرا ہوا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق علم نکالا۔اتنے پہلو وا شگاف کئے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو کبھی یہ پہلو ہمارے سامنے نہ آتے بس، اتنا جانتے تھے کہ قانون اللہ کا ہے۔ بھائی عمل کر لو اس پر، مگر ٹکر سے آپس میں ترقی ہوئی، عجیب لطائف اور نکات پیدا کئے علماء نے۔اگر یہ ٹکر نہ ہوتی تو پرسنل لاء کا مسئلہ واضح نہ ہوتا۔حق تعالیٰ جب چاہتے ہیں کہ اسلام کے کسی مسئلہ کو کھول کر واضح کریں تو جہلاء کو ٹکرا

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۱.

دیتے ہیں کہ تم اعتراضات کرو اور مخالفت کرو، جتنی مخالفت ہوگی علماء اس کے جواب میں کھڑے ہو جائیں گے اور جو گوشے چھپے ہوئے تھے وہ کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

اسی لئے کفار کو ٹکر دی گئی مسلمانوں سے، فساق کو ٹکر دی گئی متقیوں سے، منافقوں کو ٹکر دی گئی مخلصوں سے تا کہ مخلص کا اخلاص کھل جائے، منافق کا نفاق کھل جائے اور جو چیز اصل ہے وہ کھل کر بر سر عام آ جائے۔

تو واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لاء کی مخالفت ہمارے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو اتنا بڑا اتحاد جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ نہ ہوتا۔ اس اتحاد سے جو حفاظت ہو رہی ہے پرسنل لاء کی وہ نہ ہوتی۔ اس حفاظت سے رعب کی جو کیفیت مخالفین کے دلوں میں پیدا ہوگئی وہ نہ ہوتی۔ ہزاروں مسلمان جو پرسنل لاء کو سمجھتے ہوئے نہ مانتے تھے وہ اچھی طرح مان گئے۔ تو ایک نعمت کیا ہزاروں نعمتیں مل گئیں۔ اس اعتبار سے تو ہم شکر گزار ہیں مخالفت کرنے والوں کے کہ اگر وہ مخالفت نہ کرتے تو ہمیں یہ نعمتیں نہ ملتیں۔ اور وہ زیادہ مخالفت کر کے دیکھیں، مسئلہ اور زیادہ واضح ہوگا۔

اور ممکن ہے کل کو اس کھلے ہوئے مسئلے کی لپیٹ میں وہ بھی آ جائیں اور وہ بھی کہیں بھائی! وہی بات تو تھی جس سے لڑ رہے تھے، اسے دیکھو اور جب دیکھیں گے تو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاویں گے۔ تو یہ مخالفت ذریعہ بن جائے گی ان کی موافقت کا، یہی مخالفت ذریعہ بنے گی پیروی کرنے کا۔ تو ان کے لئے بھی راستہ ہموار ہو رہا ہے۔

مبنی بر حقیقت قانون ...... اور ہمارے لئے تو اللہ نے علمی اور نظری راستہ پیدا کر ہی دیا، بہت سوں میں اب استعداد پیدا ہو رہی ہے غور و فکر کی اور استعداد کے بعد جب وہ غور و فکر کریں گے تو فطری قانون پر آ کر رہیں گے۔ یہ مصنوعی قوانین سب ختم ہو جائیں گے۔

باپ کا بیٹا ہونا یہ کوئی فرضی بات تھوڑا ہی ہے کہ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ بیٹا ہے بس وہ بیٹا بن گیا۔ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ باپ ہے وہ باپ بن گیا۔ باپ بیٹا ہوتا ہے جزئیت کے تعلق سے کہ وہ باپ کا جزو ہے، اس کے نطفے سے ہے اس لئے وہ اس کا بیٹا ہے۔ محض منہ کے بولنے سے جز نہیں بن جائے گا۔ کسی شخص کا محض نام لینے سے بیٹا بنا دینا درحقیقت فرضی اور مصنوعی بات ہوگی۔ حالاں کہ اس کا تعلق خلقت سے ہے۔ خدا ہی باپ بناتا ہے خدا ہی بیٹا بناتا ہے، وہی ایک کے اندر سے دوسرے کو نکالتا ہے، اس کے اجزاء منتقل ہوتے ہیں دوسرے کے اندر جس سے وہ بیٹا بن جاتا ہے۔ بیٹی بن جاتی ہیں۔ ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ.﴾ ① ''وہ مردہ سے زندہ کو نکال دیتا ہے، ایک قطرہ پانی سے جو مردہ محض ہے''۔

زندہ انسان پیدا کرتا ہے اور اس زندہ انسان میں سے پھر وہ قطرہ آگے کو چلتا ہے تو زندہ میں سے مردہ کو نکال دینا اور مردہ میں سے زندہ کو پیدا کرنا، یہ تو اللہ کا کام ہے کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ تو ایک انسان کا جزء بن جائے گا دوسرا انسان۔ وہ جزء زبان کی حرکت سے تھوڑا ہی بنے گا۔ وہ تو خلقتاً بنا ہوا ہے۔

---

① پارہ: ۲۱، سورة الروم، الآیة: ۱۹۔

جو بیٹا ہے وہ بیٹا ہے، جو باپ ہے وہ باپ ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جب اس حقیقت پر وہ غور کریں گے وہ خود نادم ہوں گے اگر عقل رکھتے ہوں گے کہ بھائی! محض منہ سے بیٹا کہہ دینے سے بیٹا کیسے بن گیا اور بیٹا بھی حقیقی کہ وراثت میں بھی شریک اور حقوق میں بھی۔ یہ سب فرضی کارخانہ ہے کہ ہم نے بیٹھ کر خیال کر لیا بس ہو گیا تو باپ بیٹا ہونا خیالات سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو خلقت ہے تخلیق خداوندی ہے، جتنی چیزیں قانون کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مصنوعی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون جو آتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسری قومیں اپنے اقتدار کی وجہ سے، اپنے تحفظات کی وجہ سے قانون ایسے بناتی ہیں کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ دوسرا چاہے پامال ہو جائے لیکن اللہ کے تو سب بندے ہیں، وہ تو سب کا خیر خواہ ہے۔ اس لئے وہ قانون بھیجتا ہے سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے، اس لئے سب ہی بنی آدم کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

پرسنل لاء کی خدمت...... بہر حال اب اس لحاظ سے میں عرض کروں گا کہ اہل بنگلور نے جو مدارات کی ہے آنے والوں کی اور جو مہمانداری کی اور اخلاقی بلندیوں کا ثبوت دیا وہ فی الحقیقت ہمارے گوشت پوست کی خدمت نہیں۔ بلکہ وہ خدمت کی ہے پرسنل لاء کی۔ وہ خدمت کی ہے اتحاد طبقات کی، وہ خدمت کی ہے تمام فرقوں کے متحد ہونے کی، تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ہم الفاظ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی انسان کے اوپر فرض ہے کہ شکریہ ہی ادا کرے اللہ کا بھی اور بندوں کا بھی۔ "مَنْ لَّا يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ." ① "جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں"۔

اس لئے کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ کیا ہے اللہ ہی کی توفیق دینے سے تو اولاً اللہ کا شکر ہوتا ہے پھر وسائل کا شکر ہوتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم آپ کا شکر ادا کرتے یہ آپ کی عالی حوصلگی ہے کہ آپ ہمارا شکر ادا کر رہے ہیں۔

دے بھی رہے ہیں شرما بھی رہے ہیں

فی الحقیقت یہ شکریہ آپ کے لئے ہے اس وقت تک جب تک آپ کی نسلیں باقی ہیں، آپ کے لئے دعاء ہے، اس وقت تک جب تک دنیا میں آپ کا نام ونشان باقی ہے۔ تو اللہ آپ کو بھی دوامی کرے اور خدا کرے کہ ہمارا شکر بھی دوامی ہو۔

دوامِ شکر...... انسان تو ہے ہی دوامی، انسان ازلی نہیں بلکہ ابدی ہے۔ ازلی تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے پیدا کیا تو ہو گیا۔ اس سے پہلے انسان کا نام ونشان نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے فرمایا: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ ② "انسان پر ایک بڑا زمانہ گزر چکا ہے کہ لاشئی محض تھا اور اس کا چرچا بھی نہ تھا زبانوں پر"۔ کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ زید کون ہے اور بکر کون ہے ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ.﴾ ③ "ہم

---

① السنن للترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک، ج:۷، ص:۲۰۹.

② پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۱. ③ پارہ: ۲۹، سورۃ الدھر، الآیۃ: ۲.

نے پیدا کیا انسان کو ایک بوند کے لچھے سے، پلٹتے رہے اس کو"۔

تو ہمیں پیدا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہم معدوم تھے۔ اس سے پہلے ہمیں اپنے عدم کا بھی علم نہ تھا۔ زمانہ دراز گزر چکا ہے کہ انسان نہیں تھا۔ اللہ نے پیدا کیا، لیکن جب پیدا کر دیا تو اب وہ مٹنے والا نہیں اب وہ ابدی ہے۔

موت کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ آدمی موت آنے کے بعد فنا ہو گیا، یا ختم ہو گیا ایسا نہیں ہے بلکہ موت کے معنی منتقل ہو جانے کے ہیں۔ اس دار سے دوسرے دار میں، اس جہان سے دوسرے جہان منتقل ہونا۔ تو انتقال ایک دار سے دوسرے دار کی طرف، ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف یہ تو ہوتا رہے گا، مگر مٹ جائے انسان، یہ نہیں ہوسکتا، نو مہینے آپ ماں کے پیٹ میں رہے ایک عالم میں تھے۔ اس سارے عالم کی عمر نو مہینے کی تھی وہاں سے انتقال ہوا تو دنیا میں آ گئے۔ اب دنیا میں آپ کی عمر ساٹھ، ستر اسی سو برس کی ہے یہاں رہے، یہاں سے انتقال ہوا تو عالم برزخ میں پہنچ گئے، جسے آپ قبر کہتے ہیں۔ وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ آپ اس میں کتنی مدت رہیں گے۔ قیامت تک تو رہنا ہی ہے۔ پھر قیامت آ گئی تو آپ عالم برزخ سے عالم حشر کے اندر منتقل ہوں گے اور عالم حشر میں ایک دن قیام کرنا ہے اور وہ ایک دن ہوگا پچاس ہزار برس کا، لہٰذا پچاس ہزار برس اس عالم کی عمر ہے۔ اس عالم میں آپ پچاس ہزار برس گزرنے کے بعد منتقل ہوں جنتوں کی طرف۔

تو انسان مٹنے والا نہیں ہے۔ باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ سے چلا تو چلتا رہے گا ابدالآباد (ہمیشہ) تک۔ اس لئے آپ بھی باقی، ہم بھی باقی، آپ کے اخلاق بھی باقی، ہمارا شکریہ بھی باقی۔ دونوں چیزیں دوامی ہیں جو چلتی رہیں گی اور جنت تک ساتھ جائیں گی۔

وحدت خیال و وحدت قلوب...... بہر حال آپ نے فی الحقیقت یہ خدمت مہمانوں کی نہیں بلکہ ایک مسئلہ عظیم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے مسلم پرسنل لاء کی خدمت کی ہے، اس کو عام کیا، اس کو پھیلایا اور آپ نے چاہا کہ ساری پبلک اس سے واقف ہو جائے۔ اس کے لئے یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ درحقیقت وعظ و تقریر کا نہیں ہے۔ وعظ و تقریر میں ہوتی ہے تربیت۔ یہ جلسہ ہے اعلان کا کہ آپ کو ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جو قانون کے اوپر آنے والے ہیں۔ ان کی بچاؤ کی صورتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں۔ ان صورتوں پر آپ متفق اور متحد ہو کر چلیں۔ یہ جلسہ اس اعلان کے لئے ہے، وعظ و تقریر کے لئے تو ہزاروں جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں عبادات، معاملات وغیرہ سب چیزوں کی نصیحت بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ محض وعظ و نصیحت کا اجلاس نہیں یہ تو جلسہ اِذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔ تو بہت سے خطرات سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ فلاں مسئلے کو اگر بدلا گیا تو یہ خطرات ہوں گے، پرسنل لاء کے مسئلے میں مداخلت کی گئی تو یہ خطرات رونما ہوں گے۔

ان خطرات پر تجویزیں آ رہی ہیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو یہ جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ آپ کا اتحاد باقی رہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اتحاد زبان سے نہیں ہوتا۔ آپ نے کہا کہ میں آپ کا دوست

ہوں، میں نے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کا دوست ہوں۔ یہ دوستی قائم نہیں رہ سکتی کیوں کہ یہ تو لفظوں کی دوستی ہے، دوستی واقعی جب ہے کہ واقعی دل میں دوستی آجائے، جگر کے اندر پیوست ہو جائے وہ دوستی باقی رہ سکتی ہے، اور وہ دوستی کب ہوگی؟ جب وحدت خیال پیدا ہو۔ اگر خیالات بدلے ہوئے ہیں، آپ کا رخ ایک طرف میرا رخ ایک طرف، کبھی اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا اور جب خیالات میں آگئی وحدت تو خود بخود اتحاد پیدا ہوگا۔ تو پرسنل لاء اور قانون الٰہی اور قرآن کے ایک ایک جز کی حفاظت ایسی چیز ہے کہ اس کے اوپر سارے متفق ہیں۔ اس کے معنی میں چاہے اختلاف کریں، رائے الگ ہیں۔ لیکن نفس قانون قرآن وحدیث اس پر سارے متحد ہیں۔

تو اس وقت آنچ آپ کے میرے خیالات پر نہیں آرہی ہے اس وقت تو آنچ آرہی ہے کتاب وسنّت پر ان کے مسائل پر لوگ تغیر وتبدل چاہتے ہیں۔ تو کون سا فرقہ رہ جائے گا جو اسے گوارہ کرلے قرآن وحدیث میں کوئی شخص تغیر کرے، اس واسطے سارے کے سارے متحد ہوگئے لہٰذا وحدتِ خیال بھی ہے اور وحدت قلوب بھی۔

اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی...... اور باہمی اخلاص بھی ہے ایک دوسرے سے، بغیر اخلاص کے اس طرح جمع نہیں ہو سکتے اور اخلاص اس لئے ہے کہ مقصد ہے مشترک، الگ الگ مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہی مقصد ہے کہ یہ قرآن وسنت نا قابل تغیر ہے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا ہے۔ تغیر وتبدل تو کیا کرتے اس کا حق تو خود صاحب شریعت کو بھی نہیں دیا گیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ارشاد فرمایا گیا کہ آپ بھی اعلان کردیں: ﴿قُلْ مَايَكُوْنُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ.﴾ ① ''میرے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ میں اس کے کسی شوشے کو بدل دوں''۔

میں تو ناقل اور امین اور داعی بن کر آیا ہوں، اللہ کی طرف سے، جو حق تعالیٰ فرمائیں گے بلا کم وکاست تمہارے آگے رکھ دوں گا۔ اس کے اندر میری طرف سے کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔ تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام بھی جس تغیر و تبدل کے مجاز نہیں، میں اور آپ اس کے مجاز کیسے ہو جاویں گے؟ اور جب میں اور آپ نہیں تو دوسری قومیں کیسے ہو جاویں گی؟ یہ تغیر وتبدل کرنے کھڑی ہوں گے، تو لامحالہ مقابلہ بھی ہوگا اور مقابلہ ہوگا تو ہماری مدد بھی ہوگی۔

بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی...... مدد حاصل کرنے اور لڑنے کا ایک خاص اصول ہے۔ اگر آپ ضعیف اور کمزور ہیں، مدمقابل ہے، بہت قوی اور آپ مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں اس سے۔ تو اصول یہ ہے کہ کسی قوی کو اس کے مقابلہ پر ڈال دیجئے۔ وہ لڑتے رہیں گے آپ بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہیں گے تو آج قانون پر آنچ آرہی ہے، آپ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اقوام کو اللہ سے بھڑا دو اور کہہ دو کہ یہ قرآن وحدیث میں تغیر کرنا چاہتے ہیں، قرآن والا خود ان کو سمجھ لے گا۔ لڑائی ان کی شروع ہوگی۔ ہم آرام سے بیٹھ کر دیکھیں گے، خدا کو کون مغلوب کرسکتا ہے؟ اس کے قانون کو کون نیچا دکھا سکتا ہے؟ اس کی صورت یہی ہے کہ ہم آڑلیں قرآن وحدیث کی۔ اپنی

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۱۵.

طرف سے کوئی بات نہ کہیں۔ نہ ہماری عقل کوئی چیز ہے، نہ ہمارا خیال کوئی چیز ہے۔ ہم تو قانون کے حق میں امانت دار ہیں اس قانون کو پہنچائیں گے۔ قانون قانون والے کا ہے۔ اگر کوئی لڑے گا تو وہ قانون سے اور قانون ساز سے لڑے گا۔ ہم تو قانون ساز نہیں ہیں۔ ہم تو بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔

جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا گیا۔ مقابلہ ہوا مشرکین مکہ سے ظاہر بات ہے کہ مسلمان تعداد میں بھی تھوڑے، سامان بھی ان کے پاس نہیں اور مقابلہ اس قوم سے کہ سارے وسائل زندگی اس کے ہاتھ میں ہیں، اقتدار حجاز کا اس کے ہاتھ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ.﴾ ① ''اے پیغمبر! مجھے چھوڑ دو اور میرے مقابلہ پر انہیں چھوڑ دو''۔

ہم نمٹ لیں گے تم بیٹھ کر دیکھو تو ہمارا بھی کام یہ ہے۔ بھائی تم ہماری جائیداد ہماری ذات پر حملہ نہیں کر رہے ہو۔ یہ تو براہ راست قانون پر حملہ ہے اور قانون الٰہی ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے تو تم لڑ لو۔ اگر تمہارے اندر طاقت ہے اللہ میاں سے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم پیش کر دیں کہ یہ خدا کا قانون ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے پھر بھی کرو گے تو مجرم ٹھہرو گے خدا کے، ہمارا کوئی جرم نہیں کہ ہم خواہ مخواہ تم سے لڑیں، تم نمٹ لو۔

بہرحال اصول بھی یہی ہے کہ جب آپ کے اندر طاقت نہیں تو کم از کم اتنی طاقت ہے کہ اپنے دین کو مضبوطی سے سنبھال لیں اور دوسروں میں اعلان کر دیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ یہ ناممکن التغیر ہے، بس اتنا آپ کرتے رہیں۔ اب آگے جھگڑنے کے بعد کون مغلوب ہو کون نہیں۔ اس کو قانون والا اپنے آپ جان لے گا۔

شاہ حبش کی شکست...... آپ کے سامنے تو واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر جب دھاوا بولا ہے ابرہہ نے یہ یمن کا بادشاہ تھا اور اس نیت سے آیا تھا کہ بیت اللہ شریف کو منہدم کرے۔ (معاذ اللہ) تاکہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف سے ختم ہو کر اس مکان کی طرف ہو جائے جو اس نے یمن میں بنایا تھا، تو وہ بڑے بڑے ہاتھیوں کا لشکر لے کر آیا اور مکہ کے اردگرد اس نے گھیرا ڈال لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ معاذ اللہ بیت اللہ مسمار کر دے اور ڈھا دے۔ تو اس نے عبدالمطلب کو اطلاع دی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو آ کر کہو۔ مکہ کے باشندوں کے تم سردار ہو۔ عبدالمطلب آئے، ان کی بڑی تعظیم کی، بڑی توقیر سے پیش آیا اور کہا کہ اگر کوئی بات ہو تو آپ کہیں۔ انہوں نے کہا میرے چند اونٹ ہیں، میری چند املاک ہیں، ان کی آپ حفاظت کریں۔ ان پر آپ ہاتھ نہ ڈالیں اور میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اسے حیرانی ہوئی کہ یہ اپنے چند اونٹوں کو لے کر بیٹھ گئے اور بیت اللہ جیسی چیز کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا کہ صاحب! اسے مسمار مت کرو، اس پر حملہ مت کرو، تو اس نے عبدالمطلب سے کہا کہ آپ اپنے چند اونٹوں کے بارے میں آئے ہیں اور اپنی ایک شخصی ملک کو سامنے رکھا ہے۔ حالاں کہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس مرکز کو ڈھا دوں جس سے آپ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کچھ بھی نہیں کہا۔

① پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۴.

تو عبدالمطلب نے کہا کہ بیت اللہ میری ملک تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو خدا کا گھر ہے۔ خدا آپ سے خود نمٹ لے گا، میں تو اپنی ملک کے بارے میں کہنے آیا ہوں، خدا کی ملک کے بارے میں کہنے نہیں آیا۔ وہ جانے آپ جانیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اس کے ہاتھیوں کے پرخچے چند چڑیوں کے ذریعے اڑا دیئے۔ بیت اللہ اسی طرح قائم رہا اس کے ہاتھیوں کے اور اس کے لشکر کے پرخچے اڑ گئے، ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہا۔

پرسنل لاء میں مداخلت کی وجوہ...... ہم اور آپ اس چیز کے ذمہ دار ہیں کہ پہلے تو اس قانون پر ہم اور آپ عمل کریں اور اپنے اندر اس کو رچالیں، اس کے بعد اس کا اعلان کریں کہ یہ خدائی قانون ہے۔ اس میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کو خدا کے مقابلے پر ڈال دیں کہ ہم تو اسی پر عمل کریں گے اور اسی کا اعلان کریں گے، جو تمہارا جی چاہے کرلو، تو حقیقت یہ ہے کہ کوتاہی ہماری ہے۔ عامل ہم نہیں۔ پرسنل لاء کے نام سے ہم واقف نہیں۔ شخصی اور عائلی قوانین کیا ہیں ان پر عمل درآمد نہیں، اگر عمل درآمد ہو تو دوسرے خود مغلوب ہو جاویں گے۔ لیکن خود آپ عمل نہ کریں تو دوسروں کو جرأت ہوتی ہے کہ دخل اندازی کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان کو پتہ نہیں کہ پرسنل لاء کیا ہے۔ لہٰذا جس طرح سے چاہو اس کے روپ کو بدل دو۔

ہماری بدعملی نے یہ راستہ دکھایا ہے، اگر آج سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو اسلامی معاشرہ ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے۔ پھر کروڑہا کروڑ انسان جن کو سات کروڑ کہا جاتا ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ دس بارہ کروڑ سے کم نہیں۔ یہ سارے مل کر اگر عمل درآمد کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دے دی جائے کہ اس قانون میں تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا ہے اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کرسکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

فریضۂ مسلم اور ادائیگی شکر...... یہ اعلان کردینا آپ کا فرض ہے، اس پر جم جانا آپ کا فرض ہے، اس لئے یہ جلسے منعقد کئے جارہے ہیں۔ پرسنل لاء کے مسائل کے بارے میں مجھے کوئی تحقیق عرض کرنی نہیں تھی۔ بلکہ مقصد آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور ایک یہ کہ پرسنل لاء کے اوپر آپ کو جم جانا چاہئے۔ علماً بھی عملاً بھی اور اعلاناً بھی اور اذن عام بھی آپ کریں، مطلع کردیں کہ یہ قانون خداوندی ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ ہم ایک منٹ کے لئے بھی اس میں تغیر وتبدل گوارہ نہیں کرسکتے۔ یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ کوئی تقریر یا وعظ نہیں کرنا تھا۔

ایک خادم بورڈ کی حیثیت سے یہ بھی میرا فرض تھا کہ آپ حضرات کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کروں۔ اپنی طرف سے بھی اور ان سب بزرگوں کی طرف سے بھی۔ اصل میں تو یہی سارے بزرگ ہیں، انہوں نے مجھے لاکر آگے بٹھلا دیا ہے کہ تو یہ کام کر۔ صدر تو اصل میں وہی ہیں جو صدر بنا سکتے ہیں کیوں کہ وہ کرسی پر جسے چاہیں بٹھا

دیں۔ میں تو ایک علامتی نشان ہوں کام کرنے والے تو یہی سارے بزرگ ہیں جو کام کر رہے ہیں اور انہوں نے ہی کیا ہے۔ اس لئے اداشکر کے اندر میں ان کی طرف سے نیابت کر رہا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر دے۔ آپ کے احوال میں برکت عطا فرمائے!۔ (آمین)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَ تُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ.

وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

اسلام اور آزادی

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضاء پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی، تا کہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضا پر محیط ہو جائے۔ اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں۔ بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا مناد (دعویدار) ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

آزادی کا مفہوم...... بزرگانِ محترم! اسلام آزادی کا سب سے بڑا حامی و علمبردار ہی نہیں، بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا مفہوم ذہنوں میں اور اس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیوں کہ عقل کی تگ و تاز کی حد تک آزادی کے معنی کوٹھی، بنگلہ، کیک پیسٹری، توس مکھن، کھیل تماشا، گانا بجانا، آلات لہو و لعب، نفسانی عیش و نشاط، ملکوں میں آمد و رفت، ہوائی یا بری و بحری سیر و سیاحت، پارٹی فیلنگ اور اس سے حریفوں کی شکست، استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون اور قانونی داؤ پیچ کے پردوں میں اقوام و طبقات کو بے بس اور بے حق ٹھیرا دینے کے نہیں ہیں۔ ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ بلکہ آزادی کے معنی حق و صداقت، عدل و انصاف اور ایثار و رواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو ابھارنے، بے کسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کو اٹھا دینے اور حدود سے گزر کر ابھرے ہوؤں کو اتار دینے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں۔ تا کہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے اور

قوی کو ظلم وزیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوت وقدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے، جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست وپائی ختم ہو جائے۔

آزادی کا اسلامی نصب العین...... آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھئے تو وہ یہ ہے کہ: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ٥ وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ٥ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ.﴾ ①

''فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف (پارٹیاں) بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کی بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ واقعی وہ بڑا مفسد تھا اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جا رہا تھا، ہم ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنا دیں اور ان کو مالک بنا دیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں۔ فرعون اور ہامان اور ان کی اہالی وموالی کو (زوال قوت وشوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے، اس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو ابھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرایا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقت وروں نے زور قوت کے بل بوتے پر سلب کر رکھے تھے وہ ان کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کئے جائیں۔ تا کہ کمزور آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون وہامان اپنی اصلی حد پر آجائیں، ورنہ ختم ہو جائیں۔

اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت وقوت کا یہی مقصد ہے اور بلا شبہ یہی ہے نہ کہ فراعنۂ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جن کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گزری، تو پھر اسلام کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت واخلاق کے ساتھ دنیا میں لے کر آیا ہو؟

اس سے انکار نہیں کہ دنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ آزادی کے نعرہ کے بعد، حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اٹھائی۔

پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن ان کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں، جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے عین مطابق عملی اور اخلاقی پروگرام بھی سامنے رکھا ہے۔ اس لئے دعوائے آزادی میں اسی کو سچا مدعی کہا جائے گا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

آزادی ضمیر...... اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہوسکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیۃً چھٹکارا میسر ہو اور یہ اس

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۴، ۵، ۶.

کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل و دماغ اور ضمیر آزاد ہو، ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو۔ عقل و فہم اور شعور، ادراک آزاد ہوتا کہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے دوسرے کے دباؤ اور جبر و قہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عمل درآمد کرے وہ اسی کا عمل درآمد کہلائے۔ انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں۔ یہ آزاد ہے تو اس کی پوری دنیا آزاد ہے، ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اس کی پوری دنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اس کے عقل و فہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا، مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فعل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اسے بھی دلیل نبوت تو ٹھہرایا ہے۔ لیکن دلیل صداقت کو مسائل نہیں بنایا۔ کیوں کہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجت و برہان سے واضح ہوتی ہے۔ خوارق سے ظاہر نہیں ہو سکتی، بغیر حجت و دلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جیسے اکراہ و اجبار کہا جاتا ہے۔ جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کہ اس کے ردّ و قبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوٰۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔ نکاح و طلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے، بیع و شراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز۔ امن و جنگ کے یہ اوقات و مواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں اور دلیل یہ بیان کر کے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈنگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی بولیاں سمجھتا ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اس کی معنوی قوت ضروری کھل جائے گی، مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاء موتی اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آجائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گرادینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلا دلیل مسئلہ کو تسلیم کرلے۔ کیوں کہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق کے ظہور سے۔ خوارق سے پیغمبر کا منجانب اللہ ہونا تو ضرور واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آجائے بلکہ ان کا معقول اور موافق فطرت ہونا دلائل سے واضح ہوگا۔ معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔

آزادیٔ عقل و فہم...... پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا۔ اور عقلی بصیرت کو استدلال کی راہ سے گزر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا، جس سے عقل کی آزادی میں فرق آجاتا۔ دراں حال یہ کہ اسلام نے عقل کو آزادانہ سوچ بچار کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس لئے خوارق کو نبی کی نبوت کی دلیل تو کہا گیا۔ لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے انہیں دلیل نہیں ٹھہرایا گیا، بلکہ اس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادت ہی بہترین دلیل

بن سکتا تھا۔ حجت و برہان اور فراست و وجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تو لنے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قرطاس مستقیم ہے، چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی قوت یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے۔ خواہ اسے غیر معقول بھی جانتا ہو، بلکہ یہ بیان کیا گیا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ ۔ ① ”اور یہ (مومن بندے) ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل وفہم کے ساتھ) متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ماننے کے ساتھ ان کا سمجھ لینا بھی ساتھ ساتھ رہے“۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہہ دینے کا ارشاد ہوا کہ: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۖ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ② ”آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے، میں خدا کی طرف سے اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں۔ میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل مانے اور منوائے جاؤں)“۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل میں بردوسلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوانے کے لئے بجائے خرق عادت کے، نمرود سے استدلالی بحث و مناظرہ فرمایا جو حجت و برہان کی لائن تھی۔ کسی معجزہ سے اسے چپ کرانے کی سعی نہیں فرمائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصاء اور ید بیضا کے چمکتے ہوئے خوارق عادت نشان پیش کئے تاکہ ان کا پیغمبر ہونا واضح ہو جائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا۔ بلکہ فرعون سے مکالمہ حجت و برہان سے کیا جس کی تفاصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔ ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہزارہا معجزات دکھلائے ہیں۔ وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت و برہان اور عقلی وحسی طرق استدلال سے بھرپور ہے۔ بس آپ کو بوجہ خاتم النبیین ہونے کے طریق استدلال معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے خوارق سے نہیں۔ خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کو منوانا، ایک ایسا دباؤ ہوتا، جس سے عقل و خرد کی آزادی سلب ہو جاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا نہ دینا برابر ہو جاتا۔

پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا، بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اس کے ضمیر کو آزاد کیا، اس کی عقل کو آزاد کیا اس کے فہم کو آزاد کیا اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تخم بو دیا اور اسے مجسم آزادی بنا دیا۔ بہرحال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے۔ جس کے اوپر سے اس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔

آزادیٔ رائے...... آزادی ضمیر کے بعد مافی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیانتاً ضمیر ایک بات کو حق مان رہا ہے تو اسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرت کا کام تھا۔ ضمیر کی آواز دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں ابھاری جاتی بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچے دل سے ابھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کردے۔ اس کی تصدیق و تکذیب یا تصویب و تردید کا حجت کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے۔ لیکن اسے ابھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں، اگر رائے کو آزاد نہ کیا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔ حد ہے کہ عام انسانی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں، بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا، نہیں مشورہ و رائے ہے۔ عرض کیا: تو میں آزاد ہوں۔ (۱) یہ رائے مانوں نہ مانوں اور بالآخر نہیں مانی۔ ایک طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہے جو خاتم الانبیاء ہونے کے علاوہ اعقل الناس بھی ہیں۔ دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص العقل شمار کی گئی ہے۔ لیکن اسلام کی بخشی ہوئی آزادی رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کسی ادنیٰ دباؤ ڈالنے کی مجاز نہیں ٹھیرائی گئی۔

بہرحال اسلام کی آزاد فطرت نے انسان کی آزادی کے لئے سب سے پہلے اس کے باطن کو آزادی بخشی ہے، اس کی عقل اس کے ضمیر اور اس کی رائے کو آزاد رکھا ہے اور اس پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا، جو اس کے فطری ابھار اور تقاضوں کو پامال کردے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوت اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیر ہی کے رجحان اور اپنے ہی اندرونی دباؤ سے اسے واجب القبول نہ سمجھ لے۔ تو وہی اسلام اسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دباؤ، سونے چاندی اور زر و جواہر کی ڈھیریوں کے دباؤ تیر و تفنگ اور بم و گیس کے دباؤ کسی کی رسمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا اور برداشت کرسکتا ہے اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلوار کے زور سے کسی کے اندر اتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رسمی دباؤ سے اپنے اندر گھس آنے اور اتر پڑنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اس نے صاف اعلان کردیا ہے کہ: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (۲) ''دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے''۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ: ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۳) ''سو کیا

---

(۱) السنن لابن ماجه، كتاب الطلاق، باب خيار الامة اذا اعتقت، ج:۶، ص:۲۹۰. حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابن ماجه ج:۵ ص:۷۵ رقم:۲۰۷۵. (۲) پاره:۳، سورة البقرة، الآية:۲۵۶. (۳) پاره:۱۱، سورة يونس، الآية:۹۹.

آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں''۔

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے، وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کرے گا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرون انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا اور انسانی ضمیر، انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں ابھرنے اور ابھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔

ظاہری آزادی، باطنی آزادی کے تابع ہے...... ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرونی آزادی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر ضمیر آزاد ہے تو اس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے۔ بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حریت و آزادی اتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو، لفظی ترجمانی نہ ہو، جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرون نفس میں آتی ہے پھر اس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے قرآن حکیم نے سائنٹیفک (ٹھوس) حقیقت واشگاف فرمادی کہ: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَابِاَنْفُسِهِمْ. ﴾ ① ''واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے، جب تک وہ لوگ خود اپنے نفوس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدل دیتے''۔

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے، جب اندر آ چکتی ہے، باہر انقلاب جب ہی رونما ہوتا ہے جب اندر آ لیتا ہے، باہر غلامی اس وقت آتی ہے، جب نفوس کے اندر سرایت کر چکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی اس لیے اسلام نے باہر آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی۔ تاکہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے اور اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا مناد ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

باطنی آزادی...... پس باطن میں تو اسلام آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسویٰ سے آزاد ہو کر حق کا پابند ہو جائے۔ ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہرمانی سے آزاد ہو کر حق کی حکمرانی کے نیچے آ جائے۔ اگر یہ اختیارِ حق اور ردِ باطل ضمیر کا جوہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ماحصل ہے، تو ایسے ضمیر سے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستارانِ حق کا غلبہ ہو جائے گا اور پرستارانِ باطل کی شکست، صدیقوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہو جائیں گے۔

ذلیل قسم کی غلامی...... لیکن اگر حق سے آزاد ہو کر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آثار سے دل اور ضمیر شکست کھا چکا ہے، یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں۔ بلکہ بیرونی اثرات سے متاثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے۔ گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اس نوع کی آزادی باہر نمایاں

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۱۱.

ہوگی۔فرعون وہامان برسر اقتدار ہوں گے، صلحاء وصدیقین بے یار مددگار بن جائیں گے اور یہ آزادی یقیناً عالم کی آبادی نہ ہوگی بلکہ بربادی ہوگی۔جس کو احادیث صحیحہ میں علامات قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے اور جو اقوام عالم اور عالم کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جبریل علیہ السلام نے علامت قیامت دریافت کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ رِعَآءَ الشَّآءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ'' ① ''(قیامت اور عالم کی تباہی اس وقت قریب ہوگی جب) باندی اپنی مالکہ کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشت منزلی کی) اور سیاست مدن یعنی ملکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ) تم دیکھو کہ ننگ پیرے ننگ سرے (ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے چرواہے یعنی کمینے قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں''۔

یعنی کمینے برسر اقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرعاً جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں۔تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہوگا، مگر بنگاہ غور ذلیل قسم کی غلامی ہوگا، جو غلامی حق کی بجائے غلامی نفس کی دل دل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف ملتوں کو دھکیل دے گا۔ بہر حال اسلام کی نگاہ میں آزادی باطن کے معنی ضمیر کی آزادی، عقل وخرد اور فہم وفکر کی آزادی ہے۔جس سے انسان بذات خود اپنے ضمیر کی آواز اٹھانے میں جری اور بیباک ہو جائے اور آزادی ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت وقوت پیدا ہو جانا ہے۔ جو امر حق کے نافذ کرنے میں کسی پس وپیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لَوْمَةَ لَآئِمٍ کی پرواہ رہے نہ نُصْحِ نَاصِحٍ کی۔

صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے......اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا۔ بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔اسلام ظواہر ہی کو آزاد کرانے نہیں آیا بلکہ بواطن اور ضمائر کو بھی آزادی بخشنے کے لئے آیا ہے۔اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس وشیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت، پھر اس منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ حق کی غلامی کا دوسرا نام ہے۔

پس اس نظریہ پر جو حق کا غلام ہوا وہی آزاد ہوا اور جو اس سے آزاد ہوا وہی غلام ہوا۔اس سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شتر بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ حجت وبرہان سے پابند حق بن جانے کے ہیں۔

آزادی کا معیار......آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا ملک اگر آزاد ہو تو اس کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ اسی اصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوق خدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے۔اسے ضعیف کو قوی کرنے اور اس کے حقوق واپس دلانے اور زور آور ظالم کے پنجہ استبداد کو توڑ کر

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الایمان والاسلام والاحسان، ج: ۱، ص: ۸۶.

اس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سدراہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ غلام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں تو اپنے ذلیل نفس اور اس کی ہوا و ہوس کا غلام ہے اور ظاہر ہے یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزادی شدہ ملک کا ضمیر آزاد ہے اور اس کے عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے، تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت، رنگ، نسل، وطن، ہوسِ زر، ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ ملک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیرپا بناتی رہے گی۔

پس حقیقی آزادی وہی ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں، اس کے برعکس مقابلہ نہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کررہا ہو یا زبانی حقیقی آزادی کے ادعا میں رطب اللسان ہوں مگر دلوں میں اس کے برعکس جذبات کا طوفان بپا ہو۔ ﴿یُرْضُوْنَکُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰی قُلُوْبُهُمْ وَاَکْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ.﴾ ①

اسلامی آزادی کے آثار...... اسلام بھی جامع آزادی لے کر دنیا میں آیا اور جونہی اس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا وہیں پسماندہ ابھر پڑے، پست بلند ہوگئے اور بلند نیچے کی طرف آگئے، غلام اور آقا میں فرق نہ رہا، یتیم بے کسی کا لبادہ اتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آگیا۔ مظلوموں کی فریادیں عرش سے ٹکرانے لگیں، صنف نازک باندیوں سے حرہ (آزاد) ہوگئیں۔ بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنہیں سونے کے لئے فرش خاک بھی مشکل سے میسر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے اور جو خود ہل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے، وہ خادم خلق اللہ بن گئے۔ غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا وہ اونچ نیچ اور من و تو کے امتیاز کا انقلاب نہ تھا، بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من و تو کے قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیم یکسانی، مالی توازن، جاہی ہم رنگی، امیر غریب کے سنگم، اونچے اور نیچے کے ملاپ، آقا و غلام کی ہم آہنگی، شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا، جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سب مل کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو ان سب سے بالاتر ہے اور اس طرح ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کی بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد و قیوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزاد روشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کیساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کارفرما تھا، جو خود انسان کے نفس کی عظمت اصطلاحی خودداری سے نہیں ابھاری۔ بلکہ ہر ہر نفس کی مخفی

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۸۔

عظمت کو مٹا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامی نفس یا غلامی غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامی حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے، لیکن اس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور باہم بعید تر ہیں۔

''اسلام اور آزادی'' کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیّز ہو سکے۔

عروج وزوال

مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے، لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے، جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو۔ کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ و مال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب اوروں کے پاس بھی ہیں ہی، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

عروج وزوال کا معیار...... ہر قوم کی زندگی کا ایک معیار اور نصب العین ہوتا ہے جس سے اس کی ترقی وتنزل اور فناء وبقاء پہچانی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے بھی یہی راستہ زیادہ سہل اور مختصر ہے کہ اس کے بنیادی نصب العین کو سامنے رکھ لیا جائے۔ گردوپیش کے حالات، ہنگامی حوادث یا شخصی آراء معیار کا درجہ نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی قوم کے عروج وزوال کو پہچانا جائے۔ پس مسلم قوم کا نصب العین اس کی سیاسی تعلیمات اور ابتدائی قرون کے تعامل ہی سے سامنے آ سکتا ہے جو اس کے عروج کا دور ہے۔ جس حد تک امت اس کے مطابق ہو اسے قوم کی بقاء باور کیا جائے گا اور اس میں اس کی ترقی مضمر ہوگی اور جس حد تک وہ اس سے ہٹی ہوئی ہو، اسی کو اس کے لئے سبب تنزل قرار دے کر اس سے ہٹانے اور راستہ بدلنے کی سعی کی جائے گی اس میں اس کا تنزل مضمر ہوگا۔

جناب کا یہ احساس بالکل صحیح ہے کہ مسلم قوم دنیا کی محتاج رہ کر، ان کے سامنے سائل اور بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتی، چہ جائیکہ بڑھے اور پھلے پھولے۔ لیکن استغناء کے معنی یک سوئی انقطاعیت، گوشہ گیری اور علیحدگی پسندگی نہیں بالخصوص اس بین الاقوامی دور میں کہ یہ بھی موت کے مترادف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری اقوام سے مستغنی بھی ہوں، سائل اور بھکاری بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی اقوام کے جمگھٹوں میں کندھے سے کندھا ملا کر ان میں گھسے ہوئے بھی ہوں تو اس گھسنے کے کیا معنی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ سائل بن کر نہیں محسن بن کر

اور ایثار پیشہ بن کر گھسیں، جسے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو، کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ ومال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب کچھ اوروں کے پاس بھی ہیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں۔

معلم وامام اقوام...... اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں اور ان کے معلم اور امام بنیں۔ اس سے امت مسلمہ کے نصب العین اور وجۂ تشکیل کا خلاصہ مختصر لفظوں میں صلاح نفس کے ساتھ اصلاح عالم کی دعوت عام، اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء سنن انبیاء کے سوا دوسرا نہیں نکلتا۔ امت اسی راستہ سے آگے بڑھی اور اسی لائن سے دنیا کے خطے اس کے تابع فرمان ہوئے۔ اس لئے اس کی ترقی وتنزل اور عروج وپستی کے پہچاننے کا بھی یہی معیار ہو سکتا ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں خواہ دیانت و سیاست ہو یا تمدن ومعاشرت، بین الاقوامی تعلقات ہوں یا جنگ وصلح، امن ہو یا بدامنی، سرمایہ داری ہو یا ناداری، وہ اسے اختیار کئے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کئے ہوئے ہیں تو اس صورت میں نہ اس کا استغناء باقی رہ سکتا ہے، نہ احسان وایثار، جو ان کے وجود کی اصل بنیاد تھا اور اس طرح ان کی قومیت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

اب اگر مسلم قوم کا نظریہ محض کسی خطۂ زمین پر آرام وآسائش یا زیادہ سے زیادہ کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لینے کے ساتھ گذر بسر کر لینا ہے تو اس ملک کی مختلف اقوام کے ہجوم میں اس کا نتیجہ اس کے حق میں رشک، احساس کمتری، حرص وآز اور پھر اس سے قلبی بے چینی، اندرونی تشویشات، ماتم سرائی، اضطراب وگھبراہٹ اور پراگندہ خاطری کی صورت میں نمایاں ہوگا، جیسا کہ ہو رہا ہے اور وہ کبھی چین اور امن کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ اسی لئے اسلامی زندگی میں اس گذر بسر کے تصور کی کوئی خاص قدر وقیمت نہیں۔ جبکہ اس کے ساتھ وہ معیار جذبہ نہ ہو جس پر اس قوم کی بنیاد ہے اور جس کی خاطر دنیا میں اسے مبعوث کیا گیا تھا۔

قلبی تمکین...... ہاں اگر وہ ہے تو پھر ان مذکورہ خطرات کی بجائے قوم میں قلبی تمکین، اطمینان خاطر و دل جمعی اور استغناء اور تفوق (برتری) لازمی ہے اور اسی کے ہوتے ہوئے قوم کی امتیازی شان یا وجاہت، حیثیت عرفی اور اقوام کے قلوب میں اس کی ہیبت قائم رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسے بار بار دہرا چکی ہے۔

اندریں صورت اگر اس ملک میں دائیں بائیں بازو کے ساتھ ایک تیسری قوت مسلمان بھی ہیں تو انہیں اور ان کے تمام افکار ونظریات زندگی کو پہلے اسی معیار پر جانچنے کی ضرورت ہوگی۔ جس معیار کی رو سے وہ مسلمان کہلائے۔ اس لئے سوالات کی یہ نوعیت باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کے کس خطے میں مسلمانوں کی اخلاقی یا سماجی حالت کیسی ہے یا دوسری اقوام سے ان کے تعلقات کیسے ہیں اور ان کی سیاسی پالیسی کیا ہے؟ یا وہ نادار اور بے روزگار ہیں یا سرمایہ دار اور برسر کار؟

بلکہ سوال کی صحیح نوعیت یہ بنتی ہے کہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں، وہ اس قوم کے بنیادی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کر رہے ہیں تو ان کے دلوں میں ان کا بنیادی نصب العین کس طرح پیدا کیا جائے اور انہیں مختلف مصنوعی نصب العینوں سے ہٹا کر کس طرح اصلی اور حقیقی نصب العین کی طرف لایا جائے۔ غیر مسلموں کی نظر ہمارے حالات پر نہیں بلکہ کردار اور اخلاق اور قومی خصوصیات پر ہے جنہیں وہ تاریخ سے جانتے ہیں۔

عظیم تعمیری خدمت ...... میں سمجھتا ہوں کہ بہت حد تک موجودہ حالات اور کردار اور اخلاق کی گراوٹ، نیز منصب سے روگردانی ہی نے انہیں اسلام کی اور مسلمانوں کی طرف سے شکوک وشبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر کردار واخلاق معیار کے مطابق ہوتا اور اپنے منصبی فریضہ سے وہ غافل نہ ہوتے تو شکوک کی گنجائش نہ تھی۔ ہر شبہ کا جواب مسلمانوں کا کردار بن جاتا، جیسا کہ پہلے بنتا رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد وتنظیم کے بغیر ان کا مستقبل تاریک ہے، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہ اتحاد بھی تجربہ اور قرآنی شہادت کی رو سے محض رسمی تنظیموں سے نہ کبھی حاصل ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کی صورت بھی ایمان وعمل صالح اور بالخصوص دعوت الی اللہ ہی سے ہویدا (ظاہر) ہوتی ہے۔ جس حد تک ہماری مخلصانہ توجہ اغیار کی طرف ہوگی اور ہم اسلامی حلقوں کی توسیع کی طرف متوجہ رہیں گے، اس حد تک طبعی طور پر باہمی خلفشار سے بچے رہیں گے۔ اگر جناب ان سوالات پر بھی خود بھی غور فرما کر یا ملک کے اہل فضل وکمال سے ان کے جوابات طلب فرما کر ان کے حل کی طرف متوجہ ہو جائیں گے تو یہ یقیناً قوم کے امتیاز وتفوق اور اس کے کردار کی بلندی کی ایک عظیم تعمیری اور بنیادی خدمت ہوگی۔

سوالات گرامی دیکھ کر جہاں ان سے استفادہ کی توفیق ہوئی، وہیں یہ چند سوالات بھی ذہن میں ابھر آئے۔ گو طالب علمانہ ہیں مگر پھر بھی پیش کر دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مسلمانوں کی ہمہ جہتی تربیت میں خواہ وہ سیاسی اور اقتصادی ہو یا مذہبی، اگر یہ معیار پیش نظر رہے تو امید ہے کہ ان کی حالت بدل جائے گی اور ان میں حوصلہ مندی پیدا ہو جائے گی۔

والسلام

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۳/ ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

تیونس و مراکش کی جدّ وجہد آزادی

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو، یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے، اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

احوال واقعی...... بزرگانِ محترم! ہم یہاں انسانی تاریخ کے ایک اہم مرحلے پر ایک بڑے مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں، میں خداوند برتر وتوانا کا اور اس کے بعد آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقعہ پر صدارت کی عزت سے سرفراز فرمایا اور یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے دو قوموں کی آزادی کے معاملہ میں وکالت کا فرض انجام دوں۔

حق خود ارادیت...... زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہمارے میدان، ہمارے کھلیان، ہمارے گاؤں کے چوپال اور بڑے بڑے شہروں کے ہال اس نعرہ سے گونج رہے تھے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج جبکہ ہمارا ملک آزاد ہے اور اس کی آزادی کے ۶ سال گذر چکے ہیں تو ہم ایک قدم آگے بڑھ کر اس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگیں قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔

آزادی کی حمایت...... حضرات! ہم یہاں ملک کی مشہور اور مؤقر جماعت جمعیت علماء ہند کی ہدایت پر تیونس اور مراکش کی آزادی کی حمایت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ملک کے قومی اور مذہبی رہنماؤں

نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ لگایا تھا۔ آخر کار غلامی کی فوجوں نے ہندوستان چھوڑ دیا اور انگریزوں کو ہندوستان سے بوریا بستر باندھنا پڑا۔ آج ہم اس شہر میں فرانس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تیونس اور الجزائر کو چھوڑ دے اور یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ نعرہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ کامیاب ہوا۔

تیونس کی صورت حال...... محترم حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ میں تیونس اور مراکش کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے پیش کر دوں، تیونس ۴۸ ہزار مربع میل کا اسلامی علاقہ ہے جو شمالی افریقہ میں بحر روم کے کنارے اٹلی اور فرانس کے سواحل کے سامنے واقع ہے۔

یہاں آخری مردم شماری کے مطابق ۲۶ لاکھ انسان آباد ہیں۔ اب یہ آبادی اندازاً ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں ایک لاکھ آٹھ ہزار فرانسیسی موجود ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں۔ یہاں برائے نام ایک سلطان موجود رہتے ہیں مگر اصل راج فرانسیسی شہنشاہیت کا ہے۔ پچاس سال کا عرصہ ہوگیا کہ غیر ملکی طاقتیں تیونس کے معاملہ میں بے جا اور ظالمانہ طور پر دست اندازی کر رہی ہیں۔ تیونس کی جنگ آزادی نئی دستور پارٹی کی رہنمائی میں لڑی جارہی ہے مجھے اس تحریک کے اسیر رہنما جناب حبیب بورقیبہ سے گذشتہ سال اسی شہر بمبئی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جب کہ انہوں نے خلافت ہاؤس کے ایک نمائندہ اجتماع میں اپنے مطالبات آزادی کی شرح فرمائی اور مجھے ان کی تائید میں تقریر کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ اس مختصر تقریر میں انہیں یقین دلایا گیا کہ ہندوستان کا آزادی پسند طبقہ اور بالخصوص مذہبی حلقہ آپ کے مطالبات کی تائید میں ہے۔ آج ایک سال کے بعد اسی وعدے کو دہرانے کا پھر موقع مل رہا ہے، آپ کے شہر میں تیونس امدادی کمیٹی موجود ہے۔ جس کا اعلان آپ تین چار روز پہلے اخباروں میں دیکھ چکے ہیں جوان نعروں اور وعدوں کا عملی ثبوت ہے۔

مراکش کا مسئلہ...... تیونس سے زیادہ مراکش کا مسئلہ بین الاقوامی ہنگامۂ آزادی کا سبب بنا ہوا ہے۔ مراکش شمالی افریقہ میں مغرب اقصٰی کا ملک ہے۔ یہ ملک عرض البلد شمالی کے (۲۸) اور (۳۶) درجے کے درمیان اور طول البلد غربی کے (۳) اور (۱۴) درجے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحر روم اور آبنائے جبل الطارق، مغرب میں اٹلانٹک سمندر، جنوب میں صحرائے اعظم اور شمال مشرق میں کوہستان واقع ہے، اس کا رقبہ ۵ لاکھ ۸۱ ہزار کلومیٹر مربع میل ہے۔

مراکش کو فرنگی اقوام نے جو بد قسمتی سے اس وقت جمہوریت کے نام پر دنیا کی ٹھیکیدار بنی ہوئی ہیں۔ تین حصوں میں تقسیم کر کے اس کی سالمیت، طاقت اور صلاحیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ایک حصہ فرانسیسی مراکش ہے جو فرانس کی غلامی میں ہے۔ اس حصہ کا دار السلطنت فیض ہے اور اس کی آبادی ۸۴ لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ دوسرا حصہ اسپینی مراکش ہے جو اسپین کی غلامی میں ہے، جس کا پایۂ حکومت رباط ہے اور اس کی آبادی ۱۱ لاکھ ہے۔

تیسرا حصہ سفید فام بین الاقوامی غلامی کے ماتحت ہے جس پر انگریز، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، امریکی، ڈچ

اور بیلجیم شہنشاہیت پسند طاقتیں حکومت کرتی ہیں۔ اس کا دار الخلافہ طنجہ ہے اور اس کی آبادی دس ہزار ہے، ایک عام اندازے کے مطابق مراکش کی آزادی کا مسئلہ کم یا زیادہ ایک کروڑ انسانوں کی آزادی کا مسئلہ ہے۔

دو نئی سلطنتیں...... پس آج شمالی افریقہ کے نقشہ پر اسلامی دنیا کی سرحدوں کے اندر دو نئی سلطنتیں ابھر رہی ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق اب دونوں قوموں کی آزادی ایشیا کی طاقت میں ایک نیا اضافہ کرے گی اور ان دونوں ملکوں کی آزادی سے دنیا کے امن کو ایک نئی ضمانت مل سکے گی۔

اس نقشے کے پیش نظر ہم آج یہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ آزادی کا وہ نعرہ جو ساری دنیا میں گونج رہا ہے، تیونس اور مراکش کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔

ہم دنیا کی رائے عامہ کے ساتھ مل کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فرانسیسی شہنشاہیت کو تیونس، الجزائر اور مراکش سے دستبردار ہونا چاہئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح برطانیہ ہندوستان اور پاکستان سے، امریکہ فلپائن سے، اٹلی طرابلس اور حبش سے اور ہالینڈ انڈونیشیا سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

مطالبات اور تائید...... ہمارا یہ مطالبہ اس لئے ہے کہ:

1 ...... تیونس کی نئی دستوری پارٹی اور مراکش کی استقلال پارٹی دونوں ملکوں کے عوام کی طرف سے آزادی کا مطالبہ کر چکی ہیں اور یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

2 ...... اقوام متحدہ کے چارٹر کے ماتحت تیونس اور مراکش کی آزادی، آزاد دنیا کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے اور اقوام متحدہ کی اسمبلی میں دو نئے ملکوں کے داخلہ سے خود اقوام متحدہ کی ساکھ بڑھے گی اور شکوک و شبہات کم ہو جائیں گے جن سے دنیا کے امن کو خطرہ درپیش ہے۔

3 ...... عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتیں تیونس اور مراکش کی آزادی کے لئے اقوام متحدہ کی راجد ہانی (دار الحکومت) میں سرگرم کار ہیں اور ان طاقتوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو سلامتی کونسل میں دونوں ملکوں کی آزادی کا مقدمہ پیش کر دیا ہے۔ ان ملکوں کے ساتھ آزاد ہندوستان بھی شامل ہے، نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہے۔ اس لئے یہ ہماری قومی پالیسی کا بھی تقاضا ہے کہ ہم ان دونوں ملکوں کے جہاد آزادی میں پوری پوری حمایت کریں۔

4 ...... ۶ ستمبر کے اجلاس میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اقوام متحدہ میں عرب ملکوں کے نمائندوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے شروع ہونے والے اجلاس میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ پرزور طریقہ پر پیش کریں اور اپنے دوست ممالک سے اس مسئلہ میں کمک حاصل کریں۔

فرانس کا دیوالیہ پن...... سیاسی واقعات کے اس صاف وصریح نقشے کو سامنے رکھ کر ہمیں ایک تجویز کی صورت میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

جمہوریت اور آزادی کے اس دور میں جبکہ ابھی ماضی قریب میں پچاس کروڑ انسان (جو دنیا کی آبادی کا

پانچواں حصہ ہیں) اپنی آزادی کے مالک بن چکے ہیں۔ فرانس کا ایک کروڑ انسانوں کا غلام بنائے جانے پر اصرار کرنا اس کے سیاسی دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہے، جسے آج کل کے دور میں آزاد قوموں کی منظوری نہیں ہوسکتی۔ اندریں حالات ہندوستانی عوام اوران کی حکومت جنہوں نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اور آج مصر اور فلسطین کی آزادی کی حمایت میں ہمنوائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ تیونس اور مراکش کے مطالبۂ آزادی کی تائید و حمایت سے بھی کسی طرح چشم پوشی اور سکوت نہیں کر سکتے۔

آج دنیا میں امن، انصاف، حق خود ارادیت، مساوات اور انسانیت کے الفاظ سب سے زیادہ یورپ کی آبادیوں کے زبان زد ہیں۔ اگر ان کے یہاں ان الفاظ کے کچھ معنی ہیں اور حقیقتاً یہ الفاظ مہمل اور بے معنی بنا کر استعمال نہیں کئے جا رہے ہیں، تو فرانس، اٹلی، بلجیم، اسپین، انگلستان، امریکہ اور تمام ان یورپین طاقتوں سے جو تیونس اور مراکش پر اپنا پنجۂ استبداد (قبضہ) جمائے ہوئے مطمئن بیٹھے ہیں۔ ہم یہ اپیل کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انسانیت پروری کے دعویدارو! اے امن وانصاف کے ٹھیکیدارو! اور اے خود ارادیت اور انسانی حقوق کے علمبردارو! تمہیں تیونس اور مراکش کی آبادیوں کو غلام بنائے رکھنے پر آخر کیوں اصرار ہے؟

اگر تمہیں حقیقی امن وانصاف اور انسانیت کی لاج نہیں تو کم از کم اپنے ان لفظی دعوؤں ہی کی پاسداری کرو اور ایک کروڑ انسانوں کے ایک ایسے جائز مطالبہ کی راہ میں حائل نہ ہو، جن کی کمک پر پوری جمہوریت پسند دنیا کھڑی ہوئی ہے۔

مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن...... حضرات! مجھے چوں کہ ہندوستان میں بلکہ ایشیا کے سب سے بڑی مذہبی اور علمی مرکز دارالعلوم دیوبند سے ذمہ دارانہ تعلق ہے اور اسی کے ایک ذمہ دار اور خادم کی حیثیت سے میں نے اسلامی اخوت کا حوالہ دے کر تیونسی لیڈر جناب حبیب بورقیبہ کو یقین دلایا تھا کہ اس مطالبہ میں ہندوستان کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔ اس لئے بے موقعہ ہوگا اگر میں اس اہم ترین مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن واضح کئے بغیر اس افتتاحیہ کو ختم کردوں۔ جبکہ کسی بھی ایسے اجتماعی یا سیاسی مسئلہ میں جس میں مسلمان بالاستقلال یا دوسری اقوام کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں، اسلام نے ہمیں تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ صاف، واضح اور روشن ہدایات دی ہیں۔ جہاں تک کسی قوم کی آزادی اور ظالم قوموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس کا سب سے بڑا حامی ہے۔ فرعون سے بنی اسرائیل کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبۂ آزادی اس بارے میں ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔ اسرائیلوں کو مصر کی فرعونی حکومت نے غلام بنا رکھا تھا۔ انہیں اچھوت بنادیا گیا تھا، اقتصادی حالت ان کی زبوں (بدتر) تھی۔ اوپر سے انہیں پارٹیوں میں منقسم کردیا گیا تھا تاکہ ان کی سالمیت اور اجتماعی صلاحیت ختم ہوجائے۔ اس کا نرینہ اولادوں پر کنٹرول تھا اور پیدا ہوتے ہیں تہ تیغ کردیا جاتا تھا تاکہ آئندہ بھی ان میں کوئی اولوالعزم سپوت پروان نہ چڑھنے پائے، جو اپنی قوم کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر ابھر جائے اور اس غلام قوم میں کوئی صحیح لیڈر شپ قائم نہ ہوجائے۔ جو ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائے، لیکن غاصب قوم کی اپنی سفاکیوں اور چالاکیوں کے اندھیریوں

میں بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مقدس ہستی اسرائیلیوں میں پیدا ہوئی اور ابھری جسے فرعون جیسے قاتل بنی اسرائیل کے دربار میں شاہانہ طریق پر بلوایا گیا۔ اور آخر انہوں نے قوم کی اس بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر فرعونی دربار میں اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ فرعون نے اپنے کچھ سابقہ احسانات پر رورش جتا کر اور نعمتوں کے تذکرہ سے مطالبۂ آزادی کو ٹلانا اور رلانا چاہا۔ جس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

''ہاں میری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے شاید یہی ہوگی کہ تو نے میری قوم کے لاکھوں افراد کو غلام بنا رکھا ہے'' پھر اس نے دھمکیوں سے مطالبہ آزادی کو دبانا چاہا جو ظالم قوموں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے اور کہا: ''اے موسیٰ! میں تجھے جیل بھیج دوں گا''۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''اگر چہ میں روشن دلیلیں بھی اپنے مطالبات کے جواب میں پیش کر دوں یعنی جیل اور قید وبند کی دھمکیوں سے ایک مدلل دعویٰ کا جواب تھوڑا ہی ہو سکتا ہے؟''

ان غلط حیلہ جوئیوں سے کوئی اثر نہ لیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واضح لفظوں میں فرعون کے سامنے یہ مطالبۂ آزادی رکھ دیا ہے کہ میں بحکم خداوندی کہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ کر دے اور ان کو غلامی کا عذاب دینے سے دست کش ہو جا۔ درصورت خلاف ورزی فرمایا کہ: ورنہ پھر اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی اور حق وصداقت کے مطالبات جھٹلانے کا وبال جھٹلانے والے ہی کو بھگتنا ہوگا۔

اس واقعہ میں خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو مطالبۂ آزادی دے کر بھیجنے سے واضح ہے کہ مظلوم قوموں کا مطالبۂ آزادی ایک مذہبی حق ہے جس کو خدا کی طرف سے تائید ہی حاصل نہیں، بلکہ اس کا حکم اور امر شامل ہے جو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ ایسے مطالبات کو لے کر اٹھنے والا درحقیقت ایک مذہبی تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔ پھر جہاں تک کسی دبے ہوئے وطن اور سرزمین کو ظالموں کے ناجائز قبضہ سے نکالنے اور حق دار کو قبضہ دلانے کا تعلق ہے۔ اسی واقعہ میں اس کی بھی صاف وصریح ہدایت ملتی ہے۔

استخلاص وطن کی جدوجہد سے انکار پر عتاب الٰہی...... سرزمین فلسطین پر عمالقہ نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا اور بنی اسرائیل کو جن کی وہ سرزمین تھی، اس سے محروم کر دیا تھا۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسرائیلیوں کو حکم بھیجا کہ فلسطین کی سرزمین تمہارا حق ہے، اس میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرو اور عمالقہ کی غاصب اور جابر قوم کا قبضہ وہاں سے اٹھا دو۔ بنی اسرائیل نے عمالقہ کے تن وتوش اور ظاہری قوت سے مرعوب ہو کر تعمیل حکم میں پس وپیش کیا اور غاصب قوم کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر اپنے وطن میں داخل ہونے سے انکار کر دیا کہ جب تک یہ جابر قوم ہمارے وطن کو خود نہ چھوڑ دے گی ہم اس میں داخل نہ ہوں گے۔ ﴿قَالُوا يٰمُوسٰى إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوا مِنْهَا﴾ ①

---

① پارہ: ٦، سورة المائدة، الآية: ٢٢.

قوم کو سمجھایا گیا کہ خدا سے ڈرو، اس پر بھروسہ کرو، وعدہ ہے کہ جب تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تم ہی کو دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی بنی اسرائیل جی چرا گئے اور استخلاص وطن کے لئے جدوجہد کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر انہیں خدا کی طرف سے سزا دی گئی۔ ایک تو یہ غلبہ وقبضہ چالیس برس مؤخر ہو گیا۔

اور دوسرے ۴۰ سال کی اس لمبی مدت میں بنی اسرائیل وادئ تیہ میں بھٹکتے پھرے، گویا سزا کے طور پر گھر سے بے گھر بھی رہے اور معتوب الٰہی بھی ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ظالم قوموں سے اپنی سرزمین کا چھڑانا ایک ایسا مذہبی فریضہ ہے کہ اس میں پس وپیش یا انکار کرنے سے اقوام معتوب خداوندی ٹھہر جاتی ہیں اور انہیں مزید تباہیوں اور ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس مقصد کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔

آزادی، مذہبی اور انسانی حق...... پس! آج تیونس اور مراکش کے باشندے اگر فرانس سے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے ان سے اپنی سرزمین چھڑانا چاہتے ہیں اور اپنے ملک پر خود اپنا قبضہ چاہتے ہیں تو یہ ان کا شرعی اور مذہبی حق ہے جس کو انہیں بہر صورت حاصل ہی کرنا چاہئے۔ اور اگر ہم یا دنیائے اسلام کے تمام باشندے خواہ وہ عرب لیگ کے ممبر ہوں یا عرب ممالک کے سرکاری نمائندے اس مطالبۂ آزادی کی حمایت میں فرنچ حکومت اور یورپین اقوام کے غاصبانہ اقتدار کے مقابلہ میں کھڑے ہوں تو ان کا یہ فعل نہ صرف بین الاقوامی قانون، آزاد ممالک اور جمہوریت پسند اقوام کی متفقہ خواہشات کے مطابق ہے، بلکہ مذہبی اصول اور اسلامی قانون کے منشاء کے بھی عین مطابق بلکہ اس کے امر وحکم کے تحت ایک شرعی فریضہ ہے۔

بہر حال تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی یہ حمایت خود ان ملکوں کی ذمہ دار عوامی جماعتوں، اقوام متحدہ کے چارٹر، عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتوں، عرب لیگ کمیٹی کی تجویز، ہندوستان کی جمہوریت پسند پالیسی اور بالآخر مذہب کی صاف وصریح ہدایت کے تحت نہ صرف واجبی بلکہ واجب اور انسانیت کے حقوق کی صحیح حفاظت ہے۔

جہاد آزادی میں شرکت...... ہم جمعیت علماء ہند کے شکر گزار ہیں کہ اس نے عین وقت پر اس ملک کے لوگوں کو، مساوات کا شور برپا کرنے والوں کو کہا، اگر تم واقعی ان الفاظ سے دنیا کو دھوکا نہیں دے رہے ہو ان کا قومی اور مذہبی فریضہ یاد دلایا۔ ہم ان تمام جماعتوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس عظیم مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں اور آئندہ کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہمیں اس کام کو قانونی پوزیشن کی حد تک اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی اور اپنی قومی پالیسی کی رہنمائی میں جاری رکھنا چاہئے اور بمبئی کے اس نمائندہ اجلاس میں ایک مکمل اور جامع تجویز سلامتی کونسل میں بھیج کر شمالی افریقہ کے اس جہاد آزادی میں اپنی شرکت کا واضح یقین دلا دینا چاہئے۔ نیز مجھے امید ہے کہ ذمہ داران اجلاس اس موقع پر اپنی سیاسی اور مذہبی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس بارہ میں ہندی عوام کے نقطۂ نظر سے تیونس اور مراکش کے تمام باشندوں کو بھی باخبر کر دینے کا خوشگوار فریضہ ادا کریں گے۔ (وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ)

آئینہ خدمت جمعیت علماء ہند

پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی راہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں۔ البتہ اس تضاد اور کشمکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے، جوان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی وسعت قلب ونظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حَکَم کے ہو جو سب کے قضیئے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہو سکتی ہے جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جارہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے۔ مذہب اور بالخصوص ''دین فطرت'' (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء وقیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِ يْرًا ، وَّدَ اعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

شکریۂ اکابر...... زرگان ملت واعیان امّت! اس مقدس جلسہ کی صدارت کا یقیناً میں اہل نہ تھا۔ پھر بزرگان اور اکابر شیوخ کی موجودگی نے تو میری ذات ہی کو درجۂ صفر میں پہنچا دیا ہے، اس صورت میں کسی نام نہاد اہلیت کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جرات نہیں ہوتی کہ اس مقام پر کھڑا ہوں چہ جائیکہ کچھ عرض ومعروض کروں۔ ساتھ ہی اس مقام کی ذمہ داریاں اور وہ بھی بحالات موجودہ جن وسیع معلومات اور جس ہمہ گیر فکر و تجربہ کی متقاضی ہیں وہ اپنے اندر مفقود ہیں۔ اس لئے رہی سہی ہمت بھی جواب دے دیتی ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ جن بزرگوں نے بنام صدارت یہ عزت افزائی فرمائی ہے وہی اس کی سرپرستی بھی فرمار ہے ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہونے کی جرأت کی اور اکابر واعیان کے شکریہ کے بعد ذیل کی چند معروضات پیش کرنے کی ہمت ہوئی۔

نظریاتی فتن کا دور...... حضرات محترم! آج کے حالات جن سے ہم گذر رہے ہیں نہایت پیچیدہ اور نازک ہیں، سطح پر سکون ہے مگر سطح کے نیچے آب زیر کا مضمون ہے۔ اوپر سے سبزہ زار ہے مگر اندر خارزار، اگر کوئی تخملین سبزہ

زار میں گھس جاتا ہے تو نیچے کے چبھتے ہوئے خارا سے زخمی کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ خصوصیت سے مسلمانوں کا معاشرہ چند در چند فتن میں گھرا ہوا ہے شریعت نے دین کے بارے ہمیں خبر دی تھی کہ دور فتن میں دین کا سنبھالنا ہاتھ میں چنگاری سنبھالنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن آج دنیا کا تھامنا دین تھامنے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔ کشمکشوں اور مصادمتوں کا دور دورہ ہے۔ قوم میں باہم جماعتی کش مکش علیحدہ ہے قومی رجحانات اور ہیں اور سرکاری کچھ اور، کچھ ان دونوں لائنوں سے الگ ہوکر دونوں کے مدمقابل ہیں، افراد و جماعت ہی میں کش مکش نہیں بلکہ نظریات بھی باہم دست وگریباں ہیں۔ ان کشمکشوں میں مسلمان ؎

''دوگونہ رنج و عذاب است جان مجنون را''

کا مصداق ہے اور اس کی ہدف ہونے کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ: ؎

ہر بلائے کز آسماں آید ۔۔۔ بر زمین نارسیدہ می پرسد

خانۂ انوری کجا باشد؟

یعنی مسلم آزار اغیار کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر مسلم آزاروں کی فہرست تیار کی جانے لگے تو اغیار کے ساتھ مسلمان بھی اس میں نظر آئیں گے۔

متضاد عناصر کی ہمہ گیر راہنمائی...... ظاہر ہے کہ پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی رہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں، البتہ اس تضاد اور کش مکش کے میدان میں وہ جماعت آگے آسکتی ہے جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو، اس کی وسعت قلب ونظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہوکر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو، سب کے قضیے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہوسکتی ہے، جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جارہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے، مذہب اور بالخصوص ''دین فطرت'' (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء وقیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہوجاتی ہیں۔

اس ہندوستان کی سرزمین میں اگر حضرت سلطان الہند خواجہ اجمیری، نور ہند خواجہ کلیری، قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ہر قرن کے علمائے ربانی ومشائخ حقانی قدس اللہ اسرارہُم، نے ہر پارٹی ہر فرقہ اور ہر فریق کو آخر اپنی وسعتوں میں گم کرکے رکھ دیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ پارٹی سسٹم کا ثمرہ نہ تھا بلکہ پارٹی فیلنگ (سوچ) سے بالاتری کا کرشمہ تھا۔ آج بھی اگر مسلم اقوام کی صحیح رہنمائی ہوسکتی ہے تو خواہ وہ کسی لائن پر ہو، انہیں اعیان امت کے اس ہمہ گیر رنگ اور انہی کے سچے جانشینوں کے اسوہ پر کارآمد اور موثر ہوسکتی ہے۔

جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت...... جمعیت علماء اپنی اصل فطرت سے ایک خالص مذہبی

جماعت ہے۔ گو اس نے ۱۹۴۷ء سے قبل سیاسی خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا۔ قربانیوں کا لگا تار سلسلہ صفحۂ تاریخ پر ثبت کیا اور آزادی کے میدان جنگ میں نہ صرف یہی کہ کسی سے پیچھے نہیں رہی بلکہ سب سے آگے ہو کر کام کیا۔ لیکن پھر بھی اس کی بنیاد مذہب تھی اور مذہب ہی کے معیار سے اس نے یہ کچھ کیا۔ وقتی ضرورت ختم ہو جانے پر بالآخر اس نے پھر اسی اصل کی طرف رجوع کیا جو اس کی اصل سرشت تھی یعنی مذہب اور مذہبی رجحانات۔

جمعیت علماء نے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سیاست سے علیحدگی کا جو نظریہ قائم کیا وہ یقیناً قومی تعمیر کے لحاظ سے موزوں ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔ نہ اس لئے کہ سیاست کوئی شجر ممنوعہ تھی یا وہ اسکے حق میں عدم جواز کے تحت میں آگئی تھی، بلکہ عام سیاسی مصالح کے علاوہ اس لئے کہ انقلاب کے بعد کسی قوم کو بنانے والے طبقہ کے لئے سیاسی الجھنوں سے یکسو ہونا ہی طبعاً ضروری ہوتا ہے اور وہ سیاسی اتار چڑھاؤ میں گھر کر تعمیری کاموں کے لئے وقت نہیں دے سکتا۔

قومی تعمیر کی دفعات...... قومی تعمیر کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام کو جو اپنی جزوی تفصیلات کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سمیٹ کر ذیل کے عنوانات کے تحت میں لا سکتے ہیں:

نظام تعلیم، نظام تبلیغ، اصلاح معاشرہ اور مذہبی و تمدنی حقوق کا سیاسی تحفظ۔ قومی تعمیر کی ان دفعات میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے جس سے کسی قوم کا دل و دماغ بنایا جاتا ہے۔ تمام کامیابیاں اور ہر نوع کی عزت و سربلندی کا ابتدائی زینہ علم ہے، حق تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کا سلسلہ اسی علم کی نظر و اشاعت کے لیے قائم فرمایا۔ اسلام میں سب سے پہلی آیت ہی "اقـــرأ" نازل ہوئی جس کا حاصل پڑھنے پر ابھارنا ہے۔ اسلام سے قبل کا قریبی دور گو ساری ہی بشری خرابیوں پر مشتمل تھا مگر اسے "دور جاہلیت" کا نام دے کر یہ بتلایا گیا کہ ہمہ نوع شرور و آفات کا سرچشمہ جہل اور ہمہ نوع کمال و خوبی کا سرمنشا علم ہے، اس لئے دینی تقاضوں کے اعتبار سے سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔

سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی مستقبل کا تحفظ...... وقت کے لحاظ سے یہ بھی مسئلہ مسلمانوں بلکہ ہر مذہبی فرقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ توجہ طلب ہے، کیوں کہ جبری تعلیم کے قوانین کے تحت جو نصاب حکومت نے تیار کیا ہے اس سے سیکولرازم کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا عام رخ بلکہ اس کے بہت سے اجزاء اسلام کے عقائد و اعمال پر براہ راست ایک مستقل زد ہیں۔ جس سے ایک مسلمان بچہ کا عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مسلمان باقی رہنا دشوار ہے۔ اس لئے بتقاضائے وقت بھی اس کی شدید کی ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی کفالت قومی طور پر کی جائے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی اکابر امت اور نبض شناسان قوم کی یہی اعلیٰ ترین سیاست تھی کہ وہ جا بجا دینی مدارس قائم کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے سنبھال لیا۔ یہ مدارس آج بھی بحمد اللہ کامیابی کے ساتھ جاری اور اپنے کام میں مشغول ہیں اور ان میں سے کتنے ہی مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسے دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہانپور، مدرسہ شاہی مراد آباد وغیرہ، ان مدارس کا مقصد جامع علماء تیار کرنا ہے، جو قوم کی ہدایت ور ہنمائی کے فرائض انجام دیں۔ لیکن موجودہ دور اور اس کے حالات کے لحاظ سے ان مدارس کے علاوہ ایسے مکاتب کی بھی اشد ضرورت پیش آگئی ہے جو مختلف پراگندہ بلکہ گندہ لٹریچروں کے زہریلے اثرات سے مسلمان بچوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ اگر مدارس دینیہ علماء تیار کریں تو یہ مکاتب دینیہ پڑھے لکھے دین دار تیار کرسکیں جو گو عالم نہ ہوں مگر دین کی سمجھ رکھتے ہوں۔

نصاب تعلیم اور ذریعۂ تعلیم...... جمعیت نے ان ہی مقاصد کی روشنی میں کافی عرق ریزی سے ایک جامع نصاب تیار کرلیا ہے جو بتدریج ملک میں اپنی جگہ کرتا جارہا ہے۔ اگر ہندوستان کے مختلف صوبے جمعیت کے ساتھ اس بارے میں تعاون کریں اور اس کے پروگرام کے مطابق یہ نصاب رائج کرنے پر تل جائیں تو بہت حد تک اس زہر کو نکالا جاسکتا ہے۔ جو ان غیر معتدل نصابوں یا مروجہ بلیک تعلیم (اندھی تعلیم) کے ذریعہ دل ودماغ میں پیوست کیا جارہا ہے۔

اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعۂ تعلیم اردو کے سوا دوسرا نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ اسکا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اردو ایک ہلکی اور شریں زبان ہونے کے علاوہ یہاں کی مادری زبان بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سے علوم وفنون کی خزینہ دار بھی بن چکی ہے، اس کا تحفظ علوم وفنون کا تحفظ ہے جو بہر حال مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی کی رکھی اور تفہیم اردو کی، اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی، بلکہ دنیائے اسلام کے ہزار ہا افراد ان مدارس کی بدولت اردو دان ہوگئے اور آج افغانستان، ایران چینی ترکستان، روسی ترکستان، حجاز، افریقہ، عراق، جاوا، ساٹرا وغیرہ دور دراز ممالک بھی اردو زبان سے بے گانے اور بے تعلق نہیں۔ اور اس لئے جتنے ادارے آج اردو کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں ہمیں ان سب کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ پچھلے دونوں انجمن ترقی اردو نے تحفظ اردو کے سلسلے میں جو کامیاب مہم شروع کی، جمعیت علماء اور مدارس دینیہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور تا بحد مقدور اس میں تعاون سے کام لیا جس کے اچھے آثار نمایاں ہوچکے ہیں۔

ذوق عربیت کی اہمیت...... مجھے اس سلسلہ میں ادھر بھی توجہ دلانا ہے کہ جیسے اردو ہماری وطنی اور علمی زبان ہونے کی حیثیت سے اس ملک میں اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ عربی زبان کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

یہ قرآن وحدیث کی زبان ہے جو ہمارے دین و مذہب کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس حد تک مذہب میں فنائیت کا مقام رکھتے ہیں، اسی حد تک وہ اس مذہبی زبان سے نابلد اور بے پرواہ بھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن اور اس کے محاورات سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی، جو بہت حد تک ان کے دینی ذوق کے لئے حجاب اور کتاب وسنّت سے بے تعلقی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اگر اقوام وملل اور دنیا کے ممالک میں ربط باہمی کا ذریعہ زبان کے سوا دوسرا نہیں تو کتاب وسنّت کے لگاؤ اور ربط پیدا کرنے کا ذریعہ بھی عربی زبان کے سوائے دوسرا نہیں۔

ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمان بچوں میں رائج کیا جائے جو انہیں عربیت سے بے گانہ نہ رکھے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس ضرورت کو مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی سابق پارلیمنٹری سیکرٹری نے پورا کر دیا ان کے عربی نصاب کا پانچ کتب پر مشتمل سیٹ عربی کی ایک قابل قدر پنج گنج ہے جس سے بچوں میں بہت آسانی کے ساتھ قلیل مدت میں قرنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھی اس اردو نصاب کے ساتھ جو جمعیت علماء نے مرتب کیا ہے مکاتب کا جزو بنا دیا جائے اور آگے بڑھایا جائے تو یہ اہم ضرورت پوری ہو سکتی ہے، جو کتاب وسنّت ہی کی حد تک نافع ثابت نہیں ہوگی بلکہ دنیائے اسلام کے باہمی رابطہ کے لئے بھی مؤثر اور کارآمد ثابت ہوگی۔

تربیت عوام...... لیکن تعلیم پھر بھی تربیت خواص کا ذریعہ ہے اس سے تذکیر عوام کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس کا ذریعہ تبلیغ ہے۔ بشرطیکہ وہ جماعتی خصوصیات کی نہ ہو کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور مسائل پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خالص اسلامی مسائل کی نشر واشاعت اور الاہم فالاہم کے قاعدے سے جس قسم کی ضرورتیں پیش آئیں انہی کے مناسب حال شریعت کے مسائل سے دماغوں کو روشنی بخشی جائے۔

جمعیت علماء اس فرض سے بھی غافل نہیں رہی اس کی رپورٹوں میں تبلیغی خدمات کا بھی ایک ذخیرہ موجود ہے۔ فی الحال ایسے مبلغ تیار کئے جانے کی ضرورت ہے جو جھگڑالو نہ ہوں، ضدی نہ ہوں، سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ مسائل کو سلجھا کر دماغوں میں سلجھاؤ پیدا کر دیں۔ آج جبکہ پرچار اور تبلیغ کے نام پر بہت سے پراگندہ خیالات اور غیر اسلامی چیزیں آرہی ہیں، اشد ضرورت ہے کہ صحیح مسائل کو پیش کر کے دلوں کو تشتت و پرگندگی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

اصلاح معاشرت...... آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ عامۂ مسلمانوں کی معاشرت غیر اسلامی ہوتی جارہی ہے۔ ان کا رہن سہن چال چلن رفتار گفتار وغیرہ غیر اقوام کے نمونہ کا ہوتا جارہا ہے۔ روحانی آداب کے بجائے جذبات نفسانی دل و دماغ پر چھاتے جارہے ہیں۔ شادی غمی کے اجتماعات اور خانگی زندگی میں غیر اسلامی رسوم اور منکرات بطور جزء زندگی کے داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بغیر مسلم قوم کا صحیح کیریکٹر اور مقام متخص (خاص) نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

اور وہ محض وعظ و پند یا لٹریچر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہر ہر مقام پر برادریوں میں سے بااثر لوگوں کو چن کر ان کی عملی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ برادری کے بڑوں کی اصلاح پر زور صرف کیا جائے اور پھر ان کے ذریعہ اس اثر کو پھیلایا جائے جس میں عملی مشقت اور جدوجہد کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جمعیت علماء قیامِ مکاتب اور تبلیغی نظام کے سلسلہ میں یہ خدمت باحسن اسلوب انجام دے سکتی ہے۔ پس قیام مکاتب اور تنظیمی مساعی کے وقت اس اصلاحی تنظیم کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہ سہولت کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ اصلاحی کام خود اتنا وسیع اور اہم ہے کہ جو طبقہ بھی اس کام میں ہمہ تن لگ جائے گا، اسے دوسرے میدانوں میں کودنے کا وقت نہیں مل سکتا۔

بنابریں ان امور کے لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔ قومی کاموں کے سینکڑوں شعبے ہیں اگر کارکنوں کا ایک ہی طبقہ سارے کاموں کو سنبھالنے کی فکر میں لگ جائے تو کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے تقسیم عمل کے اصول پر کارکنوں کی جماعت کو بانٹ دیا جانا ضروری ہے۔

جمعیت علماء ان تعمیری خدمات میں لگ کر یقیناً سیاسی میدانوں میں پہلے کی طرح نہیں اتر سکتی، لیکن اس کے معنی کلی یکسوئی کے بھی نہیں۔ اگر جمعیت علماء مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اور عام اجتماعی خدمت کے لئے کمربستہ ہوگی تو لامحالہ مثبت پہلو کے ساتھ اسے منفی پہلو بھی سامنے رکھنے ہوں گے اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حقوق پر کس راستہ سے زد پڑ رہی ہے؟ اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے؟ اگر قانون ان حقوق پر اثر انداز ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا اور اسے اپنی پوری آئینی جدوجہد سے بدلنے کی سعی کرنا بھی اسی کا کام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس منفی پہلو کی روک تھام کے لئے اسے سیاست اور سیاسی رفتار سے کلی علیحدگی کئے بغیر، اس پر گہری اور تنقیدی نظر بھی رکھنی پڑے گی اور ساتھ ہی سیاسی حلقوں سے کچھ نہ کچھ قریب بھی رہنا ہوگا۔ اس لئے جمعیت علماء کے سیاست سے کلی علیحدگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاسی میدان سے اس حد تک تعلق اس کے ۱۹۴۷ء کے اعلان علیحدگی سیاست کا مخالف نہیں، کیوں کہ سیاست سے اس کا اتنا تعلق کسی عام عملی جدوجہد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جہاں تک پارلیمنٹری سیاست کا تعلق ہے جس سے جماعتی علیحدگی کا اعلان ۴۷ء میں کیا گیا ہے وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ گذارش کئے بغیر نہ رہوں گا کہ خاص افراد کو چھوڑ کر کم از کم جمعیت کے عام عہدیداران اور اس نظریہ میں عملی ہم آہنگی قائم رہنی ضروری ہے۔ ورنہ یہ صورت حال غلط اور صحیح ہر قسم کے الزامات کا منشاء بنتی رہے گی۔

جو جماعتیں خالص سیاسی یا دفاعی لائنوں پر کام کرنا چاہتی ہیں، ہمارے لئے ان سے الجھنے کا کوئی موقعہ نہیں۔ تعمیری کام کتنے بھی ضروری ہوں، دفاعی ضرورتوں سے خالی نہیں رہ سکتے۔ بالخصوص جبکہ دور ہی کشاکشی اور کش مکش کا ہو۔ تقسیم عمل کے اصول پر اگر کوئی جماعت اپنے اندرونی دواعی اور سچے ارادوں سے ایسی کوئی لائن اختیار کرتی ہے تو اس کے مسائل پر ہمیں جانچ اور تنقید کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن خود اس کمیونٹی یا جماعت کو رد کر دینے کا کوئی موقع نہیں۔ اگر وہ آئین کے دائرے میں اپنے کام کے لئے کوئی وجہ جواز رکھتی ہو تو کلمہ خیر کہہ دینے کا بھی مضائقہ نہیں۔

جمعیت کا منتہائے نظر...... جمعیت علماء اپنے نام و رسم کے اعتبار سے اہل علم کی جماعت ہے، جس کا منتہائے نظر مذہب اور دین ہے۔ اس لئے وہ صرف اپنے ہی حلقہ کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام کارکن جماعتوں کے لئے ایک مفتی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لیے اس کا اخلاقی ہی نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی آئینی ربط بھی ملک کے ذی رائے طبقہ اور مسلمانوں کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے قائم رہنا مناسب ہوگا۔ تاکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کی مذہبی ضروریات اور ان کی مواقع و مشکلات خود ان ہی حلقوں کی زبانی براہ راست جمعیت علماء کے سامنے آتی رہیں اور ادھر

جماعتی مسائل میں جمعیت کو بھی ہر طبقے سے فکری مدد ملتی رہے۔ اس سلسلہ میں اگر جمعیت کے انتخابات کی صورتیں امکانی حد تک رسمیات سے آزاد ہو کر سادہ اور بے تکلف رہیں تو ان میں ہمہ گیری بھی بڑھ جائے گی۔ خود اس عوام کی کشش میں بھی اضافہ ہوگا اور کسی طبقہ کو بھی عقیدت سے اس کی طرف رجوع کرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار...... ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء کے ذمہ دار کارکنوں نے مسلمانوں کے پرسنل اور مخصوص معاملات کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں نہ وہ نظر انداز کی جاسکتی ہے اور نہ ہی صفحہ عالم سے مٹ سکتی ہیں۔ ایسے معاملات کا سلسلہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک برابر قائم رہے گا جب تک کہ حالات کلیۃً سازگار نہ ہو جائیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی حجاج اور زائرین حرم کے پاسپورٹ کے ساتھ انکم ٹیکس کے فارم کی خانہ پری کی قید بھی ہے جو اس سال سے لگائی جارہی ہے۔ یہ مختلف وجوہ سے حجاج کے لئے پریشانیوں کا باعث ہوگی اور اس کا اثر زائرین کی تعداد اور حج کے ابھرتے ہوئے ذوق وشوق پر بھی پڑسکتا ہے۔

امید ہے کہ جمعیت علماء اس بارے میں پوری توجہ سے کام لیتے ہوئے حج کے پاسپورٹ سے اس قید کو اٹھا دیئے جانے کی پوری پوری جدوجہد کرے گی۔

بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ...... اس سلسلہ میں ایک مسئلہ مسلمانوں کی بے کاری اور بے روزگاری کا بھی ہے جو ان کے لئے باعث تشویش و پریشانی بنا ہوا ہے۔ اس میں الجھ کر کبھی ان میں ترک وطن کے وساوس ابھرنے لگتے ہیں۔ کبھی آئندہ نسلوں کے بارے میں پریشان کن خیالات انہیں ستاتے ہیں اور یوں بھی بے کاری بہت سے فتنوں کی آبیاری (افزائش) کی جڑ ہوتی ہے۔ برسرکار اور باروزگار ہو جانے سے خود ہی بہت سے مفاسد کا سد باب ہو جاتا ہے۔ جمعیت علماء اس کی کوئی ذمہ داری تو نہیں لے سکتی۔ لیکن اگر زیر غور مسائل میں یہ مسئلہ بھی سامنے رکھ لیا جائے تو قوم کے اغنیاء یا حکومت کے ذریعہ غرباء کی بیکاری کا مسئلہ حل کرنے کی کیا کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اس مسئلہ میں مسلمانوں کو تسلی دلائی جاسکے اور ان کے اطمینان خاطر کا کم از کم استدلالی سامان ہی فراہم کیا جاسکے۔

قیام مکاتب اور اصلاح معاشرت کی مساعی کے سلسلہ میں اگر یہ مسئلہ سامنے رہے تو ہر جگہ کے اغنیاء اور غرباء کے ارتباط (رابطہ) سے اس مشکل کے آسان ہونے کی صورتیں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوں گی۔

جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت ...... بہر حال جمعیت علماء کی سابقہ بیش قیمت خدمات کے ساتھ آج بھی اگر اس کے تعمیری پروگرام اور کام کو سامنے لایا جائے تو اس کی وسعتیں سابق سے کم نہیں ہوئیں۔ یہ کہنا کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا کہ اگر جمعیت علماء نے سیاسیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دیا، تو اب اس کے کشکول میں کچھ باقی نہ رہا اور اس کی کائنات ختم ہوگئی اگر اس کی سیاسیات حقیقۃً مذہب کے ماتحت اور بلاشبہ تھیں تو یہ کہا جاسکتا

ہے کہ پہلے بھی وہ مذہب ہی کا کام کر رہی تھی اور آج بھی مذہب ہی اس کے سامنے ہے۔ ضرورت ختم ہو جانے یا بدل جانے پر کام کی نوعیت میں فرق پڑتا ہے، اصل موضوع و مقصد میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اور اس لئے آج بھی اس کے نصب العین کا دامن پہلے ہی کی طرح بھرپور ہے اور اس لئے جس طرح ۴۷ء سے پہلے اس کے نظام میں شامل ہونے کی ضرورت تھی، اسی طرح آج بھی ہے۔

بالخصوص اس کے تعلیمی پروگرام کو عملاً جاری کرنے اور پھیلانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان جمعیت علماء کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور پوری امنگ اور حوصلہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کے پلیٹ فارم پر مسلمان اپنے تمام دینی، معاشرتی، تمدنی اور دوسرے تمام جماعتی مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک شاندار تاریخ ہے جو سب کے سامنے ہے، کل کی طرح آج بھی اس سے بے اعتماد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے نئی نئی جماعتیں بنانے کی بجائے یہی زیادہ بہتر ہے کہ اس بنی ہوئی جماعت سے کام لیا جائے۔ اس کے نظام کو مضبوط بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نظام سے وابستہ ہو کر اسے کامیاب بنایا جائے۔

رائیوں کے تفاوت اور اختلاف خیال سے نہ کوئی ادارہ خالی رہ سکتا ہے نہ کوئی جماعت۔ لیکن یہ کسی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مخل نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ کام کرنے کا عزم ہو اور نیت صادق ہو، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ جمعیت علماء کے مقاصد مسلمانوں کی کسی خاص جماعت یا خاص پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتے، اس لئے تمام مسلمان اس ارادہ کو بلا تفریق خیال و مشرب اپنا سکتے ہیں۔

سرمایۂ جمعیت...... جمعیت علماء اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتی ہے۔ اس کے نظریات ہندوستان کے ان چیدہ علماء کے ذہنوں کا سرمایہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی کامیاب خدمت اور تربیت کی ہے۔ اس لئے اس کے نظریات کی حد تک بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کسی بھی نظریہ کو مان کر مسلمانوں کو پچھتانا نہیں پڑا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے نظریات اور ہمارے اعتماد و تعاون میں کوئی خلیج حائل نہیں ہو یا ہم اس کی تنظیم میں شامل ہونے سے کوئی جھجک محسوس کریں، اگر رکاوٹ کی کوئی وجہ بھی سامنے ہو تو اس کے دفعیہ کا طریق بھی اعتراض یا دور بیٹھ کر کچھ کہنے سننے کی بجائے یہی زیادہ مفید ہو سکتا ہے کہ یگانگت کے ساتھ قریب ہو کر اس کی اصلاح کی جائے۔

جو چیزیں اس وقت عرض کی گئیں وہ نئی نہیں ہیں، پہلے بھی بارہا کہی جا چکی ہیں اور ان کا بہت سا حصہ خود جمعیت علماء کے پروگرام میں پہلے ہی سے شامل ہے۔ مقصد صرف تذکیر و تجدید اور آپ سے طلب عمل ہے، کسی آئین و اصول کی خوبی کھلنے کا راستہ صرف عمل ہے، اگر عمل نہ ہو تو قرآنی اور قطعی اصول بھی اپنی جگہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں، نافع ثابت نہیں ہو سکتے۔

حالات کا تقاضا ہے کہ جزوی آراء و قیاسات کے اختلافات کو یک قلم ترک کر کے راہ عمل پر قدم بڑھائے

جائیں، بلکہ اب اس کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ جمعیت علماء لوگوں کو بلانے اور کام میں لگنے کی بار بار اپیل کرے بلکہ لوگ ازخود اپنی خدمات پیش کر کے اس کا ہاتھ بٹائیں، اگر بالفرض کارکنان جمعیت کے عمل میں کوتاہی اور فروگذاشت بھی ہے جس سے کوئی فرد اور کوئی جماعت بری نہیں، تو وہ بھی آپ حضرات کے مستعد ہو جانے اور عمل کا مطالبہ کرنے پر رفع ہو جائے گی جس سے اعتراض کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

بزرگان جمعیت علماء کی یہ صدارت بخشی اپنے ایک کمر بستہ خادم کی محض حوصلہ افزائی ہے، ورنہ اس مجمع اکابر واعیان کے سامنے ایک ناکارہ و نااہل کا کرسی صدارت ہی نہیں بلکہ اس صف کی کسی کرسی پر آبیٹھنا بھی جرأت و بے ادبی ہے۔ میں اس بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے ان سطور کو ختم کرتا ہوں اور ''جمعیت علماء زندہ باد'' کہتا ہوں۔

نصاب تعلیم کی تدوین

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور تھا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا۔ جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھا گیا۔ آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو میں بطور خلاصہ ان الا سکتا ہوں کہ ''مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں'' ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

عربی و فارسی نصاب تعلیم کے متعلق اسمبلی ہال لکھنؤ میں حضرت اقدس حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی معرکۃ الآرا تقریر

پس منظر...... حکومت ہند نے مدارس عربیہ کی تنظیم اور ترمیم و اصلاح نصاب تعلیم علوم مشرقیہ کے متعلق جو قدم اٹھایا ہے وہ یقیناً قابل تحسین اور لائق تشکر و امتنان ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے ۷ ربیع الاول ۶۶ھ کو ایک مفصل مکتوب عالی جناب حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب وزیر تعلیمات انٹریم گورنمنٹ ہند کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا جس میں دارالعلوم دیوبند کی سند فراغ اور سند تکمیل کو معتبر اور موثر قرار دیئے جانے کے متعلق موصوف کو خصوصی توجہ دلائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آج اگر فضلائے دارالعلوم اپنی معاشی ضروریات کے ماتحت حکومت کے کسی محکمہ میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو وہ خواہ کتنی ہی بہترین استعداد رکھتے ہوں، انہیں مولوی فاضل یا اسی کے مساوی کوئی سرکاری امتحان پاس کئے بغیر سرکاری ملازمت کا موقع میسر نہیں آتا۔ حالاں کہ دارالعلوم کے فضلاء علمی قابلیت کے اعتبار سے ہر حیثیت سے یونیورسٹیوں کے رسمی ڈگری یافتہ لوگوں سے لائق و فائق ہوتے ہیں، اگرچہ دارالعلوم کی تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمتوں کا حصول نہیں ہے، مگر جو لوگ ضروریات سے مجبور ہو کر اس کے خواہش مند ہوتے ہیں ان کے حقوق مولوی فاضل، بی اے، ایم اے کے مساوی اور سند تکمیل کو ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مساوی تسلیم کئے جانے میں حکومت کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ دارالعلوم ہر حالت میں اپنے نظام تعلیم، امور انتظامی اور حکومت کی امداد سے جس طرح اب تک بے تعلق اور آزاد رہا ہے یہی پالیسی اس ادارہ کی مستقبل میں بھی بدستور رہے گی۔

حضرت مہتمم صاحب کے اس مفصل مکتوب کے جواب میں مولانا آزاد صاحب کی جانب سے جواب موصول ہوا کہ میں خود اس بارے میں جناب والا سے ملاقات اور مفصل گفتگو کرنا چاہتا تھا، چوں کہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اسمبلی ہال لکھنؤ میں عربی وفارسی نصاب تعلیم کے متعلق ایک سرکاری تعلیمی کمیٹی کے زیر سرکردگی ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوگی۔ جس میں دارالعلوم کے نمائندے بھی شریک ہوں گے، اسی میں جناب والا سے بھی اس معاملہ میں تبادلہ خیال ہوگا۔ براہ کرم اس موقع پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔

چنانچہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اس تعلیمی کانفرنس میں دارالعلوم کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مفتی دارالعلوم اوردیوبند شریک کانفرنس ہوئے۔ ان حضرات کی معیت میں مولانا فخرالحسن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب مدرسین دارالعلوم، مولانا عزیز احمد صاحب مبلغ دارالعلوم اور احقر خلیق احمد صدیقی مدیر ماہنامہ دارالعلوم، مبلغ وناظم شعبہ صنعت وحرفت دارالعلوم بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ یوپی کے مختلف مشرقی تعلیمی اداروں کے نمائندوں سے اسمبلی ہال بھرا ہوا تھا۔ حکومت یوپی کے وزیر اعظم اور دیگر متعدد وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹری صاحبان بھی شریک کانفرنس تھے، ٹھیک تین بجے سہ پہر صدر کانفرنس مولانا آزاد صاحب نے ایک مبسوط (جامع) تقریر صدارت تقریباً پونے دو گھنٹہ فرمائی جس میں تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کے علمی تفوق اور اس کے تنزل کی کیفیت بیان فرماتے ہوئے مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر سخت تنقید فرمائی، اور بتلایا کہ اس طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے سے عاری اور یکسر خالی ہیں۔ جنہیں بہت جلد پورا کردینے کی ضرورت ہے، طریق تعلیم املا ہونا چاہئے۔ کتاب کی پابندی ایک فضول اور مضر چیز ہے۔ جس سے علم چند سطروں میں سمٹ کررہ جاتا ہے۔ نظر وفکر اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہونا مفقود ہوچکا ہے۔ مولانا کی اس تنقید سے بعض حضرات علماء پر گرانی کا اثر ہوا اور وہ ایک حد تک بجا تھا لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ختم تقریر پر خود مولانا آزاد صاحب نے بھی اس کو محسوس فرمایا کہ موصوف اس تنقید میں حدود سے ایک حد تک تجاوز فرما گئے ہیں۔

اور انہوں نے فرمایا کہ: مجھے ابھی اور بھی کچھ کہنا تھا اور پھر آپ حضرات کی آراء سے مستفید ہونا تھا لیکن چونکہ وقت پورا ہوچکا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ کانفرنس کا ایک دوسرا اجلاس کل ۲۳ فروری کو ڈیڑھ بجے سہ پہر سے اور رکھ لیا جائے۔ چناں چہ دوسرے روز ٹھیک ڈیڑھ بجے سہ پہر کو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم اور دوسرے حضرات علماء کرام، اسمبلی ہال میں وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ تقریباً پونے دو بجے مولانا آزاد صاحب نے تقریر صدارت کا سلسلہ شروع فرمایا جس میں نصاب تعلیم کے مسئلے کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آج علم کو محض علم کے لئے جو طبقہ پڑھتا ہے جس کی غرض علم سے کسب معاش نہیں ہے، بلکہ صرف علم اور علمی کمال پیدا کرنا ہے۔ وہ صرف یہ قومی مذہبی آزاد مدارس ہیں۔ جو دینیات کی تعلیم انتہائی استغناء اور لاغرضانہ

طریق پردے رہے ہیں۔جن میں خصوصیت سے دارالعلوم دیوبند ایک اعلیٰ ترین مرکزی درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔جس نے گزشتہ اسی (۸۰) سال میں نہایت شاندار علمی خدمات انجام دی ہیں،اس مرکزی علمی ادارے نے مشرق ومغرب میں اپنے علمی آثار پھیلائے اور افغانستان، بخارا، بلخ، جاوا، ساٹرا، عرب، ترکستان، وغیرہ تک اس کے فضلاء پھیل گئے جنہوں نے اسلام کی سچی اور حقیقی خدمت انجام دی۔

میرے پاس اس بارے میں ایک جچی تلی تحریر بھی پہنچی ہے جس میں یہی دکھ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان فضلائے دارالعلوم کوان کی اعلیٰ ترین قابلیت کے باوجود آخر وہ مقام کیوں نہیں دیا جاتا جس کے وہ اہل اور مستحق ہیں (یہ اشارہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے اس خط کی طرف تھا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) یہ خود میرے دل کی آواز ہے۔مگر ضرورت اسکی ہے کہ وہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے آگے بڑھیں اوران کی تعلیمی زندگی میں کچھ خفیف سا تغیر ہو۔ان کے نصاب تعلیم میں وقت کے تقاضوں کو کچھ پورا کیا جائے۔زیادہ نہیں بہت تھوڑا سا تغیر کافی ہوگا۔ نصاب کی اصلاح،طریق تعلیم میں قدرے تغیراور تعلیمی رنگ کی ذراسی تبدیلیاں۔بہرحال اس طرح مولانا آزاد صاحب نے آج کی تقریر میں دردمندانہ انداز میں علمائے کرام سے اپیل کی کہ وہ اصلاح نصاب تعلیم کے مسئلہ پر غور کریں اور پہلے دن کی تقریر میں جوشدت آگئی تھی اس کی کافی حد تک تلافی فرمادی۔مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے بعد متصلاً ہی خان بہادر مولوی مہدی حسن صاحب شیعی مدارس عربیہ لکھنؤ کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کے لئے باجازت صاحب صدر کھڑے ہوئے اورانہوں نے تحریری یادداشت سامنے رکھ کر مولانا آزاد کی حرف بحرف تائید کی۔صرف انگریزی زبان کی تعلیم پر بحیثیت زبان ثانوی مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں داخل کئے جانے کی مخالفت کی۔اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (جوتمام علماء دیوبند، علمائے مظاہر العلوم سہانپور اور مرادآباد کی طرف سے اس بارے میں اظہار خیال کے لئے نمائندہ بنائے گئے تھے) اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور صدر محترم مولانا آزاد سے تقریر کی اجازت چاہی۔

صاحب صدر نے نہایت خوش دلی اور آرزومندانہ انداز کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب کوتقریر کی اجازت دی۔چونکہ ابتداء میں آواز کسی قدر دھیمی تھی جسے صاحب صدر نہیں سن سکے۔اس لئے صاحب صدر نے فرمایا کہ جناب! میرے پاس اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور یہاں سے تقریر فرمائیے۔چناں چہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اسٹیج پر مولانا آزاد کی کرسی کے قریب کھڑے ہوکر اپنے مخصوص خداداد دلنشیں انداز میں نہایت فصیح و بلیغ جامع مانع تقریرفرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

خلاصۂ تقریر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ علیہ...... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (اس کانفرنس میں صرف اسی تقریر کی خصوصیت تھی کہ وہ اللہ کے نام سے شروع کی گئی) صدر محترم ومعزز حاضرین! تعلیمی کمیٹی کا یہ عملی اقدام جوعظیم الشان کانفرنس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے اور کانفرنس میں صدر گرامی قدر کے

ارشادات جو کل سے اب تک آپ نے سنے ہیں، ایک نہایت ہی مبارک اقدام اور تعلیمی سلسلہ میں مستحسن قدم ہے۔

صحیح تعلیم کے اسباب و عوامل...... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی قوم کی برتری اور ترقی اس کی بقاء نہیں بلکہ اس کا قیام جس بنیاد پر استوار ہے، وہ صرف صحیح تعلیم ہے۔ صحیح تعلیم سے میری غرض یہ ہے کہ نصاب تعلیم موزوں ہو، طریق تعلیم موثر ہو، ذریعۂ تعلیم فطری ہو، اساتذہ کا انتخاب صحیح ہو، نظام تعلیم درست ہو۔ اگر کسی قوم میں تعلیم ہی نہ ہو تو یہ ایک بنیادی روگ ہے جس سے کوئی قوم پنپ نہیں سکتی، نصاب تعلیم اگر غلط ہو تو ذہن کا سانچہ درست نہیں ہوسکتا، طریقۂ تعلیم غلط ہو تو تعلیم کا پورا اثر نہیں ہوسکتا۔

استاذ قابل نہ ہو تو قابلیت کا دروازہ ہی نہیں کھل سکتا۔ سب کچھ ہو اور نظام تعلیم درست نہ ہو تو نتائج متوقع نہیں نکل سکتے۔ غرض تعلیم کی صحت کے لئے ان اجزاء کا ہونا از بس ضروری اور یہ تعلیم کے حق میں بنیادی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو ان سب بنیادوں کی ایک اور گہری بنیاد ہے کہ اس کی صحت و سقم پر ان سب امور کی صحت و سقم موقوف ہے اور وہ ہے ''تعلیم کا نصب العین اور مقصد'' اس نصب العین کی خوبی و خرابی سے ان بنیادوں میں خوبی و خرابی پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ نصب العین تعلیمی اداروں اور ان اداروں سے فیض حاصل کرنے والوں کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے۔ اسی نصب العین کے لحاظ سے اس ادارہ کے کمال و نقصان کا فیصلہ کیا جائے۔

نصب العین کی اہمیت...... نصب العین کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثلاً گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری تعلیم گاہوں کا نصب العین ملازمت قرار دیا تا کہ اس تعلیم کے ذریعے سستے کلرک اور محرر یا دفتری کارکن تیار کر لئے جائیں۔ یقیناً حکومت برطانیہ کا نصب العین انسانیت کی خدمت یا دیانتداری اور حق و صداقت کی خدمات نہ تھا، اس لئے ہم سرکاری اداروں کو اسی کے نصب العین کے ماتحت پرکھ سکتے ہیں۔

ہمیں سرکاری اداروں سے نکلے ہوئے لوگوں کو اس معیار پر جانچنا ہی نہ چاہئے کہ وہ کس قدر سچے اور کتنے بہی خواہ ملک وقوم ہیں۔ پس خود اپنے مقرر کردہ معیار سے گورنمنٹ اور اس کے ادارے کامیاب رہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے معیار سے ان کو جانچیں۔ ہاں ہمیں اعتراض کا حق اس سرکاری نصب العین پر ہوسکتا ہے نہ کہ اس کے پروردہ افراد پر کہ وہ تو اپنے معیار پر کامیاب ہیں۔

اس کے بالمقابل قومی اداروں اور دینی درس گاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم سے نہ روٹی، نہ کرسی بلکہ تہذیب نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو انسانیت کے سچے خدمت گزار ہوں، اور عالم بشریت کی بہی خواہی میں اپنی جان، مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ان افراد کی کامیابی اور ناکامی اور ان اداروں کے کمال و نقصان کو اسی معیار اور نصب العین سے جانچنا ہوگا جس کو لے کر یہ ادارے کھڑے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کو سرکاری معیار سے جانچیں اور پھر ان کی تنقیص کریں۔

قومی اور سرکاری اداروں کا نقطۂ اشتراک...... قومی اداروں کے فضلاء اور حکومت کے تعلیمی اداروں یا عام

سرکاری محکموں میں آئندہ باہمی ربط کیا رہے گا؟

اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ آج ایک تیز رفتار انقلابی ہوا چل رہی ہے اور اقتدار بدل رہا ہے۔ موجودہ حکومت قومی حکومت سے تشکیل پا رہی ہے۔ سو اس کے تعلیمی اداروں کا نصب العین اگر وہی ہوگا جو بدیسی حکومت کا تھا کہ چند کلرک، چند سرکاری مشین کے کل پرزے حکومت کی دفتری مشین کے لئے تیار ہو جائیں تو مدارس کے طلبہ کا جو رویہ سابق حکومت کے ساتھ رہا ہے وہی اس حکومت کے ساتھ بھی رہے گا۔ لیکن اگر موجودہ گورنمنٹ کا نصب العین تعلیمی دفتری کارکن تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے ذہن وطبیعت کے لوگ تیار کرنا ہے جو حقیقی انسانیت سے آراستہ ہو کر انسانیت کے سچے خادم ہوں، آشتی ومسالمت اور پریم وصلح کے خوگرہ (عادی) کر ملک کو آسمان ترقی پر پہنچا دینے کے جذبات رکھیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصب العین ان قومی مدارس کے قریب آ جائے گا اور یہ ایک نقطہ سنگھم کا پیدا ہو جائے گا۔ تعاون کے لئے قرب ضروری ہے اور قرب اس اشترا کی (مشترک) نقطہ پر ممکن ہوگا۔ اس لئے میرے خیال میں دینی عربی مدارس کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں نصب العین کو تبدیل کیا جائے۔ یہی ایک مشترک نقطہ ہے جو سرکاریت اور قومیت کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے۔ اس صورت میں قومی مدارس کو اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ وہ کسی سرکاری ڈگری یا امداد کی طرف جھکیں بلکہ شاید خود گورنمنٹ کو اس کی حاجت ہوگی کہ وہ وہاں کے فضلاء کی خریدار بن جائے اور ان کی تلاش میں رہے۔ سو اس صورت میں دینی مدارس ہر اخلاقی امداد کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی آزادی کو برقرار رکھ کر وہ جیسے ہمیشہ سے آزاد رہے ہیں اب بھی ان کی تعلیم اور نظام تعلیم دونوں آزاد رہیں گے۔ یہ ان کی آزادی کا ہی کرشمہ ہے کہ جب حضرت مولانا آزاد نے آزادی سے انہیں اور ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ اگر وہ آزاد نہ ہوتے تو قابل ستائش بھی نہ ہوتے اور جو آزاد نہیں انہیں یہ مقام حاصل بھی نہیں۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ...... اب رہا مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ سو مجھے اس اصول سے انکار نہیں اور نہ کسی کو ہو سکتا ہے۔ کہ جن تعلیمات کا وحی الٰہی سے تعلق ہے اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں نہ ہمیں حق ہے۔ باقی جو فنون یا کتابیں قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں وہ زمانہ اور احوال کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، اس دور میں تصوف کا زور رہا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو بطور خلاصہ ان الفاظ میں لا سکتا ہوں کہ

مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں...... ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔ پس تبدیلی نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کر دیں۔ نہ وحی کی کتابیں اور مسائل بدلے جا سکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کا حق ہے۔ اس لئے وقت

کے تقاضوں کے ماتحت یہ تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی سدلتی رہی ہیں اور برابر بدلتی رہیں گی۔ خود درس نظامی کی تدوین ہی تبدیلی نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے، کیوں کہ بہرحال یہ نصاب قرن اول کا نہیں ہے۔ وقت کے تقاضوں سے بنایا گیا ہے۔ جب اس کے آغاز کے وقت تغیر وتبدل ممکن تھا تو آج بھی ممکن ہے مگر ان ہی حدود کے ماتحت جو عرض کی گئیں۔ نصاب کا مسئلہ بہرحال علماء میں زیر غور ہے اور وقتاً فوقتاً اس نصاب میں بہت سے تغیرات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ میں نے خود ۱۳۵۸ھ میں سفر افغانستان سے واپسی پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اس سلسلہ میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی جس میں تبدیلی نصاب کے متعلق اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔

بہرحال نصاب تعلیم میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ذمہ دار علماء اسے از خود ہی کریں۔ جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں ہاں جو کچھ بھی ہو وہ اپنی بصیرت سے تغیر کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام سرکاری اداروں کے لئے قابل تقلید ہونا چاہئے، جس سے وہ قومی مدارس کے قریب لائے جا سکتے ہیں۔

نصاب کا تغیر وتبدل ہر دور میں ہوتا آیا ہے جو اس امر کی مستقل دلیل ہے علماء میں فکر ونظر کو ہر زمانہ میں اہمیت حاصل رہی ہے اور ہر دور میں مفکر ومبصر علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنہوں نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ قرون اولیٰ، قرون متوسط، اور قرون اخیرہ میں اہل فکر ونظر کی امّت میں کمی نہیں رہی اور نہ ہو سکتی ہے کیوں کہ خود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''مَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَایُدْرٰی اَوَّلُہٗ خَیْرٌ اَمْ اٰخِرُہٗ۔'' ① جس سے واضح ہے کہ اہل نظر کسی خاص قرن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خلف میں سلف کے ہمرنگ ارباب نظر پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح صاحب شریعت (فداہ ابی وامی) نے ارشاد فرمایا: ''یَحْمِلُ ھٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُہٗ یَنْفُوْنَ عَنْہُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاوِیْلَ الْجَاھِلِیْنَ۔'' ② اسی طرح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَّنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔'' ③ اور دین کا حاصل جبکہ ایمان عقائد، اسلام واحکام، تزکیہ اخلاق اور اعلائے کلمۃ اللہ تو ناممکن ہے یہ مجدد اس سے ناآشنا ہوں یا ان کے زیر تجدید تربیت یافتہ مفکر نہ بنیں، اس لئے بہرحال فکر ونظر کا دروازہ ہر آن کھلا رہے گا۔ مگر ہاں اپنی ہی بساط اور اپنی ہی استعداد کے مطابق ہم حدود سے گزرے ہوئے فکر کو فکر ونظر نہیں بلکہ تو ہم کہیں گے۔

بہرنوع بنیادی چیز نصب العین ہے۔ اس سے ادارے بنتے ہیں اور اس کے بگڑ جانے سے بگڑ جاتے ہیں۔ اس نصب العین کے ماتحت پھر دو بنیادی چیزیں ہیں جن کی تفاصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے۔

---

① مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ، ج:۷، ص:۴۹۵، رقم: ۳۳۸۱۔ بزار کے طریق سے یہ روایت حسن ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب ماجاء فی فضل الامۃ ج:۴ ص:۳۵۶۔

② السنن الکبریٰ للبیھقی، ج:۱۰ ص:۲۰۹۔ (جماع ابواب من تجوز شھادتہ ومن لاتجوز..)

③ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المئۃ، ج:۱۱، ص:۳۶۲۔

میں اپنے ذہن میں اس سلسلہ میں مزید تفصیلات پاتا ہوں، لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں کیوں کہ جناب صدر محترم ان تفاصیل پر بحث کرنے کے لئے خود ہی ایک کمیٹی کا تقرر منظور فرما رہے ہیں۔ یہ چیزیں اس میں آسکتی ہیں۔اس لئے اس اجمال پر قناعت کیا جانا کافی خیال کرتا ہوں۔

تاثرات تقریر...... حضرت حکیم اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر مسئلہ تعلیم کے ہر پہلو پر اصولی حیثیت سے اس درجہ جامع تھی کہ بعد کے آنے والے مقررین کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ وہ تعلیم کے بنیادی نقطوں میں حضرت موصوف کی تقریر کا حوالہ دے کر پرزور تائید کریں۔ چناں چہ حضرت موصوف کی تقریر کے بعد مولانا محمد رضا صاحب فرنگی محل نے علمائے فرنگی محل لکھنؤ کی طرف سے تقریر فرمائی، جن کی اصل تقریر کا ماحصل مناظرانہ انداز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر پر غم وغصہ کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب تعلیمی نقطہ کی بات آئی تو انہوں نے بالآخر حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی پرزور تائید کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبد الحلیم صاحب عربی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی والے نے بھی مناظرانہ انداز میں تقریر فرماتے ہوئے مولانا آزاد کی تقریر پر نکتہ چینی کی اور آخر میں حضرت مہتمم کی تقریر کا بنیادی نقطہ تعین نصب العین لے کر اس کی تائید وتصویب نہایت پرزور الفاظ میں کی۔

آخر میں علامہ سید سلمان صاحب صدر قاضی وڈائریکٹر علوم مشرقیہ ریاست بھوپال تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور موصوف نے ایک نہایت مفصل ومدلل تقریر فرماتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کا یہ جملہ دہراتے ہوئے کہ ''مسائل پرانے اور دلائل نئے ہوں'' فرمایا یہ کہ اس سے زیادہ جامع جملہ کوئی نہیں ہے جو تغیر نصاب پر جامع روشنی ڈال سکے۔

علامہ موصوف کی تقریر کی بعد مولانا عبد المجید صاحب بنارسی نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ تقریر فرماتے ہوئے نہایت پرشوکت الفاظ میں حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی تائید کی۔

سب سے آخر میں مولانا آزاد صاحب نے اختتامی تقریر فرمائی اور حضرت مہتمم صاحب کی تقریر سے اس حد تک اپنے تاثر کا اظہار فرمایا کہ گویا اپنی اختتامی تقریر صدارت کا متن حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کو قرار دے کر اس کے مختلف جملوں کو بار بار اپنے الفاظ میں دہرانا شروع فرمایا جیسا کہ ابھی مولانا محمد طیب صاحب نے فرمایا اور یہ مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل بجا درست فرمایا۔

مولانا آزاد صاحب نے فرمایا کہ محمد طیب صاحب کی تقریر کا یہ جملہ کہ ''مسائل قدیم ہو اور دلائل جدید ہوں، ہمارے ان تمام تعلیمی مقاصد کا آئینہ دار اور لب لباب ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ اس قدر جامع تعبیر ہے کہ آپ کتنی شرحیں کرتے چلے جائیں، تفاصیل کے دفتر تیار کر دیں لیکن کوئی مقصد بھی اس جملہ سے باہر نہ ہوگا۔

مولانا آزاد نے فرمایا کہ ہاں! مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل درست اور نہایت ہی بجا فرمایا کہ مدارس عربیہ کو اپنے نصاب تعلیم اور نصب العین میں اصلاح کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ سرکاری تعلیمی اداروں کو

ضرورت ہے۔ یہ اگر اپنا نصب العین اور طریقۂ تعلیم و تربیت درست کریں تو وہ قومی مدارس کے قریب آ جائیں گے۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے یہ بالکل صحیح فرمایا کہ ان قومی اور دینی مدارس کا تفوق ان کی آزادی اور آزاد روش پر منحصر ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ ان کا آزاد رہنا ہی ان کا اونچا اور بلند مقام ہے اور انہیں اسی مقام پر رہنا چاہئے۔

پھر مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے صحیح فرمایا کہ تعلیم کی غرض و غایت اگر محض کلرک اور محرر یا دفتری لوگ پیدا کرنا ہے تو اس کم مرتبہ غرض کوئی دوسری نہیں ہو سکتی اور یہ ملک کی کوئی صحیح خدمت نہ ہوئی۔

بہر حال حضرت مولانا آزاد صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے جملہ جملہ کو لے کر اس کی شرح نہایت وقیع اور شاندار انداز سے اپنے الفاظ میں فرمائی جس سے مولانا کے تاثرات قلبی کا اظہار ہوتا رہا اور جس کا تمام حاضرین نے نہایت اچھا اثر قبول کیا۔

ہم جملہ وابستگان دار العلوم کے لئے بالخصوص انتہائی مسرت وخوشی کا مقام ہے کہ اس پوری تعلیمی کانفرنس کا ہیرو دار العلوم دیوبند رہا اور دار العلوم کے حلقہ میں پوری کانفرنس کے ہیرو حضرت مہتمم صاحب رہے۔ جن کی تقریر کے ہر ہر جملہ بلکہ ایک ایک لفظ کو سنجیدہ اور باہوش علماء کرام نے دہرایا۔ پرزور تائیدیں فرمائیں اور تقاریر میں اس کی تشریح و تفصیل کرتے رہے اور ایک مرکزی تعلیمی ادارے کی تعلیمی لائنوں میں جو حیثیت ہونی چاہئے تھی وہی رہی۔

"فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْمِنَّةُ"

خاتمۂ تقریر پر مولانا آزاد صاحب نے اعلان فرمایا کہ میں ایک عملی تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں وہ یہ کہ ۱۵ تا ۲۱ ارکان پر مشتمل ایک تعلیمی کمیٹی بنا کر جلد سے جلد نصاب تعلیم کی اصلاح و ترمیم کا عملی کام شروع کر دیا جائے۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی اور نہایت خیر وخوبی کے ساتھ یہ تعلیمی کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

احقر: خلیق احمد صدیقی

مدیر ماہنامہ دار العلوم (دیوبند)

تصویر سازی کی مذہبی وتمدّنی حیثیت

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے ۳۳ کروڑ، دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے ،مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے، ایران کے مجوسی یزدان واہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت و رہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیاز ختم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا۔ (از: حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَنَـدَ نَـا وَمَوْلَا نَـا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِ یْرًا ، وَّدَ اعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَ اجًا مُّنِیْرًا. اَمَّابَعْدُ!

مہلک دستکاری...... بزرگان محترم! آج تصویر اور صورت سازی اپنی غیر معمولی شیوع کی بدولت موجودہ تمدن کا ایسا جزءِ لاینفک بنی ہوئی ہے کہ اس کا کوئی شعبہ اپنی رونق کو تصویر کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا۔ مکان، دوکان، خطوط، کتب، رسائل، سکہ، تمغہ، رقعہ، دستاویز، تلوار، ہتھیار، چھری، چمچہ، لیول مارکہ کوئی چیز نہ تصویر سے خالی اور نہ تصویر بغیر اس میں کوئی کشش ہی محسوس کی جاتی ہے۔ پس جاذبیت کی ساری ہی طاقتیں آج تصویر کے ایک رخ میں پنہاں ہو چکی ہیں اور تقریباً دنیا کی ہر قوم بلا استثناء اپنی پوری ہی گرویدگی وشغف کے ساتھ تصویر کی طرف پروانہ وار دوڑتی چلی جا رہی ہے۔

اقوام متحدہ (اقوام عالم) کے اس اجماع میں جو تصویر کے ساتھ فدائیت پر منعقد ہو چکا ہے، ہم تصویر کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس اجماع کے خلاف ہم ایک ایسے نظریہ کے ماتحت تصویر کو دیکھ رہے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے تصویر نہ صرف بدترین منکر ہی دکھلائی دیتی ہے جسے معروف کی لائن سے کوئی مناسبت نہیں۔ بلکہ ایسی مہلک اور مخرب دستکاری نظر آتی ہے جسے ایک مسلم کی مسلمانہ ذہنیت تبدیل کر دینے میں کافی مداخلت حاصل ہے۔

صورت محض وسیلۂ تعارف ہے...... یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت اپنی حقیقت کا ظہور اور اس کے لئے تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیائے صور و اشکال میں کوئی حقیقت بغیر صورت کے شناسا نہیں ہو سکتی۔ پس

صورت ایک درمیانی خادم ہے، جس کا منصبی فرض صرف حقیقت تک پہنچا دینا ہے اور بس۔

زید اور عمر کی صورتیں، حیوانات اور نباتات کی ہیئتیں (شکلیں) صرف اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ دنیا کو اپنے باطنی حقائق سے شناسا بنا دیں۔ جس کے صاف معنی یہ نکل آتے ہیں کہ کوئی صورت بلا حقیقت یا بلا ترجمانی ہی نہیں کہ کہ صورت محض نہ بذاتہ مقصود ہے اور نہ مقصودیت کی شان رکھتی ہے۔

اس اصول پر یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں کہ مقصود واقعی صرف حقیقت ہے صورت نہیں۔ صورت وسائل تعارف میں سے ایک وسیلہ ہے، اگر بالفرض ہم بلا صورت ہی کسی حقیقت پہچاننے پر قادر ہو جائیں تو شاید پھر صورت کی طرف التفات بھی ہم پر شاق گزرنے لگے اور ہم اسے اضاعت وقت سمجھنے لگیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صورتوں کی طرف توجہ کرنا فی الواقع حقیقت پر براہ راست قدرت نہ پا سکنے کا ثمرہ اور ہمارے قصور ادراک کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ہم تاج محل آگرہ کا اصلی نقشہ آنکھوں میں رکھنے کے لئے اس کی تصویر سامنے رکھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ذریعے سے ہم خود تاج محل کو یہاں اٹھا کر لا سکتے ہوں یا ہمہ اوقات ہر جگہ سے اسے دیکھتے رہنے کی قدرت رکھتے تو شاید ہمارا دھیان اس کاغذی تاج محل کی طرف کبھی بھی نہ منعطف ہوتا۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ صورت وہیئت سامنے رکھنا اصل کی یادآوری کا ایک ذریعہ اور ساتھ یہ صورت بین کے قصور ادراک کا ثمرہ ہے کہ وہ براہ راست اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس جب کہ ایک ایسی صورت بھی جو کسی واقعی حقیقت کا عنوان یا ترجمان بھی بنی ہوئی ہے۔ واسطۂ محض سے زائد کوئی درجہ نہیں رکھتی تو وہ تصویر جو صورت ہی صورت کی ترجمانی کر رہی ہو اور حقیقت سے اسے کوئی بھی واسطہ نہ ہو یا تصویر ہی فرضی ہو جس کے نیچے کسی واقعی صورت کا بھی وجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بے اصل محض، بے وزن محض اور بے التفات محض ہونی چاہئے، کہ وہ حقیقت کی بجائے باطل اور بے بنیاد شے یا لاشے محض کی ترجمانی کر رہی ہے۔ پھر بھی اگر ایسی بے بنیاد اور باطل صورتوں کو مرکز توجہ بنا لیا جائے تو یہ مقصود سے اعراض اور وسائل میں شغف کے سوا کون سے لفظ سے تعبیر کیا جائے گا اور کون نہیں جانتا کہ مقصود کے ہوتے ہوئے وسائل محض میں انہماک وشغف رکھنا یا بالفاظ دیگر اپنے قصور ادراک اور عجز تصور کو باوجود ازالہ کی قدرت کے پالتے رہنا، دانائی کی بجائے انتہائی سادہ لوحی بلکہ اس سے بھی آگے ہی کا درجہ ہے۔

شرک فی المقصود...... بس اسی قلب موضوع سے کہ وسائل مقصود کا درجہ حاصل کر لیں اور خود مقصود غیر اہم ہو جائے، شرک فی المقصود کی بنیاد پڑتی ہے۔ جس کی ذمہ داری تنہا تصویر پر عائد ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب قلب جو باطن اور غیبی امور میں منہمک ہو کر ذوقی مشاہدوں کا شائق بنایا گیا ہو۔ تصویر آرائی کے ذریعے گرفتار صورت بنا دیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی جمعیت کھو کر کچھ باطن کا ہو رہے اور کچھ ظاہر کا ہو رہے۔ کچھ حقیقت کی طرف مائل ہو اور کچھ صورت کی طرف۔ گویا اپنی اصل جبلت سے تو غیبات اور حقائق کی طرف جھکے اور ان غیر جبلی قواسر سے ظاہری نمود اور صورت واشکال کی طرف مائل ہو اور اس طرح توحید

مطلب کے بجائے تعدد مطالب کا مجرم ہو جائے جو شرک کی حقیقت ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مقصود کے مقصود باقی رہتے ہوئے شرک فی المقصود سے نہ بچنا، عقل کی گمراہی اور فہم سلیم کا خون اپنی گردن پر لینا ہے۔ ہاں جس درجہ کا مقصود ہوگا، اسی درجہ غیر مقصود کا اس میں ساجھا قائم کرنا خلاف فطرت اور جرم ہوگا۔

تصویر پرستی...... یہاں پہنچ کر دنیا کی قوموں کے دو راستے ہو گئے۔ ایک طبقہ نے جو تلاش معبود میں سرگرداں اور تعارف غیب کا دلدادہ تھا، اپنی خوگر محسوس ذہنیت سے مغلوب ہو کر تصویر کو خدائے برتر وتوانا کے تعارف کا ذریعہ قرار دیا اور معرفت رب کے لئے ابتداء تصویر کو مرکز تصور بنایا۔ لیکن عادت جاریہ کے موافق انسان کی خوگری احساس اور مغلوبیت عقل ومعرفت نے پہلے تصویر کو اس کا ساجھی بنایا اور پھر رفتہ رفتہ تصویر میں مقصودیت اور معبودیت کی شان پیدا کردی۔ وہ تمام افعال عبودیت، رکوع وسجود، نذر و نیاز، بھینٹ اور قربانی وغیرہ جو اس بے چون و بے چگون ذات کے لئے ہوتے۔ اب اس کی نام زد صورتوں اور فرضی مجسموں کے لئے ہونے لگے۔ کل تک جو حظ وکیف اس کے نام اور اسی کے لطیف دھیان سے روح میں پیدا کیا جاتا تھا۔ آج اس کی فرضی صورتوں سے حاصل کیا جانے لگا۔

دنیا کی سب سے پہلی بت پرست قوم (امت نوح علیہ السلام) جس نے پانچ مردانِ حق (ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر) کی تصویروں کو ذریعہ خداشناسی بنا کر اپنے معبدوں میں نصب کیا۔ آخر کار انہی مجسموں نے اس خوگر محسوس قوم کی ذہنیت پر فتح حاصل کر لی اور ایک لطیف وخبیر خدا کی جگہ پانچ کثیف الاجسام معبود جم گئے اور ایسے جمے کہ پھر مستقلاً انہی سے استمداد (مدد طلب) کی جانے لگی۔ وہی اولاد دہندہ شمار ہوئے۔ وہی ابر وباراں کے مالک ٹھہر گئے اور انہی کی سنگین صورتوں سے ہر ایک مراد مانگی جانے لگی۔ جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ قوم حقیقت الحقائق تک تو کیا پہنچتی، عام حقیقتوں سے بھی محروم ہو کر محض صورت پرستی کے جال میں پھنس گئی۔ اور اس کی ذہنیت غائر ہونے کی بجائے اس درجہ سطحی ہو کر رہ گئی کہ نوح علیہ السلام کے ساڑھے نو سو سالہ وعظ وپند (وعظ ونصیحت) سے سوائے چند روزہ ظاہر داری کے، کوئی ایک عبرت اور کوئی ایک انجام بینی بھی ان کے دل ودماغ تک نہ پہنچ سکی۔ پھر نہ صرف قوم نوح بلکہ ہر تصویر کی پجاری قوم جو قوم نوح کے نقش قدم پر گامزن ہوئی، اسی سطح پرستی کا شکار ہوئی۔

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتۂ نیاز جوڑنے والے تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتاؤں کی رنگیں تصویروں کے غلام بنے۔ مغرب کے تثلیث پرست کنواری مریم کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے۔ ایران کے مجوسی یزداں واہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت ورہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیاز خم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا اور خالص شرک کے راستہ پر لا کھڑا کیا۔ جس سے یہ اشرف المخلوقات اپنی توحید مطلب کو یکسر فنا کر بیٹھا اور قلبی پراگندگی وتشتت کے مہلک جال میں پھنس کر اپنی طمانیت وبشاشت خاک میں ملا دی۔

تصویر بازی...... دوسری قوم کو اپنی تصویر بازی اور صورت پسندی کے ذریعے خدا کی تلاش نہ تھی اور نہ انہوں نے

تصاویر سے مظاہر غیب کی جستجو شروع کی۔ تاہم تمدن و معاشرت کے سلسلہ میں ساری کائنات کو اس کی تصاویر کے ذریعہ پہنچاننے کے جذبہ نے ان کو بھی اصل سے ہٹا کر نقل پسندی، اور پھر خالص صورت پرستی یا حقیقت سے بے تعلقی میں الجھا دیا۔ یہ قوم پہلے سے بہت ادنیٰ اور ذلیل مرتبہ پر آ کر رکی۔ پہلی قوم نے اگر صورتوں اور مجسموں کو قبلہ استقبال بنایا تو خداشناسی کے لئے گویا حقیقت رسی کم از کم جذبات میں تو مرکوز تھی۔ گویا تلاش حقیقت ہی کے سلسلہ میں صورتوں کے ساتھ انہیں شغف پیدا ہوا۔ لیکن دوسری قوم کی تصویر بازیوں میں ابتداء ہی سے حقیقت بینی کا کوئی جذبہ بھی دستیاب نہیں۔ اس کے تصویری جذبات صرف تزئین و آرائش یا نمائش وزیبائش ہی تک محدود ہیں۔ جس کا تعلق صورت در صورت ہی سے ہے اور بس۔

یعنی اس قوم کے یہاں تصویروں سے کسی مستور اور غیبی حقیقت کا ظہور تو کیا مطلوب ہوتا اس مشاہد کائنات کی بھی صرف صورتوں ہی سے شناسا ہونا منتہائے مقصود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کائنات کی حقیقت و صورت میں صورت کا درجہ خود فانی اور عارضی تھا اور جب کہ فانی کا بھی، فانی درجہ، یعنی تصویر کو منتہائے مقصود بنا دیا جائے تو ایسی قوم صرف واقعیت ہی سے دور نہیں ہوگی۔ بلکہ باطل سے باطل اور بے حقیقت بنیاد پر کھڑی ہو کر اپنے وزن اور طاقت اور جڑوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے کمزور کر دینے کی مرتکب ٹھہرے گی۔

یورپ کی تمدن پرست قومیں اسی باطل سازی اور تصویر بازی کی لعنت میں سب سے زیادہ گرفتار ہوئیں۔ ان اقوام کو اس بنیاد صورت پرستی اور نمائش پسندی نے اس درجہ سطحی اور بے بنیاد قوم بنایا، کہ آج وہ کسی حقیقت تک تو کیا پہنچتیں اپنی مصنوعی صورتوں کے سامنے قدرتی صورت کے ساتھ پورا شغف قائم نہ رکھ سکیں۔ کہ ان میں کچھ نہ کچھ تو واقعیت کی شان ضرور تھی۔ ان کی ذہنیت اور جذبات کا بہت بڑا حصہ اپنی ہی خود ساختہ صورتوں کے ساتھ وابستہ ہوگیا۔ تصویروں کی ساخت و پرداخت اور خریداری پر لاکھوں روپیہ صرف کرنا تصویریں سامنے رکھ کر عالم خیال میں ان سے باتیں کرنا، عشق و محبت کے جذبات کاغذ کے رنگین عکوس پر نچھاور کرنا ان کا شعار ہوگیا۔

سطح پرستی کی انتہاء...... آج عریاں تصویروں کو سامنے رکھ کر شہوانی جذبات اس طرح مشتعل کئے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی اصل صورت کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے مجسمے صرف بازاروں ہی کے چوک میں نصب نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اس درجہ گھس چکے ہیں کہ ان کی کسی ادنیٰ توہین پر اسی طرح ازالہ حیثیت کے مقدمات چلائے جاتے ہیں، جس طرح اصل شخصیت کے بارہ میں مقدمہ چل سکتا ہے۔

آخر لارنس کے بت کا مقدمہ دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ وکٹوریہ کے بت کی توہین پر تحقیقاتی پولیس کا مقرر کیا جانا اس دور صورت پرستی کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ حالاں کہ اصل کا آج کوئی پتہ نشان بھی نہیں، یہ تمام معاملات صرف مصنوعی پیکروں کے ساتھ اسی شدومد سے کئے جا رہے ہیں، جس طرح قدرتی مجسموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض نایاب اور پرانی تصویری شاہکاروں کی قیمتیں اسی مقدار میں اٹھ جاتی ہیں کہ شاید اس

مصور کو اگر نیلام کیا جاتا تو اس کے عشر عشیر بھی دام نہ اٹھ سکتے۔ حتیٰ کہ ان تصویری جذبات نے فلم سازی کا ایک مستقل فن ہی پیدا کر دیا جس کے لئے خزانوں کا ایک مستقل حصہ وقف ہے۔ ایک ایک فلم پر ہزار ہا روپیہ کی لاگت ہے، فلم سازوں کی بیش قرار تنخواہیں اور سینما کی قیمتی عمارتیں، باب تمدن کا ایک نہایت ہی شاندار اور خوشگوار اضافہ سمجھی گئیں۔ آدمیوں سے وہ اثر نہیں لیا جاتا جو سینما کی محرک تصویروں سے لیا جارہا ہے۔

نمائش و سطح پرستی کی یہ وہ انتہائی حد ہے کہ آج کا انسان گویا خود بھی اپنے نزدیک اس لئے باطل محض ہو گیا کہ اس کے شغل کے لئے خود اس کی قدرتی شکل بھی کافی نہ رہی، جب تک کہ اس صورت کی بھی خود ساختہ صورت اس کے سامنے موجود نہ ہو۔ غرض حب و بغض، نفرت و رغبت، عشق و محبت اور خرید و فروخت کے تمام وہ معاملات جو ایک سطح پسند انسان، انسان کی اصلی اور قدرتی صورت سے قائم کرتا، آج اس سطح کی بھی نقلی اور فرضی سطح و صورت کے ساتھ جوڑتا جارہا ہے، کیا یہ صورت پسندی کی انتہا نہیں ہے؟ اور جب ایسا ہے تو کیا یہ حقیقت سے بے خبری اور بیگانگی کی بھی انتہا نہیں ہے؟ اور پھر ایسی قوم کے حق میں جو حقائق سے بے گانہ محض بن کر محض صورتوں اور صورتوں کی بھی نقالی میں الجھ کر رہ جائے، عقل و دانش کیا فیصلہ کرے گی؟

صورت پسندی کی آخری منزل...... بہرحال قوموں کے ان دونوں طبقات میں تصویر نے اپنی طبعی رفتار کے ماتحت اصل کو پردۂ نسیان میں چھپا کر زبردستی اس کی جگہ سنبھال لی۔ اور اس طرح دونوں جگہ اس توحید مطلب کی جڑیں اکھاڑ کر شرک کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا۔ متدین اقوام میں شرک عبادت پیدا کر دیا اور متمدن اقوام میں شرک عادت۔ پھر یہ شرک بھی اس تصویر پسندی کا درجہ اول ہے۔ صورت پسندی کی آخری منزل یہ ہے کہ بلا شرکت غیرے صورتیں ہی حقائق کی جگہ سنبھال کر بالاستقلال خود مقصودیت کی شان پیدا کر لیں۔ چناں چہ مذہبی اقوام کے سامنے اصنام ہی مستقل حاجت روا بن کر قبلۂ قلوب ہو گئے، اور تمدنی قوموں کے سامنے فوٹو اور تصویریں ہی مستقل محبوب و مطلوب بن گئے۔

آج کوئی ڈیزائن اور نمونہ مقبول نہیں جس میں تصویر کو دخل نہ ہو، کوئی رسالہ جاذب نظر نہیں جب تک تصاویر اور خصوصاً عریاں تصاویر سے مزین نہ ہو، گویا ادبی رسالوں کی جان اب بجائے علو مضامین کے، رنگینی تصاویر قرار پا گئی ہے۔ علم میں طاقت نہیں کہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے گھسیٹ سکے۔ مگر تصویر اپنی خالص محبوبیت کی بناء پر یہ جذب و کشش ضرور رکھتی ہے کہ تجارتوں کو فروغ دے سکے، دوکانوں کی رونق بڑھائے اور لوگوں کا وقت اپنے اوراق کے لئے خرید سکے۔

خزائن مخفیہ سے محرومی...... خلاصہ یہ نکلا کہ تصویر بالخاصہ حق پسندی سے ہٹا کر بہ سہولت باطل پسندی کی ذہنیت پر لے آتی ہے، واقعی جذبات کو بے ثمرہ بناتے ہوئے انجام کار عاقبت کی بہرہ مندیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے، پس کہاں تو انسان غیب سے نکل کر عالم شہود میں اس لئے آیا تھا کہ ہر حسی شاہد سے کنارہ کش ہو کر غیب کی قلبی مشاہدوں

میں مصروف ہو۔ ہر صورت سے اعراض کر کے حقیقت کی طرف جائے، اور ہر باطل سے نگاہ ہٹا کر حق کی طرف دوڑے تا کہ اس کا لگاؤ فانی کے بجائے باقی سے ہو اور اس طرح وہ خود بھی باقی بن جائے اور اسے اپنی اصل سے وابستگی رہے۔ اور کہاں ان تصاویر کی بدولت اس کج راہی میں گرفتار ہوا کہ غیب کے ہر مرتبہ سے کنارہ کش (الگ) ہو کر اس نے محسوسات ہی کو اپنا قبلۂ نظر بنالیا۔ مخفیات کے ہر خزانہ سے محروم ہو کر حسیات ہی کو منظور نظر کر لیا اور روحانیت کے تمام لذیذ مشاغل سے بے پرواہ ہو کر مادیات کی کثافتوں میں دھنستے رہنا ہی اپنا سب سے زیادہ لذیذ مشغلہ قرار دے لیا۔ یہاں تک کہ جب باقیات صالحیات سے اعراض کر کے فانی چیزوں میں جا پھنسا تو اپنی اصل سے منقطع ہو کر خود بھی بے اصل بن گیا۔

شناسان حقیقت کا تصویر سے معاملہ...... اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر بارگاہ حق کے حقیقت شناس اور ان کے حقیقت رس قلوب صورتوں سے بے لگاؤ اور تصویروں سے متنفر ہوں تو کون سی جائے تعجب ہے؟

ملائکہ جیسے حقیقت شناسان بارگاہ حق تصویروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں؟ ''**لَاتَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَّلَا تَصَاوِيْرُ**'' ① ''جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں اس میں ملائکہ داخل نہیں ہوتے''۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حقیقت شناس بارگاہ قدس کا ان رسوم ونقوش کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ ''**اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَتْرُكُ فِيْ بَيْتِهٖ شَيْئًا فِيْهِ تَصَالِيْبُ اِلَّا نَقَضَهٗ**'' ② (رواہ البخاری) ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی ایسی شے جس میں تصویر ہو بلا توڑے نہیں چھوڑتے تھے''۔

تصویر سازی کا اخروی انجام...... حق تعالیٰ شانہ تصویر سازوں کے ساتھ یوم آخر میں کیا طریق عمل اختیار فرمائیں گے؟ **اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ الَّذِيْنَ يُضَاهُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ** ③ (**وَفِيْ رِوَايَةٍ**) **اَلْمُصَوِّرُوْنَ** ④ ''یوم قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جو خدا کی شان تخلیق میں اپنے کو اس جیسا بنانا چاہتے تھے (یعنی مصورین)''۔ یہ تو صورتوں کی تصویروں کے متعلق ارشادات شریعت تھے۔ لیکن حقائق کی تصویریں خود ہماری صورتیں ہیں، ان کے متعلق بھی منشاء حق یہ ہے کہ ہم انہیں مستقلاً مرکز التفات نہ بنادیں۔

''**اِنَّ اللّٰهَ لَايَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَنِيَّاتِكُمْ**.'' ⑤ ''اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے (جو تم میں غیب کی چیزیں ہیں)''۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کا بلاشرکت غیرے اصل وجود اور اپنی حسی کائنات کی اصل الاصول کی

---

① الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب التصاویر، ج:۲، ص:۱۶۷۹۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب نقض الصور، ج:۲، ص:۱۶۷۸۔ ③ الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب ماوطئی من التصاویر، ج:۱۸، ص:۳۳۲۔
④ الصحیح للبخاری، کتاب اللباس، باب عذاب المصورین یوم القیامة، ج:۱۸، ص:۳۲۶۔ ⑤ الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره، ج:۱۲ ص:۴۲۷۔

فکر و دھیان میں رہنا جب ہی ممکن تھا کہ صورتوں سے اپنی حسی آنکھ بند کر کے فہم و فراست اور قلب کی آنکھ کھولے تا کہ غیبی وجود اور مخفی اسرار اس کے مشاہدے میں آسکیں۔

حقیقت الحقائق کی جستجو...... پس اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ نکلا کہ صورتوں کی تصویریں تو بالکلیہ نا قابل التفات اور تشتت کی جڑیں ہیں۔ رہیں قدرتی صورتیں سو گو کچھ نہ کچھ عارضی واقعیت رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی تم کائنات کی اس حسی اور صوری خوشنمائی سے یکسو ہو کر اس کی حقیقی خوبی کو توجہات کا مرکز بناؤ۔ بلکہ پھر ان حقائق سے بھی قطع نظر کر کے اس حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی سعی کرو جو تمام کمالات و جمالات کا سر منشاء اور حقیقی خوبیوں کا سر چشمہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے شہود سے ہٹا کر غیوب کی طرف انسان کو بڑھانا چاہا ہے، اجسام سے ہٹا کر حقائق کی طرف اور بالآخر مخلوقاتی حقائق سے بھی ہٹا کر حقائق الٰہیہ کی طرف لانا چاہا ہے۔ جن کا مشاہدہ بجز صورتوں سے قطع تعلق کئے ہوئے دشوار و ناممکن تھا۔

پس کہاں اسلام کی یہ حقیقت رسانی اور حق نمائی کہ بطون در بطون اور غیب در غیب کی طرف بڑھا کر انسان کو حقیقت سے ہم کنار کر دیا، اور کہاں انسانی تخیل کی یہ کج راہی کہ نمائش و زیبائش اور نمود در نمود کی طرف دھکیل کر انسان کو حق اور حقیقت سے بعید و بے گانہ محض کر دیا۔ حقیقت الحقائق سے جدا کر کے جزوی حقائق پر اور ان سے بھی بے بہرہ بنا کر صور و اشکال پر اور پھر ان سے بھی ہٹا کر تصویری خد و خال پر لا کھڑا کیا۔ پس وہاں اگر اصل الاصول تک پہنچ جانے کی وجہ سے توحید در توحید حاصل ہوتی تھی تو یہاں غیر حق کی طرف بڑھتے چلے جانے سے شرک در شرک پیدا ہو گیا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ تصویر اشراک (شرک) کی جڑ ہے اور صورت پسندیاں انسان کی توحید کو بجائے خود کبھی باقی نہیں چھوڑ سکتیں تو یہ ایک بجا اور مطابق واقعات دعویٰ ہوگا۔

توحید پسند کا تصاویر سے تنفر...... اس لئے اگر توحید پسند طبقہ مطلقاً تصویر کا دشمن اور اس سے متنفر (نفرت کرنے والا) ہو تو یہ اس کا ایک قدرتی جذبہ اور فطری حق ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام جیسے کامل موحدین نے انسان کو انہماک صور و اشکال سے دور در دور رکھنا ہی اپنے مسلک کا ایک جلی اور روشن نشان قرار دیا ہے اور انہوں نے:

1 تصویر ذی روح کو حرام قرار دیا۔ 2 ملائکہ کی نفرت اس سے ظاہر کی۔ 3 خود اپنا بغض اس سے بتلایا۔ 4 تصویر سازی اور مصور (فوٹو گرافر) پر لعنت کی۔ 5 تصویر بنا دیئے جانے پر اس کے مٹا دینے کی تعلیم دی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے شجرۃ الرضوان جیسے متبرک شجرہ کو کٹوا دیا کہ کہیں اس سے صورت پرستی کی بنیاد نہ پڑ جائے۔ مطاف مقدس میں حجر اسود کو یہ جتلا کر چوما کہ: ’’میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ ضرر، اگر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے ہرگز نہ چومتا‘‘۔

حقیقت پسندانہ ذہنیت...... پس اسی لئے حقیقت شناسانِ باطن نے تصویر پسندوں اور صورت دوستوں کو ایسے مظان (گمان) سے بھی بچانے کی سعی کی ہے جہاں ان کے گرفتار صورت ہو کر بعید از حقیقت ہو جانے کا ذرا سا

بھی خطرہ تھا۔

سالک ابتدائے سیر الی اللہ میں جبکہ حقائق کو مختلف باطنی صور واشکال کے جامہ میں مشاہدہ کرتا ہے جو خود بھی ایک حد تک غیبی ہی چیز ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی غیب ہی میں ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا راہنما اور مربی اسے ان صورتوں سے بے التفات بنانے کی سعی کرتا ہے، کہ کہیں ان نقوش کی رنگینیوں میں پھنس کر اصل حقیقت سے بے گانہ نہ رہ جائے ؎

کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

غرض صورت پسندی، تصویر دوستی، تصویر سازی، تصویر بازی اسلامی مقاصد کے منافی اور اس کے بنیادی مقصد رجوع الی الغیب یا سیر الی اللہ کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ہے۔ اس لئے کم از کم مسلم قوم کو اپنی حقیقت پسندانہ ذہنیت چھوڑ کر صورت پرستانہ جذبات پیدا کر لینا بلاشبہ قلبِ ماہیت (حقیقت کو بدلنا) اور قلبِ موضوع (مقصد سے ہٹنا) ہے۔

حق تعالیٰ توفیق دے کہ ہم صحیح اسلامی جذبات کا احترام کریں اور کم سے کم ایسی پگڈنڈیوں سے کترا کر چلنے کی سعی کریں جو اسلامی شاہراہ سے دور پھینک رہی ہوں اور منزلِ مقصود کو بعید سے بعید تر بنانے میں جادو کا اثر رکھتی ہوں۔

وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْق

اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہو گا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو۔ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا، وہی کامیاب ہو گا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . اَمَّابَعْدُ!

اشتراک ذہن...... بزرگان محترم! اس وقت آپ جانتے ہیں کہ سائنس نے پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ کر بہت مختصر بنا دیا ہے۔ پوری دنیا ایک چھوٹا سا کنبہ بن گئی ہے۔ ایجادات نے ملنا جلنا اور چلنا پھرنا سہل بنا دیا ہے۔ پہلے بیل گاڑی وغیرہ کے سفر میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ خشکی کے راستے سے حج کے لئے پیدل چلنے میں دو تین سال لگتے تھے۔ دوسری سواریوں میں نو مہینے لگتے تھے، لیکن آج سائنس کی ترقیات نے سفر کو سہل بنا دیا۔ رتھوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ ریلیں چلیں اور اب تو ہوائی جہاز چلنے لگے جو بمبئی سے جدہ تک ۹ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں، حالاں کہ دریا کے راستہ سے یہ سفر (۹) دن میں ہوتا ہے اور اب تو ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز چلانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ یعنی انسان بالکل پرندوں جیسے ہو جائیں گے اور گھنٹوں کی مسافت منٹوں میں طے ہو گی۔ اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بات کہنے کے لئے کہیں جائیں، کسی شہر میں جلسہ ہو تو مقرر وہیں پہنچ کر تقریر کرے بلکہ ریڈیو کے ذریعے ساری دنیا سے خطاب کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں نے پوری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا ہے اور سارے ممالک محلوں کی حیثیت میں ہو گئے ہیں۔ ان ایجادات کا اثر یہ پڑا کہ ملکوں کی خصوصیات مٹتی چلی گئیں اور ایک ملک کا اثر اور اس کے رجحانات دوسری جگہ اثر انداز ہونے لگے۔ خیالات میں بھی اشتراک پیدا ہوتا جا رہا ہے یعنی جذبات ایک سے، افکار ایک سے، خیالات ایک سے یعنی ساری دنیا یہ چاہتی ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں۔ برما کے وزیر صحت ہمارے یہاں آئے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا دہلی کیسے تشریف لانا ہوا تھا، تو انہوں نے

فرمایا کہ: ہمیں حکومت ہند سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک اپنے داخلی معاملات میں بھی خارجی ممالک کی پالیسی کے ماتحت ہے۔گویا کہ سیاست داخلی سیاست خارجی سے پوری طرح متاثر ہے۔چناں چہ یونائیٹڈ نیشن کا ادارہ (یو این او) یعنی مجلس اقوام متحدہ قائم ہے جو اشتراک ذہن کا نتیجہ ہے۔گویا کہ دنیا کی قوموں کے تعصبات ختم ہوتے جارہے ہیں۔حد بندیاں اور خصوصیات ختم ہو رہی ہیں۔

تبدیلیٔ اصول...... چناں چہ اب یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ اگر عالمی امن چاہتے ہو تو چھوت چھات مٹاؤ اور امتیازات کو ختم کرو، اسی وقت امن قائم ہوگا۔

گاندھی جی جب دلی میں آتے تھے بھنگی بستی میں قیام کرتے تھے۔محض یہ ظاہر کرنے کے کے لئے کہ اب امتیازات ختم کرنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

پنڈت پنت صاحب جب رنکھنڈی میں آئے تو انہوں نے ایک ہریجن کے مکان پر قیام کیا اور اس کے گلاس میں دودھ پیا۔ان واقعات سے معلوم ہوا کہ تمام قوموں کے اصول بدل رہے ہیں۔

پہلے عوام تابع تھے خواص کے اور اب خواص تابع ہیں عوام کے، پہلے چراغ تلے اندھیرا تھا اب چراغ کے اوپر اندھیرا ہے۔پہلے جو چیز چھپانے کی تھی وہ اب برسر عام آ گئی، مثلاً دولت، عورت، پہلے خواص کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔اب عوام کی رائے کو اہمیت ہے، لہٰذا خواص کو نیچے اترنا پڑے گا اور عوام کو اوپر اٹھنا پڑے گا۔

اشتراک مذہب...... حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائیگی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو، جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا وہی کامیاب ہوگا۔چناں چہ ایک مذہب نے اعلان کیا کہ۔﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى﴾ ① الخ. گویا تمام اقوام مل کر ایک بدن کے اعضاء ہیں۔''بنی آدم اعضائے یک دیگر اند الخ۔

''ہم نے تم میں قبیلے بنائے تا کہ پہچان باقی رہے نہ اس لئے کہ تفاخر کا ذریعہ ہو۔تم میں نسل کے اعتبار سے کوئی بڑائی چھوٹائی نہیں، البتہ عمل کے اعتبار سے بڑائی چھوٹائی رہے گی، پیدائشی اعتبار سے کوئی چھوٹائی بڑائی نہیں، آفتاب اگر چمکتا ہے تو وہ روشنی تقسیم کرنے میں اونچ نیچ نہیں برتتا بلکہ سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق روشنی سے مستفید ہوتے ہیں، شیشہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے روشن ہوتا ہے اور کالا توا اپنی صلاحیت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے۔اس نے اعلان کیا کہ عبادت گاہیں کسی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔جو زیادہ خشوع سے عبادت کرے گا وہ بڑھ جائے گا اور جو ایسا نہ کرے گا وہ نیچا رہے گا۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳.

عمومی مساوات...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اگر میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا“ ①۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ سنو اور مانو! ایک بڈھے نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے، تم خائن ہو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میں نے کیا خیانت کی؟ تو اس نے کہا، بیت المال سے سب کو ایک ایک چادر ملی ہے لیکن آپ کے بدن پر دو چادریں ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ دے گا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنی چادر اپنے باپ کو دے دی تھی۔ معلوم ہوا کہ اگر امیر اعتراض کر سکتا ہے تو غریب بھی اپنے امیر پر اعتراض کر سکتا ہے۔ غور کی بات ہے کہ آج کے دور میں یہ اعلان مناسب ہوگا کہ اے انسانو! تم ایسے کام کرو جن میں سب کے لئے نفع سب کے لئے عزت سب کے لئے راحت ہو۔

یا یہ اعلان مناسب رہے گا کہ اے ہندیو! اے عربو! تم صرف اپنا نفع دیکھو، بہر حال اونچ نیچ جو کچھ بھی ہے عمل کے امتیاز سے ہے، لہٰذا وہی مذہب چل سکے گا جس میں عمومی مساوات موجود ہو۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس وقت دنیا نے اسی اصول مساوات سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا اب زمانہ کا تقاضہ ہے کہ معاشی اور معاشرتی اور روحانی ہر اعتبار سے یکسانیت ہو، جو کہ وہ پہلے ہی سے اس ہمہ گیر ذہنیت کو لے کر چل رہا ہے۔ اسے کسی سے لڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی، وہ سب کو اپنے اندر سمو سکے گا۔

حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول...... بہر حال تعصب سے بچنا پڑے گا۔ تعصب مختلف اسباب سے قوموں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ اس سے بھی تعصب پیدا ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مقتداء کو برا کہا جائے۔ لہٰذا سب سے پہلے اس آیت قرآنی میں یہی کہا گیا ہے کہ ”ہم نے مان لیا اللہ کو اور اس کی کتاب کو جو ہماری طرف اتری ہے“۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ پہلوں پر نازل ہوا اس کو برا کہو بلکہ یہاں تک ہے کہ جو کچھ نبیوں، رشیوں، منیوں پر نازل ہوا ہم ان سب کو بھی ان کے وقت کے لئے سچا سمجھتے ہیں۔ حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول یہی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں جتنی سچائیاں ہیں انہیں قبول کرے اور کتابوں کو سچا سمجھے اور جو کچھ ان لوگوں نے بعد میں اضافہ یا ترمیم کی ہے، اس کو رد کرے۔ قرآن کریم نے اعلان کیا ہے کہ ہم نے تمام اقوام میں رسول بھیجے ہیں، شام، دمشق، عرب وغیرہ میں پیغمبر آئے۔ پھر کیا ہندوستان میں کوئی پیغمبر نہیں آیا؟ ضرور آیا۔ سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام ہی آئے جو لنکا میں اترے۔ گویا مذہب کی ابتداء ہندوستان سے ہوئی ان کی کنیت ابو البشر ہے (یعنی مہادیو) ان کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر جودھیا میں ہے، پھر ہر ملک اور قوم میں انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، آخر میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے، تو

---

① السنن للنسائی، کتاب قطع السارق، باب ذکر اختلاف الفاظ الناقلین لخبر الزهری. ج:١٥، ص:٦١.
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج:١٠ ص:٤٦٦ رقم:٤٩٦٦.

گویا ہندوستان سے پیغمبری کی ابتداء ہوئی اور عرب پر ختم ہوئی۔

مہاتما بدھ کی پیشین گوئی......حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک دو جگہیں بہت مقبول ہیں، ایک وہ جگہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام اترے، دوسری وہ جگہ جس میں کعبۃ اللہ ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''النبی الخاتم'' اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مہاتما بدھ نے ہندوستان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی تھی۔

چنانچہ بدھ کی جانکنی کے وقت بدھ کے ایک شاگرد نندا نے ان سے پوچھا کہ تمہارے بعد اب ہماری راہنمائی کون کرے گا؟ تو مہاتما بدھ نے کہا کہ ہم سے پہلے بہت بدھ آ چکے ہیں اور اب ایک آخری بدھ آئے گا جس کا لقب متریا ہوگا۔ اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر چلنا چاہئے۔ متریا کے معنی ہیں رحمت کے۔ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کہا گیا ہے۔ چناں چہ بدھ مذہب والوں نے اکثریت سے اسلام کی تعلیمات قبول کیں۔

اجمالی ایمان......قرآن پاک میں ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل فرمایا گیا، مولانا مناظر احسن نے اس کے متعلق اپنے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے یہ مقام کپل ہے اور کپل وستو اسی سے بنا ہے کفل اور کپل میں زیادہ فرق نہیں، ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بہر حال مشرقی ممالک نے اس بشارت کو قبول کیا اور مغربی ممالک مادیات میں پھنس کر تباہ ہو گئے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سرہند شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہاں دو پیغمبر ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گنگا کے پانی میں خصوصی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ گنگا کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی تلاش میں چل دیئے اور گنگوتری پہنچے، وہاں ایک ہفتہ قیام کیا اور واپس آ کر فرمایا کہ جہاں گنگا کا دہانہ ہے وہاں کسی پیغمبر علیہ السلام کے انوار نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ گنگا کسی پیغمبر کی دعا سے نکلی ہو۔ جیسے زمزم کا چشمہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی برکت سے جاری ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کو برا مت کہو۔ ممکن ہے یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں، اس لئے نام لے کر انہیں کبھی برا نہ کہو۔ چنانچہ ان کے پیغامات میں بہت سی باتیں حق ہیں۔ ممکن ہے بعد کے لوگوں نے خلط ملط کر دیا ہو۔ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تعلیمات میں خلط کر دیا ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ جن کا نام قرآن و حدیث میں صراحۃً موجود ہے ان کا نام لے کر مانو اور جن کا نام نہیں آیا ان پر اجمالاً ایمان لاؤ۔

مذہب کی بنیاد......اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی بنیاد ماننے پر ہے، یعنی تصدیق پر مدار ہے تکذیب پر نہیں۔ بخلاف اس کے یہودیوں کا مدار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار پر ہے اور عیسائیوں کا مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر۔ مگر اسلام نے اپنی بنیاد ماننے پر رکھی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب کی بنیاد ماننے ہی پر ہو سکتی ہے نہ ماننے پر نہیں، یعنی مذہب کی بنیاد مثبت پہلو پر ہونی چاہئے منفی پہلو پر نہیں۔

بہر حال چوں کہ پوری دنیا ایک قبیلہ بن گئی ہے اس لئے اب حد بندیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہی حال روحانی

خیالات اور عقائد کا بھی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تعصبات مٹانے پڑیں گے اور تفریق ختم کرنی ہوگی اور وطن کی حد بندی ختم کرنی ہوگی۔ مدار ملک کا کلی امور پر ہوتا ہے، جزوی امور پر نہیں ہوتا۔ اور کلی امور عالمی امور ہیں۔ ان ہی پر ملک کا دارمدار ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کسی ملک والے کو دوسرے ملک والے پر فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

احترام انسانیت...... انسانیت کا احترام اسی طرح ضروری ہے۔ جس طرح مذہبیت کا احترام، لہٰذا چھوت چھات اور تعصب کو مٹانا پڑے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ بن ایہم شاہ غسان مسلمان ہو کر طواف کر رہا تھا، اس وقت کسی اعرابی کا پاؤں اس کی چادر پر پڑ گیا تھا۔ جبلہ نے اس اعرابی کو طمانچہ مار دیا۔ اعرابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ اعرابی اپنا بدلہ اس طرح لے سکتا ہے کہ جبلہ کے ایک طمانچہ لگائے۔

یہ وہی مساوات کا معاملہ تھا۔ جبلہ نے اس حکم کو سن کر کہا کہ مجھے مہلت دی جائے، جب اس کو مہلت دی گئی تو وہ بھاگ گیا اور پھر کفر کو اختیار کر لیا۔ لیکن اسلام نے بڑے اور چھوٹے، اونچ نیچ کے فرق کو مٹانے کے لئے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔

مذہب واحد...... بنی اسرائیل کو ہر طرح کی دولت اور حکومت دی گئی تھی۔ انہوں نے عیش پرستی میں زندگی گزارنی شروع کر دی۔ پیغمبروں نے بہت سمجھایا، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر عراق کے بادشاہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور ان کا قتل عام کیا اور کئی لاکھ بنی اسرائیل گرفتار کئے گئے۔ حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر بھی اسیروں میں سے تھے ان کی دیانت و امانت و راست بازی، صدق و صفا اور عبادت و زہد کو دیکھ کر حکام جیل ان کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے اور کمال احترام سے پیش آنے لگے۔ اس حالت پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس سے اس کے دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے دربار کے کاہنوں اور ساحروں کو طلب کیا اور اپنی قلبی بے چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس غیر معمولی خواب سے پیدا ہوئی تھیں، ان سے خواب کی تعبیر طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ خواب بیان فرمائیے کہا، کہ خواب تو مجھے یاد نہیں رہا۔ انہوں نے کہا کہ پھر ہم تعبیر کیسے بتلائیں؟ اس نے غضبناک ہو کر کہا کہ "میں نے تمہیں اسی قسم کے انکشاف کے لئے تو دربار میں اس رتبہ تک پہنچایا تھا (جب تم ایسے امور کا بھی انکشاف نہیں کر سکتے تو تم کس مرض کی دوا ہو؟) جاؤ تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اگر تم نے اس مدت میں خواب اور تعبیر بتلا دی فبہا، ورنہ تم سب قتل کر دیئے جاؤ گے"۔ اس واقعہ کا چرچا ہو گیا شدہ شدہ یہ خبر جیل میں بھی پہنچی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے کان میں پڑی۔ آپ علیہ السلام نے جیلر سے فرمایا جو ان کا بہت زیادہ معتقد اور محسن تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دے۔ کیوں کہ میرے پاس اس کے خواب کا علم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے بادشاہ کے یہاں تیرا رتبہ اور منصب بڑھ جائے گا اور میری رہائی کی صورت نکل آئے گی (جس سے میری قوم اس قید و بند کے عذاب سے چھٹکارا پا سکے گی) جیلر

نے کہا، مجھے آپ کے بارے میں بادشاہ کے بے پناہ غصہ کا ڈر ہے کہ کہیں آپ جیل کے مصائب سے چھوٹنے کے لئے فرمار ہے ہیں یا واقعی آپ کو علم ہے۔ حالاں کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ کے اس فراموش شدہ خواب کا علم ہے تو وہ صرف آپ ہی کی ذات ہے۔ فرمایا، تم میرا خوف نہ کھاؤ اور بے فکر ہو کر بادشاہ سے میرا تذکرہ کردو (میں قطعاً اس کے خواب اور تعبیر خواب کو جانتا ہوں) جس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جو مجھے ان باتوں کی خبریں دے دیتا ہے، جن کو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جیلر نے بادشاہ سے جا کر تذکرہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت حضرت دانیال علیہ السلام کو طلب کر لیا اور وہ شاہی دربار تک پہنچا دیئے گئے۔ دربار کا ضابطہ تھا کہ اندر داخل ہونے والا، بادشاہ کو سجدہ کرے۔ لیکن دانیال علیہ السلام داخلِ دربار ہو کر کھڑے رہے اور سجدہ نہ کیا۔ تھوڑے وقفہ سے بادشاہ نے دربار برخاست کیا اور تخلیہ میں حضرت دانیال علیہ السلام سے گفتگو شروع کی۔

سب سے پہلے پوچھا کہ آداب دربار کے مطابق آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ فرمایا: اس کی وجہ ہے کہ میرا ایک رب ہے، اس کا حکم ہے کہ میں اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کروں۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میں تجھے سجدہ کرلوں اور وہ اسی وقت یہ علم مجھ سے سلب کرلے، تو میں تیرا خواب نہ بتلانے کے سبب تیرے ہاتھ میں قیدی بن کر رہ جاؤں اور تو مجھ سے اس علم کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور مجھے قتل کر ڈالے۔ اس لئے میں نے ترک سجدہ قتل سے آسان سمجھا اور ترک سجدہ کے خطرہ کو اس خطرہ سے ہلکا سمجھا کہ تو ساری عمر اس بے چینی میں مبتلا رہے۔ جس میں فراموش شدہ خواب کی وجہ سے اب مبتلا ہے، پس میں نے ترک سجدہ کو تیرے اور اپنے دونوں ہی کے لئے مفید سمجھا۔

بخت نصر نے کہا کہ میرے نزدیک تجھ سے زیادہ اپنے الٰہ و معبود کا وفادار دوسرا نہیں اور بلاشبہ وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے رب کے عہد و میثاق کو پورا کرتے اور وفادار رہتے ہیں۔ ہاں تو کیا تیرے پاس میرے خواب اور اس کی تعبیر کا علم ہے؟ فرمایا: ہاں ہے۔

''تو نے خواب میں دیکھا کہ زمین و آسمان کے درمیان ایک عظیم الشان بت معلق ہے۔ جس کے پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں اور سر آسمان میں۔ اس بت کے اوپر کا حصہ سونے کا ہے، درمیانی حصہ چاندی کا ہے اور نچلا حصہ تانبے کا ہے، ٹانگیں لوہے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ تو اس کی خوبصورتی، حسن و جمال اور بے نظیر ساخت کو حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک زبردست پتھر گرا اور اس بت کی ٹوی پر آ کر اس زور سے پڑا کہ یہ بت پاش پاش ہو کر سرمہ کی طرح پس کر رہ گیا۔ اس کا سونا، چاندی، تانبہ، لوہا اور مٹی سب ایک رَل ہو کر اس طرح خلط ملط اور ڈھیر ہو گئے کہ یہ سب دھاتیں رل مل کر ایک ذات ہو گئیں اور کوئی دھات دوسری سے ممتاز اور جدا نہ رہی اور تو اس یقین پر پہنچ گیا کہ اب اگر دنیا کے تمام انسان اور جن بھی جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ان دھاتوں کو الگ الگ کر دیں تو نہیں کر سکتے۔ اگر اس حالت میں ہوا چل جائے تو (یہ دھاتیں پس کر اس درجہ سرمہ ہو گئی ہیں

کہ ہوا بھی ان ذرات کو اڑا سکتی ہے۔

اسی حالت میں تو نے دیکھا کہ وہ آسمان سے گرنے والا پتھر (اس بت کو پیس دینے کے بعد) اچانک فضائے آسمانی میں پھیلنا شروع ہوا، اور پھیلتے پھیلتے اتنا بڑا ہوگیا کہ پوری زمین پر چھا گیا، اور زمین اس سے چھپ گئی یہاں تک کہ آسمان اور اس پتھر کے سوا تجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

بخت نصر نے کہا بالکل درست، یہی تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا۔ اچھا اب اس کی تعبیر فرمایئے! حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا (سنیے) وہ بت دنیا کی مختلف قومیں ہیں جو دنیا کے اول و آخر اور درمیانی زمانوں میں (مختلف درجات و مراتب کے ساتھ آئیں گی اور) موجود ہیں۔ سو اس بت کے سونے کا حصہ تو یہ موجودہ دور اور تیری قوم ہے، جس پر تو حکمرانی کر رہا ہے اور چاندی کا حصہ تیرے بعد کی قوم ہے، جس پر تیرا بیٹا حکمرانی کرے گا۔ اور تانبے کا حصہ رومی قوم ہے اور لوہے کا حصہ فارسی قوم ہے۔ اور مٹی کا حصہ دو اور قومیں ہیں جن پر دو عورتیں حکمرانی کریں گی۔ ایک مشرقی یمن میں اور ایک مغربی شام اور وہ پتھر جو اس خوش نما بت کے اوپر آسمان سے پھینکا گیا، وہ دین ہے جو کہ نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آویں گے وہ اور ان کی امت اس دین کو ان قومیتوں کے بت پر پھینک مارے گی تا کہ اس دین کو تمام اقوام کے ادیان پر غالب کر دے۔ (قومیتوں کی اونچ نیچ کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دے) پس اللہ تعالیٰ ایک نبی امی کو عرب میں مبعوث کرے گا جو تمام امتوں قومیتوں اور متخالف مذہبوں کو توڑ پھوڑ کر مذہب واحد کر دے گا۔ جس طرح اس پتھر نے بت کی تمام اونچی نیچی دھاتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک کر دیا (اور پھر وہ آخری دین) اسی طرح پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ جس طرح وہ پتھر بت کو توڑ کر خود ساری فضاء میں چھا گیا۔

حق تعالیٰ اپنے دین کو خالص کر دے گا، باطل کا سر نیچا ہو جائے گا، راہ ہدایت سامنے آجائے گی۔ ضلالت گم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ امیوں (ان پڑھوں) کو اس دین کی تعلیم دے گا اور دین کے ذریعہ ضعفاء کو (جنہیں اچھوت بنا دیا گیا تھا) قوت عطاء کرے گا۔ ذلیل اس سے عزت پائیں گے اور کمزوروں کو اس سے مدد ہوگی۔

(بادشاہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے انتہائی عقیدت سے) عرض کیا کہ میں نے جب سے سلطنت سنبھالی ہے میری نظر سے آپ جیسا شخص نہیں گزرا، جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی کسی کیفیت (دہشت و بے چینی) کو اس طرح چھانٹ دیا ہو اور اب میرے دربار میں آپ سے زیادہ کوئی بارتبہ نہ ہوگا۔ میں آپ کو اس احسان عظیم کے بقدر ہی صلہ دوں گا۔ ①

دین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم......اس حدیث صاف سے واضح ہے کہ خاتم الانبیاء کا دین جو دنیا کے آخری دور میں ظاہر ہوگا (جیسا کہ ہو چکا ہے) ان تمام قومی نسلی اور وطنی امتیازات کو پاش پاش کر ڈالے گا اور اس

① تفسیر الطبری، سورۃ الاسراء، الآیۃ:۷، ج:۱۷، ص:۳۷۷.

طرح دنیا کی متفاوت قومیتیں اور اونچی نیچی ذاتیں رل مل کر ایک ذات ہو جائیں گی۔ چھوت چھات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ وہی قومیں جن کا مذہب ہی اونچ نیچ اور چھوت چھات تھا، خود اپنے اس مذہب پر لعنتیں بھیجنے لگیں گی۔ حتیٰ کہ سارے رجعت پسند لیڈر مل کر بھی اگر ان امتیازات کو پھر لوٹانا چاہیں گے تو نہیں لوٹا سکیں گے اور اس طرح پوری دنیا میں ایک قوم ہو گی، ایک ازم ہو گا اور دنیا کی اس واحد قوم کی عالمی حکومت ہو گی۔

پھر جب یہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو چکی کہ سارے عقلاء و مدبرین اصول مساوات کو تمدنی، معاشی اور معاشرتی حیثیت سے قولاً وعملاً وقلباً قبول کرتے جا رہے ہیں اور اس کے فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں۔ تو جس اسلام میں اس کی مکمل تعلیم تیرہ سو برس سے موجود ہے۔ اس مذہب کے دوسرے اصول بھی قابل غور ہو جاتے ہیں اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ چیز پیش کر رہا ہوں کہ یقیناً اسلام کے تمام اصول اسی طرح مکمل اور بہترین ہیں۔ پھر جس طرح دنیاوی ضروریات کے لئے سب نے وصول اسلام کو قبول کر لیا ہے تو کیوں نہ روحانی حیثیتوں سے بھی اسلامی اصول کو تسلیم کیا جائے۔ تعصبات سے ہٹ کر سنجیدگی سے گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو ان شاء اللہ اسلام ہی ایسا مذہب ظاہر ہو گا جو شخصی جذبات کو تو نہیں، لیکن سلیم الطبع ہر مدبر و سنجیدہ انسان کے قلب و دماغ کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیا و آخرت

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو ایک راستہ ہے یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ. ① ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ جیسا بیج یہاں ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے۔ تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل آئے گا۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلَى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ٥ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۗ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ ② صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

احوال واقعی...... بزرگان محترم! مجھے اس وقت کوئی لمبی تقریر کرنی نہیں ہے۔ وقت بھی تھوڑا ہے۔ اور میں بھی اس وقت تھکا ہوا ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوں اور عوارض کے لحاظ سے بھی۔ اس لئے زیادہ بولنے کی ہمت نہیں، مختصر طریق پر اس آیت کریمہ کی روشنی میں ''چند باتیں'' آپ حضرات کی خدمت میں گزارش کرنی ہیں۔

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال فی المقاصد لم اقف علیه مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء، وقال القاری: قلت معناه صحیح مقتبس من قوله تعالیٰ ''من کان یرید حرث الآخرة نزد له فی حرثه'' دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص ۴۱۲. ② پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۶۴، ۶۵، ۶۶.

تذکرۂ دنیا کا مقصد......اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ، نے دو عالموں کا ذکر فرمایا ہے۔ایک عالم دنیا اور ایک عالم آخرت۔عالم دنیا کا ذکر اس لئے کیا کہ ہم اس میں آباد ہیں۔ ہمارے فرائض بتلانے کے لئے دنیا کا ذکر کیا گیا ہے، دنیا کو منوانے یا دنیا پر ایمان لانے کے لئے تذکرہ نہیں کیا گیا۔اس لئے کہ ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔''انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اعتماد کر کے کسی چیز کو ماننا'' یہ ایمان ہے آنکھ سے دیکھ کر ماننا یہ ایمان نہیں ہے یا عقل سے سمجھ کر مان لینا، اسے ایمان نہیں کہتے۔کوئی یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایمان لایا کہ دو کا دگنا چار ہوتا ہے۔یہ ایک عقلی چیز ہے، ایمان لانے کی چیز نہیں، محسوسات میں سے ہے، یا جب صبح آفتاب نکلے تو کوئی یوں نہیں کہے گا کہ میں ایمان لایا کہ سورج نکل آیا ہے وہ ایمان لانے کی چیز نہیں، وہ تو آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہے۔غرض ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔اور وہ بھی پیغمبر کے منہ پر اعتماد اور اطمینان کر کے جیسے وہ فرمائیں ویسے مان لینا اسے ایمان کہتے ہیں۔

بہر حال اس آیت کریمہ میں دنیا کا ذکر ایمان لانے کے لئے نہیں فرائض بتلانے کے لئے کیا۔

تذکرۂ آخرت کا مقصد......اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا ہے کیوں کہ وہ آنکھوں کے سامنے موجود نہیں۔آخرت کی پہلی منزل ''عالم برزخ'' ہے جسے قبر کہتے ہیں۔اس کے حالات کو نہ عقل معلوم کر سکتی ہے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔بجز اس کے کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خبر پر اطمینان کیا جائے اور کوئی صورت نہیں۔عالم آخرت کا برپا ہونا، میدان محشر کے حالات، جنت و دوزخ کا وجود، پل صراط اور میزان کا وجود آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ عقل نے دریافت کیا۔اس کو ماننا یہ ایمان ہے۔غرض دنیا کا ذکر احکام کو بتلانے کے لئے کیا گیا ہے اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا گیا ہے۔

آخرت کو عقل سے سمجھنے کا نقصان......جن قوموں نے آخرت کو عقل سے سمجھنا چاہا ہے، انہوں نے بہت ٹھوکریں کھائیں اور وہ حقیقت حال نہیں سمجھ سکیں کیوں کہ عقل غیبی امور کا ادراک نہیں کر سکتی۔

عقل تو ان محسوسات میں آنکھ سے دیکھی چیز، کان سے سنی چیز یا ناک سے سونگھی چیز ان میں سے کچھ نتائج نکالتی ہے۔لیکن غیبی امور کو پا لینا یا پرکھ لینا یہ عقل کا کام نہیں ہے یہ وحی کا کام ہے اور وحی ہی یہ خبر دے سکتی ہے۔کہ غیب کیا چیز ہے؟ عالم غیب میں کیا واقعات پیش آئیں گے؟ اس میں عقل در کار نہیں ہے نہ عقل کار آمد ہے نہ عقل اس میں چل سکتی ہے، غرض جن قوموں نے آخرت کو محض نشانہ بنایا، انہوں نے ٹھوکریں کھائیں۔

منکرین آخرت کا نظریہ......بعض قوموں نے تو یہ سمجھا کہ آخرت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، صرف دنیا ہی کا عالم ہے، آگے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں جب آدمی مر گیا تو فنا ہو گیا، اب وہ نہ آئے گا نہ پہلے تھا، نہ آئندہ ہوگا، بس قصہ ختم ہوا۔وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں کہ جزا و سزا ہوگی، حساب و کتاب ہوگا اور اللہ کے آگے بندوں کی پیشی ہوگی۔وہ نہیں مانتے۔اس لئے کہ کرام انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اطمینان نہیں رکھتے بلکہ وہ عقل پر پرکھتے ہیں۔ظاہر بات ہے کہ عقل مرنے کے بعد کی چیزوں کی کوئی خبر نہیں دے سکتی، اس واسطے انہوں نے انکار

کر دیا۔ اور موت کے معنی ''فنائے محض'' کے سمجھے کہ بس گیا سو گیا، جیسے پہلے نہیں تھا ویسے ہی آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ غرض بعض اقوام نے ایک نظریہ یہ قائم کیا کہ جو کچھ ہے معاذ اللہ وہ دنیا ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔

دنیا کو فقط ''راہ گزر'' ماننے کا نظریہ...... بعض قوموں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اصل آخرت ہے، دنیا اس کا راستہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی عالم آخرت آئے گا۔ جو دنیا میں نہیں آیا، پیدا نہیں ہوا اس کے لیے آخرت بھی نہیں۔ جو دنیا میں آ گیا، پیدا ہو گیا پھر اس نے انتقال کیا اس کے لئے عالم آخرت ہے۔ غرض دنیا ایک راستہ اور راہ گزر ہے، آنے والی چیز آخرت ہے۔ وہی اصل منزل و مقصد ہے وہیں جانا ہے۔ تو ایک یہ نظریہ کہ آخرت کو مانا مگر اس کے ساتھ دنیا کو محض ایک راہ گزر مانا۔

پہلے نظریئے کے دنیوی آثار...... ان دونوں نظریات کے اقوام پر دو اثر پڑے، جنہوں نے کہا کہ فقط دنیا ہی کا عالم ہے آخرت آنے والی نہیں۔ وہاں سے تمدن کا غلو برپا ہوا۔ انہوں نے کہا جب دنیا ہی دنیا ہے تو عیش اڑانے میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

بابر بہ عیش کوش کہ ایں عالم دوام نیست

کھانا، پینا، پہننا اور رہنا سہنا، نیز کوٹھی اور بنگلے، یہی ان کی دنیا ہے اور یہی ان کی آخرت ہے۔ اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ نہ ان کو حلال اور حرام کی تمیز کی ضرورت۔ جب دنیا ہی دنیا ہے آگے کہیں جانا نہیں۔ کوئی حساب دینا نہیں۔ اس لئے جائز و ناجائز کی بحث ہی نہیں آتی، بس جس طرح سے ہو عیش اڑاؤ۔ اس طرح سے تمدن کا غلو اور تمدن میں مبالغے برپا ہوئے کہ فقط یہی نہیں کہ آدمی اچھا کھا لے، پی لے اور اچھا پہن کر گزر کر لے۔ بلکہ کھانے اور پینے میں اتنا مبالغہ اور اتنے تکلفات بھی جہاں عقل بھی نہ پہنچے، وہ تکلفات بھی پیدا کئے جا رہے ہیں۔ غرض دنیا کو سجا دینے کا نام زندگی ہے۔ وہ نہ سجے تو انسان کی زندگی نہیں ہے۔ تو تمدن کے مبالغے، عیش و آرام کی چیزیں، کھانے اور پینے کے سامان، رہنے اور سہنے کے سامانوں میں مبالغے اتنے ہوئے کہ پچھلوں کی عقل میں بھی نہیں آ سکتے تھے کہ دنیا ترقی کر کے اس درجے پر پہنچ جائے گی، عیش و آرام کے اتنے سامان برپا ہو جائیں گے۔ غرض اس نظریئے کے تحت تمدن کا غلو پیدا ہوا کیوں کہ دیانت اور دین کوئی چیز نہ رہا۔ اللہ کے آگے حاضری اور حساب دینے کا کوئی سوال نہ رہا۔ دنیا ہی دنیا رہ گئی تو جس طرح سے چاہو اس کو برپا کر لو۔ جتنا چاہو اس کو برپا کر لو، جتنا چاہو اس میں عیش اڑا لو، بقول شاعر کہ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوام نیست

جتنی عیش اڑانی ہے اڑا لو آگے کچھ نہیں ہے۔ تو تمدن و مدنیت اور تمدنی سامانوں کی افراط پیدا ہوئی۔ اس لئے جو لوگ اس تمدن کے موجد ہیں انہیں شاید بھول کے بھی موت کا خیال نہیں آتا۔ بھول کر بھی قبر یا آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ ایک ہی تصور ہے کہ دنیا آنکھوں کے سامنے ہے، بس جس طرح چاہو اسے چلا لو۔ غرض ایک نظریہ تو یہ تھا اور

اس کا یہ اثر پڑا کہ دین ختم ہو گیا، دنیا رہ گئی۔ آخرت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، فقط دنیوی سامان سامنے رہ گئے۔

دوسرے نظریئے کے دنیوی آثار...... دوسرا نظریہ یہ تھا کہ آخرت ہے اور وہی مقصود ہے۔ دنیا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر جانا ہے۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ نہ صرف یہ کہ تمدن اختیار نہ کرو۔ بلکہ جتنا جسم کو عذاب دو، جتنا اسباب عیش کو ترک کرو، جتنی رہبانیت اختیار کرو وہی آخرت بنانے والی ہے۔ تو بعض اقوام نے یہی کیا۔

چنانچہ ہم نے برما میں دیکھا کہ ان کے جو مذہبی پیشوا ہیں جنہیں ''بھکشو'' کہتے ہیں، وہ نہ گھر بناتے ہیں، نہ نکاح نہ شادی نہ بیاہ۔ بلکہ کھانا پینا بھی خود نہیں پکاتے، بھیک بھی نہیں مانگتے۔ ان کا کام یہ ہے کہ صبح کو وہ نکل گئے، قوم جانتی ہے کہ کھانے کے لئے آئے ہیں۔ تو ہر گھر میں کھانے سے پہلے ایک آدھ روٹی ان کے نام کی رکھ لی جاتی ہے اور کچھ سالن رکھ دیا۔ جہاں وہ آئے انہیں دے دیا۔ یہ ان کا کھانا ہے۔ پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے ہیں۔ ایک دھوتی انہوں نے باندھ لی اور وہی اوڑھ لی۔ اور کہتے ہیں دنیا راہ گزر ہے۔ جتنا اس میں تکلف کیا جائے گا اتنا ہی آخرت فراموش ہو جائے گی۔ اور ہے اصل میں آخرت۔ بہر حال یہاں تمدن سرے سے ختم ہو گیا۔ پہلے نظریئے کے تحت تو تمدن ہی تمدن رہ گیا تھا اور دوسرے نظریئے کے تحت سرے سے تمدن ختم ہو کر دنیا لاشی، ہیچ اور فانی بن گئی کہ اس کے اندر ذرا سا بھی آرام کرنا یہ گویا آخرت کو کھو دینا ہے۔

عیسائیت اور دنیا...... عیسائیوں میں دیکھا گیا، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جتنا بدن کو تکلیف پہنچائی جائے اتنا ہی آخرت بنتی ہے۔ چنانچہ ان میں بعض رہبان دیکھے گئے، تاریخوں میں یہ موجود ہے کہ ایک گڑھا ہے اور اس میں گارا ہے اس میں پڑے برس گزارتے ہیں اور بڑی مکھیاں انہیں کاٹ رہی ہیں، بدن کے اوپر ورم چڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ گارے کے اندر پڑے ہوئے ہیں اور سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم آخرت میں جا رہے ہیں، دنیا سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ شادی بیاہ سے غرض نہیں، مکان بنانے سے غرض نہیں۔ اگر گرجا میں کوئی عورت ''نن'' (NUN) بن کے گئی تو وہ یہ عہد کر کے جاتی ہے کہ نہ شادی کرے گی نہ بیاہ کرے گی۔ لذات دنیا سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مرد جاتا ہے تو وہ عہد کر کے جاتا ہے نہ نکاح کرے گا نہ عورت اس کے گھر میں آئے گی، نہ گھر در ہوگا۔ غرض ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا برپا ہوا کہ آخرت فراموش ہو گئی۔ اور ایک نظریئے کے تحت تمدن اتنا مٹا کہ دنیا بے رونق ہو گئی۔ بس آخرت ہی آخرت پیش نظر ہے۔ وہ بنتی ہے یا نہ بنے، یہ الگ بات ہے۔ یہ دو متضاد نظریئے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے، آخرت ہی ایک چیز ہے۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہے دنیا ہے، آخرت کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلامی نقطہ نگاہ...... اسلام نے یہ تعلیم دی کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو راستہ ہے، یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: ''اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ.'' ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل۔

گندم از گندم بروید جوز جو   از مکافات عمل غافل مشو

گیہوں کا بیج ڈالو گے تو گیہوں اگے گا، کیکر کا بیج ڈالو گے تو کانٹے دار درخت اگے گا۔ سینڈھ کا بیج ڈالو گے بدبودار درخت اگے گا۔ غرض جیسا یہاں کروے گا ویسا ثمرہ سامنے آ جائے گا۔ تو آخرت سے دنیا بنتی ہے، یہ نہیں ہے کہ دنیا کا تعلق آخرت سے نہیں اور آخرت کا تعلق دنیا سے نہیں۔

دنیا میں رہنے کا انداز...... اب یہ کہ دنیا میں کس طرح سے رہو؟ تو اسلام نے یہ نہیں بتلایا کہ تم پھٹے حال سے رہو، تم بھک منگے بن کر رہو، گھر گھر بھیک مانگ کر معاذ اللہ اپنا پیٹ پال لیا کرو۔ فرمایا: ''اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی.'' ① ''اونچا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے''۔ مانگنے والا ہاتھ وہ کم رتبہ ہے اور عطاء کرنے والا ہاتھ بہتر ہے۔

اور فرمایا: ''کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ.'' ② ''حلال مال کا کمانا ایسا ہی فرض ہے جیسا نماز روزہ فرض ہے''۔ آدمی کا فرض ہے کہ وہ کمائے، وہ مانگ کر نہ کھائے، بلکہ دس کو کھلا کر کھانے کے بھی قابل ہو اس درجے پر آئے۔ غرض مسلمان کوئی بھک منگا نہیں بنایا گیا، کوئی سائل بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ بھکاری بنے۔ بلکہ عطاء کرنے والا بنا کر بھیجا گیا کہ دنیا کی اقوام کو کچھ دے، ان سے مانگنے کا روادار نہ ہو بلکہ معطی بنے، عطاء کرے اور وہ چیزیں دے جس کی دنیا محتاج ہے۔ ان کو دین کی طرف دعوت دے، اس دین کی طرف جس میں دنیا بھی برابر کی ہے اور آخرت بھی برابر ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ'' ③ اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس کے اوپر کچھ آنا چاہئے۔ کچھ ڈھنگ کا لباس ہو، کچھ ڈھنگ کا کھانا پینا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو۔ ڈھنگ سے ہو اور جمال کے ساتھ ہو۔ مبالغے کو تو روکا ہے کہ حدود سے مت گذرو۔ جیسے دین کے بارے میں فرمایا: ''لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ.'' ④ ''دین میں زیادہ مبالغے مت کرو کہ تحمل سے باہر ہو جائے۔ اتنا ہی عمل اختیار کرو جسے عمر بھر نبھا دو'' اسی طرح دنیا کے بارے میں فرمایا کہ اتنا مبالغہ مت کرو کہ وہ آخرت کے بھلانے کا ذریعہ بن جائے۔ اتنی دنیا اختیار کرو کہ عیش و آرام سے گزر بسر کرو۔ دوسرے کو کھلا کر خود کھا سکو۔ یہ ضرور کرو۔ مگر اپنی آخرت کو مت بھلاؤ کہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جاؤ کہ دل سے موت کا تصور ہی نکل جائے۔ اس سے روکا ہے۔ یہ غلو اور مبالغہ ہے۔

دولت وعبادت کا باہمی ارتباط...... حدیث میں فرمایا گیا (جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے) تم اس طرح

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلیٰ ج: ۱، ص: ۳۳۲.

② شعب الایمان للبیھقی، الستون من شعب الایمان وھو باب فی حقوق الاولاد، ج: ۱۸، ص: ۱۲۶.

③ السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ تعالیٰ یحب ان یریٰ، ج: ۱۰، ص: ۲۰.

④ پارہ: ۶، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۷۱.

زندگی بسر کرو اور زہد و قناعت کے یہ معنی سمجھو کہ جب دنیا سے جاؤ تو کوئی چیز پیچھے چھوڑ کے نہ جاؤ، (اور نہ یہ کہ) اولاد بھک منگی ہو۔ فرمایا۔ ''یہ بہتر نہیں ہے''۔ یہ بہتر ہے کہ اپنی زندگی میں اولاد کے لئے کچھ سامان کرتے جاؤ۔
یہ جبھی تو ہوگا جب آدمی کچھ کمائے گا، کچھ دولت فراہم کرے گا، کچھ بچوں کے لئے چھوڑے گا، کچھ ان کی خدمت کرے گا، کچھ عزیز و اقرباء کی خدمت کرے گا۔ ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں، آپ زکوٰۃ کیسے دیں گے؟ تو ایک فرض سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں مال نہیں حج کیسے کریں گے؟ تو حج کی دولت سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں تو غرباء کی خدمت کیسے کریں گے؟ تو عطایا سے آپ محروم ہو گئے غرض ہزاروں عبادتیں ہیں، جو دولت پر موقوف ہیں۔
میں کہتا ہوں کہ یہ جو مساجد میں آپ نماز پڑھ رہے ہیں یہ بھی تو دولت پر موقوف ہے، دولت ہاتھ میں نہ ہوتی تو اتنی خوشنما مسجد کہاں سے بنتی؟ اللہ کا گھر اتنا آراستہ کیسے ہوتا؟ اور یہ بہترین قالین کی جانمازیں جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے کہ اللہ کے گھر کو سجا رکھا ہے۔ یہ دولت ہی کا تو کرشمہ ہے۔ تو دولت پر نماز بھی موقوف، حج بھی موقوف، زکوٰۃ بھی موقوف اور صدقات بھی موقوف، ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اسلام جامع دین تھا وہ دولت کو حرام کیسے قرار دیتا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آدمی کو ساری عبادتوں سے محروم بناتا۔ اس واسطے اس نے یہ حکم دیا۔ ''کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ'' ''حلال کی کمائی کرنا انسان کے اوپر ایسا ہی فرض جیسا نماز روزہ فرض ہے''۔
مقصد تو یہ ہو کہ میں کسی کا محتاج بن کے نہ رہوں اتنا کمائے، مگر اب اللہ برکت دے اور لکھ پتی بنا دے تو اس کی اجازت بھی نہیں دی کہ اس مال کو ضائع کر دو یا سمندر میں بہا دو۔ اس کو اس کے مصرف میں جائز اور حلال طریق پر خرچ کرو۔ غرض حلال ہی طریق پر کماؤ اور حلال طریق پر اسے صرف کرو تو یہ صرف کرنا اور کمانا یہ سب عبادت میں داخل ہوگا۔ اس لئے کہ یہ عبادت کا وسیلہ ہے۔

وسائل عبادت کا حکم...... اور وسیلہ کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقصد کا ہوتا ہے، جب مقصد عبادت ہے تو اس کا وسیلہ بھی عبادت ہے۔ آپ جو نماز پڑھ رہے ہیں اس کا وسیلہ وضو ہے اس لئے وضو بھی عبادت میں داخل ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وضو پر کوئی ثواب نہ ملے۔ البتہ نیت شرط ہے۔ بلا نیت وضو کریں گے تو پاکی تو حاصل ہو جائے گی، نماز بھی جائز ہوگی، مگر وضو پر ثواب نہیں ملے گا۔ جب تک آپ یہ نیت نہ کریں کہ اس لئے وضو کر رہا ہوں کہ یہ نماز کا وسیلہ ہے، تو وضو بھی عبادت ہے اس لئے کہ نماز کا وسیلہ ہے۔

دنیا وسیلۂ آخرت...... اسی لئے ساری دنیا مسلمان کے لئے دین کا وسیلہ بنائی گئی ہے۔ ''اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ.'' ① ''دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو''۔

① شعب الایمان للبیهقی، فصل فیما یقول العاطس فی جواب التشمیت، ج: ۲۲، ص: ۶، رقم: ۱۰۱۸۵. حدیث منقطع ہے۔ دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۷ ص: ۲۶۲ رقم: ۳۱۸۷.

تو دنیا آخرت کے لئے کماؤ۔ خدمت واطاعت کے لئے۔ اور یہ ساری چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ غرض کمانا اور خرچ کرنا یہ سب طاعت میں داخل ہے، بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور رضائے خداوندی مقصود ہو۔

اسی لئے قرآن کریم میں بعض آیتوں میں تو مذمت کی گئی ہے اور بعض میں مدح کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔ ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ﴾ ① "یہ تمہاری اولادیں اور یہ تمہارے مال تمہارے لئے فتنہ ہیں اور آزمائش کی چیزیں ہیں"۔ تو اس سے ایک گونہ مذمت نکلی۔ دوسری جگہ حدیث میں ارشاد فرمایا۔ "نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ." ② "اچھے انسان کا اچھا مال وہ بہترین متاع اور بہترین پونجی ہے"۔ تو یہاں مال کی تعریف کی ہے۔ غرض ایک جگہ ہے مذمت اور ایک جگہ مدح ہے۔ مذمت اس لئے ہے کہ رضائے خداوندی اور جائز طریق پیش نظر نہ ہو۔ مدح اس لئے کہ رضائے خداوندی مقصود ہے اس کے لئے آدمی بڑھ رہا ہے اور اس کے دائرے میں رہ کر کما رہا ہے۔ وہ مال بھی مبارک اور کمانے والا بھی مبارک۔

اگر مال مطلقاً مذمت کی چیز ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی دولت مند نہ ہوتا۔ حالاں کہ ان میں لکھ پتی بھی ہیں، ان میں کروڑ پتی بھی ہیں، ہزار پتی بھی ہیں۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کے اندر کروڑ پتی، لکھ پتی لوگ موجود ہیں۔

کروڑ پتی امام...... آپ ہی کے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ جن کی فقہ پر آپ چل رہے ہیں، کے ہاں ریشمی کپڑے کی تجارت تھی اور یہ نہیں کہ کوئی ایک آدھ دکان لگی ہوئی ہو کہ ریشمی کپڑا فروخت ہو گیا، بلکہ کپڑے بنانے کے کارخانے تھے اور ملکوں میں کپڑا اسپلائی ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے امام صاحب گویا کروڑ پتی تھے، حتیٰ کہ وفات ہوئی تو مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے خزانے کے اندر کروڑوں روپیہ جمع تھا جس میں کچھ وصیتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ اولاد پر تقسیم ہوا۔

تجارت میں امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط...... بایں ہمہ کمانا بھی انتہائی حلال کا تھا۔ چنانچہ ان کے واقعات میں موجود ہے کہ امام صاحب نے ایک شخص کو تجارت کے لئے وکیل بنا کر بھیجا اور فرمایا مصر میں جا کر اس مال کو بیچو۔ اول تو اس شخص نے یہ کیا کہ بیچنے میں کچھ تاخیر کی کہ ذرا مانگ کچھ بڑھ جائے اور مال کچھ گراں ہو، تب بیچوں۔ چنانچہ مہینہ بھر روکے رکھا۔ مہینہ بھر کے بعد قیمت چڑھ گئی تو ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ کمایا، کافی نفع ملا۔

دوسرا اس نے یہ کیا کہ جب مانگ بڑھی تو اس نے ایک پیسہ فی روپیہ اس کی قیمت بڑھا دی۔ گاہک زیادہ تھے تو دو لاکھ کے اڑھائی لاکھ وصول ہوئے۔ یہ رقم لا کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدمت میں پیش کی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اندازہ یہ تھا کہ ستر، اسی ہزار روپیہ نفع ہوگا، وہاں اڑھائی لاکھ نفع سامنے آیا۔ فرمایا اتنا نفع کیسے ہوا؟ اس نے کہا، اول تو میں نے بیچنے میں تقریباً ایک ماہ کی تاخیر کی تا کہ کچھ مانگ بڑھ جائے، کچھ گرانی ہو جائے

① پارہ: ۲۸، سورۃ التغابن، الآیۃ: ۱۵.

② مسند احمد، حدیث عمرو بن العاصؓ، ج: ۳۶، ص: ۱۶۵.

اوراس کے ساتھ میں نے ایک پیسہ فی روپیہ بڑھادیا۔

فرمایا: ''نعوذ باللہ! پہلی صورت ''احتکار'' کی تھی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تاخیر کروتا کہ گاہک مجبور ہو کر خریدے۔ تو گاہک کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا یہ حرام خوری ہے۔ غرض احتکار کیا جو شریعت میں ممنوع ہے کہ مال بیچنے میں اس لئے تاخیر کرو کہ اس کی قیمت زیادہ اٹھے گی۔ بلکہ اپنے وقت پر بیچو۔ عام طور سے جتنی قیمت ہے اس پر فروخت کردو۔ مال کا انتظار میں رکھنا کہ قیمت چوگنی ہو جائے، شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے''۔ پھر فرمایا کہ ''ایک پیسہ فی روپیہ بڑھا کر تم نے غبن فاحش کیا، شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی''۔ فرمایا۔ ''اب یہ تو مشکل ہے کہ تمہیں اڑھائی لاکھ روپے دے کر بھیجوں کہ لوگوں کو واپس کرو، خدا جانے کوئی گاہک کہاں کا ہوگا کوئی کہاں کا؟ لہٰذا ایک پائی بھی میرے خزانے میں داخل نہ کی جائے۔ ابھی اس مال کو غریبوں پر صدقہ کردیا جائے''۔ تو اڑھائی لاکھ روپے اسی وقت غریبوں میں تقسیم کردے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ کمائی کی صورت تھی کہ انتہائی احتیاط کے ساتھ فروختگی ہوتی اور مال کمایا جاتا۔

مصارف سے مداخل کا اندازہ...... جب جائز طریق پر مال آتا تھا اس کے بعد میں تو جائز ہی طریق پر خرچ بھی ہوتا تھا۔ جیسے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ''میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ جس جگہ صرف ہوتا ہے سمجھ لیتا ہوں کہ اگر یہ اچھی جگہ ہے تو آیا بھی اچھے طریق سے ہے۔ اگر حرام جگہ صرف ہو رہا ہے تو سمجھ لیتا ہوں کہ حرام ہی کی کمائی ہے۔ غرض مصرف دیکھ کر اس کے مدخل کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ کس طرح سے آیا ہوگا''۔ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مال پاک اور انتہائی پاکیزہ طریق پر آتا تھا تو خرچ بھی ایسے راستوں میں ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے علماء کرام کی تنخواہیں...... امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس بنائی جس میں تقریباً چار، پانچ سو علماء کرام اور محض علماء نہیں بلکہ اپنے اپنے فن کے امام اس میں جمع کئے۔ کوئی تفسیر کا امام، کوئی حدیث کا امام، کوئی لغت کا امام اور کوئی فقہ کا امام۔ ان سب پر مشتمل مجلس بنائی اور فقہ کے مسائل مرتب ہونا شروع ہوئے۔ اجتہاد اور استنباط سے مسائل نکالے گئے۔ ایک مسئلہ اس مجلس میں پیش ہوتا اور ہفتوں اس پر بحث ہوتی۔ نکھر نکھرا کر جو اخیر میں نکھری ہوئی بات نکلتی ہو، مرتب کرکے لکھی جاتی کہ یہ قرآن وحدیث سے قریب تر ثابت ہے۔ یہی آپ کا فقہ حنفی ہے۔ تو ان چار، پانچ سو علماء کرام کی تنخواہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خزانے سے دی جاتی۔ کسی کے ایک ہزار ماہوار مقرر، کسی کے دو ہزار اور کسی کے تین ہزار اس طرح لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ اس پر ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا غرباء پر خرچ...... پھر یہ الگ تھا کہ صدقات وخیرات کے اندر کوفے کے جتنے گھرانے تھے، ان کی فہرستیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں لکھی ہوئی تھیں کہ فلاں گھر میں اتنے بڑے

ہیں، اتنے بچے ہیں، اتنی عورتیں ہیں اور اتنے مرد اور غریب ہیں۔ بس روز روز کا کھا پی لیتے ہیں اور پس انداز ہ (بچایا ہوا) اور پیچھے کچھ چھوٹا ہوا نہیں۔

ہر گھر میں جتنے افراد ہوتے اور کوفے کے اندر جتنے غریبوں کے گھر ہیں سب کے لئے لباس ان کی قد و قامت کے مناسب رمضان میں تیار ہوتے۔ عید کا چاند دیکھا گیا اور فجر کی نماز سے پہلے ہر گھر میں گھر کے افراد کی تعداد کے مطابق لباس پہنچ جاتا تھا۔ تو غرباء کہتے تھے کہ ہم غریب نہیں، ہماری عید بھی امیروں کی سی ہے۔ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ غرض یہ خرچ الگ تھا کہ کوئی غریب گھرانہ خالی نہ رہتا تھا کہ ان کی عید نہ ہو۔ اعلیٰ ترین لباس جتنا اس کے مناسب حال ہے پہنچتا تھا۔ تو علماء پر لاکھوں کا یہ خرچ تھا اور غرباء پر یہ خرچ تھا۔

ایک مقروض سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ...... پھر اوپر سے قرض کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ قرض لیتے تھے۔ کسی کو پچاس ہزار کی ضرورت ہے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ دے دیتے تھے، تیس ہزار کی ضرورت ہے تو دے دیتے تھے۔

اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ لینے کے بعد ان کی نیت بدل گئی، دینے کو جی نہ چاہا۔ چنانچہ ایک شخص نے پچاس ہزار کا قرض لیا۔ اب یا تو یہ کہ دینے کی قوت نہیں رہی تھی یا یہ کہ اتنی بڑی رقم کیسے واپس کروں۔ تو کترانا شروع کیا۔ دیکھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے ہیں تو کسی گلی میں گھس گیا۔ پھر دیکھا کہ ادھر سے آ رہے ہیں تو دوسری گلی میں گھس گیا۔ سامنے نہیں ہوتا تھا، شرمندہ ہوتا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سمجھ گئے کہ اس کی نیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے تھے وہ دیکھ کر دوسری گلی میں گھسا۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ لپک کر اسی گلی میں گھسے اور جا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

''بھائی! ہم نے کیا قصور کیا جو ہم سے کترانے لگے؟ ہم کوئی اچھوت اقوام میں سے ہیں کہ ہم سے کنارے کنارے چلو؟ آخر کیا وجہ ہے؟'' اب وہ چپ، کیا کہے دل میں چور تھا ہی۔ فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے پیسے واپس کرنے کو جی نہیں چاہتا''۔ یہ نہیں فرمایا کہ پاس نہیں ہیں۔ وہ خود مالدار آدمی تھا۔ یہ فرمایا کہ قرض ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کترانے کی یہ وجہ ہے۔ فرمایا: مال بھی ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے تعلقات خراب کیے جائیں؟ پچاس کا پچاس ہزار روپیہ بالکل معاف۔ مگر تعلقات پہ پانی نہیں پھیرنا چاہئے۔ آمد و رفت ویسی ہی جاری رکھنی چاہئے۔ بالکل معاف ہے۔ تمہیں ایک پائی بھی دینی نہیں پڑے گی'۔

سینکڑوں واقعات ہیں کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قرضے معاف کر دیئے۔ یہ سخاوت کا دریا جاری تھا۔ تو کمانا بھی انتہائی احتیاط کا اور خرچ کرنا بھی انتہائی احتیاط کا تھا۔

عبادتِ مالیہ کی توفیق کا معیار...... اس لئے شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میں مال کے مصرف کو دیکھ کر اس کے آنے کے راستہ کا پتہ چلا لیتا ہوں، اگر مصرف صحیح ہے تو آیا بھی صحیح راستہ ہے اور اگر مصرف غلط

ہے تو آیا بھی غلط راستہ سے ہے۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

جو ناجائز یا غیر محتاط طریق پر کمایا جاتا ہے وہ خرچ بھی ایسے ہی مصارف پر ہوتا ہے، اس مال کے لئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جو ناجائز طریق پر کمایا گیا ہو۔

اظہار نعمت کا موقع...... بہر حال میرا مقصد یہ تھا کہ اسلام نے دنیا کو لاشی اور ہیچ نہیں قرار دیا کہ آخرت کو پیش نظر رکھو اور دنیا میں بھک منگے بن کے رہو، دنیا میں بالکل ژولید (پریشان) حال ہو کر رہو اور پھٹے حال سے رہو، یہ نہیں فرمایا بلکہ: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یَّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ.'' ① ''جس بندے کو اللہ نعمت دے تو اللہ کو یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا کچھ اثر آئے''

کچھ لباس ڈھنگ کا ہو۔ کچھ کھانا بھی ڈھنگ کا ہو۔ کچھ رہنا سہنا بھی ڈھنگ سے ہو۔ اور کچھ معاشرت بھی اچھی ہو۔ یہ نہیں کہ پھٹے حال سے رہے۔

شخصی احوال قابل اتباع نہیں...... اب بعض کو یہ شبہ ہوگا کہ بعض احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ نے تو ٹاٹ تک پہنا ہے۔ اچھے کپڑے چھوڑ دیئے۔ وہ ان کا حال قانون نہیں ہوتا۔ یہ قانون شریعت ہے، باقی کسی پر زہد و قناعت کا حال غالب آجائے اور وہ سارا مال دولت صدقہ کر کے قبرستان میں جا بیٹھے، وہ اس کا حال ہے۔ اسے برا نہیں کہا جائے گا۔ وہ اپنے حال میں مگن ہے لیکن اسے قانون نہیں بنایا جائے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دی جائے۔ دعوت اس چیز کی دی جائے گی جس کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قانون غیبی پیش کیا، قانون وہی رہے گا۔ لوگوں کے احوال قانون نہیں بن سکتے، ان لوگوں کی عظمت کی جائے گی، انکی عزت کی جائے گی۔ ان کے اس فعل کو بڑا سمجھا جائے گا، مگر قانون نہیں بنایا جائے گا کہ اس فعل کی آپ تبلیغ کریں کہ فلاں نے سارا گھر چھوڑ دیا تھا لہٰذا تم بھی چھوڑ دو۔ غرض یہ قانون نہیں، شخصی حال ہے۔ آپ کے اندر وہ حال آجائے گا، آپ اس پر عمل کریں پھر کوئی روکنے والا نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی اتباع...... بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کو اپنا مذہب قرار دیا۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان وہ ہے کہ کون ان کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سید الانبیاء ہیں، تو آپ کی زندگی اور بھی اونچی ہے اور بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے ہر ایک اس کے اوپر چل نہیں سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ گنے چنے ہیں جو اس شان پر چلے ہیں، جو خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی شان تھی اس لئے وہ شہروں میں نہیں رہ سکے۔

چنانچہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا زہد و قناعت مشہور ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ تعالیٰ یحب ان یریٰ، ج: ۱۰، ص: ۲۰.

عنہ کا دورِ خلافت تھا۔ یہ شام میں گئے اور شام میں تمدن و تکلفات اور کھانا، پینا خوب تھا۔ وہ غربت تھوڑا ہی رہی تھی جو عربوں میں تھی۔

مکانات اور بلڈنگیں بھی ہیں کھانے پینے کی بھی متعدد چیزیں ہیں، لباس بھی عمدہ ہے۔ اب جس کے ہاں دیکھا کہ دستر خوان پر دو کھانے تھے، بس ڈنڈا لے کر وہاں پہنچے اور فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر کب دو کھانے آئے؟ ابھی صدقہ کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین ڈر کے مارے صدقہ کر دیتے تھے۔ کسی کے گھر میں ایک لباس کے علاوہ دوسرا جوڑا بھی موجود ہے، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دوسرا جوڑا کب تھا؟ تو تمہارے لئے رکھنا کب جائز ہے؟ یا کسی کے پاس کچھ پیسہ جمع ہو گیا، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کب دولت جمع تھی جو تم نے جمع کی، ابھی صدقہ کرو''۔ حتیٰ کہ لوگ عاجز آ گئے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا کہ: ''انہوں نے ہماری زندگی تنگ کر دی۔ ہم قانونِ شریعت پر چلتے ہیں، قانون میں گنجائش ہے، توسعات ہیں''۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک ...... اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت اعلیٰ عزیمت کی زندگی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہو بہو اس کی پیروی کر سکے۔ ہر ایک کی قوت نہیں۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''مغرب کی تکبیر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصلے پر تھے، تکبیر ہو چکی نماز شروع کرانے سے پہلے ایک دم گھبرا گئے اور گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑے سے وقفے کے بعد تشریف لائے اور مغرب کی نماز پڑھائی''۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ''آج خلافِ عادت تکبیر کے بعد کچھ وقفہ کیا، گھر میں تشریف لے گئے پھر واپس تشریف لائے، کچھ دیر لگی کیا وجہ پیش آئی؟۔ فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کے طاق میں ایک دینار پڑا ہے اور نبی کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کے گھر پر رات گزرے اور سونا، چاندی اس کے گھر میں ہو''۔ وہ ایک دینار تھا جو سات درہم کا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے ہمارے لحاظ سے دو اڑھائی روپے کا سونا تھا۔ فرمایا: ''جا کے اسے صدقہ کیا، گھر کو اس سے پاک کیا تب آ کر میں نے نماز پڑھائی نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ نبی کے گھر پر رات گزرے اور سونا یا چاندی اس کے گھر میں ہو''۔ ① تو آج کون ہے جو اس ذاتی چیز پر عمل کرے کہ بیوی کا سارا زیور لے کر ابھی صدقہ کرے، جو کچھ تجوری میں رکھا ہے سب غریبوں کو بانٹ دے۔ یہ کس کی مجال ہے اور کس کی ہمت ہے؟

توسعاتِ شریعت ...... شریعت نے جب اجازت دی کہ زکوٰۃ دے دو، صدقات دے دو، بقیہ مال تمہارے لئے حلال ہے، عام لوگ تو اسی پر چلیں گے۔ اب یہ کیفیت کہ ایک پائی گھر میں نہ رہے، یہ جب حال ہو گا کیفیت

① السنن للنسائی، کتاب السھو، باب الرخصة للامام فی تخطی رقاب الناس، ج:۵، ص:۱۹۱۔
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی، ج:۴ ص:۹ رقم:۱۵۰۹۔

ہوگی اور حال کسی کا حجت نہیں بنا کرتا، وہ قانون نہیں بنا کرتا، حجت قانون شریعت ہے۔ ہاں اللہ تمہیں وہ حال دے دے سبحان اللہ! تم یہ کام کرو، تمہاری بھی تعظیم کریں گے، لیکن تم قانون بنا کر اس کو اسٹیج پر پیش کرنے لگو کہ سارے گھر کی چیزیں ابھی صدقہ کر دو یہ جائز نہیں ہوگا، بلکہ یہ قانون کا مقابلہ ہوگا۔ بہرحال شرعی توسعات الگ چیز ہیں اور لوگوں کے ذاتی احوال الگ چیز ہیں، ہر کس و ناکس کے لئے جو پیغام ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا۔ حال اس کے لئے حجت ہوگا جو صاحب حال ہے، وہ عمل کرے، اس کی عظمت کی جائے گی۔

اتباع بلا حال...... ورنہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ایک شیخ طریقت جن کے بہت سے مرید تھے۔ شیخ بیمار ہوئے اور اطباء نے کہا اگر آپ نے وضو کیا تو بیماری بڑھ جائے گی یا کھڑے ہونے کی قوت نہیں تھی، تو شریعت نے اجازت دی ہے، انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

اگلے دن مریدین نے اعلان کیا کہ شیخ نے بیٹھ کر نماز پڑھی ہے لہٰذا آج سے سب لوگ بیٹھ کر نماز پڑھا کریں گے اور قیام جو فرض تھا وہ ترک کر دیا۔ یہ حرکت کی جو بالکل ناجائز تھی۔

اس لئے کہ فعل میں نقالی کی۔ نقالی فعل پیغمبر کی ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کے فعل کی۔ پھر یہ کہ اگر نقل اتارنی تھی تو شیخ کی سی بیماری کا حال بھی اپنے اندر پیدا کرتے اتنی بیماری آنی چاہئے تھی، جو شیخ پر آئی تھی تو انہیں بھی بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی۔ بیماری تو ندارد ہٹے کٹے اور فعل میں شیخ کی نقل اتاری۔ تو ایسی نقالی محض روپ بنانا ہے۔ حقیقت اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی قانون ہی سب کے لئے حجت ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اسی پر چلا جائے گا۔

تعظیم صاحب حال...... البتہ صاحب حال کی تعظیم کی جائے گی۔ اس پر کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی، اللہ ویسا حال سب کو نصیب کر دے تو وہ خوش نصیبی ہوگی۔

توسعات شرعیہ کا دائرہ کار...... بہرحال شریعت اسلام نے وسعتیں اور گنجائش دی ہیں۔ صرف یہ کہا ہے کہ ایک تو حرام کے دائرے میں مت پڑو، حلال کے دائرے میں رہو۔ دوسرے یہ کہ سامانوں میں مبالغہ مت کرو، اتنا رکھو کہ زندگی بھی آراستہ اور اچھی ہو اور قلب بھی اٹکا ہوا نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ آدمی ان سامانوں کا بندہ بن جائے۔ ایسے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے۔ فرمایا: "تَعِسَ عَبْدُالدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُالدِّيْنَارِ تَعِسَ عَبْدُالْخَمِيْصَةِ." ①

"برباد ہو پیسے کا بندہ، برباد ہو گنی یا درہم مراد (سونے کا سکہ) کا بندہ، برباد ہو شالی چادروں کا بندہ"۔

یعنی جس کا دل ان چیزوں میں اٹکا ہوا ہے کہ ان میں پڑ کر نہ موت یاد نہ آخرت یاد نہ فرائض یاد۔ ایسی دولت تو وبال جان ہو جائے گی۔ تو ایسے آدمی کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعاء دی ہے۔ لیکن جائز حدود میں رہ کے۔ "جمال پسندی" جو انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ پھٹے حال سے رہنا پسند نہیں کرتا، بلکہ خوبصورتی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کھانا زمین پر ڈال کے اور منہ لگا کے کھا لے بلکہ رکابی ہو، پھر رکابی ذرا نفیس اور کچھ اچھی بھی

① السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب فی المکثرين ج: ١٢ ص: ١٦٤.

ہو، دیکھنے والوں کی نظر میں نہ چبھے۔ تو تھوڑا بہت جائز حد تک تکلف بھی کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ مبالغہ نہ کرے کہ صبح کی رکابیاں اور ہوں، شام کی اور ہوں دوپہر کی اور۔ اسی طرح رات کے سونے کا لباس اور، دوپہر کا اور یہ تو لباس کی اور برتن کی بندگی ہے حالاں کہ بندگی اسے اللہ کی کرنی تھی۔

دولت دنیا کی مدح وذم کا معیار...... بہرحال مطلب یہ ہے کہ دولت دنیا کی مذمت بھی آئی ہے اور مدح بھی آئی ہے، اس دنیا کی مذمت آئی ہے جو آخرت سے غافل کر دے اور اس دنیا کی مدح آئی ہے جو آخرت تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔ اسی لئے عارف رومی نے مثال دی ہے کہ جیسے ایک سمندر ہے تو کشتی جب اس میں پڑی ہوئی ہو تو پانی اگر کشتی سے باہر باہر ہے تو کشتی کے لئے مددگار ہوگا۔ کنارے پر جالگائے گا اور منزل آجائے گی۔ لیکن اگر پانی کشتی کے اندر آگیا تو کشتی بھی ڈوبی اور کشتی والے بھی ڈوبے، دونوں کی تباہی ہے۔

اسی طرح فرمایا کہ انسانی قلوب کشتیوں کی مثل ہیں اور دنیا کی دولت اور سامان مثل دریا اور سمندر کے ہیں۔ تو قلب سے جب تک دولت باہر رہے گی، وہ قلب کو کنارے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی اور اگر اندر آگئی تو قلب بھی ڈوبا اور قلب والا بھی ڈوبا۔

استعمال دنیا...... مطلب یہ کہ ایک دنیا کا استعمال ہے، اس کی شریعت نے ممانعت نہیں کی۔ ایک دنیا کی محبت ہے کہ اس میں پڑ کر محبت خداوندی رہ جائے، محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہ جائے اس کی مذمت کی گئی ہے۔

محبت طبعی...... پھر یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم نے توسع کر دیا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ مال کی محبت بالکل نکال دو، یہ تو طبعی بات ہے کہ جب آدمی کمائے گا تو کچھ نہ کچھ اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے، اپنے سامان سے بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ بالکل محبت نکالنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

یہ تو طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو چیز انسان کے پاس ہے اس سے تھوڑی بہت محبت ہو جاتی ہے، اجنبی بھی اگر پڑوسی بن جائے اور چند دن رہنا سہنا ہو تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے، تو اپنے گھر اور مکان سے تو طبعاً محبت ہوگی تو قرآنِ کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔

کیوں کہ ایک مطلقاً محبت ہونا ہے، یہ ممنوع نہیں ہے۔ ایک ہے ایسی محبت ہونا جو فرائض اور واجبات میں حارج ہو جائے، اس سے بچو، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ ①

”حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم! (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے فرما دیجئے یہ تمہارے آباء واجداد، یہ تمہاری آل واولاد، یہ تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے بیوی اور بچے، یہ تمہاری دولت اور مال تجارت جس کی

---

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۲۴.

کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار مندا نہ ہو اور رات دن جوڑ توڑ میں ہو کہ نفع زیادہ ہو اور یہ تمہاری بلڈنگیں اور مکانات جن کے اندر تم راحت اٹھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں اگر ''احب'' بن جائیں اور اتنی محبوب بن جائیں کہ خدا اور رسول سے غفلت پیدا کریں، تو عذاب خداوندی کا انتظار کرو کہ یہ دولت چھننے والی ہے''۔ لیکن اگر یہ نہ ہو کہ ''احب'' نہیں بلکہ مطلق محبت ہے تو وہ فطری اور طبعی ہے، اس کو شریعت نے نہیں روکا کہ فطرتاً اپنے مال اور گھر بار سے تھوڑی بہت محبت تو ہوگی، تو مطلق محبت کو منع نہیں کیا، احبیت کو روکا ہے۔ ''احب'' ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مجھے صرف یہ محبوب ہے، نہ خدا محبوب نہ رسول محبوب نہ فرائض محبوب، نہ واجبات۔ اس محبت کو روکا ہے۔ لیکن اگر اتنی محبت ہے جو طبعی ہے اور ساتھ میں دین کی محبت بھی دل کے اوپر چھائی ہوئی ہے کہ دولت بھی ہے اور ساتھ میں نمازیں بھی پڑھ رہا ہے۔ روزے بھی رکھ رہا ہے، حج بھی کر رہا ہے، اور ذکر میں بھی مصروف ہے، یہ دولت ممنوع نہیں نہ اس کی فی الجملہ محبت ممنوع ہے۔

دولت دین و دنیا...... خدا کا شکر ہے کہ ہم افریقہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دولت دین بھی دی اور دولت دنیا بھی دی ہے، تجارتیں بھی ہیں، منافع بھی ہیں، گھر بار بھی اچھے ہیں، پہننا، رہنا سہنا اچھا ہے اور اس کے ساتھ میں مساجد بھی ہیں اور نمازیں بھی ہیں۔ بلکہ مساجد کو اتنا آراستہ کیا ہوا ہے کہ شاید لوگوں نے اپنی کوٹھی بنگلوں کو بھی اتنا نہ سجایا ہو۔ قالینوں کی جانمازیں بچھی ہوئی ہیں۔ راحت کا ہر سامان موجود ہے، جتنا اپنے گھر کی فکر ہے اس سے زیادہ اللہ کے گھر کی فکر ہے کہ وہ بھی آراستہ ہوں اور سجے سجائے ہوں۔

اللہ میاں کے بنگلے...... میں نے تو یہاں آ کر کہا کہ مسجدوں کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے، میں نے کہا یہ اللہ کے گھر نہیں یہ تو اللہ میاں کے بنگلے ہیں، آراستہ پیراستہ قالینوں سے سجے ہوئے۔ بجلی کی روشنی اور چھتیں بھی منقش اور آراستہ۔ یہ گھر تھوڑا ہی ہیں۔ گھر تو ہم جیسوں کے ہوتے ہیں، یہ تو بنگلے ہیں۔

ہمارے ہاں جو مسجدیں ہیں وہ تو اللہ میاں کے گھر ہیں۔ یہاں جو مسجدیں ہیں وہ اللہ میاں کے بنگلے ہیں، جو بنگلے بنانے والے ہیں وہ اپنے لئے بنگلہ بنالیں تو ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی مضرت نہیں ہے۔ جو اللہ کے گھر کو سجا رہے ہیں وہ تھوڑا بہت اپنے گھر کو بھی سجالیں، اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح اپنے لباس کو بھی سجا لیں، اللہ کے گھر میں قالین بچھائے۔ اگر اپنے گھر میں بھی قالین بچھالیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ بس یہ ہے کہ مبالغہ نہ ہو اور اتنا تعلق نہ ہو کہ اس سے دینی کاموں میں خلل پڑیں گے۔ ورنہ اگر یہ چیزیں بھی ممنوع ہوتی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہ میں ایک بھی متمول نہ ہوتا۔ حالانکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مال دار لوگوں میں سے ہیں، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے مال دار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔

حضرت جابر کا تمول اور قلبی کیفیت...... مگر قلب کی کیفیت کیا ہے؟ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن گھر میں تشریف لائے، کچھ اداس، غمگین اور چہرہ اترا ہوا۔ تو بیوی نے پوچھا آج آپ غمگین کیوں ہیں؟

فرمایا: ''خزانے میں دولت اتنی جمع ہوگئی ہے کہ میرے دل کے اوپر بار پڑ رہا ہے اور میرا قلب پریشان ہو رہا ہے''۔ وہ بھی صحابیہ رضی اللہ عنہ تھیں۔ انہوں نے کہا پھر آپ نے کیا کیا۔؟ فرمایا: ''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا''۔ فرمایا: ''گھبرانے کی کیا ضرورت ہے، صدقہ کرنا شروع کر دو، غریبوں کو دینا شروع کر دو''۔ فرمایا: ''واقعی تدبیر تو اچھی بتائی''۔ چناں چہ جا کر خزانچی کو حکم دیا کہ تقسیم شروع کر دو۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں غرباء کے اوپر چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو آ کر بیوی کے ہاتھ چومے کہ اللہ تجھے جزائے خیر دے کیسی اچھی تدبیر بتائی، میرا دل ہلکا ہو گیا۔ تو اتنے دولت مند بھی تھے، مگر قلب متوجہ الی اللہ تھا، زیادہ دولت بڑھتی تھی تو ان کے دل پر بار پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں کم ہو جائے تو دل پر بار پڑتا ہے۔ زیادہ ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ وہاں قصہ الٹا تھا اور واقعہ بالکل برعکس تھا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مال کے بارے میں انوکھا جھگڑا...... حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دوسری صحابی سے زمین خریدی۔ قیمت ادا کر دی زمین قبضے میں آ گئی عمارت بنانے کے لئے جو بنیاد کھودی تو ایک بہت بڑا دیگچہ نکلا جس میں سونا اور چاندی بھرا ہوا تھا۔ گویا لاکھوں روپے کا مال نکلا۔ اسے لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی۔ اور فرمایا: ''یہ آپ کا دیگچہ ہے؟'' انہوں نے کہا: ''کیسا دیگچہ ہے''۔ فرمایا: ''وہ جو زمین میں نے خریدی تھی اس میں سے نکلا ہے اور میں نے زمین خریدی تھی، دیگچہ تھوڑا ہی خریدا تھا۔ یہ آپ کا حق ہے''۔ انہوں نے کہا: ''جب میں نے زمین بیچی تھی، زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ تھا وہ سب بیچنے میں آ گیا، لہٰذا یہ آپ کا حق ہے میرا حق نہیں''۔ اب لڑائی اس پر ہو رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا حق ہے۔ انہوں نے کہا نہیں میرا حق نہیں یہ آپ کا حق ہے۔ آخر کو وہ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم دونوں کی کوئی اولاد ہے؟''۔ تو ایک کے ہاں بیٹا اور ایک کے ہاں بیٹی تھی۔ فرمایا ''دونوں کی شادی کر دو اور اس میں اس دولت کو خرچ کر دو! بس سکون ہو گیا''۔ [1]

ہمارے ہاں تو اس پر لڑائی ہوتی ہے کہ میرا حق ہے تمہارا نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا حق ہے۔ وہاں لڑائی اس پر تھی کہ آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ دوسرے کہہ رہے ہیں آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ ان میں اور ہم میں فرق ہے۔ دولت مند وہ بھی تھے ہم بھی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے دل دولت کے ساتھ اللہ رب العزت میں اور محبت دین میں فانی تھے۔ ہمارے قلوب میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن اس حد تک کہ اگر تھوڑی، بہت محبت ہو اور دین کی محبت زائل نہ ہو، شریعت نے اجازت دی ہے کہ جمع بھی کر لو اور خرچ کر لو۔ کچھ اچھا کھا پہن لو، کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے...... بہرحال مطلب یہ ہے کہ جو آیت میں نے پڑھی تھی تو اس کے ضمن میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ دنیا کا راستہ اور ہے اور ختم ہو جانے والا ہے اور ہمیں تو گزر جانا ہے۔ چاہے چورا ہے میں پڑ کے گزرے، چاہے میلے میں پڑ کے گزرے، چاہے بھیک مانگ کے گزرے، بس آخرت میں پہنچ جائیں

[1] الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار، ج: ۱۱، ص: ۲۹۱.

گے، اس کا نام تو رہبانیت ہے اور سرے سے دنیا کی حیثیت ختم ہے، اگر اس مذہب پر دنیا چلتی ہے تو ویران ہوتی ہے اور جگہ جگہ ویرانی کے اثرات ہوتے، دنیا آباد نہ ہوتی۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے بس دنیا ہے۔ لہٰذا حلال وحرام کی تمیز نہ کرو، بس کھاؤ، اڑاؤ، عیش کرو اور مزے کرو۔ اس کا بھی شریعت اسلام نے رد کیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ: ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ'' ① ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''

جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی آخرت میں پھل کما لو گے، اگر دولت کا بیج پاک مصرف میں ڈالا ہے تو وہاں پاک ثمرات اور پاک پھل نمایاں ہوں گے۔ ناپاک جگہ میں ڈالا ہے، بیج بھی ناپاک اور وہاں کانٹے دار درخت ملیں گے اور ''زقوم'' ملے گا جس کا تحمل کرنا مشکل ہوگا، یوں کہ وہ عذاب کی صورت اختیار کرے گا۔

غرض دنیا کو نہ تو راستہ بتلایا کہ بھئی! مسافر کی طرح گزر جاؤ نہ کماؤ نہ دھماؤ اور نہ ہی اصل قرار دیا بلکہ کھیتی قرار دیا جس میں ''بونا'' ضروری ہے۔

کاشتکار کا فریضہ...... ظاہر بات ہے کہ جب کاشتکار بوئے گا تو کچھ نہ کچھ محنت تو کرنا پڑے گی۔ خون پسینہ ایک رنگ بھی کرنا پڑے گا بیج بھی ڈالنا پڑے گا، پانی بھی دینا پڑے گا، اچھی خاصی محنت اٹھانا پڑے گی۔ تب جا کے وہ چھٹے مہینے غلہ کمائے گا اور اس سے پھر پیسہ کمائے گا۔ غرض دنیا کو فرمایا یہ کھیتی ہے اور تم کاشتکار ہو۔ کاشتکار کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر پر پڑا رہ جائے، ورنہ پھر لوگ غلے لے آئیں گے تو وہ بیٹھ کر روئے گا اور کہے گا کاش! بیج ڈالتا تو میں بھی غلہ کماتا، اس وقت حسرت میں مبتلا ہوگا۔ لہٰذا حکم دیا کہ دنیا میں رہو اور کچھ کام کرو۔

مقام آخرت...... اور اس دنیا ہی سے اپنی آخرت پیدا کرو۔ اس لئے یہ تصور نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا یہ عالم ہے اور آخرت ساتویں آسمان پر رکھی ہوئی ہے۔ بلکہ آپ کی آخرت اسی دنیا میں سے نکلے گی، نکالتے رہو۔ انہی افعال میں سے نکلے جو ادا کر رہے ہو۔ نیت اچھی ہونی چاہئے، اتباع سنت ہونا چاہئے، اسی دنیا میں سے آخرت پیدا ہوگی۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: آدمی دسترخوان پر بیٹھے ''بِسْمِ اللّٰهِ'' سے شروع کرے اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةَ'' پر ختم کرے: ''غُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.'' ② ''اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے''۔ تو کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے تو اس روٹی میں سے ہی آخرت نکلی۔ اگر روٹی نہ کھاتا اور سنت طریق پر حمد وثناء سے ابتداء وانتہاء نہ کرتا، تو یہ مغفرت گناہ کا وعدہ کہاں سے ہوتا؟ تو روٹی میں سے آپ کی آخرت نکلی۔

---

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال فی المقاصد لم اقف علیه مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء، وقال القاری: قلت معناه صحیح مقتبس من قوله تعالیٰ " من کان یرید حرث الآخرة نزد له فی حرثه" دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۴۱۲. ② السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب مایقول اذا فرغ من الطعام، ج: ۱۱ ص: ۳۵۹.

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اگر کوئی شخص شفقت و محبت اور پیار سے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ ① دیکھا جائے تو یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا تو ایک دنیوی فعل ہے۔ مگر نیت کی سچائی سے نیکیوں کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ نہ رکھتا یا اسے دین نہ جانتا تو بالوں کے برابر نیکیاں کہاں سے آتیں؟۔ تو یتیم کے سر میں سے آپ کی آخرت نکلی اور آپ کے ہاتھ میں سے آخرت نکلی۔ آپ یہ ہاتھ یتیم کے سر پر نہ رکھتے تو نیکیوں میں یہ اضافہ نہ ہوتا۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر کسی شخص نے اللہ کی راہ میں صدقہ کیا اور ''زوج'' (جوڑا) بنا کے صدقہ کیا، یعنی پیسہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے، روپیہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے کپڑا دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے: ''مَنْ اَنْفَقَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ زَوْجَیْنِ'' ② ''ہر چیز میں سے جس نے جوڑا جوڑا صدقہ دیا''۔ تو فرماتے ہیں جنت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔ تو دنیا میں دو چیزوں کا یعنی جوڑے کا صدقہ کیا، اس سے ہی تو آخرت بنی، تو آخرت آپ کے فعل سے نکلی، آخرت کہیں الگ تو نہیں رکھی ہوئی تھی۔ بہر حال دنیا آخرت کے کمانے کا ذریعہ ہے اور اس دنیا ہی میں سے آپ کی آخرت نکلے گی۔

تجارت میں مخفی آخرت...... آپ تجارت کر رہے ہیں، نیت صاف رکھیں۔ یہ تجارت آخرت کا ذریعہ بنے گی، چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاء'' ③ ''ایک سچا تاجر جو امانت دار ہو اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوگا جنت میں ان کے ساتھ جائے گا'' کتنی بڑی فضیلت ہے۔ اگر دیانت کے ساتھ تجارت نہ کرتے تو یہ فضیلت ان کو کیسے ملتی؟ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا: ''غَفَرَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ کَانَ قبلکم سَھْلًا اِذَا اشْتَرٰی سَھْلَ وَاِذَا بَاعَ سَھْلَ۔'' ④ ''اللہ اس شخص پر مغفرت اور رحم کرے جو شفقت کے ساتھ خریدتا ہے اور شفقت کے ساتھ بیچتا ہے،، بیچنے میں اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے گاہک کو نقصان نہ ہو۔ گاہک خریدتا ہے تو اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے تاجر کو نقصان نہ پہنچے۔ دونوں کے دل میں نیک جذبہ ہے تو دونوں کے لئے دعا دی کہ: غَفَرَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ ''اللہ اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے بیچ رہا ہے اور اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے خرید رہا ہے''۔ اگر یہ تجارت نہ ہوتی تو یہ آخرت کا وعدہ آپ کے لئے کہاں سے پورا ہوتا۔؟ اسی میں سے تو آخرت نکلی ہے۔ یہ نہیں کہ آخرت کہیں عرش کے نیچے چھپی ہوئی ہے اور دنیا یہاں ہے۔ اسی دنیا میں آخرت چھپی ہوئی ہے، نکال لینا آپ کا کام ہے جیسے اسی زمین کے اندر یہ پھل پھول

① مسند احمد، حدیث ابی امامۃ الباھلی، ج:۴۵، ص:۱۲۷، رقم:۲۱۱۳۲.

② المعجم الکبیر للطبرانی، باب الجیم، ابو ذر غفاریؓ، ج:۲، ص:۲۱۰.

③ الجامع للترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی التجار، ج:۱، ص:۲۲۹.

④ السنن للترمذی، کتاب البیوع، باب ماجاء فی استقراض البعیر، ج:۵، ص:۱۵۹.

چھپے ہوئے ہیں، نکال لینا کاشتکار کا کام ہے کہ بیج ڈالتا رہے، پانی ڈالتا رہے پھل نکالتا رہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا کہ یہ تو زمین ہے اور یہ جو پھلوں کی دنیا ہے کہ یہ آسمان پر رکھی ہوئی ہے۔ وہاں سے پھل برسیں گے تو کبھی بھی اسے پھل نہیں ملیں گے، اسی زمین پر محنت کرنی پڑے گی۔ تو انسان دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ رد کر کے پس پشت ڈال دے بلکہ اس سے اپنی آخرت کا کام لے۔ ہر چیز سے کام لے۔ حیات سے بھی کام لے، موت سے بھی کام لے۔

موت میں مخفی آخرت...... چنانچہ جب انسان کا کوئی عزیز گزر جاتا ہے تو طبعی طور پر آدمی کو صدمہ پیش آتا ہے۔ لیکن دانش مند وہ ہے جو اس صدمے سے اپنے لئے اجر نکال لے، وہ یہ ہے کہ نہ تو جزع فزع کرے نہ بین کر کے روئے نہ یہ کہ بالکل پتھر ہو جائے کہ اس کی آنکھ سے آنسو تک نہ نکلے، قلب کی سلامتی کے ساتھ جتنا طبعی غم ہے وہ ہو، اور عبرت پکڑے کہ جہاں آج یہ گیا ہے مجھے بھی کل کو جانا ہے۔ اس کی موت کو اپنی موت کی یادگاری کا ذریعہ بنائے تو اس کی موت دین کی ترقی کا ذریعہ بن گئی۔ اگر یہ میت نہ ہوتی تو اسے یہ اجر کیسے ملتا۔؟

حدیث میں ہے کہ: ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا، وہ واویلا کر رہی تھی۔ سر کے بال نوچ رہی تھی کہ ہائے ہائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ فرمایا: ''بڑی بی! صبر کرو''۔ بڑی بی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس نے کہا:

''ہاں! تم نے یہ کہہ دیا کہ صبر کرو، تمہارے گھر میں یہ آفت آتی جب میں جانتی تم صبر کرتے، مجھے صبر کرانے کے لئے آئے ہو؟ میں نہیں صبر کر سکتی''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اچھا تو جان!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے گئے۔ اگلے دن اس کو پتہ چلا کہ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تب حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ ہیں، آپ نے صبر کی تلقین فرمائی تھی۔ میں اب صبر کرتی ہوں''۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰى.'' ① ''جب صدمہ پیش آیا تھا، جب صبر کرتی تو اجر ملتا''۔ یوں تو دو چار برس کے بعد خود بخود ہی صبر آ جاتا ہے۔ کوئی ساری عمر آدمی تھوڑا ہی روتا رہتا ہے۔ تو وہ مجبوری کا صبر ہے اور صدمہ کے وقت اختیاری صبر ہوتا ہے۔ جو نفس کا ضبط کرنا ہے وہی اجر کا باعث ہے۔ مجبوری کی چیز اور بے اختیار چیز پر کوئی اجر نہیں ہوتا۔ جس چیز میں ارادہ واختیار صرف کیا جائے اور طبیعت کے خلاف جدوجہد کی جائے اس پر اجر مرتب ہوتا ہے۔ غرض موت تک کو آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے زندگی کو بھی آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔

دوسرے کی نیکی ذریعۂ ترقی...... علماء کرام لکھتے ہیں کہ کسی کی اچھائیاں دیکھو تو حرص کرو۔ برائیاں دیکھو تو حرص مت کرو۔ مثلاً آپ نے کسی کو دیکھا کہ نوافل بہت پڑھ رہا ہے اور دل میں حرص آئی اور دعاء کی کہ یا اللہ! مجھے بھی اتنے نفلوں کی توفیق دے۔ اور توفیق ہو گئی تو اس کے نوافل آپ کو نوافل پڑھوا دینے کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی نیکی بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور لوگوں کی موت بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارة القبور، ج: ۵، ص: ۲۹.

دوسرے کی برائی ذریعۂ عبرت......اور اگر برائیوں کو دیکھ کر آپ نے عبرت پکڑی اور ان سے بچ گئے تو لوگوں کے گناہ بھی ہمارے لئے ترقی کا ذریعہ بن گئے۔غرض دنیا کی ہر چیز میں عبرت، نصیحت و موعظت موجود ہے، انسان اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ دنیا کو مٹا کر ختم کردے۔اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کی ہر چیز سے عبرت پکڑے۔ہر ہر چیز سے نصیحت حاصل کرے۔ہر ہر چیز سے اپنی آخرت بنائے اور اپنی آخرت کو یاد کرے۔یہ جبھی ہوگا جب دنیا بچی ہوئی ہو۔اس کو دیکھ دیکھ کر ہم عبرت پکڑیں۔

حضرات کا احترام......اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔وقت بھی تھوڑا تھا، اور کچھ زیادہ ہمت بھی نہیں تھی اور ضعف بھی کافی تھا اور کچھ کام بھی زیادہ ہے اور سفر کی آخری رات بھی ہے۔اس واسطے ارادہ کیا جب اعلان ہوگیا تو کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔اعلان کے احترام اور حضرات کے جمع ہونے کے احترام میں یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔

اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور ہمیں علم وعمل کی توفیق دے۔ہماری دنیا بھی درست فرمادے اور آخرت بھی درست فرمادے اور ہمیں عدل واعتدال پر قائم رکھے۔افراط وتفریط اور مبالغوں سے ہمیں محفوظ رکھے، آمین!

دعاء

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ اٰمِيْنَ

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ.

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ خَيْرَ الْحَيٰوةِ وَخَيْرَ الْمَمَاتِ وَ ثَقِّلْ مَوَازِيْنَنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا

اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ.

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ يَا عَزِيْزُ يَا غَفَّارُ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

(۶ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ)

عالم اصغر

انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں ؎

آسماں ہاست در ولایت جاں	کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہست	کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے: میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَفِيْٓ أَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾. ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

اقسامِ عالم اور ان کے حصص...... بزرگانِ محترم! انسان عالمِ صغیر ہے۔ عالمِ کبیر کے جملہ نمونے اور نقشے اس میں موجود ہیں، چنانچہ غور کیجئے کہ عالمِ کائنات کی دو ہی قسمیں ہیں۔ عالمِ شاہد اور عالمِ غائب عالمِ شاہد اجسام کا مجموعہ ہے جو آنکھوں سے مشاہد اور محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً دریا، پہاڑ، زمین، آسمان وغیرہ۔ انسان میں عالمِ شہادت بدن ہے۔ جس میں گوشت پوشت، ہڈی، چہرہ وغیرہ اور دیگر اعضاء بدن وغیرہ۔ پھر جیسے اس دنیا میں عالمِ شہادت کے دو حصے ہیں۔ سفلیات (نچلے)، جیسے زمین اور اس کے سبزہ زار دریا، پہاڑ وغیرہ۔ علویات (اوپر کے) جیسے آسمان، چاند، سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں فوقانی حصہ جس میں قلب اور دماغ ہے، اس کے علویات ہیں۔ اور تحتانی حصہ جس میں مختلف حسی اعمال وحرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں، پیٹھ وغیرہ یہ اس کے سفلیات ہیں۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۲۱.

عناصر اربعہ کی کارفرمائی میں کمال درجہ تشابہ ہے...... پھر جس طرح عالم انسانی کی بنیاد عناصر اربعہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی کے مادوں پر ہے بعینہ انسان میں انہی چار مادوں کے اثرات حرارت، برودت، یبوست اور رطوبت کارفرما ہیں۔ پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کارفرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی بجنسہ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔

مٹی کی جملہ انواع...... مثلاً زمین ایک تودہ خاک ہے۔ ایسے ہی انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے۔ پھر جس طرح زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول وعرض اور عمق (گہرائی) سب کچھ ہی ہے۔ ایسے ہی انسان کا بدن ہے۔ پھر جس طرح زمین کھودو تو تری نکلنا شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کاٹنے سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے۔ سفید، سیاہ، سرخ، زرد۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے۔ مستور حصے جیسے زیر بغل، کنج ران سیاہ ہے۔ چہرہ پر سرخی رہتی ہے۔ ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے پوری نوع بشر پر نگاہ ڈالو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید، مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد اور عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے، جیسے تفریح گاہ اور کوئی گندا جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں، ایسے ہی انسان کا لطیف اور صاف ستھرا حصہ چہرہ اور ہاتھ ہے جسے عزت سے چومتے ہیں۔ اور گندا حصہ زیر بغل یا اعضاء نجاست ہیں۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات وکیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کی جملہ انواع...... پھر جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رو دوڑ رہی ہے۔ بعینہ بدن انسانی میں حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اسی حرارت غریزی وطبعی پر انسانی زندگی قائم ہے پھر جیسے مٹی اور پتھر اور لوہے کے آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی انسانی ران یا ہاتھ کے آپس میں رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جیسے آگ درحقیقت فیض ہے علویات یعنی سورج کا۔ یعنی سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں۔ ایسے ہی بدن انسانی میں حرارت اس کے علویات یعنی قلب اور دماغ کا فیض ہے۔ قلب ہی حرارت غریزی تیار کرتا ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن جھڑنے لگے اور قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کی جملہ انواع...... پھر یہ پانی جیسے زمین کے گوشے گوشے میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی انسانی بدن میں رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے۔ پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں کوئی بڑے دریا ہیں، کوئی چھوٹے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بڑی اور چھوٹی رگیں گویا دریا ہیں۔ پھر جیسے زمین میں نہریں، ندی نالے، پانی کے ڈونگرے مثلاً تالاب ہیں، ایسے ہی انسانی بدن میں وہ رطوبات کا پانی رہتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں شیریں، نمکین اور شور مختلف قسم کے چشمے ہیں ایسے ہی انسانی بدن میں منہ سے آب شیریں اور آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے۔ پتے سے کڑوا اور معدہ سے ترش پانی چلتا ہے۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت و برودت کے غلبہ سے یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں ہے کہیں کا جما ہوا ہے جیسے بحر منجمد شمالی تو بلغم وغیرہ منجمد چشمے ہیں۔ پھر جیسے کہیں

گندا پانی ہوتا ہے۔ انسان میں پیشاب یا سنک گویا گندہ پانی ہے۔ جو گندصفائی سے بہتا ہے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے ہیں۔ اور کہیں گرم جہاں گندھک کا زور ہے۔ ایسے بدن انسانی میں ٹھنڈے پانی کے چشمے جاری۔ زبان سرد پانی کا چشمہ اور پیشاب گرم پانی کا چشمہ۔ پھر دنیا میں مجمع البحرین ایک مقام ہے۔ جس کا ایک حصہ شیریں اور دوسرا تلخ وشور ہے۔ ایسے ہی انسان کے دماغ کی حس مشترک میں شیریں چشمہ قوت ذائقہ اور نمکین چشمہ قوت باصرہ موجود ہے۔ پھر جس طرح دنیا میں برسات ہوتی ہے ایسے ہی بدن انسانی میں پسینہ ہے۔

ہوا کی جملہ انواع...... پھر جس طرح عالم کا ہر خلا ہوا سے پر ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن کا ہر خلا ہوا سے بھرپور ہے۔ پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں سانس کے ذریعے جو ہوا اندر جاتی ہے وہ سرد ہے اور جو ہوا باہر نکلتی ہے وہ گرم ہے پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی۔ ایسے ہی انسان میں ڈکار آتی ہے تو خوشبودار ہوتی ہے اور خروج ریاح ہوتا ہے تو بدبودار۔ پھر جیسے زمین پر حبس اور گھٹن ہونے سے انسان کا دل گھبراتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔ ایسے ہی ریاح بند ہونے کے وقت حالت ہوتی ہے۔ پھر جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا کھینچ لی جائے تو سارا عالم ختم ہو جائے ایسے ہی انسانی بدن میں سانس کھینچ لی جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔ غرض ہوا کی جملہ انواع انسان میں موجود ہیں۔

انواع جمادات...... جمادات میں ہڈیوں کا سلسلہ گویا پہاڑ ہیں۔ جن میں سے پہاڑوں کی طرح کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی۔ پھر جس طرح پہاڑوں پر مٹی جمتی ہے ایسے ہی اقلیم بدن پر گوشت چڑھا ہے۔ پھر پہاڑوں کے بعض خطے گرم ہیں، بعض سرد، ایسے ہی انسانی بدن کے مستور حصے گرم ہیں اور سطح بدن کے تمام نمایاں حصے سرد۔ پھر پہاڑوں کے مقامات مقدسہ کی زیارت کی جاتی ہے اور بعض سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں چہرہ مرہ کی ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے اور بعض حصوں کو دیکھنا شرعاً وعقلاً ننگ وعار سمجھا جاتا ہے۔ پھر زمین کے بعض حصوں کو دیکھنے کی قوت ہے۔ لیکن ایسا کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کے بعض حصوں کو دیکھنا (مثلاً پیٹھ وغیرہ) حماقت ہے۔ پھر جیسے پہاڑ پر نباتات اگتے ہیں، ایسے ہی انسان بدن پر بال اگتے ہیں۔ پھر جس طرح زمین پر کہیں گھنا جنگل ہے، کہیں جھنڈ، ایسے ہی انسانی بدن کے چہرہ اور سر پر گھنے بال ہیں اور عام بشرہ بدن پر چھید ہیں۔

پھر جس طرح زمین پر بعض نباتات برابر بڑھتے اور نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بعض یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں یکساں رہتا ہے۔ پھر بعض جگہ زمین کے جھاڑ جھنکار کے صاف کئے بغیر زمین پر رونق نہیں آتی۔ ایسے بدن انسانی کے موئے بغل اور موئے زہار ہیں۔

پھر زمین کے بعض حصے قائم رکھنے سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور بعض حصوں کی تراش خراش سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں موئے ریش ہیں جن کے رکھنے سے انسانی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیز ان کی اصلاح اور موئے شوارب (مونچھوں کے بال) کی تراش سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انواع حیوانات...... پھر جس طرح زمین کے مختلف قسم کے حیوانات کی غذا زمین کی رطوبات ہیں۔ایسے ہی انسانی جہاں میں سر میں جوئیں، پیٹ میں کینچوے، معدے میں ریسمانی کیڑے، بدن کے خون کو چوستے اور بڑھتے ہیں۔

پھر جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں مختلف صورتوں کے حشرات الارض ہیں۔ایسے ہی انسان کے بدن میں مختلف رنگوں کے جراثیم ہیں جو خوردبین سے نظر آتے ہیں۔ پھر جس طرح دنیا کے ہر خطہ کے جانور مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ایسے ہی انسانی بدن کے ہر حصہ میں نئی نئی شکل وشمائل کے جراثیم ہیں۔ پھر جس طرح زمین کی مخلوقات زمین میں پیدا ہو کر مرکر زمین میں ہی دفن ہو جاتی ہیں، ایسے ہی جراثیم بدن میں پیدا ہو کر مرتے اور بدن میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔

آثار زلزلہ...... پھر جس طرح زلزلہ سے ساری زمین حرکت میں آتی ہے ایسے ہی بدن میں جھرجھری آنے سے پورا بدن اچانک متحرک ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح زلزلہ کا سبب آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی اندرونی گرمی، بھڑکاہٹ یا پریشانی دل سے انسان کے پورے بدن میں جھرجھری آ جاتی ہے۔

پھر جس طرح اقلیم عالم میں عناصر کے غلبہ سے غیر معتدل آثار پیدا ہوتے ہیں مثلاً قحط سالی، آندھیاں، آگ برسنا، ایسے ہی اقلیم بدن پر غیر طبعی آثار مثلاً بخار، زکام، سرسام اور خارش وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔

عقل وحکمت کے آثار...... پھر جس طرح عقل وحکمت کی کمی اور شہوات عضلات کی زیادتی سے انسان، انسان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی بعض دفعہ بحرانی مرض پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنے بدن کو نوچنے لگتا ہے۔ پھر جس طرح کسی ملک پر بادشاہ کی حکومت ہوتی ہے اور وزراء جنود وعساکر (افواج) اس کے مددگار ہوتے ہیں، ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے۔ دماغ اور حواس خمسہ اس کے وزراء اور مشیر ہیں۔ معدہ خزانچی ہے اور ہاتھ پیر جنود وعساکر ہیں۔ پھر جس طرح علویات میں چاند اور سورج روشن ہیں۔بعینہ اقلیم بدن میں سر میں دو آنکھیں منور ہیں پھر جس طرح ستاروں سے راستہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دماغ میں غور وفکر کے نتائج اور نظریئے ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں۔

ستاروں کے آثار...... پھر جیسے ستارے مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں، ایسے ہی دماغی فکر غم ومسرت پیدا کرتی ہے۔ پھر جس طرح آسمان کے اوپر غیب میں جنت ہے۔ جس میں سوائے مسرت واطمینان کے غم کا کہیں نشان نہیں۔ بعینہ انسان میں آثار فرحت ومسرت اور بشاشت وطمانیت (خوشی واطمینان) مثل جنت کے ہیں۔ جن میں مگن ہو کر نفس دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح غیب میں جہنم ہے۔ جہاں سوائے غم وتردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں۔ ایسے ہی انسان کے باطن میں آثار مصائب وغم اور تشویشات، مثل جہنم کے ہیں۔ پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے، جہاں حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات کا بلاواسطہ دور دورہ ہے ایسے ہی فوقانی اشیاء میں انسان کا لطیفہ قلب ہے جو تجلی گاہ ربانی ہے۔ جس میں بلاواسطہ اسرار الٰہی متجلی اور منکشف ہوتے ہیں۔

ملائکہ وشیاطین...... پھر جس طرح آسمان پر فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں جن میں عصیان کا کہیں نشان نہیں۔ ایسے ہی دماغ میں حواس خمسہ ملائکہ کی طرح خدمات انجام دیتے ہیں۔ پھر جس طرح غیبی عالم میں آسمان کے نیچے گمراہ شیاطن ہیں جو حکم الٰہی کے سامنے نہیں جھکتے ،ایسے ہی انسانی دماغ کے نیچے نفس ظلمانی ہے، جو قلب کے اشاروں پر نہیں چلتا اور فانی لذات میں منہمک ہو کر سارے اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا ہے۔

عالم غیب سے تشابہہ...... دوسرا عالم، عالم غیب ہے جو جسمانیت سے پاک ہے اور صرف دل کی آنکھوں سے نظر آتا ہے، مثلاً ذات وصفات حق، ملائکہ، عالم اسرار غیب وغیرہ، انسان کا عالم غیب روح انسانی ہے۔ جس میں علم کے سرچشمے ہیں اور لطیفہ روح معنویات وروحانیات اور الٰہیات کا مرکز ہے۔ گویا اس روح میں کمالات باطن کے نمونے ہیں جو اس کو ودیعت کئے گئے ہیں۔ جس طرح ذات بابرکات مدبر وحکیم اپنی حکمت وقدرت سے سارے عالم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا توجہ ہٹالے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

اسی طرح روح انسانی بدن کی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اگر ذرا بھی اپنا رخ بدن سے پھیرے تو اقلیم تن گل سڑ جائے، پھر جس طرح وہ مختلف رنگ کے جہانوں کے لئے ایک مدبر ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح روح بھی انسانی بدن میں وحدہ لاشریک ہے۔ پھر جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود انسانوں سے اوجھل ہے اور ادراک سے قاصر ہے۔ ایسے ہی روح انسانی ہے۔ پھر جیسے وہ خالق اکبر عالم کے ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ ہونے کے باوجود کوئی اشارے سے نہیں بتلا سکتا کہ ذرا ادھر یا ادھر۔ ویسے ہی روح انسانی رگ رگ میں سمائے ہونے کے باوجود کوئی نہیں بتلا سکتا کہ کس کونے میں بیٹھی ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ کو جو تعلق عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں۔ جو بیت اللہ سے ہے وہ عام جہان سے نہیں۔ چنانچہ اگر مقامات مقدسہ پر آنچ آجائے تو سارا عالم زیروزبر ہو جائے۔ ایسے ہی روح انسانی کا سب سے زیادہ تعلق قلب سے ہے۔ پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ ملائکہ مقربین کو مامور فرماتے ہیں اور وہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حکم الٰہی لے کر اترتے ہیں۔ اسی طرح روح انسانی کی صفت بھی رشد وہدایت ہے۔ پھر جس طرح ہر ادراک اور حواس خمسہ اس کے ملائکہ ہیں، جن کی قوتیں دماغ میں پوشیدہ ہیں اور جن اعضاء کے ذریعے قوتیں نمایاں ہوتی ہیں، وہ آنکھ، کان، ناک وغیرہ بمنزلہ انبیاء علیہم السلام کے ہیں۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کی گوناں گوں صفات وکمالات ہیں۔ کسی نہ کسی خاص غلبہ کے تحت ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے۔ ایسے ہی روح بھی کسی نہ کسی صفت سے ان کارکنوں پر متجلی ہوتی ہے اور ہر عضو آنکھ، کان، ناک اس کی اس قوت احساس وادراک کا مظہر ہے۔ پھر حق تعالیٰ شانہٗ کی سب سے زیادہ جامع تجلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم وکمالات جمع کردیئے گئے ہیں۔ ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ تجلی قلب پر ہے اور قلب مجمع العلوم ہے۔ حواس خمسہ میں ادراک وشعور کا فیض قلب ہی کا ہے۔

پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت و معرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و معرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے۔ ایسے ہی ان اعضاء حواس کا علم قلب کی قوت علم سے مستفاد اور وابستہ ہے اور قلب بالذات مدرک ہے، چناں چہ آنکھ، کان بند کر کے تنہا قلب تدبر و فکر کرتا ہے اور ساری کائنات کے نقشہ کو عالم خیال میں دیکھتا ہے اور حواس خمسہ کا محتاج نہیں۔

پھر جس طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے حاکم اور جملہ ادیان کے ناسخ ہیں۔ ایسے ہی قلب تمام اعضاء رئیسہ مروسہ پر حاکم اور ان کے علمی ذخیروں پر ناقد اور متصرف ہے کہ آنکھ نے صحیح دیکھا یا نہیں، کان نے صحیح سنا یا نہیں اور قلب کے علوم پر اختیار نہیں۔ پھر جس طرح کمالات خداوندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر اولاً اترے۔ اسی طرح روح کا فیضان بھی اولاً قلب پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حیات و زندگی بھی پہلے قلب پر اترتی ہے۔

پھر جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر عمل کے لئے جبر و اکراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے ہی روح انسانی اشیاء کا حسن و قبح دکھلا کر اعضاء بدن میں استعداد عمل کی قوت پیدا کر کے نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتی ہے اور عمل کے لئے نفس پر جبر و اکراہ نہیں کرتی۔ پھر جس طرح غذا کے اثرات بدن پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح روح بھی اپنی تربیت سے اس کے (خیر و شر کے) ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے۔

آخر میں بطور تبرک حضرت قاری صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔ غرض مبداء ہو یا معاد، نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا و جزاء، حق تعالیٰ کے کمالات و صفات ہوں یا افعال، ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ اور ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج (نمونے) قائم ہیں ۔

آسماں ہاست در ولایت جاں	کارفر فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست وبالا ہست	کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے۔ ۔

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔ (ماخوذ از ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک)

افاداتِ علم وحکمت

مختلف مواقع پر کئے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کے علمی جوابات

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللهُ إِلَى اللّٰهِ كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ، أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ ① . صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

قرآن حکیم اور انسانی نفسیات...... ظاہر بات ہے کہ آیت میں ظاہری پاکی و ناپاکی تو مراد نہیں ہے کہ جس کے کپڑے پاک ہوں وہ تو طیبین میں داخل ہو گیا اور جس کے کپڑے ناپاک ہوں وہ خبیثین میں داخل ہو گیا۔ طیبین وہ خبیثین بلحاظ عقائد و اعمال اور افکار کے مراد ہیں کہ طیبین وہ ہیں جن کے عقائد بھی درست، اعمال بھی درست اور جن کا فکر بھی درست اور جو اس میں داخل نہیں ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ اور اگر انبیاء علیہم السلام کی بھی اولاد ہو اور وہ کفر میں مبتلا ہو وہ خبیثین میں شامل ہوگی، طیبین میں شامل نہیں ہوگی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرمادیا گیا: ﴿إِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ ② وہ آپ کے اہل میں سے نہیں آپ کا اہل وہ ہے جو آپ کا مطیع ہو۔ جیسے کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَنْ أَطَاعَنِيْ فَهُوَ اٰلِيْ.'' جو میری اطاعت کرے گا وہ میری آل اولاد میں داخل ہے، جو اطاعت نہیں کرے گا وہ آل اولاد سے خارج ہے۔ یہاں پر نسبی اولاد مراد نہیں، روحانی اولاد مراد ہے جو میرے دین پر ہوا اور اس دین پر چلے وہ میری اولاد ہے۔

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۲۶. ② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۴۶.

اور بعض روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا بھی ہے کہ: ''اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ.'' ① ''میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں،،۔اس سے بھی نسبی باپ مراد نہیں۔ بلکہ نسبتی اور روحانی باپ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو میرا دین پہنچا اور وہ اس پر چلا تو میں اس کے حق میں باپ ہوں اور وہ میرے حق میں اولاد ہے اور جو اس سے نکل گیا نہ میں اس کے حق میں باپ ہوں اور نہ وہ میرے حق میں اولاد ہے۔ یہی معنی طیب وخبیث کے ہیں کہ جو اس فکر وعقیدے اور عمل سے خارج ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ جو اس میں داخل ہے وہ طیبین میں داخل ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جو طیبین میں داخل ہیں۔ وہ دین پسند ہیں۔ وہ طیبات ہی کو پسند کریں گے کہ ان میں بھی دین ہو۔ کوئی نیک صالح یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی فاحشہ آجائے یا بدکردار آجائے۔ بخلاف خبیثین کے جو خبث میں مبتلا ہیں انہیں عورتیں بھی وہی پسند ہوں گی جو خبث میں مبتلا ہوں۔ پاک صاف اور طاہرات ہوں تو ان کی طبیعت کبھی رجوع نہیں کرے گی۔ اس لئے کہ دلوں کے اندر خبث بھرا ہوا ہے تو یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کو قرآن نے اٹھایا ہے کہ نیک آدمی نیک چیزوں کی طرف توجہ کرے گا اور بد آدمی بد چیزوں کی طرف۔ وہ چیزیں عورتیں ہوں یا اشیاء ہوں جب دل میں بدی ہے تو بدی ہی پسند آئے گی۔ دل میں پاکی ہے تو پاکی ہی پسند آئے گی۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ان کی طبائع ہی پاک پیدا کی گئیں ہیں بالطبع جب نبی علیہ السلام کی طبیعت چلے گی خیر کی طرف چلے گی۔ شر کی طرف کبھی نہیں جائے گی۔ اس لئے کہ بنیاد پاک ہے۔ اسی طرح سے اگر ان کے طفیل سے کسی کی بنیاد پاک ہے۔

یا ریاضت ومجاہدہ سے اپنی طبیعت پاک کرلی تو وہ پاک ہی چیزوں کو پسند کرے گا، ناپاک چیزوں کو کبھی نہیں پسند کرے گا۔ غذا بھی ہو، تو پاک غذا پسند کرے گا ناپاک نہیں، لباس ہو تو جائز لباس پسند کرے گا، ناجائز نہیں، ہر چیز میں یہ اصول چلے گا کیوں کہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔

یورپ کے ایک ریفارمر نے لکھا ہے کہ قرآنِ کریم دنیا کی پہلی کتاب ہے جس نے نفسیات سے بحث کی ہے اور کتابوں میں احکام دیئے گئے ہیں یہ ناجائز ہے یہ حلال ہے یہ حرام ہے اور قرآنِ کریم نے صرف حلال وحرام بیان نہیں کیا، حلال تک پہنچے کا جو نفسیاتی طریقہ ہے ادھر بھی توجہ دلائی ہے، حرام تک پہنچنے کے جو نفسیاتی اصول ہیں ان کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات...... جیسے مثلاً ایک حدیث ہے جو قرآنِ کریم کی شرح ہے۔ اس میں فرمایا گیا صحابہ رضی اللہ عنہ کا مجمع تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کَیْفَ بِکُمْ اِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ وَطَغٰی نِسَآئُکُمْ'' لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فاسق وفاجر بن جائیں گے اور عورتیں آزاد ہو

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب کراهیة استقبال القبلة عند قضاء الحاجة، ج: ۱، ص: ۱۰۲، حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۱ ص: ۸۶.

جائیں گی اور تمہارے کہنے میں نہیں رہیں گی۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تو خیر القرون میں ہیں، ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی۔ حیران ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ ہو جائے گا؟ "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ" "یہ بھی ہوگا اور اس سے زیادہ سخت بات ہوگی"۔ "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا لَمْ تَاْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ." اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب اچھی باتوں کی نصیحت چھوٹ جائے گی اور بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے گا۔ تو صحابہ میں حیرانی پیدا ہوئی کہ یہ کیسے ہوگا۔ وہ تو پاک زمانہ ہے، رات دن معروفات میں ہیں، بدی کا تو ان کے ذہنوں میں تصور بھی نہیں آتا۔ تو حیران ہوئے اور عرض کیا: "وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَّارَسُوْلَ اللّٰهِ؟" "یا رسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟" "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ." "یہ بھی ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا"۔ "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْکَرِ وَنَهَیْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ." اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب منکرات کی تو ہدایت کرنے بیٹھ جاؤ گے اور معروفات کے روکنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ گے، اب تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پہلے سے بھی زیادہ تحیر بڑھا اور عرض کیا: "وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَآئِنٌ یَّارَسُوْلَ اللّٰهِ؟" "یا رسول اللہ! کیا ایسا ہو جائے گا؟" "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ." "بھی ہوگا "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا" ① "اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ اچھی چیزوں کو تم برا جاننے لگو گے یعنی فہم ہی الٹ جائے گا کہ اچھی چیزیں بری نظر پڑیں گی اور بری چیزیں دلوں کے اندر اچھائی بن جائیں گی۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا۔"

تو اس حدیث میں درجات بتلائے گئے ہیں کہ سب سے پہلے عمل سے ابتداء ہوتی ہے کہ عملی طور پر آدمی فسق و فجور اور تعدی و زیادتی کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔ عقیدے میں کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ عمل خراب ہوتا ہے۔ نوجوان فاسق و فاجر ہو گئے، عورتیں سرکش اور آزاد بن گئیں۔ خاوند کی سنتی ہیں نہ باپ کی سنتی ہیں نہ اولاد کی سنتی ہیں، جو ان کے جی میں آتا ہے کرتی ہیں۔ تو عملی خرابی ہے۔

عملی خرابی جب جڑ پکڑ جاتی ہے تو نصیحت کا کارخانہ رک جاتا ہے۔ نصیحت کرنے والے کے دل میں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کہہ دیا تمہارا عمل نہیں ہے تم کس منہ سے نصیحت کر رہے ہو۔ تو نصیحت کا کیا منہ رہے گا۔ تو نصیحت رک جائے گی تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو گیا۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اچھی باتوں سے روکنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور بری باتوں کی ہدایت کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ گے اور چوتھا مقام فہم کے الٹ جانے کا ہے کہ جو اچھائی کی چیزیں ہیں، وہ بری بن جائیں اور جو بری چیزیں ہیں وہ اچھی نظر آنے لگیں۔

① مسند ابی یعلی الموصلی، شهر بن حوشب عن ابی هریرةؓ، ج: ۱۳، ص: ۱۸۴۔ علامہ ہیثمیؒ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب فی أيام الصبر و فیمن یتمسک ج: ۳ ص: ۳۱۴.

یہاں آ کر فہم کا الٹا پن ظاہر ہوتا ہے، غرض خرابی پہلے عمل سے شروع ہوتی ہے، پھر عقیدے پر پھر نصیحت پر، پھر عقل وفہم پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، انجام کار آدمی الٹا چلنے لگتا ہے قلب میں زیغ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب یہ نفسیاتی اصول ہے کہ عمل اول بگڑے گا فکر بعد میں بگڑے گی، عقیدہ اس کے بعد بگڑے گا اور پھر فہم الٹ جائے گا۔ تو فقط یہ نہیں فرمایا کہ برائی سے بچو۔ برائی سے بچنے کا نفسیاتی راستہ بھی بتلا دیا کہ عمل کی حفاظت کرو تاکہ فکر محفوظ رہے فکر کی حفاظت کرو تاکہ عقیدہ محفوظ رہے۔ عقیدے کی حفاظت کرو تاکہ فہم میں کجی نہ پیدا ہو۔ تو یہ ایک سلسلہ ظاہر فرمایا۔

تو یورپ کے ریفارمر نے یہی کہا کہ دنیا کی ساری کتابوں میں احکام موجود ہیں، قرآنِ کریم میں احکام کے ساتھ نفسیات سے بحث کی گئی ہے۔ جو کسی کتاب میں نہیں کی گئی۔ فطرت کے راستے دکھلائے گئے۔

اب جب قرآنِ کریم کی تعلیم ہی چھوٹ جائے تو احکام کیسے معلوم ہوں۔ احکام نہ معلوم ہوں تو عقائد کیسے درست رہیں۔ عقائد درست نہ ہوں تو فکر کیسے صحیح رہے اور جب فکر صحیح نہیں رہے گی۔ الٹی ہو جائے گی۔ تو دل ہی الٹ جائیں گے۔

اسی کو فرمایا گیا ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ﴾ ① ''بہت سے وہ لوگ ہیں جو مومن ہونے کے مدعی ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں''۔ شرک میں مبتلا ہیں یہی تو وہ مقام ہے۔

گائے علامت حیات ہے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ گائے ذبح کر کے اس میت سے ملاؤ، وہ زندہ ہوگا۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ آپ مذاق کر رہے ہو۔ فرمایا۔ ﴿أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ ② ''مذاق مسخرہ ہم نہیں کیا کرتے۔ میں تو وحی الٰہی سے کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا اس کی شان کیا ہوگی؟ فرمایا: ''وہ نہ بوڑھی ہو نہ بن بیاہی بلکہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہو''۔ انہوں نے کہا رنگ کیا ہوگا؟ ﴿صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ.﴾ ③ نہایت زرد خوش رنگ جو نگاہوں کو خوش کرتی ہو اور یہ کہ وہ نہ کسی کھیتی میں جڑی ہوئی ہو نہ کسی محنت میں لگی ہوئی ہو۔ یہ ساری شانیں ایک ہی گائے میں پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک صالح آدمی کی ملک تھی، اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے یتیم بچے تھے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بس یہی ایک گائے تھی۔ سارے بنی اسرائیلی جمع ہو کر وہاں پہنچے اور کہا کہ اس گائے کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا اس کو ذبح کر کے اس کھال بچھائے دیتا ہوں، اس میں سونا بھر دو، تو لاکھوں روپے کا سونا ان کو ملا اس کو ذبح کر کے اس کو میت سے ملایا گیا وہ زندہ ہوا اس نے قاتل کا پتہ دیا، غرض گائے علامت حیات ہے۔

سامری نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دریائے نیل میں فرعونی غرق ہوئے۔ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام مع بنی اسرائیل کے پار ہو گئے، پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور پانی رک کر بارہ راستے بن گئے۔ اور بارہ قبیلے اس

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۶۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۷۔ ③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۹۔

سے گزرے جو ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے۔ فرعون جب نکلا تو ہامان نے کہا کہ آپ کے اقبال سے دریا میں راستے ہوئے ہیں۔ وہ جھجکتا تھا کہ میرا اقبال کیا۔ یہ تو موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ ہے۔

مگر وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دوسرا وزیر گھوڑی یعنی مادہ پر سوار تھا، وہ گھوڑی جو تھی آگے بڑھی۔ گھوڑا بھی لپک کے اس کے پیچھے پڑا، اور وہ دریا میں کود گئے، تو یہ سارے قبطی کود ے اور وہاں غرق ہو گئے اس کے بعد سامری نے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس گھوڑے کے سم کے نیچے اگر خاک بھی ہوتی تو سبزہ اگ آتا تھا اس نے سمجھا کہ اس میں حیات کا مادہ ہے۔ اس نے چٹکی اٹھا کے رکھ لی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ اپنے زیوارت جمع کرو، سونے چاندی کے زیوارات جمع کر کے اس کا بچھڑا بنایا۔ اس میں وہ خاک پھونکی تو کودنے لگا اور اس میں آواز بھی نکلی۔ اس نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) خدا کو دیکھنے وہاں گئے۔ خدا تو معاذ اللہ یہاں آگیا۔ وہاں سے گو (گاؤ) کی پوجا شروع ہوئی۔

ہندوستان میں جو گاؤ پرستی کی وبا آئی ہے تو مؤرخین لکھتے ہیں کہ چند بنی اسرائیل جو مرتد ہو گئے تھے، بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں، تو جو کلمات حقہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے سنے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ اپنی چیزیں مل ملا کر لوگوں کو سمجھایا تو وہاں سے گوسالہ پرستی شروع ہوگئی۔ بہر حال اتنی بات معلوم ہوئی گائے جو ہے اسے حیات سے مناسبت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ماں کا دودھ نہیں ہوتا تو بچوں کو گائے کا دودھ پلواتے ہیں۔ اس کے اندر وہی مادہ ہے یعنی حیات آفرینی جو ماں کے دودھ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے خواب میں گائے وغیرہ دیکھنا انشاء اللہ حیات کی علامت ہے۔

تعبیر خواب میں حدیث فہمی کی ضرورت...... تعبیر خواب کا تعلق کچھ موسموں سے بھی ہوتا ہے۔ کچھ دیکھنے والے کی صفات سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اعداد وشمار کا بھی تعلق ہوتا ہے تو معبر (تعبیر دینے والا) اگر صحیح ہے تو وہ قواعد کی رو سے تعبیر دے گا۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر ایک سے خواب مت کہو جو پہلے تعبیر دے دے گا وہی واقعہ ہو جائے گا۔ اسی لئے سمجھدار اور خیر خواہ سے خواب کہتا کہ وہ اچھی تعبیر دے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ وہ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ ایک بہت بڑا دنبہ جو گائے کے برابر ہو ان کے مدمقابل آیا، تو مولانا نے اس کے سینگ پکڑ لئے اب کبھی وہ ریلتا ہے تو یہ پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی یہ ریلتے ہیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی مقابلہ میں اس نے مولانا کے سینگ مارا تو مولانا کی بائیں ران میں لگا اور ایک قطرہ خون کا نکلا۔ یہ خواب دیکھا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کو خواب کی تعبیریں دیا کرتے تھے، وہ بھی حاضر ہوئے اور کہا کہ بھائی صاحب! میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول کے مطابق فرمایا۔ ''موت کو دنبے کی شکل (قیامت میں) دی جائے گی موت سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ کبھی تم اسے ہٹا دیتے ہو کبھی وہ تمہیں ہٹا دیتا ہے۔

جو سینگ بائیں ران پر لگا اور قطرہ خون کا نکلا۔اس کے بارے میں فرمایا کہ عرب کا محاورہ ہے، کہ جدی رشتوں کو بطن سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ بطون کا اور پیٹ کا رشتہ ہے اور بنی اعمام جو چچا تائے کی اولاد ہے ان کو افخاذ سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ران کی اولاد ہے، یہ عرب کا ایک محاورہ ہے۔فرمایا کہ بائیں ران میں جو سینگ لگا تو ''ران'' سے میں یہ سمجھا کہ بنی اعمام میں کوئی حادثہ پیش آئے گا چوں کہ ایک قطرہ خون کا نکلا تو آپ کی چچا تائے کی اولاد میں چھوٹی عمر کا بچہ گزر جائے گا اور چونکہ عورت بائیں پسلی کی پیدائش ہے اور بائیں جانب خون لگا تو وہ لڑکی ہوگی اور چوں کہ ایک قطرہ خون ہے تو لڑکی چھوٹی عمر کی ہوگی''۔جب وہ تعبیر دی تو تھوڑی دیر میں ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں جو آپ کے چچازاد بھائیوں میں بچی پیدا ہوئی تھی وہ گزر گئی۔فرمایا تعبیر آ گئی۔

تو تعبیر میں گویا احادیث کا بھی دخل ہوا۔جیسا کہ حدیث شریف سے انہوں نے استنباط کیا۔اس لئے تعبیر دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔اسی طرح تعبیر خواب میں اختلاف موسم کو بھی دخل ہے تو معبر پہچانے گا اور موسم کے لحاظ سے تعبیر دے گا۔

تعبیر خواب میں اعداد وشمار کا دخل...... اسی طرح اعداد وشمار کا بھی دخل ہے۔حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب مرض وفات میں گرفتار ہوئے تو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام علماء کا حلقہ بہت پریشان تھے، مگر مولانا نے اطمینان دلایا کہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوگا، اب مطمئن تو ہو گئے مگر انتقال ہو گیا رحمۃ اللہ علیہ۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! آپ نے تو فرمایا تھا کہ انتقال نہیں ہوگا اور انتقال ہو گیا۔فرمایا:

''میاں! کشف تو صحیح تھا۔تعبیر میں غلطی ہوئی۔فرمایا جب میں نے مراقبہ کیا تو لفظ ''مہدی'' میرے سامنے نمایاں ہوا اور مہدی کے جو اعداد وشمار ہیں وہ ساٹھ سے بھی اوپر پہنچتے ہیں اور مولانا کو جو مرض لاحق ہوا تو عمر انچاس سال کی تھی۔تو میں نے کہا۔ابھی عمر کافی باقی ہے۔لیکن اس سے مراد لفظ مہدی نہیں تھا بلکہ مہدی کی ذات مراد تھی چناں چہ حضرت مہدی رضوان اللہ علیہ کی عمر ۴۹ سال کی ہوگی۔غرض ذات مراد تھی، نام مراد نہیں تھا۔اس لئے تعبیر میں غلطی ہوئی ہے۔کشف میں غلطی نہیں تھی''۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کشف میں اعداد وشمار کو بھی دخل ہے۔اس لئے معبر کو بہت سی چیزیں دیکھنی ہوتی ہیں، آیات واحادیث سے استدلال، موسمی اختلاف کو سامنے رکھنا، اعداد وشمار کا خیال رکھنا۔بہر حال یہ ایک مستقل فن ہے جو معبر ہی جانتا ہے۔اس لئے خواب ہمیشہ کسی ایسے آدمی سے ذکر کرنا چاہئے جس کو اس عالم شہادت سے بھی مناسبت ہو اور عالم مثال سے بھی ہو، تو وہ مطابقت اور تطبیق دے کر صحیح تعبیر دے سکتا ہے۔

روحانی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... حضور سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت عامہ ہونے کی بڑی دلیل تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ. ① ''اللہ نے سب سے پہلے میری حقیقت پیدا فرمائی''۔

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ ”نور“ سے مراد حسی نور تو نہیں ہوسکتا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے جیسے چاند اور سورج کا نور، اس حسی نور کی نورِ معنوی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے کہ آفتاب اپنے نور اور روشنی سے صورتیں اور شکلیں دکھاتا ہے اور نورِ علم سے اشیاء کی حقیقتیں اور ماہیتیں کھلتی ہیں، اس لئے علم کا نور آفتاب و ماہتاب کے نور سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے اول میرے نور کو پیدا کیا۔ کہ وہ ”نور علمی“ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوند دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ”مجسم علم“ بنایا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی شریعت کے ہر ہر حکم کے نیچے حکمت ہے۔ ہر حکمت کے نیچے حقیقت ہے ہر حقیقت کے نیچے علت ہے جس پر حکم کا مدار ہے۔ اس طرح پوری شریعت علم سے لبریز ہے۔ حتی کہ معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا۔ جہاں ہزاروں معجزات دیئے گئے جن کا اثر آسمانوں میں بھی ظاہر ہوا۔ زمین میں بھی ظاہر ہوا۔ حجر و شجر اور حیوانات میں بھی ظاہر ہوا۔ اسی لئے حیوانات نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دی۔ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزات کا اثر آسمانوں تک پہنچا، غرض یہ معجزات تو ایک طرف ہیں۔ لیکن سب سے بڑا معجزہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء کیا گیا یہ علمی اور کلامی معجزہ ہے جو قرآنِ کریم ہے، جو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی جامعیت احکام کے لحاظ سے غرض ہر اعتبار سے ایک عظیم معجزہ ہے۔ تو حقیقت میں علم گوند دیا گیا اور معجزہ علمی دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا علم ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ علم ہی سے دنیا چل رہی ہے۔ حق تعالیٰ کے علم و حکمت اور مشیت ہی پر یہ سارے کاروبار اور کارخانے چل رہے ہیں۔ اس لئے علم اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے۔ ویسے تو ساری صفات ان کی بلند ہیں مگر علم سب سے اونچی صفت ہے۔ اس واسطے کہ ہر صفت اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہے۔ مثلاً ارادہ ہے تو اس وقت تک نہیں کریں گے، جب تک مراد معلوم نہ ہو۔ قدرت ہے جب تک مقدور معلوم نہ ہو اس پر قدرت کیسے حاصل ہوگی؟ تو ارادہ و قدرت علم کا محتاج ہوا۔ فعل ہے جب تک علم نہ ہو وہ سرزد نہیں ہوسکتا۔ لیکن علم اپنا کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں۔ نہ ارادے کا نہ قدرت کا۔ مثلاً آپ ریل میں جا رہے ہیں اور ایک بڑا دریا نظر پڑے۔ تو ارادہ کریں تب معلوم ہو کہ یہ دریا ہے۔ ارادہ نہ کریں تب معلوم نہ ہو یہ دریا ہے۔ وہ تو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے علم اپنا کام کرنے میں ارادے کا محتاج نہیں۔ اسی طرح سے قدرت کا محتاج نہیں کہ اس تالاب پر آپ کو قدرت ہو جائے۔ تو معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے۔ ورنہ معلوم نہ ہو۔ قدرت ہو نہ ہو جب سامنے آئے گا تو علم ہو جائے گا۔

غرض ہر صفت علم کی محتاج ہے کہ وہ علم کے بغیر کام نہیں کرسکتی۔ علم کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ اس لئے ساری صفات اور سارے کمالات علم ہی کے تابع ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم گوند دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبوت اور ولایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ تعالیٰ نے علمی اور عملی کمالات دیئے ہیں۔ اگر ایک بھی ولی دنیا میں نہ ہو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور ہیں۔ اگر ایک بھی صحابی رضی اللہ عنہ نہ ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور تھے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی کمالات کسی چیز کے محتاج نہیں۔ آپ کے اندر غناء ہے جبکہ ہر چیز علم کی محتاج ہے۔ جب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بتلانے سے پتہ چلے گا۔ غرض ساری دنیا محتاج ہوئی، حتیٰ کہ نبوتیں بھی محتاج ہوئیں۔

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جو ہے وہ ذاتی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے تابع ہیں جو درحقیقت آپ ہی کا فیضان ہے، تو آپ کے فیضان سے پچھلوں میں تو نبوتیں پیدا ہوئیں اور اگلوں میں ولائتیں پیدا ہوئیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام بھی محتاج اور اولیاء بھی محتاج۔

یہی وجہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا۔ اور اس میں انبیاء علیہم السلام نے تقریریں کیں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اللہ نے ''صفی اللہ'' بنایا اور مجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ مجھے اولاد دی تو دنیا اولاد سے بھر دی۔ یہ میرے فضائل ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے اللہ نے کلام کیا۔ مجھے متکلم (بات کرنے والا) بنایا، کلام کی توفیق دی اور طور پر مجھ سے بات چیت ہوئی، مجھے اور میرے ماننے والوں کو بحر قلزم میں نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ غرض انہوں نے یہ اپنے فضائل بیان کئے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ملک دیا کہ کسی کو ویسا ملک نہیں ملا۔ ہواؤں پر مجھے قدرت دی جانوروں پر مجھے قدرت دی، سب میری رعایا میں داخل ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ مجھے اللہ نے ''روح اللہ'' بنایا مجھے بلا باپ کے قدرت سے پیدا فرمایا۔ جب یہ سب بیان کر چکے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل بیان فرمائے کہ مجھے ''رحمۃ للعالمین'' بنایا، مجھے ''شفیع المذنبین'' بنایا۔ مجھے ''خاتم النبیین'' بنایا۔ میری نبوت کو اصلی بنایا اور نبوتیں تابع کیں، تو سب نے کہا کہ یہی وجہ ہے اور بنیاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء علیہم السلام پر افضل ہیں۔

غرض پہلی رحمت تو یہی ہے کہ دنیا میں ہر کمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی وساطت سے پیدا کیا گیا، دنیا میں جو کچھ ہے وہ کمال ہی سے چل رہا ہے، نقصان اور عیب سے دنیا نہیں چل رہی اور کمالات سارے علم کے تابع ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے ازل سے لے کر ابد تک روشنی پھیلی۔ تو پہلی رحمت تو یہی ہوئی۔

مادی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... دوسرے یہ کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ محدث نے روایت نقل کی ہے کہ: ﴿لَوْلَاکَ یَا مُحَمَّدُ لَمَا خَلَقْتُ اٰدَمَ﴾ ① اے محمد! (صلی اللہ علیہ

① علامہ عجلونی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قال الصغانی موضوع، واقول لکن معناه صحیح وان لم یکن حدیثاً، دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۱۶۴۔

وسلم) اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گویا پیدائش اور وجود درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوا۔ تو وجود اور زندگی کی نعمت اتنی بڑی نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تو جب وجود سب سے بڑی نعمت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ غرض مادی اعتبار سے دیکھا جائے تو وجود کی دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں بٹی۔ روحانی نعمتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کمالات علمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں پیدا ہوئے۔ تو مادی لحاظ سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ روحانی طور پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔

عالم آخرت میں رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... پھر یہ کہ قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیا جائے گا۔ تمام امتوں کے صلحاء کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے۔ میدان محشر میں سب لوگ کھڑے ہوں گے اور زمین پر ساری مخلوق اس طرح سے ہوگی کہ نہ جھک سکتے ہیں، نہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ لیٹ سکتے ہیں۔ اور آفتاب کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوگی۔ لوگ پسینے میں غرق ہوں گے۔ اور اس طرح چالیس برس کا عرصہ گزر جائے گا۔ اس وقت لوگوں کے دلوں میں آئے گا کہ کسی سے شفاعت کراؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ:

''اللہ نے آپ کو ہم سب کے لئے باپ بنایا۔ باپ کی شفقت والفت معلوم ومتعین ہے۔ آپ علیہ السلام ہماری سفارش کریں کہ اس مصیبت سے نجات ملے''۔

وہ فرمائیں گے: ''لَسْتُ لَهَا.'' ''میں اس کا اہل نہیں ہوں'' میں نے ایک غلطی کی تھی۔ گو وہ معصیت تو نہیں کی تھی مگر ایک لغزش تھی، جس درخت کی ممانعت کی گئی تھی وہ کھالیا تھا۔ اور معصیت نہیں تھی کہ معصیت حکم کی خلاف ورزی کرنے کو کہتے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ شیطان نے اس میں تاویل سکھائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی کو دوامی زندگی ملتی ہے۔ تو یہ ممانعت جو تھی وقتی تھی۔ آپ میں اس وقت تک اتنی استعداد نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے استعداد پیدا ہوگئی، اب کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔

تو تاویل کے راستے سے کھایا اور تاویل کے راستے سے کوئی کام کرنا معصیت نہیں ہوتا، خطاء فکری اور خطاء اجتہادی ہوتی ہے اور خطاء اجتہادی معصیت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ مجتہد اگر صواب کرے تو دوہرا اجر ملتا ہے، خطا پر ایک اجر ملتا ہے۔ تو معصیت پر اجر تھوڑا ہی مل سکتا ہے؟ اس لئے معصیت تو نہیں تھی۔ خطاء فکری واجتہادی تھی۔ وہ مجھ سے سرزد ہوگئی۔ تو اسے پیش کریں گے کہ میرا منہ اس قابل نہیں ہے، کہ میں اللہ سے جا کر تمہاری سفارش کروں۔ میں اس کا اہل نہیں، تم حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ پھر لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے وہ بھی عذر کر دیں گے کہ:

"لَسْتُ لَهَا:" "میں اس کا اہل نہیں"۔ میں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کو بلایا لیا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ.﴾ ① "جب یہ کفر میں مبتلا ہے تو تمہاری اولاد نہیں رہا"۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ جاہلوں کی سی باتیں مت کرو، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسی وقت استغفار کیا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ مجھ سے یہ خطاء سرزد ہوئی تھی۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں سفارشی بن کر جاؤں اگر مجھے کہا تم نے تو غلطی کی تھی تمہاری شفاعت کا کیا منہ ہے، تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

وہ بھی عذر کردیں گے کہ "لَسْتُ لَهَا" "میرے سے فلاں لغزش ہوگئی تھی"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے میں نے ایک قبطی کو تھپڑ مارا تھا۔ اس کی گردن اڑگئی حالانکہ وہ خطاء عمداً نہیں کی تھی کہ اسے قتل کیا ہو مگر نبی کا ہاتھ اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لئے اس کی گردن اڑگئی۔ اس لئے میرا منہ نہیں ہے کہ میں جاکر سفارش کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے تم نے قتل کیا تھا۔ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ مگر جب لوگ ان کے پاس آئیں گے تو وہ فرمائیں گے۔ "لَسْتُ لَهَا" "میں اس قابل نہیں ہوں"۔ میری قوم نے مجھے خدا اور اس کا بیٹا کہا۔ اگر یہ فرمادیا گیا کہ اچھا آپ وہی ہیں جنہیں ہماری مسند پر خدا بنا کر بٹھایا گیا تھا؟ کیا وہ آپ ہی ہیں جنہیں خدا کا بیٹا کہا گیا تھا؟ حالانکہ اللہ بیٹے اور باپ سے بری ہے۔

تو میرا منہ اس قابل نہیں کہ میں سامنے ہوں۔ اس لئے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ کہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ "اَنَا لَهَا اَنَا لَهَا" "میں اس کا اہل ہوں" میں سفارش کروں گا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام محمود پر فائز کئے جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سات دن رات کی لمبی مدت تک میں سجدے میں پڑا رہوں گا اور اللہ کی وہ حمد وثناء بیان کروں گا کہ عالم میں کسی نے نہیں کی ہوگی اور اب میرے دل میں بھی نہیں ہے۔ اسی وقت القاء کی جائے گی۔

مگر اس قدر رعنا کا دن ہوگا کہ سات دن آپ سجدے میں رہیں گے اور کچھ نہیں کہا جائے گا۔ سات دن کے بعد اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ:

"یَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَاْسَكَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ" ② "سر اٹھاؤ۔ سوال کرو ہم عطا کریں گے۔ شفاعت کرو تو ہم قبول کریں گے"۔ غرض پورے عالم میں صلحاء کے لئے خواہ وہ کسی بھی امت کے ہوں آپ شفاعت فرمائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم اب حساب شروع کرتے ہیں اور جس کا جو ٹھکانہ ہوگا۔ وہ وہاں پہنچ جائے

---

① پارہ: ۱۲، سورۃ هود، الآیة: ۴۶. ② الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: لما خلقت بیدی، ج: ۲۲، ص: ۴۱۸.

گا۔ غرض یہ شفاعت کبریٰ کا مقام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا۔ اس دن آخرت میں سب اولین وآخرین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور آپ کی سیادت پورے عالم پر ظاہر ہوگی۔ اس وقت جو منکر کفار ہوں گے وہ حسرت میں پڑیں گے کہ کیوں نہ ہم ایمان لائے۔ تو یہ تیسری ''رحمت عامہ'' ہے جو پورے عالم پر متوجہ ہوگی۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی آثار...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا میں ہوں گا جو جا کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور کہوں گا کہ دروازہ کھولو۔ پھر امتیں داخل ہونا شروع ہوں گی۔ گویا جنت میں داخلہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طفیل ہوگا، اسی طرح ابد تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت پہنچی ہوئی ہے۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ازلی آثار...... اور ازل سے رحمت یہ ہے کہ جب ''عہدِ اَلَسْتُ'' کیا گیا اور حق تعالیٰ نے فرمایا ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ''۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ساری مخلوق کو آدم علیہ السلام کی کمرے سے نکالا اور جمع کیا اور فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ کیا جواب دیں۔ اس لئے کہ آدم کی کمر سے نکلے ہوئے اس وقت کوئی عقل وشعور نہیں تھا اور صفت ربوبیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو حیرانی پیدا ہوگئی تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی جواب دیا کہ۔ ''بَلٰی''،'' کیوں نہیں، بیشک آپ ہمارے رب ہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب دیتے ہی تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان پر جاری ہوگیا، ''بَلٰی بَلٰی'' بے شک آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ اس کے بعد ساری مخلوق نے زبان سے کہا ''بَلٰی'' آپ ہی ہمارے رب ہیں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں اور تمہارے باپ کو گواہ کرتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا اس آسمان وزمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا۔ اور اس ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے اقرار کیا۔ جب تم دنیا میں پہنچو تو اس اقرار کو یاد رکھنا اور میرے رب ہونے کو ماننا اور میری تقدیر پر راضی رہنا۔ غرض اس وقت سب نے بَلٰی کا لفظ اختیار کیا اور سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اختیار کیا۔

تو رحمۃ للعالمین ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے جواب دینے کے قابل جب ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب سکھلایا۔ تو حق تعالیٰ نے تو تعلیم کے ذریعے سے ربوبیت کا اقرار کرایا۔ اس لئے رحمت عامہ ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے؟۔ غرض ازل میں بھی رحمت، دنیا میں تشریف لائے تب رحمت، برزخ میں پہنچیں گے تب رحمت۔ شب معراج میں پہنچے تب رحمت، قیامت کے دن شفاعت کبریٰ ہوگی تب رحمت اور ''اَوَّلُ مَنْ يَّدُقُّ بَابَ الْجَنَّةِ''۔ ① ''کہ سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے''۔ تب رحمت، غرض اول سے لے کر آخر تک رحمت ہی رحمت ثابت ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم...... اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں بلکہ فرمایا کہ آپ''

---

① کنز العمال، ج: ۱۱، ص: ۴۰۴، رقم: ۳۱۸۸۶. (ابن النجار عن انسؓ.)

رحمۃ للعالمین'' ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے لئے بھی رحمت، عالم جنات کے لئے بھی رحمت، عالم حیوانات کے لیے بھی رحمت، عالم بشر کے لیے بھی رحمت، غرض جتنے عالم اللہ نے بنائے ہیں سب کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہیں۔ جب وجود ہی ہر چیز کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ہوا تو ہر چیز مرہون منت اور مرہون احسان ہے، اس واسطے آپ کی رحمۃ للعالمینی ازل سے چلی اور ابد تک چلتی رہے گی۔ قیامت پر ختم نہیں ہوگی بلکہ جنتوں میں بھی چلے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ: حافظِ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّلْ وَارْتَقِ۔ ① ''تلاوت کرتا جا اور جنت کے درجات طے کرتا جا''۔ ظاہر بات ہے کہ قرآنِ کریم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی لے کر تشریف لائے۔ تو مدارج کی ترقی قرآنِ کریم کے ذریعے ہوئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے دنیا کو پہنچا۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ قرآنِ کریم کی جتنی آیات ہیں، جنت کے اتنے ہی درجات ہیں۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ جو آیتیں ہیں یہی بعینہ جنت میں درجات کی صورت میں منکشف ہو جائیں گی۔ یہاں یہ آیتیں علمی شکل میں ہیں، وہاں جا کر باغ و بہار کی شکل اختیار کریں گی۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ اور قومیں تو جنت میں داخل کی جائیں گی اور مسلم حفاظ کے سینوں میں خود جنت آئی ہوئی ہے۔ جو یہ قرآنِ کریم ہے۔ اس کی آیات ہی جنت بنیں گی۔

تو یہ سب رحمۃ للعالمین ہی کی شان کا ظہور ہے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت قلوب سے لے کر قوالب تک (ڈھانچہ) ازل سے لے کر ابد تک، دنیا سے لے کر برزخ تک پھیلی ہوئی ہے، اسی لئے رحمۃ للعالمین کہا گیا، رحمۃ للعالم نہیں کہا گیا۔ اس میں تمام عالم داخل ہیں۔

اللہ نے سب سے بڑا ہدیہ جو مخلوق کو دیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود ہے جو عطا کیا گیا۔ اور اسی لئے فرمایا کہ جب کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئے یا کوئی غم طاری ہو تو وہ میری وفات کو یاد کرے، کہ اس سے بڑا صدمہ عالم کے لئے نہیں ہے۔

حقیقتِ توسل...... توسل کا ایک تو مطلب یہ ہے جو دنیا میں ہوتا ہے کہ جو شفاعت کے طور پر کسی کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ حاکم پر اس کا اثر ہے۔ حاکم اس کی بات کو مان لے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معنی تو نہیں ہو سکتے۔ یہ شرک میں بھی داخل ہے۔ حق تعالیٰ پر کس کا اثر ہو سکتا ہے؟ وہ خود موثر بالذات ہیں ان پر کون موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے وسیلہ کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا۔ یہاں تو توسل کا مطلب یہ ہوگا کہ جس رحمت سے آپ نے ان لوگوں کو نوازا ہے، اس میں مجھے بھی حصہ عطاء فرما دیجئے کہ میں بھی اس رحمت سے نوازا جاؤں۔ وسیلے کے یہاں یہ معنی ہیں تو یہ معنی کہ وہ وسیلے والا حق تعالیٰ پر اثر رکھتا ہے، اس کے دربار میں تو سب بندے ہیں اور سب محتاج ہیں۔ انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جو سب سے زیادہ مقدس طبقہ اور حق تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ مقرب ہیں۔

---

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن، ج: ١٠، ص: ١٥٦.

لیکن قیامت کے دن صورت یہ ہوگی کہ انبیاء کرام علیہم السلام اس طرح تھرتھرائے ہوئے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہو پتہ۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ تورات کہاں ہے؟ وہ عرض کریں گے میں نے تو موسیٰ علیہ السلام کو پہنچا دی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جائے گا کہ آپ کو تورات پہنچی؟ وہ عرض کریں گے، جی ہاں پہنچی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے۔ میں نے امت کو پہنچا دی۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب طلب کیا جائے گا تو کیفیت یہ ہوگی کہ اس طرح تھراتھرائے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ تھرتھر کانپتا ہے۔ یہی صورتحال اور انبیاء علیہم السلام کی بھی ہوگی۔

اسی طرح سے قرآن کریم کے بارے میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ قرآن کریم کہاں ہے؟ عرض کریں گے میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر پہنچا دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم طلب کئے جائیں گے اور پوچھا جائے گا آپ تک قرآن کریم پہنچا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرض کریں گے، جی ہاں پہنچا۔ فرمایا جائے گا، آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے، میں نے امت کو پہنچا دیا۔ فرمایا جائے گا کہ اب بیٹھ کر سناؤ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرش کے نیچے منبر بچھایا جائے گا۔ سارے اولین وآخرین کے مجمع میں، آپ پورا قرآن کریم تلاوت فرمائیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ قران کریم کے اندر ایک تو لفظ ہیں، لفظوں کے نیچے ان کے معانی ہیں۔ معانی کے نیچے ان کے حقائق ہیں۔ حقائق کے نیچے اسرار ومصالح اور حکمتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں مجسم کر کے نمایاں کی جائیں گی اور قرآن کریم ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک باغ وبہار کھڑا ہوا ہے۔ ہزاروں رنگ کے پھول اس میں کھلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں خوشبوؤں سے معطر ہے۔ تو لوگ کہیں گے یہ قرآن تو آج تک ہم نے سنا ہی نہیں، یہ تو عجیب وغریب قرآن ہے۔ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ شانہ، موجود حضرات انبیاء علیہم السلام موجود، اور ملائکہ علیہم السلام موجود تو روحانیت کی کیا انتہا ہوگی؟ پڑھنے والے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے تو روحانیت کا کیا مقام ہوگا؟ غرض جو ساری چیزیں علمی طور پر قلوب میں تھیں مجسم ہو کر سامنے آئیں گے۔ تو ایک عظیم باغ وبہار کی صورت میں قرآن نمایاں ہوگا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہ بھی کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے آج تک سنا ہی نہیں تھا۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت انبیاء علیہم السلام کی شان بھی یہ ہوگی کہ وہ مصیبت کی وجہ سے تھرتھرائے ہوئے ہونگے تو پھر میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ اس واسطے توسل کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ صاحب وسیلہ کا اثر اللہ تعالیٰ پر پڑے گا۔ یہ تو دنیا کی حکومتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تو صرف، توسل کے یہ معنی ہونگے کہ جس رحمت وبرکت سے آپ نے ان بزرگوں کو نوازا ہے، اس میں ہم غریبوں کو بھی شامل فرما لیجئے، کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے نہ یہ معنی کہ ہم اثر ڈالتے ہیں اور حق تعالیٰ ہماری سفارش سے مجبور ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ

جابر ہیں مجبور نہیں ہیں۔ قاہر ہیں مقہور نہیں ہیں۔

مقہور ومجبور تو بندے ہیں۔ اس لئے توسل کے یہ معنی کہ اللہ پر اثر ہو یہ تو شرک ہے اور ایک یہ کہ اس توسل کی نعمت میں ہمیں داخل فرما لیجئے، یہ دعا اور استدعاء ہے یہ عبدیت اور بندگی میں داخل ہے۔ اس توسل میں کوئی حرج نہیں ہے اس کی شریعت نے اجازت دی ہے توسل کے اس معنی کے لحاظ سے آپ یہاں بیٹھ کر دعا مانگیں، خواہ کسی قبر پر جا کر مانگیں وہ جائز ہے یہاں بھی جائز ہے، قبر پر بھی جائز ہے۔ قبر والے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ حق تعالیٰ سے مانگے کہ جس نعمت سے آپ نے انہیں نوازا ہے اس نعمت سے مجھے بھی نواز دیجئے۔ اس توسل کی اجازت دی گئی ہے۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟...... عید میلاد النبی پر جلوس اور مجلس وغیرہ یہ سارے مظاہرات ہیں جیسے دنیا میں نمائشی مظاہرے ہوتے ہیں۔ اسلام کے مزاج میں یہ چیزیں داخل نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں اسلامی مزاج کے مطابق ہوتیں، تو سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کرتے، تابعین رحمہم اللہ کرتے، آئمہ مجتہدین کرتے۔

لیکن کسی سے منقول نہیں بلکہ چند صدیوں کے بعد یہ مظاہرے شروع ہوئے۔ ان مظاہروں میں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ بھائی! کرلیا۔ لیکن یہ جو نمائشی صورتیں ہیں اور غلو ہے یہ اسلامی مزاج نہیں ہے۔ یہ دوسری اقوام سے لیا گیا ہے جیسے ہندوؤں میں جلوس نکلتے ہیں۔ ان کے جو مقتدیٰ ہیں ان کی صورتیں بنا بنا کر اونٹوں پر اور ہاتھیوں پر رکھتے ہیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔ اسلام تو حقائق لے کر آیا ہے، صورتوں اور شکلوں کی نمائش لے کر نہیں آیا۔ اپنے اندر حقیقت پیدا کرو۔ نمائش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام کا موضوع تو یہ ہے کہ جو خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں ان میں بھی زیادہ مت الجھو۔ اسی لئے بعض علماء لکھتے ہیں اگر صورتوں کے عشق ومحبت مبتلا ہوا تو حسن خاتمہ کے اندر فرق پڑ جائے گا۔ اس لئے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کا وقت ہے اور آپ صورتوں میں الجھے ہوئے ہیں تو صورتیں حقیقت سے روکیں گی۔ اس واسطے اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو۔ حقائق کا طرف التفات کرو جو دوامی اور ابدی ہیں۔

اکمال دین کا طریق...... سوال اوّل ......﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾۔ ① یہ آیت قرآن میں اپنی جگہ سب سے آخر میں چاہتی ہے، ورنہ اس کی موجودہ جگہ قرآن کے غیر مرتب ہونے پر دال ہوگی؟

جواب اَلْيَوْمَ سے خاص یوم نزول آیت مراد نہیں، بلکہ مطلقاً دور حاضر مراد ہے اور وہ عام ہے، وقت نزول کو بھی اور نزول آیت کے ماقبل و مابعد کے زمانے کو بھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ ''آج بڑا نازک زمانہ ہے'' یا ''آج لوگوں کو بھلا کام کرنا دشوار ہوگیا ہے''۔ ''یا آج کا دن تو وہ ہے کہ بھیڑیوں نے بھی انسانوں سے پناہ مانگی ہے''۔ ظاہر ہے کہ اس سے یوم تکلم کی تاریخ مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ دور مراد ہوتا ہے جس سے متکلم اور

① پارہ: ٦، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ٣۔

مخاطب گزر رہے ہوتے ہیں۔ پس یہاں بھی ''الیوم'' سے مراد وہ دور حاضر ہے جس سے مخاطبین قرآن گزر رہے تھے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری حصہ نہ کہ خاص یوم نزول آیت۔ چناں چہ اس آیت کے نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اس صورت میں اگر اس آیت کے نزول کے بعد اور بھی کچھ آیتیں اتریں تو وہ اکمال دین کے منافی ثابت نہیں ہوسکتیں اور نہ ہی دائرہ اکمال سے خارج ہوسکتی ہیں۔ اس لئے یوم نزول آیت سے پہلا اور پچھلا سارا دین ''اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ'' میں داخل رہے گا۔ گو یہ آیت درمیان میں آجائے اور سب سے اخیر میں نہ رہے۔

تشہیر اکمال دین ...... رہا یہ کہ اس آیت کے نزول کا وقت کلیۃً آخر میں، بلکہ یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کیوں نہ رکھا گیا کہ ظاہر طور پر بھی اس آیت سے پورے دین کی تکمیل کا اعلان ہوجاتا اور ''الیوم'' کے معنی مطلقاً دور حاضر کے نہ لینے پڑتے؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے فقط اکمال دین کی کوئی علمی یا اعتقادی خبر ہی دینی مقصود نہ تھی۔ بلکہ اکمال دین کا پورا پورا اشتہار بھی مقصود تھا اور اس کے لئے یوم نزول سے بڑھ کر دوسرا کوئی وقت موزوں نہیں ہوسکتا تھا، کیوں کہ یہ یوم عرفہ تھا جس میں حج کے لئے اطراف سے لوگ جمع ہوئے تھے، پھر اوپر سے یوم جمعہ بھی تھا۔ جو خود یوم جامع ہے اور اس پر مزید یہ کہ حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا دن تھا جس میں ایک لاکھ سے اوپر صحابہ رضی اللہ عنہم کے عدد کی اکثریت حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے شریک حج ہوئی۔

پس اس یوم جامع میں تمام جمع شدہ مسلمانوں کے روبرو ہیئت اجتماعی کے ساتھ عین وقت اجتماع میں ذات جامع پر یہ آیت اتاردی گئی، تاکہ بیک دم تمام مسلمین اولین اکمال دین کی اطلاع بھی پالیں اور اس کے نزول کا مشاہدہ کرکے ان کے دلوں میں یہ چیز اتر جائے کہ اب جبکہ یہ دین کامل ہوچکا ہے، تو اس کے بعد نہ دنیا میں کوئی نیا نبی و دین آنے والا ہے اور نہ آئے ہوئے دین میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ ہونے والی ہے۔ پس یہ اکمال دین کی اطلاع ہی نہیں تھی بلکہ اس کی تشہیر و دعایت اور نزول آیت کا مشاہدہ کرا کر اور ''عَلٰی رُءُوْسِ الْاَشْهَادِ'' مراد (واضح ثبوت) اسے نازل فرما کر یہ خبر شائع بھی کرنی تھی کہ اب نجات کا انحصار اسی دین میں ہے اور بس۔ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.﴾ ①

اکمال دین کے بارے میں ازالہ تشکیک ...... اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اگر اسلام کا یہ بنیادی دعویٰ (اکمال دین) عین یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے آخر میں نازل کیا جاتا، تو قطع نظر اس کے بروقت اعلان عام نہ ہوسکنے کا ایک مفسدہ یہ بھی محتمل تھا کہ اگر اس دعویٰ کے اعلان میں کسی کو شبہ پیش آتا اور اس کی وہ شرح سامنے نہ آتی جو نزول آیت کے ۹۰ دن بعد تک ہوتی رہی، تو اس شبہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی اور ہوسکتا تھا کہ خود غرض تکمیل دین کے بارے میں شبہات ڈال کر دین کے اتمام و کمال کو مشتبہ بنا

① پارہ: ۳، سورۃ ال عمران، الآیۃ: ۸۵.

دیتے اور بعد میں آنے والے تیس دجال جو بہ نص حدیث ادعاء نبوت کے ساتھ آنے والے تھے اپنا مطلب یہ کہہ کر نکال لیتے کہ دین کے آخری اور کامل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں کوئی نبی نہ آسکے یا اس دین کے بارے میں کوئی بیان اور شرح بھی نازل نہ ہو سکے۔ لیکن جب کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹۰ دن اس دنیا میں قیام فرمایا اور اکمال دین کی حقیقت بعد کے کلمات سے اور زیادہ واضح فرمادی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کا آخری اور مکمل ہونا شرح صدر کے ساتھ سمجھ گئے اور گویا اس کی گنجائش دے دی گئی کہ اگر کسی کو اس اکمال میں شبہ یا شک ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابھی دنیا میں موجود ہیں اور ان پر وحی بھی آرہی ہے۔ وہ اس شبہ کو رفع کر سکتا ہے۔ اس چیز نے دعوئے اکمال کو ہر قسم کے احتمالی شک وشبہ سے بھی پاک کر دیا۔ ورنہ جیسے حدیث قرطاس یوم وفات نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، اور اس کے بارہ میں بعد کے بیان سے لوگ تشنہ رہ گئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کچھ اختلاف رائے بھی ہو گیا جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روافض نے اسے ملعبہ اور ایجاد فتنہ کا حیلہ بنالیا۔ محض اس لئے کہ قرب وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اس کا کوئی بیان یا کوئی شرح سامنے نہ آسکی جو عوام کی زبان بندی کر سکے۔

ایسے ہی اگر یہ آیت بھی جس میں اسلام کی تکمیل اور مدار نجات ہونے کا بنیادی دعویٰ تھا۔ عین وفات کے دن آخری ساعتوں میں نازل ہوتی اور بعد کی شرح سامنے نہ آتی تو ممکن تھا کہ اکمال دین کے بارہ میں احتمالات اور تشکیک پیدا کر کے عوام کو فتنے میں مبتلا کیا جاتا اور دجالین وقت اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ جبکہ نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد تک حضور کو دنیا میں رکھا گیا۔ وحی اترتی رہی اور اس مقصد کی شرح حد تکمیل کو پہنچتی رہی۔ تو اس قسم کے احتمالات اور شکوک کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

بہر حال آیت کا نزول تو حجۃ الوداع کے موقع پر رکھا گیا تا کہ ایک وقت میں "ایک مکان میں مسلمانوں کے تمام خواص وعوام کے جمع شدہ مجمع میں اکمال دین کا اعلان ہو جائے کہ اس اجتماع کے بعد حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پھر ایسا اجتماع ہونے والا نہ تھا۔ پھر بعد نزول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ عرصہ دنیا میں قائم رکھ کر متعلقہ شکوک وشبہات کے تمام احتمالات کو قطع کرنا منظور تھا، کہ عین یوم وفات میں نزول ہونے سے ایسے محتمل شبہات قطع نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر "الیــــوم" سے یوم خاص نہیں بلکہ دور حاضر مراد لیا گیا تا کہ بعد کی اترنے والی بھی ساری آیتیں اس دائرہ اکمال میں داخل رہیں اور دین پورے کا پورا اپنے اجزاء سمیت کامل پکارا جائے، اندریں صورت قرآن کی ترتیب میں خواہ وہ نزول کی ترتیب ہو یا تدوین کی ترتیب ہو، کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

خلق وکسب......سوال دوم...... ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (۱) آیت سے بندہ کے جبر اور اس کے مجرم نہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کفر خدا کی طرف سے ہے۔ جواب۔ اس آیت سے بندہ مجبور محض

---

(۱) پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۷۔

ثابت نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ ختم اور مہرزدگی اگرچہ خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق وایجاد سے عمل میں آئی ہے۔ مگر اس کا یہ خلق مرتب ہوا ہے بندہ کے کسب پر یعنی بندہ نے کفریہ حرکات کرتے کرتے اپنی استعداد قبول حق فنا کر لی، تو خدا کا آخری فعل اس پر بصورت ختم مرتب ہوا۔ پس بندہ اس فناء استعداد کا سبب ہے اور خدا خالق ہے، پھر نہ صرف اس آخری فعل پر بلکہ ابتداء سے لے کر انتہا تک یہ کسب وخلق جمع چلے آرہے ہیں۔ جب بھی بندہ کسی ایمانی یا کفری حرکت کا اکتساب کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے فعل کو وجود دے دیتے ہیں یعنی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ارادہ کرتا ہے تو اسکے ارادے کو وجود دیدیتے ہیں، ارادے کے بعد وہ فعل کرتا ہے تو اس کے فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا بندہ جیسے اپنے افعال میں آزاد ہے، ایسے ہی اس کے افعال قلب وقالب کے ظہور اور وجود پر بھی حق تعالیٰ نے کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی۔ ورنہ اگر بندہ کے کسب پر اللہ کا خلق وایجاد اور وجود بخشی مرتب نہ ہو تو بندہ مجبور محض ٹھہر جائے اور وہ کچھ کر ہی نہ سکے۔

اور اسی طرح اس کے اندر جو خلقی جوہر اور مادے رکھے گئے تھے وہ نمایاں نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ بخل بھی ہے اور خلاف عدل ایک ظلم بھی ہے کہ ایک شئے میں خدا تعالیٰ اچھے برے مادے تو رکھ دے مگر انہیں نمایاں ہونے کا موقع نہ دے۔ حالاں کہ اس کی بارگاہ بخل اور ظلم سے پاک اور بری ہے۔ پس بندہ کی مجبوری اس میں تو نکل سکتی ہے کہ وہ کسی فعل کا قصد کرے اور وہ فعل نمایاں نہ ہو، نہ اس میں کہ وہ جب بھی کوئی فعل کرنا چاہے تو اس کے ظاہری وباطنی قویٰ پر کوئی پابندی عائد نہ ہو، بلکہ قدرت ہر وقت اس کی مدد کے لئے تیار ہے کہ ادھر اس نے عزم فعل کیا اور ادھر اچانک وہ فعل اس سے نمایاں ہوگیا۔ یعنی بندہ کے کسب اور خدا کے خلق میں کوئی فاصلہ یا وقفہ درمیان میں حائل نہیں ہوتا، ادھر کسب عبد ہوا ادھر معاً خلق ظاہر ہوگیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے بجلی کی روشنی میں سوئچ اور قمقمہ کی نسبت ہے کہ جیسے ہی سوئچ ہلایا ویسے ہی معاً آن کی آن میں قمقمہ روشن ہوگیا۔

پس حرکت سوئچ کسب عبد کی مثال ہے اور قمقمہ میں روشنی خلق الٰہی کی مثال ہے۔ یعنی جیسے سوئچ ہلانے والے کا روشنی بنانے یا پاور ہاؤس سے اس قمقمہ میں لا کر جلوہ گر کرنے میں کوئی ادنیٰ دخل نہیں۔ ایسے کسب افعال کرنے والے بندے کو ظہور افعال اور وجود نتائج میں کوئی دخل نہیں۔ اس کا کام صرف کسب ارادہ وفعل یعنی اکتسابی حرکت کرنا ہے، اس ارادے کی تخلیق وایجاد اور اس فعل کو وجود دینا خود بندے کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔

پس ایک بدعمل نے ظالمانہ اور کافرانہ حرکات کا کسب شروع کیا تو خدا نے ان حرکات کو وجود بخشنا شروع فرمایا اور جب وہ اکتساب کفر کرتے کرتے اس حد پر آ گیا کہ اس کی قبول حق کی صلاحیت واستعداد ہی فنا ہوگئی۔ تو خدا نے اس فنا اور بطلان استعداد کو بھی وجود دے دیا اور پیدا کر دیا۔ بس اسی فناء استعداد کے فعل وایجاد کا نام ختم ہے کہ خدا نے اس پر مہر لگا دی کہ اب اس میں ایمان داخل نہ ہوگا۔

پس ایمان کے دروازے بندے نے خود اپنے اوپر اپنے کسب سے بند کئے۔ خدا تو اس کی حرکات کو وجود بخشا

رہا نہ کہ خدا اس پر ایمان کے دروازے بند فرماتا رہا اور ظاہر ہے کہ جرم اور معصیت کسب شرور ہے نہ کہ خلق شرور کیوں کہ خلق کے معنی صرف وجود بخشنے اور عطاء وجود کے ہیں اور عطاء وجود کسی حالت میں بھی جرم یا برا نہیں ہو سکتا، ہاں خود شئے وجود یافتہ کبھی اپنی ذات سے بری ہوگی کبھی اچھی۔ مگر اسے وجود دینا کسی حال میں بھی برا نہ ہوگا کیوں کہ عطاء وجود احسان ہی احسان ہے، کہ وجود جیسی نعمت کسی شئے کو بخشی جائے، اور عدل ہی عدل ہے کہ ہر شئے کو اپنے چھپے ہوئے خلقی جوہر دکھلانے کا موقع دیا گیا ہے اور اس کی خاصیتوں کے ظہور پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پس مجرم اگر ٹھہرتا ہے تو یہ کسب شرور کرنے والا بندہ ٹھہرتا ہے نہ کہ اس کسب کو وجود بخشنے والا خدا۔ حاصل یہ کہ اس بندہ کا کفر بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے مگر تخلیقاً نہ کہ اکتساباً اور مجرم کاسِب ہوتا ہے نہ کہ خالق اور معطی وجود۔

قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ......سوال سوم......قرآن مجید حمد اور تسمیہ (بسم اللہ) سے شروع کیا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کلام باری نہیں لوگ اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں مگر چوں کہ اس تاویل کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اس وجہ سے مخالف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا اور نہ دل کو طمانینت حاصل ہوتی ہے۔

جواب......تقریر اعتراض کو واضح نہیں کیا گیا کہ اس کے مطابق جواب دیا جائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معترض خود بھی اپنے اعتراض کو سمجھتے ہوئے نہیں ہیں۔ بظاہر تقریر شبہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بھلا کوئی خود ہی اپنے کلام کو اپنے نام سے شروع کیا کرتا ہے یا اپنے نام سے خود ہی برکت حاصل کیا کرتا ہے یا مدد چاہا کرتا ہے؟ یعنی یہ اندازہ کلام عرف عام کے خلاف ہے۔

اول تو شبہ یوں بے اصل ہے کہ عرف ہر جگہ کا ہر قوم کا الگ ہوتا ہے، اگر ایک جگہ ایک دستور نہ ہو تو دوسری جگہ ممکن ہے کہ وہ ہو۔ پس ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن کا عرف ہو کہ اپنے نام سے کلام کا آغاز کیا جائے۔

پھر یہ کہ شروع میں بسا اوقات متکلم اپنا نام ذکر کرتا ہے تا کہ بعد کے کلام کا تعارف اور نسبت مخاطبوں پر واضح ہو جائے جیسے اکثر خطوط اپنے نام سے شروع کئے جاتے ہیں، تا کہ باوّل وہلہ مخاطب سمجھ لے کہ یہ فلاں کا مضمون ہے۔ اس الجھن میں نہ رہے کہ لکھنے والا یا کہنے والا کون ہے؟

اس لئے آغاز کلام بہ تسمیہ الٰہی اس اصول پر قابل اعتراض نہ ہوا۔ مزید غور کیا جائے تو حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ کسی عظیم یا مہم کام کا کسی بڑے نام یا بڑی نسبت یا بڑی صفت سے شروع کرنا عقلاً مستحسن ہی نہیں، بلکہ مطلوب سمجھا گیا ہے اور ایک فطری امر ہے چناں چہ اس پر آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ آپ اسے مستحسن اور معقول جانتے ہوں گے کہ بندے اپنے کلام کو خدا کے نام اور خدا کی ثناء وصفت سے شروع کریں جس سے اس امر کا فطری اور معقول ہونا واضح ہے۔

اور ظاہر ہے کہ فطرت اللہ کی ہے جس پر بندوں کو مفطور کیا گیا ہے۔ پس بندوں میں ہر فطرت خود اللہ ہی سے آتی ہے اس لئے اصل میں یہ ڈھنگ کہ آغاز کلام کسی بڑے نام یا بڑی نسبت وصفت سے ہو، اولاً خدا کے کلام کا ہونا چاہئے، بندے تو محض اس کی نقل اتاریں گے کیوں کہ نہ خود اصل ہیں نہ ان کا وجود ہی اصلی ہے۔ نہ ان کی ذات وصفات اور افعال

ہی اصل ہیں۔اصل ہر چیز کی اللہ ہے۔اسی کی ذات وصفات وافعال اصل ہیں۔اس کے سوا ہر چیز مجاز اور اس کا ظل محض ہے۔اس لئے آغاز کلام کا یہ ڈھنگ اگر مستحسن ہے اور بلاشبہ ہے تو اولاً یہ ڈھنگ کلام الٰہی ہی میں مستعمل ہونا چاہئے بندوں میں یہ ڈھنگ محض ظلی اور مجازی طور پر خدا سے آئے گا وہ ناقل محض ہوں گے نہ کہ اصل۔

پس ادھر تو یہ اصول معقول کہ کلام کا آغاز کسی بڑے نام یا بڑی صفت وتوصیف سے ہونا چاہئے اور ادھر یہ مسلم کہ نہ خدا سے کوئی بڑا، نہ خدا کے نام سے کسی کا نام بڑا۔نہ اس کے صفات وافعال سے کسی کے افعال وصفات بڑے اور نہ ہی اس کی توصیف وتعریف سے کوئی ثناء وصفت بڑی۔

اس لئے کلام الٰہی میں اس امر مستحسن کے استعمال کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں ہوسکتی کہ خدا اپنے کلام کو اپنی ہی صفات اور اپنے ہی نام اور اپنی ہی توصیف سے شروع فرمائے، بلکہ اگر آپ غور کریں تو بندے بھی اپنے کلام کو خدا کے نام اور ثناء وصفت سے اسی لئے شروع کرتے ہیں کہ اس کے نام سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اور کلام کا بڑے ہی کے نام سے شروع کیا جانا فطری اور عقلی ہے۔اس صورت میں بندوں کے لئے بھی اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اپنے کلام کو بھی اور اپنے کام کو بھی اسی کے نام سے شروع کریں۔چناں چہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ۔

"كُلُّ اَمْرٍ ذِىْ بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ بِاسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَهُوَ اَقْطَعُ." ① ......"جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے"۔

پس بڑے نام سے آغاز کلام عقلی بھی ہوا شرعی بھی ہوا اور عرفی بھی ہوا۔اس لئے آغاز کلام خداوندی بنام خداوندی اسی فطرت کے ماتحت ہے کہ امر مہم کو بڑے نام اور بڑی ثناء سے شروع کیا جانا ہی فطرت ہے اور اس کے نام سے بڑا نہ کسی کا نام ہے اور نہ اس کی شان سے بڑھ کر کسی کی شان ہے۔تو پھر آغاز کلام میں خواہ خود اس کا کلام ہو یا اس کے بندوں کا ہو اس کے نام کے سوا اور کس کا نام لیا جائے؟

فرق اتنا ہوگا کہ بندے اپنے کلام میں خدا کا نام لے کر برکت حاصل کریں گے اور خدا اپنے کلام میں اپنا نام لے کر برکت ظاہر فرمائے گا۔وہاں حصول برکت کا سوال یوں نہیں، کہ وہ خود سرچشمہ خیر وبرکت ہے اور یہاں اظہار برکت کا یوں سوال نہیں کہ بندے اپنی ذات میں کوئی خیر وبرکت نہیں رکھتے جسے ظاہر کریں۔اس لئے ہم بسم اللہ کہیں گے تو مقصد برکت ومدد کا حاصل کرنا ہوگا اور خدا بسم اللہ فرمائے گا تو مقصد برکت ومدد کا اظہار اور پھیلانا ہوگا۔اس لئے تو ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو محض تعلیم پر محمول نہیں کرتے، بلکہ عملاً اس فطرت پر محمول کرتے ہیں کہ آغاز کلام کسی پر عظمت نام یا لفظ سے کیا جانا ہی عقل سلیم اور طبع مستقیم کی خواہش ہے اور یہی عین فطرت ہے۔

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ ②

---

① تخریج گذر چکی ہے۔ ② پارہ: ۲۱، سورة الروم، الآية: ۳۰.

چونکہ سوال میں اعتراض کی کوئی تقریر اور بناظاہر نہیں کی گئی اس لئے یہ اجمالی تحقیق عرض کردی گئی، اعتراض کا کوئی موجہ پہلو سامنے آتا تو اس پر کچھ اور عرض کیا جاتا۔

سوال چہارم...... ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی.﴾ ① خدا کی مکانیت اور اس کے احتیاج الی المکان کو بتاتا ہے اور یہ جسم وحدوث کا خاصہ ہے، لوگ اس کو متشابہات میں سے کہتے ہیں۔ ﴿وَیَقُوۡلُوۡنَ: اَللّٰہُ اَعۡلَمُ مُرَادِہٖ.﴾ عقیدت مند دل تو اس کو مان لے گا مگر عقل حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ متکلم ہی اس کے مطلب کو جانتا ہے کہ ایسی صورت میں تخاطب ہی اس کا بے کار ہوگا اور ترجمہ بھی اس کا صاف ہے، یہ ضروری مسائل ہیں جن کے حل وانشراح کی جناب کو تکلیف دیتا ہوں امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

تعیینِ مراد میں احوال متکلم کا دخل...... جواب: ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اس کی حیثیت عرفی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ پس کلام کا مقصد سمجھنے کے لئے محض متکلم کے الفاظ ہی سامنے نہیں رکھے جاتے، بلکہ اس کے احوال واوصاف اور شُؤُوْن کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، فرعون نے بھی اَنَا الرَّبُّ کہا اور منصور رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اَنَا الْحَقُّ کہا۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔

لیکن ایک کو اس دعوی کے سبب آپ ملعون قرار دیتے ہیں اور ایک کو اس دعوی کی بناء پر مقبول بتاتے ہیں۔ یہ فرق دعوی وکلام کے فرق سے نہیں جب کہ وہ دونوں کا ایک ہے بلکہ احوال کے فرق سے ہے۔ فرعون کے مجموعی احوال کفر وجحود اور اللہ ورسول علیہ السلام (موسیٰ) کی تکذیب وتردید کے ہیں۔ اس لئے اس کا اَنَا الرَّبُّ کہنا بمقابلہ خدا اپنا استقلال وجود ثابت کرنا ہے یعنی خدا کا کفار (انکار) اور اپنا اثبات (ثابت کرنا) ہے، گویا فرعون کے متمردانہ احوال سے تو اس کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں از خود ہوں کسی اور کا محتاج نہیں، میں اپنے اندر بھی خود ہوں اور اپنے سے باہر بھی میں ہی میں ہوں۔ نہ میرے اندر ہی کسی اور کا وجود ہے اور نہ میرے سے باہر ہی ہے اور منصور کے مطیعانہ احوال سے، جن کا حاصل خدا اور رسول کی تصدیق ومحبت ہے، ان کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں فانی محض اور بے ثبات ہوں، باہر تو باہر خود اپنے اندر بھی میرا اپنا کچھ نہیں، وجود ہے تو اس کا ہے اور بقاء ہے تو اس کی ہے۔ گویا میں اندر بھی خود نہیں ہوں وہ ہے۔ تو فرعون کے انا سے اثبات باطل اور نفی حق نکلتی ہے اور منصور کے انا سے اثبات حق اور نفی باطل نکلتی ہے۔ مگر دونوں کے کلاموں کے معنی کا یہ عظیم فرق، الفاظ اور دعوی کے فرق سے نہیں بلکہ صرف احوال کے فرق سے ہے۔ جن کو پیش نظر رکھ کر ہی ان کے کلاموں کا مطلب لیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم وکافر کے افعال بالخصوص معاشی افعال یکساں اور بالکل ایک ہوتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، وہ بھی رہن سہن کے وہی سامان فراہم کرتے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ مگر ایک کے تمام افعال مقبول اور موجب زیادت اجر اور ایک کے تمام افعال مردود اور موجب زیادت وزر۔ فرق اگر ہے تو صرف احوال کا ہے۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵.

پس کسی کے افعال ہوں یا اقوال ان کا مطلب ان کے احوال کو پیش نظر رکھ کر ہی لیا جاتا ہے۔ ایک نیک آدمی، جس کے عام احوال نیکی وتقویٰ کے ہوں، اگر اتفاقاً کوئی غلطی بھی کرگزرے تو اس کی بھی تاویلِ حسن کرتے ہیں اور ایک بد آدمی جس پر بدی اور فجور کا غلبہ ہو اتفاقاً کوئی نیک حرکت بھی کرے تو اسے بھی خود غرضی اور بدی پر محمول کرتے ہیں۔ بناوہی نکلتی ہے کہ کسی کے کام اور کلام کا مطلب اس کے احوال وشؤن اور اوصاف کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ از خود ہے یعنی کسی کے بنائے سے وہ نہیں ہوا، بلکہ خود سے ہے، وجود صرف اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔ اس لئے کہیں بھی کوئی ہو، وہ اسی کے دائرہ میں ہوگا۔ باہر نہیں ہوگا اور اس لئے لامحالہ اس کا وجود لامحدود بھی ہوگا۔ اگر محدود ہو، جس کی کوئی حد ہو تو حد سے باہر دوسروں کا وجود ہوگا۔ تو وجود صرف خدا کا نہ رہا اور معطی وجود صرف وہ نہ رہا، دوسرے بھی بن سکیں گے اور اس سے خالقوں کا تعدد نکلے گا۔

اس لئے اگر وجود اصلی صرف اُس کا ہوگا تو اسے لامحدود بھی ماننا پڑے گا اور ہر شئے کو اس کے وجود سے موجود اور اس کے احاطہ وجود میں تسلیم کرنا پڑے گا، پھر اس سے دوسروں کا وجود اس شان سے نہ ہوگا کہ اس کے وجود کے ٹکڑے کرکر کے دوسروں کو بانٹے جائیں۔ ورنہ ٹکڑے ہونے کے بعد اس میں حد بندیاں ہوجائیں گی اور وہ لامحدودیت باقی نہ رہے گی جو اس کی خودی کے لئے لازم تھی۔ بلکہ دوسرے جب اس سے وجود پائیں گے تو بالکل اسی طرح جیسے سورج کی روشنی سے جہان والے روشنی پاتے ہیں کہ خود سورج کی روشنی کے ٹکڑے نہیں ہوتے اور ہر چیز اس سے روشنی حاصل کرتی ہے، یعنی اس کی روشنی کے صرف پرتوؤں ہی سے منور ہوجاتی ہے۔ خود اس کا نور اسی کی ذات میں قائم رہتا ہے۔

پس خدا از خود ہی ہے کسی کے بنائے نہیں بنا ہے۔ اس کا وجود اصلی ہے، کسی کا بخشا ہوا نہیں ہے اور وجود اصلی جب سب پر محیط ہے تو وہ ہر زمان ومکان میں ہے یعنی لامحدود ہے اس سے موجودات وجود پاتے ہیں۔ تو خود اس کے وجود کے ٹکڑے نہیں ہوتے، جو اس کے جسم اور جسمانیت سے بری ہونے کی علامت ہے۔ کیوں کہ وجود خود لطیف ترین شے ہے، جو خود آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتا۔

پس خدا کا از خود ہونا، محیط الکل ہونا اور جسم نہ ہونا اس کی اصلی شان اور صفت ہے۔ اگر ”اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ“ کا کلام سامنے آئے گا تو اسی سابقہ قاعدے سے، اس کلام کا مطلب اس کے الفاظ محض سے نہیں، بلکہ ساری شانوں کو سامنے رکھ کر ہی لیا جائے گا اور شان اس کی یہ ہے کہ نہ وہ محدود ہے نہ جسیم (جسم والا) ہے نہ کسی کے احاطہ میں ہے نہ کسی کی گرفت میں ہے، بلکہ سب اس کے احاطہ میں اور اس کی گرفت میں ہیں۔ تو ”اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی“ ① سے آخر اس کی جسمانیت کیسے ثابت ہوجائے گی اور اس کا حدوث کیسے مفہوم ہوگا؟ ہاں! جب ہوگا کہ اس پاک متکلم کے کلام کے صرف یہی الفاظ سامنے رکھ کر اور اس کی ساری ثابت شدہ شانیں ...

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵.

صفات سے قطع نظر کر کے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کے معنی لئے جاویں۔ لیکن اگر الفاظ کے ساتھ احوال بھی ملائے جاویں جو عرض کردہ قاعدہ کے مطابق ضروری ہیں تو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کا جسمانیت اور حدوث سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رہتا۔

عرش رحمت خاصہ کا مظروف ہے...... بلکہ غور کیا جائے، تو عرش سے اگر ثابت ہوتی ہے تو اللہ کی صرف ایک ہی صفت یعنی صفت رحمت کا تعلق خاص ثابت ہوتا ہے نہ کہ ذات کا اور وہ بھی مظروفیت کا کیوں کہ "اَللّٰهُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" نہیں فرمایا گیا، بلکہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى جس کا حاصل یہ ہے کہ عرش پر اللہ کی صفت رحمت پھیلی ہوئی ہے اور وہاں اس کی اسی خاص شان کا ظہور اور تجلی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عرش محل تدبیر ہے اور تخت شاہی ہے۔ جس سے سلطنت الٰہی کے کاروبار چلتے ہیں اور جہانوں کی تدبیر کی جاتی ہے۔

پس بتلانا یہ ہے کہ ساری سلطنت رحمانیہ ہے، رحم وکرم اور رافت وترحم پر مبنی ہے۔ غضب پر یا کورے قانونی داؤ پیچ پر مبنی نہیں ہے اور بالالفاظ دیگر کائنات کی ہر چیز ہمارے رحم وکرم پر ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے حسی طور پر نمایاں اس طرح فرمایا ہے کہ عرش کو تو ساری کائنات پر محیط بنا دیا، کہ اس سے باہر کوئی جہان میں نہیں اور عرش پر صفت رحمت کو محیط کر دیا، تو گویا رحمت سارے جہانوں پر محیط نکلی۔ جس سے واضح ہو گیا کہ ہماری سلطنت قہر وسیاست پر مبنی نہیں، بلکہ رحمت وکرم پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ بندے رات دن اور ہمہ وقت کفر ومعصیت بھی کرتے ہیں مگر رزق اور باران رحمت بند نہیں ہوتا۔ گو کسی خاص وقت جبکہ اقوام کا ظلم وستم انتہاء کو پہنچ جائے، تو بطور تنبیہ سزا بھی دلائی جاتی ہے۔ سو اس کا منشاء بھی رحم وشفقت ہی ہوتا ہے۔

بہر حال کلمہ عرش پر استواء کے معنی جسمانی تمکن کے نہ ہوئے جو شُئُوْنِ اِلٰهِیَّهْ کا مقتضٰی ہے اور وہ استواء معنوی بھی ذات کا نہ ہوا، بلکہ صفت رحمت کا ہوا۔ تو اس سے خدا کی جسمانیت یا محدودیت یا حدوث کا کیا تعلق کہ یہ شبہات آیت پر وارد کئے جائیں۔

کیفیت استواء غیر معلوم ہے...... ہاں! اس شان رحمت کے عرش پر چھائے ہونے کی کیفیت لامعلوم ہے کہ اس کا کیا انداز ہے اور کیا نوعیت ہے اور کیفیت ہی کی لاعلمی کی بناء پر "اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بذلک" کہا جاتا ہے، نہ یہ کہ "اِسْتِوَآء عَلَى الْعَرْشِ" کا مفہوم نامعلوم ہے، "اِسْتِوَآء عَلَى الْعَرْشِ" صفت رحمت کا ہے اور یہ استواء محیط الکل ہے۔ کیوں کہ جسمانیت میں عرش تمام اجسام پر محیط ہے، تو صفت رحمت محیط الکل ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس انداز سے جیسے ہماری روح ہمارے بدن کو محیط ہوتی ہے اور بدن کا کوئی ایک جز بھی روح کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کیفیت کا پتہ نہیں جس کیفیت سے روح بدن پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے اس ساری کائنات بدن کو گھیر رکھا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم روح کے احاطہ کو نہیں جانتے یا اس کو یقینی نہیں سمجھتے ہیں۔ روح کے تعلق اور احاطہ کو یقینی جان کر اگر لاعلمی ظاہر کرتے تو اس کی کیفیت اور نوعیت

احاطہ سے، نہ کہ اصل تعلق کے علم سے۔

پس ہم یقیناً جانتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ شان رحمت عرش پر اور بواسطہ عرش ساری کائنات اجسام اور ارواح پر محیط ہے۔ مگر ہم اس احاطہ کی کیفیت اور نوعیت کو نہیں جانتے۔ اللہ اعلم کہہ کر بحوالہ خدا کر دیتے ہیں۔

پس جتنا ہم جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ اسی کے اعتبار سے ہم سے اس آیت میں تخاطب کیا گیا ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور جتنا نہیں جانتے اتنا سپرد خدا کر دینے ہی کے مکلف بنا دیئے گئے ہیں۔ یہ ہم پر لازم نہیں ہے کہ ہم اس نوعیت کی بھی کھود کرید کر کے اصلیت کا سراغ لگائیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ پس خدا کی بھی یہ شان رحمت ہے کہ بقدر استطاعت تو ہمیں تکلیف دی اور بغیر استطاعت ہمیں مکلف نہیں بنایا۔

"فَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ"

پس منظر...... جناب محترم ومکرم زید! سلام مسنون، نیاز مقرون۔ مکرمت نامہ موصولہ ۴ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ باعث شرف ہوا۔ آپ کے سلسلہ تالیفات میں "داستان عمل" اور "اخلاق وآداب" جیسی مفید اور قیمتی کتابوں کے اضافے سے بے حد مسرت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں پر دو جلیل القدر عالموں کے دیباچہ کا اضافہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ اور مستفیدوں کے لئے سرور فوق سرور کا مصداق ہے۔ آں محترم نے احقر کے چند فقرے نقل کر کے ان پر اضافہ وتشریح کا ایماء فرمایا ہے۔ جس میں حضرت مخدومی مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ کا ارشاد بھی شامل ہے۔ آپ کا ہی ایماء کیا کم تھا کہ اس میں ایک اور بھاری اشارہ کے بوجھ کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ تو اسے ضعیف کندھوں پر لادے پھرنے کی ناقابل برداشت کیفیت سے یہ بوجھ ہلکا نظر آیا کہ فوراً ہی تعمیل کروں۔ پھر بھی جو تاخیر ہوئی وہ میرے سفروں کی وجہ سے ہوئی۔ جناب کا والا نامہ دیوبند اس وقت پہنچا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو فوراً ہی لکھنو کا سفر پیش آ گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا سالانہ جلسہ سر پر آ گیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو علی گڑھ کانپور کا سفر درپیش ہو گیا۔

اس لئے آج واپس ہو کر شب میں بعد عشاء جو کچھ بن پڑا بطور تعمیل ارشاد سطور ذیل قلمبند کیں اور بلا نظر ثانی ہی ارسال ہیں۔ مناسب ہو کہ جناب یا حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ ان پر ایک اصلاحی نظر فرمائیں۔

یہ مضمون فی الحقیقت احقر کے ان تین ہی جملوں کی شرح ہے جو جناب نے نقل فرما کر بھیجے ہیں۔ اس لئے مضمون کا آغاز انہی سے کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

علم کی غایت عمل ہے۔ اس کا جوہر تقویٰ ہے۔ اس کا زیور ادب ہے شعراء کا ادب لفظی میدانوں میں دوڑنے والے شاعروں کے یہاں ادب کے معنی شستہ کلامی اور بلاغت بیانی کے ہیں۔ حفظ اشعار، حفظ لغات اور حفظ اسماء واصطلاحات اس ادب کو پونجی ہے۔ شاعری یا مرصع نثر گوئی اور جملوں کے جوڑ بند کی صنعت گری اس ادب کے میدان کی مساعی جمیلہ ہیں۔ خیال آفرینی اور تخیل کے میدانوں کی نقشہ سازی اس ادب کا جوہر ہے۔ معنویت یا

واقعیت براہ راست شاعر کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف تخیل کی کارگزاری اور خیال آفرینی مطمح نظر ہوتی ہے۔

اسی لئے اشعار اور شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ کبھی واقعیت جمع ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ لفظی دنیا میں اسی کو ادب اور اس قسم کے کلام والے کو ادیب کہتے ہیں۔ اس ادب کی غرض وغایت اکثر و بیشتر داد خواہی اور زرطلبی ہوتی ہے۔ سامعین کی تحسین وآفریں اور مدح سرائیوں پر ممدوحوں کی داد و دہش اس ادب کی انتہائی معراج ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ایک پرلے درجے کا بے ادب اور علم سے بے بہرہ حتیٰ کہ فاسق وفاجر بھی اپنی طبعی ذہانت وذکاوت اور موزوں طبیعت سے شستہ کلامی پر قادر ہو سکتا ہے۔ اس حال میں کہ اس میں علم کا کوئی بھی جوہر نہ ہو۔ جہلاء عرب بلند پایہ شاعر، پرگو، برجستہ کلام اور فصاحت بیانی کے پتلے تھے۔ اس وقت کی دنیا میں ان کی بلاغت بیانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کے لئے عجم (گونگا) کا لقب تجویز کیا تھا۔ مگر بایں ہمہ تھے وہ جہلاء ہی، حتیٰ کہ ان کی بے مثال جہالت کی بناء پر ہی ان کے زمانے کا نام تک زمانۂ جاہلیت ہوا کہ انہیں علم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔

تا بادب و تقویٰ چہ رسد

اس ادب کے ہزار ہا ادیب امراء وسلاطین کے درباروں میں نظر آتے تھے جو اپنی قصیدہ خوانی ہی کی بدولت معاش پیدا کرتے تھے۔ زبان اور زبان کے لفظوں کی بدولت ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ آج کی دنیا میں جب کہ دربار نہ رہے صرف بازار رہ گئے، شاہیت نہیں صرف عوامیت ہے، تو قومی اسٹیجوں اور عوامی نشر گاہوں سے اسی ادب کے بار بردار سینکڑوں ادیب، مرثیہ گوئی یا قومی مدح سرائی سے معاش کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ ادب علم کی آرائش اور اس کا زیور نہیں کیوں کہ اس ادب کے لئے سرے سے علم ہی ضروری نہیں، زیور علم کا تو سوال کیا پیدا ہو۔ اس ادب کا حاصل خود غرضی اور غیر فریبی یا اپنی خواہش داد اور مخاطب کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا خلاصہ قرآنی الفاظ میں صرف یہ ہے ﴿يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ. ﴾ ① ''وہ تمہیں اپنے مونہوں (زبانوں اور زبانی لفظوں) سے راضی کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے دل اس سے انکاری ہیں اور اکثر ان میں فاسق ہیں''۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب اور اس کے سرچشمہ (شاعری) کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے الگ اور دور رکھا اور فرما دیا کہ یہ شاعری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیبا بھی نہ تھی کہ اس ادب کا حاصل خیال آرائی تھا اور پیغمبروں کا موضوع حقیقت آرائی اور حقیقت الحقائق تک رہنمائی تھی۔ عارف وکامل شعراء جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ، سعدی رحمۃ اللہ علیہ، عطار رحمۃ اللہ علیہ اور سلف وخلف کے دوسرے شعر گو اکابر دلوں میں اگر باعظمت ہیں تو شاعری کی بدولت نہیں، بلکہ معرفت کی بدولت، یعنی بحیثیت شاعر کے مقدس نہیں مانے گئے بلکہ بحیثیت کمال باطن کے۔ اس لئے اس قسم کا اکابر سے مذکورہ بالا

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۸.

نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔

عوام کا ادب...... عوام الناس کے عرف میں ادب کے معنی احترام وتعظیم کے ہیں۔ مگر انہی کے مروجہ اقوال و افعال اور بندھی جڑی رسموں اور ہیئتوں کے ساتھ۔ ان ہی رسوم تعظیم کے ساتھ جب کوئی ان سے پیش آتا ہے تو وہ اسے باادب اور مہذب کہتے ہیں۔ ورنہ بے ادب اور گستاخ کہہ کر خشمگین (غضب ناک) ہو جاتے ہیں۔

برادریوں کے اجتماعات اور قبائلی تقریبات یا عام میل جول میں کسی چھوٹے کا جھک کر ہاتھوں سے سلام کرنا یا منڈی گود میں ڈال دینا یا اصطلاحی الفاظ میں تعظیمات وتسلیمات اور اور آداب بجالانا یا نیم جھکاؤ کے ساتھ سامنے کھڑے ہو کر جھک جانا یا ہاتھ جوڑ کر سروقد کھڑے ہونا یا چچا جان یا بھائی جان کے خطاب سے مخاطبوں کو متوجہ کرنا ان کے یہاں ادب اور ان الفاظ وہیئات کو من وعن ادا کر دینے والا متادب اور ادیب کہلاتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں مخاطبوں کی طرف سے کتنا ہی غبار بھرا ہوا ہو اور وہ برادری کی اونچ نیچ کے کتنے ہی مناقشات اور عصبیاتی جذبات دل میں لئے ہوئے ہو، جو اپنے وقت پر کافی جوش وخروش سے ابھرتے ہوں۔ اور محبت کی بجائے عداوت کے جذبات دل کے تمام گوشوں میں چھپے پڑے ہوں، جو اپنے وقت پر پھوٹ پڑیں مگر برادری یا شہری رسم کے مطابق اسے متادب ہی کہا جائیگا۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی وہ ادب نہیں ہوسکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ان رسم پرستیوں کے لئے نہ صرف یہی کہ علم ضروری نہیں ایک حد تک جہل ضروری ہے۔ اس ادب کا حاصل دنیا سازی اور ظاہرداری ہے۔ جس کے نیچے حقیقت ومعنویت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس ادب کی روح خود غرضی نفس اور رضا جوئی غیر تو نہیں ہوتی، بلکہ برادری کی عام ملامت سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے برادری میں اپنی شمولیت کو باور کرانے کی کوشش اور رسوم اہل زمانہ کے مطابق تصنع اور بناوٹ سے اپنے کو بھاری بھر کم ظاہر کرنا ہوتا ہے۔

مخاطب کی حقیقی عظمت وتوقیر کا اکثر وبیشتر یہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جبکہ برادرانہ مناقشات کے تحت دل اسکی برائیوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس رسمی شائستگی اور ظاہرداری کی حقیقت قرآنی تعبیر سے یوں بیان کی جاسکتی ہے۔ ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ.﴾ ① ''یہ لوگ دنیا کی زندگی کی صرف ظاہرداریوں کو جانتے ہیں اور انجام وعاقبت سے یکسر غفلت میں ہیں،،۔

تلبیس ادب...... مدعیان علم کے یہاں جن کی زبانیں تو علم سے آراستہ ہوں مگر قلوب خشوع سے خالی ہوں۔ ادب کے معنی یقیناً لفظی صنعت گری یا عرف عام کی مروجہ رسموں کی پابندی کے تو نہیں۔ بلکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرین دین ودنیا کے احترام کے لئے شریعت ہی کے بخشے ہوئے افعال وہیئات اور صریح حکم فرمودہ اعمال کی پابندی کے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے بارے میں انہیں صراحۃً لفظوں میں کوئی حکم مل جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۷.

یہ بہت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین معیار ہے جس میں شرعی ہیئتوں کی پابندی پائی جارہی ہو۔ لیکن جب کہ اس قسم کے مدعیان علم نے علم کے محض الفاظ ہی یاد کیے ہیں۔ مگر اس کی حقیقی کیفیات سے ان کے قلوب باکیف نہیں اور ساتھ ہی ریاضت نفس سے بے پرواہ رہنے کے سبب قلب میں جبلت کے غیر معتدل اخلاق اور ہوا وہوس کا غلبہ ہے۔

نیز جذبات نفسانی بیدار ہیں تو قدرتی طور پر ان شرعی ہیئتوں کی پابندیوں میں بھی ان کے قلوب کی وہ ظلمانی کیفیات جھلکنی ناگزیر ہیں جوان کا جوہر نفس بنی ہوئی ہیں۔ وہ بظاہر شرعی آداب کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخاطب کی طرف سے کینہ وحسد اور کدورت رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں جذبات نفس اور جبلی کدورتوں کی آمیزش کے ساتھ شعری رسوم کی پابندی ان ہی رواجی رسوم کی پابندی کی طرح محض رسمی اور نمائشی ہو کر رہ جائے گی جن کے خوگر عوام تھے۔ فرق اتنا ہوگا کہ عوام رواجی رسوم کے پابند ہوں گے اور یہ عوام اہل علم یعنی مدعیان علم شرعی رسوم کے پابند۔

(گو اس رسم کے درجہ میں وہ عوام سے فائق اور قابل تحسین بھی ہوں) مگر جیسے دنیادار لوگ فساد باطن کے ساتھ مخاطب کا ظاہری ادب کرتے ہوئے بھی قلباً اس کے حق میں بے ادب اور گستاخ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ مدعیان علم بھی بلاخشوع باطن شرعی صورت کا ادب برتتے ہوئے بھی مخاطب کے حق میں گستاخ اور بے ادب کہلائے جانے کے مستحق ہوں گے، چناں چہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے اہل علم قلبی عقیدت وانقیاد جذبہ عشق وگرویدگی اور حقیقی نیازمندی سے خالی رہ جانے کے سبب گو بظاہر لفظی ادب واحترام اور رسمی آداب وتعظیمات سے گریز نہیں کرتے۔ مگر ان کے ادب کی رسوم میں ذاتی فخر وغرور کی کیفیات ضرور شامل ہوتی ہیں۔ جس سے کبھی تو ان کی زبان قال پر فعلی شیخی اور اپنے علم وادب پر گھمنڈ کے کلمات آتے ہیں۔ گویا وہ خدا اور رسول پر اور ان کے نام لیواؤں پر احسان جتا رہے ہیں کہ وہ ان کا کتنا ادب کرتے ہیں اور کبھی وہ ان ہی مخاطبوں کے بارے میں جن کے ادب کے وہ زبان اور رسوم ادب سے مدعی تھے بے ادبی گستاخی اور بے باکی کے لب ولہجہ بلکہ گستاخانہ کلمات سے بھی نہیں چوکتے۔

پس بظاہر تو وہ ادب ہوتا ہے اور بباطن بے ادبی، کیوں کہ بظاہر تو وہ اتباع رسوم شریعت ہوتا ہے مگر رنگ بے ادبی شامل ہو جانے سے وہ درحقیقت اتباع نہیں ابتداع بن جاتا ہے۔ کیوں کہ صاحب شریعت نے اس رنگ کے ساتھ انہیں اتباع نہیں بتلایا تھا بلکہ جیسے احکام کی تعلیم دی تھی۔ ویسے ہی ان کے برتنے کا رنگ ڈھنگ بھی خود ہی دیا تھا جسے انہوں نے بدل کر اس میں اپنا جدید رنگ بھر دیا جو اگر چہ حکم کی بدعت نہیں مگر رنگ حکم کی بدعت ضرور ہے۔

بہر حال اس رنگ تعلّی وکبر اور عجب وریا کے ڈھنگ کی رسوم شرعیہ کی پابندی حقیقی ادب وتعظیم نہیں۔ بلکہ تکبر بصورت تواضع اور فسق بصورت تقویٰ ہوتا ہے جسے وہ دھوکہ میں رہ کر ادب وتقویٰ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ مگر وہ تقویٰ کے آس پاس بھی نہیں ہوتے۔ پس یہ ادب بجائے خود ایک مستقل دھوکہ اور تلبیس بلکہ ایک مستقل فساد ہوتا ہے جس سے ہزار ہا بے بصر عوام الناس کی راہ ماری جاتی ہے۔

صاحب ہدایہ نے ایسے ہی عوام اہل علم کے لئے فرمایا ہے:

"فَسَادٌ كَبِيرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعٰلَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ لِمَنْ بِهِمَا فِي دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ." "دنیا میں وہ عالم فساد عظیم ہے جو پردہ دری کرے اور بے ادب ہو اور اس سے بڑھ کر وہ جاہل ہے جو بلا علم کے عبادت کرے (من گھڑت بدعات میں مبتلا) یہ دونوں کے دونوں دنیا میں ایک عظیم فتنہ ہیں ہر اس شخص کے لئے جو دین میں ان سے رہبری حاصل کرے اور حجت پکڑے"۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "اِحْذَرُوْا مِنَ النَّاسِ صِنْفَيْنِ عَالِمٌ قَدْ فَتَنَهٗ هَوَاهُ وَصَاحِبُ دُنْيَا قَدْ اَعْمَتْهُ دُنْيَاهُ." "دو قسم کے آدمیوں سے بچو ایک اس عالم سے جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہو اور ایک اس دنیا دار سے جسے دنیا نے اندھا کر دیا ہو"۔ ظاہر ہے کہ اس ادب کو اس ادب سے کوئی واسطہ نہیں جو علم کا زیور کہلاتا ہے کیوں کہ اس ادب میں صورت تقویٰ تو بنی رہتی ہے مگر تقوی باطن ندارد ہوتا ہے۔ کیوں کہ تقوی باطن کے ساتھ دعویٰ، شیخی، کبر نفس، غرور اور علم پر گھمنڈ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فنائیت، محویت، کمال تواضع، اپنی حقارت اور مخاطب کی عظمت و توقیر کے جذبات نفس میں جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ادب تو ہے مگر رنگ ادب سے خالی ہے اور ذوق ادب سے مبرا، یعنی صورت ادب ہے، ادب نہیں، حالانکہ صورت ادب کے ساتھ ذوق ادب اور رسم ادب کے ساتھ کیف ادب کی بھی ضرورت ہے۔

کمال ادب...... لیکن اگر ادب کی شرعی رسوم کے ساتھ ان کی حقیقی کیفیت بھی قلب میں موجود ہو اور یہ صورت ادب، بے روح ڈھانچہ نہ ہو، بلکہ با کیف رسم ہو تو یہ حقیقی ادب کہلائے گا اور ادب کی اس کیفیت کے غلبہ کے بعد متادب اور ادیب نہ صرف مخاطب کے اوامر واحکام ہی کو پیش نظر رکھے گا۔ بلکہ اس کے منشاء اور اشارہ خم ابرو کو بھی دیکھے گا اور ایسا متادب مخاطب کے صرف منصب ہی کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس کی ذاتی عظمت و برگزیدگی کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جس سے اس کے ادب کی ذمہ داریاں رسوم سے گزر کر حقائق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ صرف زبان یا ہیئت بدن ہی سے ادب دان نہیں رہتا، بلکہ دل و دماغ اور نفس و روح سے بھی ادب و توقیر کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز اس مقام کے لحاظ سے اس پر ادب و عظمت کے وہ دقیق دقیق معارف کھل جاتے ہیں جو عوام اور مدعیان علم کو محض لفظوں میں نظر نہیں آسکتے۔ بلکہ اس صاحب معرفت پر ہی روشن ہوتے ہیں۔ اندریں صورت عظمت والا مخاطب اگر اس متادب سے ایک پھول چاہے گا تو وہ باغ دینے کو تیار ہو جائے گا۔

وہ اگر بدن کا ادب مانگے تو یہ روح سے بھی ادب کرے گا۔ وہ افعال کا ادب چاہے گا تو یہ طبیعت اور اخلاق تک کے ادب کے نمونے پیش کر دے گا، یعنی ظاہر و باطن سے اس حد تک ادب دان ہو جائے گا کہ اس کا ذوق تک ادب کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ یہی وہ کمال ادب کا مقام ہے جو خواص کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی کو ہم اہل تدین اور عالموں کا ادب کہیں گے۔ مدعیان علم کا ادب نہیں۔

پس عالموں اور دین داروں کے یہاں ادب کی حقیقت لفاظی یا نقاشی یا لفظ و ہیئت کی صنعت گری نہیں بلکہ نیاز

مندی، باطنی اور فدویت روح وطبیعت کے ساتھ شرعی آداب کے ڈھانچوں کو سنبھالنا اور پابندی احکام کے ساتھ ساتھ احکام کی آخری اور قدرتی حدود کو جو ذوق سلیم اور مشق شریعت سے سامنے آتی ہیں۔ ہمہ وقت زیر نظر رکھنا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ اس میں ادعاء ہو، نہ گھمنڈ، نہ شیخی، نہ اتراہٹ، نہ اپنی توقیر ہو، نہ دوسروں کی تحقیر، نہ روایت ہو، نہ حکایت، بلکہ محویت وگرویدگی ہو اور فنائے نفس کے ساتھ رضائے حق کے جذبات کام کر رہے ہوں۔

پس یہی وہ ادب ہے جسے علم کا زیور کہا گیا ہے پس جس طرح ایک خوبصورت پیکر کا حسن و جمال زیور سے آراستہ ہو کر دُگنا تگنا ہو جاتا ہے اسی طرح علم حقیقی کا جمال زیور ادب سے آراستہ ہو کر ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ادب ان احتیاطی افعال اور تقوائے اعمال کا نام ہے جو اعمال شرعیہ کی حفاظتی اور انتہائی حدود سے متعلق ہوں۔ پس ادب کا ابتدائی درجہ تو یہ نصوص شرعیہ کی عبارت پر عمل کرنا ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے جو اس عمل کی مشق و تکرار سے ان ہی نصوص کی دلالت واشارت اور اقتضاء سے ذہن پر منکشف ہو اور اگر ظواہر نصوص کے تعبیری حکم کو فتویٰ کہا جائے گا تو اس اقتضائی، دلالتی اور اشارتی حکم کو تقویٰ کہا جائے گا۔ پس صحیح معنیٰ میں ایک متادب اسی وقت ادب داں بنتا ہے، جبکہ عملی طور پر اسکے سامنے ادب کے یہ تمام ظاہری و باطنی اور فتویٰ و تقویٰ احکام اور حدود موجود ہوں اور دل کی آمادگی اور امنگ سے ان پر عمل پیرا ہو۔ یہاں تک کہ انجام کار ادب کی ذوق حدود بھی اس پر منکشف ہو جائیں۔

زیور علم ...... یعنی وہ نصوص کے دقیق اور بعید سے بعید محتملات تک کو بھی اپنے ادبی پروگرام میں شامل رکھنے کا خوگر ہو جائے گویا فنافی الادب ہو جائے۔ یہی وہ ادب ہے جس کو علم کا زیور اور تقویٰ کا جوہر کہا گیا ہے۔ کسی نیک عمل میں اس وقت تک نور نہیں آسکتا جب تک کہ اس کا ادب اس میں شامل نہ ہو اور وہ احتیاطی اور تقوی حدود زیر عمل نہ ہوں جس سے اس عمل کی حقیقی جامعیت اور اس کا واقعی کمال و جمال وابستہ ہے۔ پس ادب ہی فی الحقیقت علم کا زیور اور جوہر ہے۔ اس کے بغیر عمل ایک بے لباس اور بے زینہ پیکر ہے جس کی طرف رغبت وشوق کی نگاہیں نہیں اٹھ سکتیں۔ اس سے بہ سہولت اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعمال بغیر آداب کے قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتے اور ان کا حقیقی ثمرہ اور صلہ بغیر آداب کے سامنے نہیں آسکتا۔ پس جیسا کہ ہر صنعت کے تجربہ کار پر بالآخر اس صنعت کے وہ دقائق بھی بقدر استعداد کھلنے لگتے ہیں جو دوران تعلیم میں کتابوں سے اس کے سامنے نہ آئے تھے۔

ایسے ہی آداب شرعیہ کی ابتدائی عملی حدود تو نصوص شرعیہ کی لفظی تعبیرات اور عبارات میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان پر مستمراً عملدرآمد کی مشق سے جبکہ ذوق اور نیاز مندی اور فدویت کا ملکہ راسخہ باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ادب کی سی وہ ذوقی راہیں بھی قلب پر کھل جاتی ہیں جو ان نصوص کی عبارات سے گزر کر ان کی دلالات واشارات میں پنہاں ہوتی ہیں اور پھر آدمی ادب کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ادب اسے استعمال کرنے لگتا ہے۔ جن سے وہ ادب میں غرق اور فنا ہو کر سرتاپا ادب بن جاتا ہے اور پھر اس سے آداب کے وہ نقشے سرزد ہوتے ہیں جو عام نگاہوں کے

سامنے نہیں ہو یہ آداب کسی ایک آدھ شرعی حکم کے لئے نہیں، بلکہ پوری شریعت کی حد بندی ان ہی آداب سے کی گئی ہے۔ اگر ان آداب کی حدود کو توڑ دیا جائے تو نظام شریعت کی بنیادیں استوار نہیں رہ سکتیں۔ کیوں کہ افعال شرعیہ میں ایک حصہ مامورات (احکام) کا ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک حصہ منہیات (نواہی) کا ہے جن سے بچنے کا حکم کیا گیا ہے۔ ان مامورات پر جماؤ اور منہیات سے بچاؤ کے لئے کچھ احتیاطی حدود رکھی گئی ہیں جن کے دائرہ میں محدود ہو جانے ہی سے اصل ماموروں منہی محفوظ رہتے ہیں اور ان ہی احتیاطی حدود کا نام ''آداب شرعیہ،، ہے۔ اس لئے یہی آداب درحقیقت امرونہی کے شرعی نظام کو باقی اور محفوظ رکھنے کے کفیل اور ضمانت دار ہیں جب تک ان آداب پر جماؤ اور استقرار رہے گا۔ اصل احکام پر آنچ نہ آئے گی اور جوں ہی ان آداب کے کنارے ٹوٹ جائیں گے۔ وہیں اصل مقاصد احکام کا قلعہ مسمار ہو جائے گا۔

حدود ادب...... البتہ یہ حدود آداب کچھ تو منصوص ہیں جو تعبیرات شرعیہ کی عبارت ہی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور کچھ ذوقی ہیں جو وجدان صحیح سے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ذوقی بمعنی اختراعی نہیں بلکہ بواسطہ ذوق ہو۔ ان ہی نصوص کتاب وسنّت کی دلالت واشارات یا اقتضاء سے مفہوم ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے فہم کے لئے مطلق ذوق کافی نہیں بلکہ ذوق سلیم اور وجدان صحیح کی ضرورت ہے، جو ایک طرف تو فطرۃً سلامتی وصحت لئے ہوئے ہو اور دوسری طرف شرعی اتباع، پیروی ءسنّت اور محبت نبوی اور عشق خداوندی نے اسے مانجھ کر اور زیادہ صاف کر دیا ہو۔ جس کے صیقل شدہ آئینہ میں یہ دقیق آداب منعکس ہونے لگیں۔

پس یہ دقیق آداب بھی شرعی ہی ہوئے ہیں مگر شریعت میں سے ان کا نکال لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان ہی مصفا قلوب کا جو فطرۃً تشریعی ذوق سے مناسبت وقرب رکھتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً نادانوں اور کم فہموں یا عوام اہل علم کو یہ آداب ان راسخین فی العلم کے اتباع کے بغیر نصیب نہیں ہوتے۔ پس ان آداب اور ان کی حدود کو ایک راسخ فی العلم اپنے ذوق اجتہاد سے اور ایک عامی اپنے ذوق انقیاد سے پاتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعے اپنے دینی نظم کی حفاظت کرتا ہے۔

مثلاً منہیات شریعت میں اگر زنا حرام قرار دیا گیا ہے تو شریعت نے محض فعل زنا ہی سے روک دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسباب ودواعی زنا سے بھی رک جانے کا حکم دیا ہے۔ جو فی نفسہٖ چاہے ممنوع نہ ہوں، مگر اسباب زنا ہونے کے سبب وہ بھی زنا کے حکم میں آکر ممنوع ٹھہر گئے۔ جیسے نامحرم عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، اس کی خوشبو پر ناک رکھنا، اس کی طرف چل کر جانا، اس کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھانا وغیرہ کہ یہ احتیاطی حدود ترک زنا کے آداب کہلائیں گی اور اگر فعل زنا کبیرہ گناہ کہلائے گا تو زنا کے یہ اسباب ودواعی صغیرہ گناہ کہلائیں گے، ان میں گناہ ہونے کی شان زنا ہی کی نسبت سے آتی ہے، ورنہ فی نفسہٖ افعال ممنوع نہیں تھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احتیاطی حدود پر سختی سے عمل کرتے رہنے سے نہ صرف یہی کہ آدمی زنا سے بچا رہے گا بلکہ

اس کے قلب میں ایک ایسا احتیاطی ذوق پیدا ہو جائے گا جو اس شخص کو نامحرم عورت کے تصور سے بھی بچالے گا اور آدمی سمجھ لے گا کہ میرے لئے اس نامحرم کے جمال کی طرف فکر و دھیان دوڑانا بھی جائز نہیں، بلکہ مجھے ان ظاہری حدود کا پابند ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس ظاہر اثر سے متاثر ہو کر میرا باطن زنا سے پاک رہے۔

اور جبکہ باطن کا عمل فکر و تصور ہے تو باطن کا زنا دراصل اجنبیہ کا دھیان اور خیال زنا ہے جو میرے لئے یقیناً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے صراحتۃً اسے زنا کے تصور و دھیان سے روکنے کا کوئی فتوی نہیں دیا تھا اور جبکہ احکام شرعیہ ظاہر پر لگائے جاتے ہیں تو احوال قلب پر ظاہری حکم لگائے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ مگر ذوق احتیاط اور ظاہری حدود کی مسلسل پابندی کا یہ قدرتی ثمرہ ہے کہ ظاہر سے زیادہ آدمی باطن سے عمل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے جب کہ ظواہر اعمال کی مشق و تکرار سے اس کے باطن میں عمل کا ملکہ اور مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور وہ اسے گناہ ہی سے نہیں خیال گناہ سے بھی باز رکھنے لگتا ہے۔ اندریں صورت باطن کے اس ذہنی عمل کو کہ آدمی زنا کے تخیل (خیال) سے بھی باز آ جائے عمل یا شریعت یا شریعت کی حدود سے بے متعلق نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اسی سلسلہ عمل کا ایک باطنی کنارہ تصور کیا جائے گا۔

اور جب کہ اسی باطنی جڑ ہی سے ظاہر کی یہ ساری تعمیر اٹھتی ہے تو اسے اس شرعی ممنوع کی اساس و بنیاد کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ممنوع کہا جانا ضروری ہوگا۔ پس آداب شرعیہ کہیں باہر سے لا کر شریعت کے سر نہیں تھوپے جاتے۔ بلکہ شریعت ہی کے اندر سے نکال کر شرعی نظام میں اپنے موقع پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔

تحفظ دین کا طبعی نظام...... اسی طرح مثلاً شراب بلاشبہ حرام ہے لیکن اس سے بچنے کے لئے وہ برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار دیئے، جو شراب خوری کے لئے مخصوص ہوں اور جن کے استعمال سے خواہ مخواہ ہی شراب کا دھیان آئے۔ تا کہ ان کے سامنے نہ رہنے سے شراب کا دھیان ہی نہ آنے پائے۔ پس ان ذرائع کے استعمال کو قطع کر کے شریعت نے اصل مقصد (ترک شراب) کو محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے بچتے رہنے کا خوگر انسان شراب خوری ہی سے نہیں بچے گا بلکہ اس کے تخیل پر بھی لاحول پڑھے گا۔ حالانکہ بظاہر یہ تخیل ممنوع یا گناہ نظر نہیں آتا، لیکن جب وہ اصل ممنوع اور معصیت کبیرہ تک پہنچا دینے کا طبعی راستہ اور ذریعہ ہے اس لئے اس ذوقی حکم (ترک تخیل) کو بھی راہ شریعت سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ انتظام شریعت کی لائنوں پر اسے احتیاطی حکم کہا جائے گا۔ جس کے لئے فتوی کا لفظ استعمال نہیں کر سکیں گے تقوی کا کلمہ استعمال کریں گے۔ سطح پرست نگاہوں میں تقوی کی یہ حدود خواہ وہم پرستی دکھائی دیں یا تنگ خیالی نظر آئیں مگر، دوربین نگاہوں میں یہ احتیاطی حدود تحفظ دین کا ایک طبعی اور سائنٹیفک نظام ہی نظر آئیں گی جو محارم شریعت کی ... اہی چراگاہ کے لئے ڈول بندی کا حکم رکھتی ہیں، تا کہ غیر محتاط چرواہے ان ڈول بندیوں سے بھی باہر ہی باہر رہیں اور اصل چراگاہ تک نہ پہنچنے پائیں۔ پس عقلاً ایک مبصر کے نزدیک کسی ممنوع مقصد سے روکنے کا طریقہ

اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا کہ اس کے تمام وسائل اور بعید سے بعید ذرائع سے بھی روک دیا جائے ورنہ اصل مقصد سے بچائے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے یہ دقیق حدود عمل بھی جو بظاہر کتاب وسنت کے الفاظ میں صراحۃً نظر نہ آئیں معانی کتاب وسنت کا جز بن کر ماموراتِ ومنہیات کا ہی جز کہلائیں گی۔

ذوق ادب کا نتیجہ...... فقہاء ومجتہدین رحمہ اللہ علیہم نے ان ہی مخفی حدود کو اپنے نوراجتہاد سے کھول دیا ہے جس پر وہ مخترع کہلائے۔ حالانکہ ان سے زیادہ متبع دوسرا نہیں کہ ظاہری حدود کے ساتھ باطنی حدود تک کو بھی شریعت ہی کے اندر سے نکال کر ان کا اتباع کیا اور کرایا۔ مثلاً اسی زنا وشراب کے جزئیہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرتے وقت کسی اجنبی عورت کا دھیان باندھ لے تو یہ فعل مباشرت اس کے حق میں ناجائز ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس نے اگرچہ عمل سے زنا نہیں کیا لیکن تخیل سے زنا کر لیا۔

پس اگر نصوص کتاب وسنت میں لفظوں میں اس خیالی زنا کی ممانعت وارد نہ بھی ہو تب بھی اس حکم کو فقہاء کا اختراع نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ممانعت زنا کی ان ہی کھلی حدود کے سلسلہ کی ایک ناگزیر کڑی کہا جائے گا جو آداب کے عمل پیہم سے ذوق ادب اور ذوق تقویٰ کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ جسے فقہاء نے بصورت حکم ظاہر کر دیا ہے۔ گویا یہ اسی ممانعت زنا کا ایک انتہائی مخفی کنارہ ہے جو احکام کے طویل اور مرتب سلسلہ کے ساتھ درجہ بدرجہ جڑا ہوا ہے۔ جسے عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں مگر مبصر نگاہوں نے اسے پالیا۔

یا جیسے فقہاء ہی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی شخص رنگین شربت پیتے ہوئے (جو بلاشبہ حلال ہے) شراب پینے کا دھیان باندھ لے کہ گویا وہ شراب کا جام چڑھا رہا ہے تو شربت نوشی اس کے حق میں خیالی شراب نوشی ہونے کے سبب ناجائز ہو جائے گی کیوں کہ اس نے فعلاً گو شراب نہیں پی مگر خیالاً ضرور پی لی اور اگر اس پر قضاء ظاہر شریعت کی رو سے شراب خوری کا حکم نہیں لگایا جائے گا تو دیانتاً شارع حقیقی (رب العزت) کی طرف سے اس کے باطن کو ضرور شراب خور کہا جائے گا۔

مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات...... ہاں پھر جیسے افعال زنا وشراب پر حد شرعی اور تعزیرات جاری ہوں گی، ایسے ہی ان باطنی حدود کی خلاف ورزی پر بھی آدمی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا، قضاء نہ سہی تو دیانۃً ہی سہی۔ اگر آفاقی سزائیں نہ دی جائیں تو انفسی (ذاتی) ہی سہی یعنی فعل زنا وشراب پر اگر سنگساری اور درّہ زنی کی حد جاری ہوتی، تو اس ذہنی زنا کاری اور شراب خوری پر انفسی بیماریاں، آفات غم والم، تشویش وپراگندگی، فتنے اور پریشانیاں باطن پر ہجوم کر آئیں گی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر سزا یہ کہ قلب کی نورانیت زائل ہو کر اس میں ظلمت وکدورت کے بادل امنڈ آئیں گے جو اس کے سکون کو زائل کر کے قلب کی بڑی سے بڑی بیماری کا دروازہ کھول دیں گے۔

"نیست بیماری چو بیماری دل"

پس یہ تشریعی رنگ کی سزائیں نہ ہوں گی تو تکوینی رنگ کی ہوں گی۔ ظاہری آلات سے نہ دی جائیں گی تو

باطنی وسائل سے دی جائیں گی کیوں کہ یہ جرائم ہی باطن اور باطنی آلات (فکر وخیال) سے عمل میں آئے تھے۔ وہ کھلی سزائیں بھی من اللہ تھیں اور یہ مخفی سزائیں بھی جن کا تعزیر ہونا مخفی ہے، من اللہ ہی ہیں۔ بہر حال ظاہر و باطن میں سے جس سے بھی شراب خوری وزنا کاری کا صدور ہوگا اور ان میں سے کسی پر بھی آدمی مؤاخذہ خداوندی سے بری نہیں رہ سکتا۔ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْتُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ۔ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ.﴾ ① ''اور جو باتیں نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان وغیرہ سے ظاہر کرو گے یا دل میں پوشیدہ رکھو گے، حق تعالیٰ دونوں حالتوں میں تم سے حساب لیں گے، پھر بجز کفر و شرک کے جس کے لئے بخشا ہوگا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شئے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں''۔ حاصل یہ نکلا کہ: قانون الٰہی دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی طرح فقط آدمی کے ظاہر اور جسم پر ہی نہیں چلتا بلکہ بدن سے لے کر قلوب وارواح اور نیات پر لاگو ہوتا ہے۔ پس ظاہری شریعت کی رو سے تو شراب وزنا کبیرہ گناہ تھے اور ان کے ظاہری وسائل صغیرہ گناہ جن پر ظاہری حدود و تعزیرات جاری ہوتی تھیں۔ لیکن حاکم حقیقی حق تعالیٰ شانہ، کی عظمت وجلال اور ظاہر و باطن میں اس کے حاضر و ناظر ہونے کی حیثیت سے یہ خیالی زنا وشراب بھی اہل باطن کے نزدیک اکبر الکبائر کہلائے گا جس پر باطنی سزا مرتب ہوگی۔

وسائل عبادت پر اجر وثواب ...... آداب کے سلسلہ میں دو مثالیں منہیات کی عرض کی گئیں، یہی صورت ماموارت کی بھی ہے کہ ان میں بھی آداب کا ایک سلسلہ ہے جو اصل مقاصد اعمال کے تحفظ کا ضمانت دار ہے، مثلاً نماز کا فعل مقصود اصلی ہے جو حقیقی عبادت ہے۔ لیکن اس کی تسہیل اور تحفظ کے وسائل بلکہ دواعی میں مثلاً جماعت ہے جو موجب پابندی نماز اور باعث ترقی اجر وقرب ہے تو وہ سنّت موکدہ قرار دی گئی، پھر جماعت کی تیاری کے لئے اذان کی ٹوہ اور اجابت موذن (یعنی کلمات اذان سننا اور موذن کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے انہیں دہرانا مستحب قرار دیا گیا) جس سے شرکت جماعت کا اہتمام پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس اجابت اذان کے لئے مستعد ہونے کا ذریعہ طہارت اور ضروریات سے فراغت ہے تاکہ نشاط کے ساتھ اجابت موذن اور حاضری مسجد کی توفیق ہو تو اس کی بھی ترغیب وتاکید کی گئی۔

غرض درجہ بدرجہ اہتمام طہارت وسیلہ ہے اجابت موذن کا اور اجابت مؤذن وسیلہ ہے مسجد کی طرف توجہ کرنے کا اور توجہ مسجد وسیلہ ہے اقدام جماعت کا اور یہ اقدام جماعت وسیلہ ہے پابندی صلوۃ کا جو اصل مقصود ہے، اس لئے نماز کے اجر کے ساتھ ساتھ ہی ان وسائل کا اجر بھی وابستہ فرمایا گیا۔

طہارت کو نصف ایمان اور مزیل معاصی قرار دیا گیا اور اجابت موذن کے اختتام پر قبولیت دعاء کا وعدہ دیا گیا، حاضریٔ مسجد کے اقدام پر قدم قدم پر ایک نیکی لکھے جانے اور ایک ایک بدی مٹا دیئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا۔

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۴۔

حاضریٔ مسجد اور انتظارِ صلوٰۃ کو حکم میں صلواۃ کے رکھا گیا، شرکت جماعت پر ستائیس درجہ اجر وثواب کے اضافہ کا وعدہ فرمایا گیا اور اصل نماز کو نور اور دستاویز ایمان کہہ کر اسے فحش ومنکر سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، جس سے نفس انسانی پاک اور مہذب ہو جائے۔

پس مقصود تو نماز کا فعل ہے مگر یہ تمام امور چونکہ اس کی تحصیل وتکمیل کے وسائل اور حدود ہیں، اس لئے یہ سب نماز کے آداب کہلائیں گے۔ اگر اس کا اہتمام کیا گیا تو نماز قائم رہے گی ورنہ ضائع ہو جائے گی اور آدمی کو اس کی پابندی نصیب نہ ہوگی۔

تارک آداب تارک شریعت ہے...... پس ادب کا حاصل یہ نکلا کہ وہ سلسلہ مامورات میں تو محافظ فرائض ہے اور سلسلہ منہیات میں مدافع محرمات ہے، فرائض کے آداب امتثالی حدود کہلائیں گے اور محرمات کے آداب کو احترازی حدود کہا جائے گا۔

محرمات کے آداب بجالانے سے تو محرمات سے بچاؤ میسر آئے گا اور فرائض کے آداب بجالانے سے فرائض میں جماؤ میسر آئے گا، فرائض کے آداب کی پابندی فرائض کی محبت دل میں جاگزیں کرے گی اور محرمات کے آداب کی پابندی محرمات سے نفرت دل میں بٹھائے گی۔ اس لئے فرائض کے آداب تو درحقیقت تحلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس انسانی آراستہ ہوتا ہے اور محرمات کے آداب تخلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس کے جبلی عیوب ونقائص زائل ہوتے ہیں۔

اور اس طرح آداب کی ترکیاتی نوع تو نفس کو مانجھتی اور صاف کرتی ہے اور فعلیاتی نوع اس پر قلعی کر کے اسے چمکاتی ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ ان آداب کی محرومی سے نہ فرائض باقی رہ سکتے ہیں نہ محرمات۔ گویا تارک آداب درحقیقت تارک فرائض ومحرمات اور بالفاظ دیگر تارک شریعت ہے، اس لئے کتاب وسنت نے ان آداب اعمال کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہر باب میں آداب کا ایک عظیم ذخیرہ پیش کیا ہے۔ جن میں بعض آداب قرآن وحدیث کی عبارت میں صراحتاً موجود ہیں اور بعض ان کی دلالت واشارت اور اقتضاء میں پنہاں ہیں۔ جو بغیر فقہا ملت اور حکمائے امّت کی مدد کے ہر کس وناکس کے سامنے نہیں آسکتے۔ اسی لئے بطور مثال ہم نے تخیلاتی معاصی کی مثالیں پیش کیں تاکہ آداب کی اس نوع کی طرف بھی قلوب کی توجہ رہے اور یہ بغیر فقہائے امّت کا دامن سنبھالے ہوئے میسر نہیں آسکتی۔

فقہاء کا مقام معرفت...... الفاظ پرست اور بے بصر لوگ جو شرعی پابندیوں کا جوا یا سرے سے اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں یا شریعت کی الفاظ کی آڑ لے کر کم از کم اپنے باطن کو اس کی باطنی قید وبند سے آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ فقہاء کے ان دقائق کو شِـرْکٌ فِي النُّبُوَّةِ وغیرہ کے کریہہ الفاظ سے تعبیر کر کے ان کی علمی کاوشوں اور توفیقی ریاضتوں کی بے قدری کریں۔ لیکن حقیقت شناس مبصر جوان شرعی حکماء اور دینی فلاسفہ

کے بلند مقام سے کسی حد تک بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان فقہا نے نہ صرف شرعی احکام ہی کو سمجھا ہے۔ بلکہ احکام کے ظاہری و باطنی سلسلوں کو بھی سمجھا ہے اور اس لئے وہ صرف حکم شرعی ہی بیان کر دینے پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ وہ حکم کے سلسلہ سے جڑے ہوئے تمام ظاہری و باطنی مراتب احکام اور ان کی ان آخری اور احتیاطی حدود کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ جو بظاہر نظر شرعی تعبیرات میں نظر نہیں آتیں مگر ان کے معانی اور مدلولات میں اس طرح لپٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے الف با، کے بتیس حروف میں ہزار ہا کلمات وعبارات لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور جس طرح الف با، سے گذر جانے والا مبصر ہی ان حروف کی ترکیب وتحلیل سے مختلف معانی نمایاں کر دیتا ہے جن کو قاعدہ بغدادی پڑھنے والا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ایسے ہی یہ معانی شرعیہ کے مبصر شریعت کی ان ہی جامع تعبیرات سے ان میں لپٹی ہوئی مختلف حدود اور مخفی احکام کو اپنے روشن فہم اور گہرے ذوق سے باہر کھینچ لاتے ہیں جن تک مبتدیوں اور مدعیوں کی نگاہ تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔

پس یہ فقہاء امت کسی ناتمام طب کے اطباء کی طرح کسی مریض کے سامنے آ جانے پر محض دوا بتلا دینے یا زیادہ سے زیادہ علامات مرض سے صورت مرض پہچان کر نسخہ نویسی کر دینے تک محدود نہیں رہ جاتے۔ بلکہ امّت کے امراض کے ساتھ ان کے اسباب وعلل اور پھر آثار ونتائج سے باخبر رہ کر ہر شرعی دوا کی خاصیت اور اس کے درجہ تاثیر کو بھی جانتے ہیں اور وہ بھی سطحی طور پر نہیں بلکہ امراض کے تجزیہ کے بعد دواؤں کا تجزیہ کر کے مرض کے ہر ہر جزء کی تشخیص اور دوا ومرض کے اجزاء میں تطبیق دینے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ جس سے ان کا مطب ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتا رہا اور آج تک دنیا اپنے مختلف امراض کا علاج ان ہی کے اصول وقواعد پر کرتی آ رہی ہے تا آنکہ دوست دشمن کوئی بھی آن کی ان قابل قدر مساعی سے مستغنی بن کر اپنے ایمان کو قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

فقہاء کا یہ وضع احکام شارع بننا نہیں کہ تجویز احکام کا شبہ کیا جائے بلکہ شارع اور شریعت کی ایک گہری معرفت ہے جس سے ظواہر شریعت کے ساتھ مضمرات شریعت بھی ان کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ راسخین فی العلم مجوز احکام نہیں بلکہ مظہر احکام ہیں۔ اختراع احکام نہیں کرتے بلکہ استنباط کرتے ہیں اور اس لئے ان کا اتباع ان کی ذوات کا اتباع نہیں بلکہ بالواسطہ شریعت ہی کا اتباع ہے، اس لئے آداب شرعیہ کے سلسلے میں کتاب وسنت کے منصوص آداب کے ساتھ اجماع قیاس کے ظاہر کردہ آداب کے ذخیرے بھی پیش نظر رکھے جائیں گے، ورنہ ظواہر نصوص کو لے کر باطن نصوص کو ترک کر دیا جانا اور فقہاء کی مساعی سے فائدہ نہ اٹھانا نہ صرف حرمان (محرومی) ہی ہے بلکہ خسران (نقصان) بھی ہے۔

ذوقی آداب...... پھر ان چاروں شرعی حجتوں کے آداب سے متادب بن کر اور گویا۔ ذوق ادب کا خوگر ہو کر خود اس متادب پر ہی ادب کی بہت سی ذوقی راہیں کھلتی ہیں، جو دوسروں کے لئے خواہ حجت نہ ہوں مگر خود اس صاحب ذوق کے لئے حجیت کی کچھ نہ کچھ شان ضرور رکھتی ہیں۔ جو اس صاحب ذوق پر کسی کے قال سے نہیں بلکہ خود اس

کے اپنے حال سے نمایاں ہوتی ہیں اور اب وہ حاکم کے حکم ہی کے آگے ادب سے نہیں جھک جاتا بلکہ منشاء حاکم کے سامنے بھی سر ادب خم کر دیتا ہے بلکہ وہ نہ صرف حاکم حقیقی کی ذات اقدس ہی کا ادب کرتا ہے بلکہ جو بھی اس کے نامزد ہو جائے وہ اس کے آگے بھی ادب سے گردن جھکا دیتا ہے۔ اگر کوئی مکان اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے۔ جیسے بیت اللہ و بیت الرسول یا آثار و مشاہد اہل اللہ۔

اگر کوئی شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لگ جائے تو وہ ان کا بھی ادب کرتا ہے جیسے رسول اللہ اور نائب رسول اللہ۔ اگر کوئی کاغذ یا ورق خدا اور رسول کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے کتاب مصحف اور کتب حدیث و دینیات۔ غرض ادب کے شرعی طریقوں کی پابندی کے ثمرہ میں بہت سے ذوقی آداب اس پر منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سے ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے بطوع و رغبت جھک جاتا ہے، گو ظواہر شریعت میں ان آداب کے الفاظ دستیاب نہ ہوں۔

ہجرت کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دولت خانہ کے نچلے حصہ میں فروکش ہوئے، بالائی منزل پر وہ اور ان کے اہل و عیال فروکش تھے۔ تمام رات حضرت ابو ایوب مکان کے ایک ایسے کونے میں سکڑ کر بیٹھے رہتے جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سیدھ میں نیچے نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ظاہر شریعت میں نہ انہیں اس کا امر تھا اور نہ ہی وسط مکان میں رہنا ان کے لئے ممنوع تھا۔ مگر ذوق ادب نے اس طرز عمل پر انہیں مجبور کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں سے اپنے نام مبارک کے ساتھ لکھے ہوئے لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محو کر دینے کا حکم دیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صریح حکم کے باوجود اس کی جرأت نہیں کی۔ (1) تو یہ ذوق ادب ہی مانع تعمیل ہوا۔ جو ہزار تعمیلوں سے بڑھ کر تعمیل و طاعت تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زیارت مدینہ کے موقعہ پر گیارہ دن مدینۂ منورہ میں قیام پذیر رہے، مگر بول و براز نہ کیا محض اس جذبۂ ادب سے کہ مدینہ کی پاک زمین کو جو مسکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مرقد صحابہ رضی اللہ عنہ ہے، میں کس طرح آلودہ کروں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر یہ ادب حال تھا رسم مقال نہ تھا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو امام دار الہجرت ہیں ساری عمر مدینہ میں گزاری اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہو گئے۔ لیکن اس پورے عرصہ عمر میں مدینہ کی گلیوں میں جوتہ پہن کر کبھی نہیں گھومے، کہ ایسا نہ ہو میری جوتیاں اس مقام پاک پر پڑ جائیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض جوش ادب تھا جو ذوقی طور پر بطور حال کے دل میں جوش زن تھا ظواہر شریعت میں اس کا امر کہیں بھی لفظوں میں ذکر نہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ نے مکہ

---

(1) الصحیح للبخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان بن فلان، ج: ۹، ص: ۲۰۲.

معظمہ میں ہجرت فرما کر عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا کہ یہی رنگ غلاف کعبہ کا ہے، میں اسے پیروں میں کیسے ڈالوں؟ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا، مگر ادب کا ایک حال تھا جو قال سے بالاتر تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیو بند، حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے کلیر شریف جاتے تو رڑکی سے پانچ میل پاپیادہ ننگے پیر سفر فرماتے۔ ظاہر ہے کہ شریعت کی نصوص میں اس قسم کا کوئی امر موجود نہیں، مگر تبعین اوامر کا ذوقی اور وجدانی جذبہ ہے جو ان کی ذات کی حد تک انہیں ان آداب پر مجبور کرتا تھا۔

اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ...... حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو روضہ اقدس کی گیلری کا جھڑاون (جھاڑو کے ذریعہ جمع شدہ خس وخاشاک اور مٹی وغیرہ) مل گیا تو اسے پسوا کر اپنے سرمہ میں شامل کیا اور عمر بھر اس کی سلائی آنکھوں میں پھیرتے رہے، ظاہر ہے کہ یہ صورتیں شرعی احکام کی نہ تھیں ذوقی جذبات ادب تھے۔ آداب شرعیہ کی مشق سے بطور ملکہ کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے، اور ان مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بلاشبہ یہ تقلید واتباع یا دعوت دینے کی چیزیں نہیں مگر آداب کا مبصر اور صاحب حال بن جانے پر خود بخود عمل میں آنے کی چیزیں ہیں جن سے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں کیوں کہ یہ ان اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اس لئے واجب الاحترام اور لائق صد ادب ہی نہیں بلکہ درجہ حال میں قابل اتباع و پیروی بھی ہے۔

حاصل یہ نکل آیا کہ جن آداب کو لے کر علماء اسلام اٹھے تھے اور جن آداب کی دعوت شریعت اسلام نے پیش کی خواہ وہ شرعی عبارات میں نمایاں ہوں یا ان کی دلالت واشارات میں مخفی ہوں یا اہل اللہ کے پاک ذوق وجدان سے نکلیں وہ لفظی آداب اور سطحی رسوم نہیں کہ ان کی اجزاء ترکیبی کلام کی صنعت گری، تزئین بیان، لفظوں کی شائستگی اور برجستہ گوئی یا مروجہ رسوم ادب کی ڈھونگ بندی اور رواجی ڈھنگوں پر لفظ و بیان کے مقررہ کلمات ادا کر دیتا یا سر جھکا دیتا ہوں۔ بلکہ وہ حقیقی ادب ہے جس کے اجزائے ترکیبی فکر ونظر کے ساتھ نصوص کے بعید محتملات کی تعمیل، احتیاطی حدود پر عمل درآمد، تہذیب عمل کے ساتھ تہذیب خیال وتصور و ریاضت نفس مجاہدۂ عمل، تادیب جوارح، تزکیۂ باطن وتصفیہ قلب اور لوجہ اللہ ترک شہوات ولذات ہیں۔ یہی ادب ہے جو انبیاء نے اختیار کیا، صلحا نے لیا، صدیقین نے اسے اپنایا اور اسی کے ذریعہ سے اپنے دین ودیانت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔

سرچشمۂ ادب...... اس مقام ادب پر پہنچ کر نہ عبارت آرائی باقی رہتی ہے، نہ تزئین الفاظ وفقرات، نہ شستہ کلامی کے جذبات قائم رہتے ہیں، نہ سلاست بیانی کے، نہ مروجہ رسوم ہیئت وبدن باقی رہتی ہیں، نہ بناوٹی تعظیم و توقیر بلکہ سادگی و بے تکلفی کے ساتھ حقیقی عظمت وادب اور حقیقی اظہار ضمائر باقی رہ جاتا ہے جس میں زینت کی بجائے خلوص آرائش کی بجائے فنائیت ومحویت باقی رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس مرحلہ پر پہنچ کر بھرپور کلام وبیان کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نفاق سے اور عجز بیان کو (جبکہ حق کی عظمت ورطۂ حیرت میں ڈال کر زبانوں کو گنگ بنا دیتی ہے) ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عشق کے لئے زبان کی

ضرورت نہیں وہ خود اپنے مقصد کا اظہار ہے اور وہاں اعلان ادب کی ضرورت نہیں، کہ وہ خود ہی ایک مستقل ادب اور سرچشمہ ادب ہے۔

پارسی گو گرچہ تازی خوشتراست　　عشق راخود صد زبان دیگراست

بوئے او دلبر چو پراں می شود　　ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

رسمی علم وادب کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تجمل اور زینت بدن بتلایا گیا ہے علامات قیامت میں سے ایک بڑی علامت یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ لوگ اپنے علم سے تجمل اور زینت حاصل کرنے لگیں۔ اور جیسے وہ خوشنما کپڑوں اور آراستہ مکانوں سے زینت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم وادب بھی محض رونق محفل کا آلہ بن کر رہ جائے، نہ رونق باطن بنے اور نہ باطن نفس میں حقیقی ادب کی جڑیں پھیلیں۔

پس ایسے ادب میں جبکہ جاہلانہ انداز سے محض رسوم شرعیہ کو رواجی اندازوں سے قائم رکھا جاتا ہے، رسوم شرعیہ باقی رہ جاتی ہیں۔ مگر حقائق شرعیہ کلیۃً گم ہو جاتی ہیں، اسلئے الفاظ ورسوم ادب کا یہ بے روح نقشہ، ایک مردار لاشہ کی طرح ہو جاتا ہے جس کا کوئی نفع نہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں۔

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ادب اور رسمی توقیر نہ اہل اللہ اور اہل دل کا ادب ہے، اور نہ ان کے شایان شان ہے اور نہ اسے جوہر عمل کہا جا سکتا ہے۔ جس کی شرعی حیثیت سے تحسین کی جاسکے جوہر عمل اور روح تقویٰ وہی ادب ہے جو ان رسمیات سے بالا رہ کر اپنے اندر ادب کی حقیقی روح رکھتا ہو۔ اور شاعرانہ، عامیانہ، رسمیانہ، متکبرانہ اور منافقانہ رسوم آداب سے بچا کر پیغمبرانہ آداب واخلاق اور منکسرانہ حدود ورسوم پر لگا دے تاکہ انسان میں فناء نفس اور رضاء حق کے جذبات ابھر جائیں اور نفس انسانی صحیح معنوں میں شائستہ اور ربانی بن جائے۔ جس سے اسے مطلوبہ سعادت حاصل ہو جائے اور شقاوت سے بچ کر حقیقی نجات سے ہمکنار ہو جائے۔

نماز پورے اسلام کی میزان

نماز میں عبادت کا پہلو......شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل یعنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ نماز میں دو ہی بنیادی چیزیں ہیں ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیئات جو اعضاء بدن اور جوراح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء سے فاتحۂ سورت تک پھر تسبیحات سے لے کر التحیات تشہد تک اپنی عبودیت، غلامی، اور فدویت یا اللہ کی عظمت اور برتری اور لامحدود بزرگی کے سوا کسی اور چیز کا بیان نہیں ہوتا۔ اور ہیئات کے لحاظ سے نیازمندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً ہیئۃً اعتراف ہے جو عبادت کا اصل مقصود یعنی خدا کے آگے اپنی انتہائی ذلت اور رسوائی ہے۔

نماز تمام کائنات کو جامع ہے......ارشاد ربانی ہے: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾ ① یعنی ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض تصانیف میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے۔ تا کہ اس کی نماز، اس کی خلقی وضع قطع سے طبعًا ادا ہوتی رہے، مثلاً درختوں کی نماز قیام ہے، ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ چوپایوں کی نماز رکوع ہے، وہ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں، جس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑوں مکوڑوں مثلاً سانپ، بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑے کی نماز بصورت سجدہ ہے، ان کی خلقی ہیئت سجدہ نما بنائی گئی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں۔ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں رہتے ہیں، پہاڑوں کی نماز تشہد ہے۔

گویا ہر وقت زمین پر دو زانو جمے بیٹھے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں۔ پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے ہیں۔ جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے، پرندوں کے انتقالات ہی عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔ پھر سیاروں اور آسمانوں کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر آ جاتے ہیں۔ جیسے ایک نمازی رکعت پڑھ کر پھر عود کرتا ہے۔ پھر

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱.

زمین کی نماز تکوینی جمود اور سکون ہے۔ گویا ساکت اور صامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہے جو انتہائی تذلل اور خشوع ہے۔ پھر جنت و نار کی نماز سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں ہمارے مکان کو پر کر دے پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف یعنی صف بندی ہے کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔

پھر یہی سب ہیئتیں جوان جمادات و نباتات و حیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں۔ بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں، مثلاً کسی قوم کی نماز محض قیام، کسی قوم کی نماز نیم قیام کہ گھٹنوں کے بل ڈنڈوٹ کھیلنا، کسی قوم کی نماز محض رکوع، کسی قوم کی نماز اوندھا لیٹ جانا، (یعنی سجدہ) اور کسی قوم کی نماز مجموعۂ صلوٰۃ اقوام ہے۔ نباتات میں درختوں کا سا قیام، چوپایوں کا سا رکوع، فرشتوں کی سی صف بندی، آسمانوں اور سیاروں کی سی گردش اور پہاڑوں کا سا قعود ہے، اذکار میں ہر مخلوق کی تسبیح اور ذکر ان کی خلقت اور استعداد کے مطابق جدا جدا ہے، جس کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ ① یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح ہر قوم کو اس کے مناسب ہی اذکار تلقین کیے گئے کسی قوم کو تعوذ کا حکم تھا، کسی پر سوال و دعاء کا غلبہ۔ چونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مکمل کر دیا گیا۔ اس لئے مسلم کی نماز تمام اقوام کی جامع کر دی گئی، جو فطرتِ الٰہی نے اقوامِ عالم میں مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔

اوقات کی جامعیت ...... اوقاتِ نماز بھی جامع ہیں یعنی جو وقت فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے۔ ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔ صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نمازِ فجر نے اسے لیا، ظہر کا وقت سہل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔ عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلابِ آفتاب کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔ عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نمازِ عشاء نے خاتمہ بالخیر کر دیا، پھر نفل نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیت کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔ گویا اگر ایک انسان تمام اذکار و اطاعت کی بجائے صرف ان مقررہ واجب و نفل اوقات میں نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔ نماز میں روزہ، اعتکاف، حج اور زکوٰۃ کی حقیقت موجود ہے۔ روزہ کی حقیقت ہے، صبح صادق سے کھانے پینے اور عورتوں سے متمتع ہونے سے بچنا، یہ چیزیں نماز میں بھی ممنوع ہیں۔ بلکہ نماز میں ان کے علاوہ سلام، کلام، عورتوں کو چھو دینا، ہنسنا، بولنا، چلنا، پھرنا اور عام نقل و حرکت سب ہی ممنوع ہے۔ اس لئے نماز میں روزہ اپنی انتہائی شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف صوم میں ضروریات بستر پہ پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے اور کھانے پینے کی اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب امور مفسدِ صلوٰۃ ہیں۔ بلکہ مسجد میں ٹہلنے اور نقل و حرکت کی بھی اجازت نہیں اس لئے نماز کا اعتکاف زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی۔ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴.

نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط وصحت صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوسکتی پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں، بعینہ نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے تعظیماً رفع یدین کر کے نماز شروع کرتے ہیں، پھر جس طرح طواف اذکار وادعیہ سے بھرپور ہے، نماز میں ہمہ قسم اذکار (تلاوت، درود شریف، تسبیحات وغیرہ) موجود ہیں۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تا بحدِ عرفات یادِ حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں رہ کر ذکر الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں پھر جس طرح حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے، بعینہ نماز کے ذریعے شیطان کے شر کو معنوی ہتھیار کے ذریعے دفع کیا جاتا ہے، پھر جس طرح حج میں طواف وداع کر کے رخصت چاہی جاتی ہے۔ بعینہ نماز میں سلام ودعاء کر کے دربار الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے اہم اجزاء کے ساتھ نماز میں بعینہ یا بمثلہ موجود ہے، زکوٰۃ کی حقیقت تزکیۂ نفس ہے، یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا، نماز میں بھی تزکیۂ نفس اور تزکیۂ روح ہے کہ نفس ماسویٰ اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل ذکرہ کا ہورہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت اس طرح نماز میں موجود ہے اور زکوٰۃ کی صورت یوں ہے کہ نماز کے لئے مسجد، چٹائی اور حوض پر فی سبیل اللہ مال خرچ کرنا پڑتا ہے، جس طرح زکوٰۃ میں بھی فی سبیل اللہ مصارف لازم ہیں۔

نماز سے انانیت نفس کا ازالہ..... نماز سے انانیت اور کبر نفس کا ازالہ ہوتا ہے جو ہزارہا بد خلقیوں اور بداعمالیوں کی اساس ہے کیوں کہ کبر نفس جب تک باقی رہ سکتا ہے کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو، اور نماز سے حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آجاتی ہے اور جب کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر وغرور پاس بھی نہیں پھٹکتا۔

نماز میں فن تصوف کا موضوع..... فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے یعنی نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوں، اور نماز میں دو چیزیں سامنے ہوتی ہیں، نفس اور رب، نماز جب نفس کی تحقیر و تذلیل کرتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی عظمت مطلقہ نماز سامنے کردیتی ہے۔ تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں، اور وہ اپنے فضائل سے نوازتا ہے، اس سے واضح ہوگیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لئے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔

روحانی اور اخلاقی مقامات...... نماز چونکہ تزکیۂ نفس کردیتی ہے، اس کے بعد نفسانی احوال و مقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہوجاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے، لیکن بلاواسطہ بھی نماز میں تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہوجاتے ہیں، آدمی بلند پایہ ہوجاتا ہے۔ شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے، صبر کو لو تو آدمی نماز میں ہر ایک لذت سے صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزے سے زیادہ مکمل ہے، اخلاص کو لو تو نماز کی روح ہی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" ① ہے۔ جس کی حقیقت ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے۔

① پارہ: ۱، سورۃ الفاتحہ، الآیۃ: ۱۔

تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس سامنے ہے وہاں تواضع کی کیا حقیقت ہے، "رَضَا بِالْقَضَاءِ" کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا اور اس سے صبر کر لیتا ہے۔ شجاعت کو لو تو اس میں سخت ترین مقابلہ اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق

نزاع کا خاتمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اجماعی مسلک...... امابعد! برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ مشہور ومعروف اور جمہور علماء کا اجماعی مسئلہ ہے۔ علماء دیوبند حسب عقیدہ اہل سنّت والجماعت برزخ میں انبیاء کرام کی حیات کے اس تفصیل سے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی اپنی پاک قبروں میں حیات جسمانی کے ساتھ زندہ ہیں۔ اوران کے اجسام کے ساتھ ان کی ارواح مبارکہ کا ویسا ہی تعلق قائم ہے جیسا کہ دنیوی زندگی میں قائم تھا۔ وہ عبادت میں مشغول ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے اور وہ قبور مبارکہ پر حاضر ہونے والوں کا صلوٰۃ وسلام بھی سنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

علماء دیوبند نے یہ عقیدہ کتاب وسنّت سے پایا ہے اور اس بارے میں ان کے سوچنے کا طرز بھی متوارث ہی رہا ہے۔ حتی کہ بریلوی حلقوں سے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ برزخ میں حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے منکر ہیں اور اس افتراء سے علماء حرمین شریفین کو ان کی طرف سے بدظن بنا کر اور دھوکہ دے کر ان کے خلاف فتویٰ بھی حاصل کرلیا گیا، لیکن جب علماء حرمین پر اس دھوکہ دہی کی حقیقت کھلی اور انہوں نے اس قسم کے تمام مسائل کے بارے میں ازخود ایک مفصّل استفتاء مرتب کر کے علما دیوبند سے جواب مانگا جس میں حیات انبیاء کا سوال بھی شامل تھا۔

تو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مفصل جوابی فتوی بنام ''اَلْمُهَنَّدُ عَلَى الْمُفَنَّدُ'' مرتب فرما کر علماء حرمین کے پاس ارسال فرمایا۔ جس میں مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں بھی علماء دیوبند کا نقطۂ نظر غیر مشتبہ اور واضح الفاظ میں تحریر فرمایا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور برزخ میں ان کی یہ حیات، حیات دنیوی ہے۔ نیز اسی ذیل میں اس نقطۂ نظر کو مزید واضح اور مضبوط تر کرنے کے لئے انہوں نے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے رسالہ ''آب حیات'' کا بھی حوالہ دیا جو اس موضوع پر ایک مستقل اور پرُ از حقائق ومعارف کتاب ہے جس کا مقصد اس مسئلہ کی ایک مستحکم تائید کے علاوہ یہ بھی تھا کہ علماء دیوبند کا یہ عقیدہ (حیات انبیاء) انہیں ان کے اسلاف سے بطور توارث کے ملا ہے۔ کوئی انفرادی رائے یا وقتی اور

ہنگامی فتویٰ نہیں ہے جو حوادث کے پیش آنے سے اتفاقاً سامنے آ گیا ہو۔

مفاہمت کی بنیاد...... پھر اس مسئلہ اور اس کے بارے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ کے حوالہ کی تائید میں اس وقت کے تمام اکابر علماء دیو بند کے توثیقی دستخط بھی اس میں ثبت کرائے۔ جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ مسئلہ حیات انبیاء کے بارے میں یہ مذکورہ عقیدہ صرف ان کے سلف ہی کا نہیں بلکہ خلف بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سلف قائل تھے اور اسی طرح یہ مسئلہ (اثبات حیات انبیاء) بطرز مذکور سلف سے لے کر خلف تک یکسانی کے ساتھ مسلمہ اور متفق علیہ رہا ہے اور تمام علماء دیو بند کا یہ اجماعی مسلک ہے جس سے کوئی فرد منحرف نہیں ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض علماء دیو بند یا متقدمین میں سے بعض حضرات کی عبارتیں اس بارے میں کچھ مبہم یا موہوم ہوں۔ سو اگر اس سلسلہ میں ان کی کچھ صاف اور واضح عبارتیں بھی پائی جاتی ہوں تو ان کے مبہمات یا مجملات کو واضح عبارتوں کے تابع کر کے مبہمات کی تفسیر کی جاسکتی ہے، لیکن اگر صرف مجملات ہی ہوں جن سے مسئلہ کے دونوں پہلو نکل سکتے ہوں یا واضح ہوں مگر مخالف پہلو صاف اور نمایاں ہو جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو، تو پھر اپنے مفہوم کو سامنے رکھ کر مخالف پہلو اختیار کرنے والوں پر ایسی نکیر کی گنجائش نہ ہوگی۔ جو مخالف پہلو کے ناممکن ہونے کی صورت میں کی جاسکتی تھی۔ کیوں کہ اس صورت میں یہ تفصیلاتی یا کیفیاتی اختلاف ایک علمی اور نظری اختلاف ہوگا جسے مسلکی اختلافات سے تعبیر نہیں کیا جاسکے گا۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسئلہ کی تفصیلات میں ایسے اختلاف کی گنجائش ہے جو علماء میں ہر وقت ہوسکتا ہے۔

البتہ عوام سے ایسے اختلافات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ صرف نفس مسئلہ اور اس کی قدر مشترک کے مکلف ٹھیرائے جاتے ہیں جو مسلک کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی لئے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں زیر نظر مصالحت اور مفاہمت باہمی کی بنیاد تفاصیل مسئلہ کے اختلافی پہلوؤں سے الگ رہ کر نفس مسئلہ کی قدر مشترک پر رکھی گئی جو فریقین کے نزدیک قابل قبول ہوگی جیسا کہ آئندہ مفاہمت کی عبارت کے متن سے واضح ہوگا۔

اجتماعی نقصان...... بخت و اتفاق سے وقت کے بعض فضلاء دیو بند نے اس مسئلہ کی تفصیلات میں کچھ اس قسم کا اختلاف فرمایا جس کا مبنیٰ متقدمین کی ایسی ہی عبارتیں یا نصوص کے مدلولات کی اسی قسم کی تعبیرات ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے اختلاف رائے کی گنجائش کلیۃً مسلوب نہیں سمجھی جاسکتی، جس کا ظہور تین چار سال سے ہوا۔ یہ اختلاف رائے مضر، لیکن سوئے اتفاق سے یہ اختلاف اسٹیج پر آ گیا اور اس میں ردو قدح کی صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ عوام کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور آخر کار اس مسئلہ کی بحث علماء سے گذر کر عوام میں ان کے رنگ سے پھیل گئی جس سے قدرۃً اس اختلاف نے نزاع و جدال کی باہمی صورت اختیار کر لی۔ گروپ بندی شروع ہوگئی اور یہ بحث آخر کار ایک جماعتی فتنہ کی صورت میں آگئی جس سے مسئلہ تو ایک طرف رہ گیا اور فساد آگے آ گیا، اور خود جماعت دیو بند میں تفریق و تفرق اور تخریب کے آثار نمایاں ہونے لگے، جانبین سے رسالے لکھے گئے، اخباری

بحثیں چھڑ گئیں، جس سے جماعت کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچ گیا۔

مساعی طیبہ...... یہ صورت حال دیکھ کر اور اخبارات و رسائل سے ان مناقشات کی خبریں معلوم کر کے دل زخمی ہوتا رہا، اور جوں جوں یہ فتنہ بڑھتا گیا ووں ووں دل کا غم بھی ترقی کرتا گیا۔ دلی آرزو تھی کہ کسی طرح فتنہ نزاع و جدال کی یہ صورت ختم ہو جائے۔ حسن اتفاق سے ۲۶ اپریل ۱۹۶۲ کو احقر کو پاکستان حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اور اسی ماہ میں بزمانۂ قیام لاہور، جناب محترم مولانا غلام اللہ خان صاحب اور محترم مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری احقر سے ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے، دوران ملاقت احقر نے اس نزاع و جدال کا شکوہ کرتے ہوئے اس صورت حال کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی، اور عرض کیا کہ یہ صورت بہر نہج ختم ہونی چاہئے جبکہ یہ مسئلہ کوئی اساسی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اسٹیج پر لایا جائے، اور اس کی وجہ سے تفریق و تفرق و تخریب کے ان مضر اثرات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مسئلہ یا تو اسٹیج پر آئے ہی نہیں یا اگر اتفاقاً آ جائے تو اس کا عنوان نزاعی نہ رہے۔

اس پر ان دونوں بزرگوں نے نہایت مخلصانہ اور دردانگیز لہجہ میں کہا کہ ہم خود بھی اس صورت حال سے دل گرفتہ ہیں اور دلی تنگی محسوس کرتے ہیں، کاش آپ (احقر) ہی درمیان میں پڑ کر اس نزاع کو ختم کرا دیں۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے سوا یہ قصہ کسی دوسرے کے بس کا ہے بھی نہیں۔ اس بارہ میں آپ کی اب تک کی تحریرات نہایت معقول انداز سے سامنے آئی ہیں جن کو دونوں فریقوں نے احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے، اب بھی اس بارے میں آپ کی مساعی احترام و قبول کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

احقر کو ان مخلصانہ جملوں سے نزاع کے ختم ہونے کی کافی توقع پیدا ہو گئی اور ارادہ کر لیا گیا کہ فریقین کے ذمہ دار حضرات سے مل کر کوئی مفاہمت کی صورت پیدا کی جائے۔ چناں چہ جواب میں یہی عرض کیا گیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ، شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان سے مل کر اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کروں گا۔

کراچی پہنچ کر احقر نے اس سلسلے میں مولانا غلام اللہ خان صاحب سے مراسلت شروع کی تا کہ معاملہ کے ابتدائی مبادی طے ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ کسی دینی مسئلہ میں مفاہمت کے معنی خلاف دیانت رائے تبدیل کر دینے یا مسئلہ کو کم و بیش کر کے کسی اجتماعی نقطہ پر آ جانے کے تو ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے طریق مفاہمت اور فریقین کے لئے نقطہ اجتماع ذہن میں یہ آیا کہ اولاً یہ مسئلہ عوام میں لایا ہی نہ جائے اور اگر بیان مسئلہ کی نوبت آئے تو اس کا قدر مشترک پیش کر کے اس کی تفصیلات اور اختلافی خصوصیات پر زور نہ دیا جائے بلکہ عوام کو ان کی گہری خصوصیات میں پڑنے سے روکا جائے تو کم از کم عوام میں سے یہ نزاعی صورتیں ختم ہو جائیں گی، جو مضر ثابت ہو رہی ہیں، پھر اگر علماء کی حد تک تفصیلات میں کچھ اختلاف باقی بھی رہ جائے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہو تو گروپ بندی کے مضر اثرات ختم ہو جائیں گے جو فتنہ کی اصل بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے احقر نے اپنی محدود معلومات کی حد تک اس مسئلہ کے قدر مشترک کا ایک عنوان تجویز کر کے مولانا ممدوح کو لکھا کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں تا کہ دوسرے حضرات کی رائے بھی حاصل کی جا سکے۔

اس عریضہ کا جواب مجھے ملتان پہنچ کر مدرسہ خیر المدارس میں ملا۔ جس میں مولانا غلام اللہ خان صاحب نے احقر کے عنوان کو رد کئے بغیر خود بھی ایک عنوان لکھ کر بھیجا۔ اس موقع پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مولانا محمد علی صاحب جالندھری اور دوسرے معتمد علماء جمع تھے، جن کے سامنے احقر نے اپنا منصوبہ اور یہ دونوں عنوان علیحدہ علیحدہ رکھ کر گفتگو کی۔ طے یہ پایا کہ قیام ملتان کی قلیل مدت اس مسئلے کے لئے کافی نہیں ہے اور بعض ضروری افراد بھی یہاں موجود نہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو جہلم کے قیام میں رکھی جائے اور وہاں ایک مستقل دن اس کام کے لئے فارغ رکھا جائے اور ساتھ ہی احقر نے ملتان ہی سے اپنی تقریروں میں اس منصوبے کے لئے فضا ہموار کرنی شروع کر دی۔

ملتان، جہلم، سرگودھا اور راولپنڈی میں خصوصیت کے ساتھ اس بارہ میں اصلاحی عنوانات اختیار کئے گئے۔

احقر نے اس سلسلے میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سرگودھوی اور مولانا محمد علی صاحب جالندھری سے جہلم تشریف لے چلنے کے لئے عرض کیا۔ جس کو ان حضرات نے بہ خوش دلی منظور فرما لیا، مقررہ تاریخ پر یہ سب حضرات جہلم میں جمع ہو گئے اور مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قدر مشترک زیر غور آیا، طے یہ پایا کہ قدر مشترک کم از کم اتنی تفصیل ضرور لئے ہوئے ہونا چاہئے، جس سے مسئلہ کے تمام بنیادی گوشوں پر روشنی پڑ سکے اور عوام بطور عقیدہ کے اسے سمجھ سکیں۔

چنانچہ گفتگو کے بعد ایک جامع تعبیر احقر نے قلمبند کی اور ارادہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ان حضرات ممدوحین کی موجودگی میں دوسری جانب کے ذمہ دار حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب، مولانا قاضی نور محمد صاحب، مولانا قاضی شمس الدین اور مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری کو جمع کر کے اس منصوبہ اور مجوزہ عنوان پر گفتگو کی جائے۔

قدر مشترک...... چنانچہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ء یوم جمعہ دونوں جانب کے یہ سب بزرگ احقر کی قیام گاہ (مدرسہ حنفیہ عثمانیہ) میں جمع ہو گئے، اس مجلس میں احقر نے اس معاملہ کی اوّل سے آخر تک ساری روداد بیان کر کے مسئلہ کا وہ منقح قدر مشترک دونوں جانب کے ان ذمہ دار حضرات کے سامنے رکھا۔ گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ ماحول میں ہوئی اور ختم مجلس تک الحمدللہ یہی ماحول قائم رہا، نہ اس میں ہار جیت کے جذبات تھے نہ غلبہ و مغلوبیت کے تصورات تھے بلکہ مسئلہ کو سلجھانے اور نمٹانے کے جذبات نمایاں تھے اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حلقوں نے احقر کی پیش کردہ قدر مشترک کے عنوان کو قبول کر لیا۔ اور اس قدر مشترک تحریری یادداشت پر جو احقر نے اپنے دستخط سے پیش کی، فریقین نے دستخط فرمائے اس یادداشت کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

"عامۂ مسلمین کو فتنۂ نزاع وجدال سے بچانے کے لیے مناسب ہوگا کہ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے کے ہر دو فریق کے ذمہ دار حضرات عبارت ذیل پر دستخط فرمائیں۔ یہ (عنوان) مسئلہ کا قدر مشترک ہوگا،

ضرورت پڑنے پر اسی کو عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، تفصیلات پر زور نہ دیا جائے، عبارت حسب ذیل ہے:

وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں یہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں"۔

احقر: محمد طیب

وارد حال راولپنڈی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

(مولانا قاضی) نور محمد خطیب جامع مسجد قلعہ دیدار سنگھ

لاشیٔ (مولانا) غلام اللہ خان...... (مولانا) محمد علی جالندھری

اس مختصر عبارت کی کافی تفصیل چوں کہ قاضی شمس الدین صاحب (برادر مولانا قاضی نور محمد صاحب اپنے مکتوب میں لکھ کر مولانا محمد علی جالندھری صاحب کے پاس بھیج چکے تھے۔ اس لئے یہ عبارت بالا ان کی مسلمہ ہے، بناء بریں اس عبارت پر ان کے دستخط کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، عبارت بالا کو ان کا مسلمہ سمجھا جائے۔

حق گوئی اور انصاف پسندی...... چوں کہ اس موقع پر مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری بوجہ علالت راولپنڈی تشریف نہ لاسکے۔ اس لئے احقر کے عرض کرنے پر اور مسودہ پیش کرنے پر حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ صاحب نے ان کے بارے میں حسب ذیل تحریر دستخط کر کے بندہ کو عنایت فرمائی جس کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

"ہم (مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ خان صاحب) اس کی پوری کوشش کریں گے کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے بھی اس تحریر (مندرجہ بالا) پر دستخط کرائیں جس پر ہم نے دستخط کئے ہیں۔ اگر ممدوح اس پر دستخط نہ کریں گے تو ہم مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس تحریر کی حد تک ان پر برأت کا اعلان کر دیں گے، نیز اپنے جلسوں میں ان سے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریر نہ کرائیں گے اور اگر اس مسئلہ میں وہ کوئی مناظرہ وغیرہ کریں گے تو ہم اس بارے میں ان کو مدد نہ دیں گے"۔ نور محمد خطیب قلعہ دیدار سنگھ لاشیٔ غلام اللہ خان (۲۲ جون ۱۹۶۲ء) اس تحریر پر ہر دو دستخط کنندہ بزرگوں کی حق پسندی اور حق گوئی ظاہر ہے۔ باوجود یہ کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے ان بزرگوں کے قوی ترین تعلقات اور مخلصانہ روابط ہیں مگر اس بارے میں انہوں نے کسی رورعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں انہوں نے کسی رورعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں بے لوثی نمایاں ہے۔

سکوت مصلحت...... تاہم سید صاحب ممدوح کے بارے میں مجھے اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ برزخ میں انبیاء کی حیات جسمانی کے کلیۃً منکر نہیں ہیں۔ صرف اس کی کیفیت اور نوعیت میں کلام کرتے ہیں ایسے ہی وہ حاضرین قبر شریف کے درود وسلام کے حضور کے سمع مبارک تک پہنچنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سننے کا بھی علی الاطلاق انکار نہیں کرتے بلکہ اس کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل

نہیں۔ان کا یہ ناتمام اقرار چونکہ ان کی مفہومہ حجت سے ہے اس لئے انہیں اس بارے میں منکر نہیں کہا جائے گا بلکہ مئوول سمجھا جائے گا۔ گوان کی یہ تاویل بمقابلہ جمہور، اس ناچیز اور ہر دو دستخط کنندہ بزرگان ممدوحین بالا کے نزدیک قابل تسلیم نہیں لیکن مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے جبکہ ان کا یہ اختلاف حجت سے ہے۔ان پر زبان طعن وملامت کھولنا یا تشنیع کرنا کسی طرح قرین انصاف وصواب نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ دوسرے مسائل میں بحیثیت مجموعی اہل دیوبند اور اہل السنّت والجماعت کے حامی اور خادم بھی ہیں، اس لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر سکوت اختیار کرلیا جانا ہی قریب مصلحت اور جانبین کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ساتھ ہی مجھے اپنے محترم صدر سید صاحب ممدوح سے بھی پوری توقع ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ مسئلہ حیات کی ان تفصیلات میں جمہور اہل السنّت والجماعت کے مسلک کا احترام قائم رکھنے کے لئے اپنے کسی خصوصی مفہوم کو (خواہ وہ ان کی دانست میں مفہوم اہل السنّت والجماعت ہی ہومگر جمہور علماء کے نزدیک وہ ان کا خصوصی مفہوم شمار کیا جارہا ہے اور خواہ وہ کتنی بھی دیانت پر مبنی ہو) ضروری الاشاعت نہ سمجھتے ہوئے سکوت کو کلام پر ترجیح دیں گے یہ مسئلہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی عقائد کا نہیں ہے کہ اس میں سکوت روانہ رکھا جائے۔

فروعی اختلاف کی حیثیت...... اس طرح عام مسلمانوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مسائل اور ان میں علماء کے جزوی (معمولی) اختلافات کو مناقشات اور جدال ونزاع (لڑائی جھگڑے) کا ذریعہ نہ بنائیں۔اس قسم کے اختلافات امّت کے لئے آسانیوں کا ذریعہ بنائے گئے ہیں نہ کہ نزاعات اور مناقشات کا۔اس لئے عملاً واعتقاداً جمہور سلف وخلف کا دامن تھام کر دوسری جانبوں سے مصالحت اختیار کریں اور لڑنے اور لڑانے کی خو پیدا نہ کریں۔

آج امّت کے بہت سے اہم اور بنیادی مسائل ہیں جو ان کی ہیئت اجتماعی کی متقاضی ہیں اور یہ ہیئت جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اسے اس قسم کے فروعی اختلافات میں بصورت گروہ بندی ضائع نہ کیا جائے۔

خوشی کی لہر...... آخر میں دونوں جانب کے بزرگوں اور بالخصوص فریقین کے نامبردہ اکابر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گذارشات کو پوری توجہ اور التفات خاطر اور سمع قبول کے ساتھ سنا اور ملت کو بہت سے مفاسد اور مہالک سے بچالیا۔

"فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِّیْ وَعَنْ جَمِیْعِ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرَ الْجَزَآءِ."

اس نئی اصلاحی صورت کا سب سے زیادہ شاندار مظاہرہ راولپنڈی کے اس عظیم الشان جلسہ عام میں ہوا جو احقر کی تقریر کے سلسلے میں مدرسہ حنفیہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک بڑے میدان میں زیر صدارت حضرت مولانا خیر محمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان، منعقد کیا گیا تھا۔

احقر کو منظوم سپاس نامہ دینے سے جلسہ کا آغاز ہوا اور احقر کی تقریر شروع ہوئی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔تقریر کے آخر میں احقر نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس نزاع کے ختم ہونے کی بشارت تفصیل سے سنائی

جس سے عوام میں خوشی کی اک بے پناہ لہر دوڑ گئی اور ان ہزار ہا انسانوں کے ہجوم نے بے تحاشا تبریک وتہنیت کے نعرے لگانے شروع کر دیئے جس سے فضا گونج اٹھی۔

اعتراف شخصیت...... ختم تقریر پر ایک جانب سے مولانا غلام اللہ خان صاحب نے اور دوسری جانب سے مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے اپنی تقریروں سے اس بیان کی توثیق کی اور نہایت فراخدلانہ اور مخلصانہ لب ولہجہ سے فرمایا، کہ ہم نے مہتمم دارالعلوم کے درمیان میں پڑ جانے سے اس مسئلہ کی نزاعی صورت حال کو ختم کر دیا ہے اور جو چیز ہمیں ناممکن نظر آ رہی تھی وہ اس شخصیت (احقر ناکارہ) کے درمیان میں آ جانے سے نہ صرف ممکن ہی بن گئی بلکہ واقعہ ہو کر سامنے آ گئی۔ اور ہم کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس مہم کو مہتمم دارالعلوم ہی کی شخصیت انجام دے سکتی تھی جس میں ایک طرف دارالعلوم دیوبند جیسے علمی و مذہبی مرکز کی سربراہی کی نسبت موجود ہے جو ہم سب کا مرکز قلوب ہے اور دوسری طرف بانی دارالعلوم دیوبند حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی وہ قاسمی نسبت موجود ہے جو پوری قاسمی برادری کو اس پر متحد کئے ہوئے ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے سوا دوسرے سے یہ مہم انجام نہیں پا سکتی تھی۔

جذبات مسرت...... بہرحال ہم نے اس نزاع کو ختم کر دیا ہے اور ہم اس بارے میں عوام کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان دو تقریروں کے بعد ہزاروں آدمیوں کا عظیم اجتماع جذبات مسرت سے ابل پڑا اور اس نے ''مہتمم دارالعلوم زندہ باد'' ''دارالعلوم دیوبند زندہ باد'' اور ''علماء دیوبند زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کئے۔ کئی منٹ تک فضا نعروں سے گونجتی رہی اور مجمع میں جذبات مسرت کی ایک عجیب حرکت تھی، جس سے مجمع متموج دریا کی طرح متحرک نظر آ رہا تھا اور نعروں میں تقریریں بند ہو گئیں۔ بالآخر جلسہ شاندار کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جو تحریک احقر کے قلم سے کراچی سے شروع ہوئی تھی وہ ملتان، سرگودھا اور جہلم میں اپنے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی راولپنڈی میں حدِ اتم تک پہنچ گئی۔ خدائے برتر وتوانا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ چار سال کی مکدر فضا صاف ہوئی اور اس کے المناک آثار روبہ زوال نظر آنے لگے۔ (''وَالْحَمْدُلِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا.'')

حق تعالیٰ اس یگانگت کو پائیدار اور برقرار رکھے اور مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ دین ملت کے اہم کاموں کو جزئیات فرعیہ کے مقابلے میں اہم سمجھتے ہوئے اپنی جماعتی قوتوں کو ان پر لگائیں۔

احقر: محمد طیب غفرلہ

(۱۹۶۲/۶/۲۴ء) مولانا مدنی قدس سرہٗ

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں ـــــ اس کا کیا ذکر برباد ہوئے تم یا ہم

آہ! صد آہ! کل تک جنہیں ہم مولانا مدنی مدظلہ کہا کرتے تھے، آج مولانا مدنی قدس سرہٗ کہہ رہے ہیں مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ۸۱ سال کی عمر میں دار دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی اور

وابستگان کو غم واندوہ میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے مقام کریم میں جا داخل ہوئے۔

حضرت شیخ ایشیاء کی سب سے بڑی جامعہ (دارالعلوم دیوبند) کے شیخ اکبر، جمعیت علماء ہند کے صدر، جماعت دیوبند کے عظیم روحانی رہنما اور جماعت دیوبند کی صد سالہ تاریخ کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی، دینی، روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر ہو کر اس ۱۸۵۷ء ہی پر انتہا ہوگئی۔ اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہو کر ختم ہوگیا۔

کمال جامعیت...... حضرت ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان جس کی تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے۔ جامع ہستیاں دیر سے بنتی ہیں اور اٹھ جاتی ہیں تو ان کی جگہ لمبی مدت تک خالی پڑی رہتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی، عزم وثبات، ہمت مردانہ، اٹل ارادہ، علم وبصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی۔ آپ نے آج کے لادینی مادی دور میں جن دینی، اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص وعوام کے لئے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون وآداب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری وباطنی سے ملک اور ملک سے باہر ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے۔ جو اس مرکز علم وفن (دارالعلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی، آپ اپنے اساتذہ وشیوخ کے ابتداء ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثناء ان کے تمام اکابر وشیوخ انہیں اطمینان واعتماد اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اس لئے آپ مختلف ماہر فن اساتذہ وشیوخ کی علمی وعملی یادگار تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، ادب وخطابت، منطق وفلسفہ کی مہارت وحذاقت آپ کے قول وفعل سے نمایاں رہتی تھی۔ آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔ باطنی سلسلوں میں پارسائی، پاکیزگی، نفس، تقویٰ وطہارت، ضبط اوقات، تکمیل معمولات اور باوجود متفرق دینی وقومی مشاغل کے ان کی ہمہ وقت پابندی آپ کا ایک سہل ممتنع مشغلہ تھا۔

حب الوطنی آپ کے نزدیک ایک سیاسی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک علمی اور اخلاقی اور خود ان کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی، اور دین کی یہ تعلیم کہ ''ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہو'' آپ کی ذات گرامی میں عملی صورت سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔

ایک حسین امتزاج...... مادی دنیا سامان راحت بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسانی ضمیر کو مطمئن نہیں کر سکتی، سائنس اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے مگر اچھے انسان نہیں بنا سکتی، جب تک کہ ایمانی سائنس اس کی راہنما اور مربی نہ بنے۔

حضرت ممدوح کی ذات ان دونوں سائنسوں کا ایک معتدل امتزاج تھی، آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارموں اور سیاسی اسٹیجوں کی جلوتوں میں نمایاں نظر آتے رہتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں، درس حدیث وقرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرما رہتے تھے اور دونوں لائنوں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے۔ ایک شعبہ سے دوسرا شعبہ ان کی توجہ کی جامعیت کو پراگندہ نہیں کرسکتا تھا۔

دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی، اپنوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور اپنوں سے احتساب کے ساتھ دوسروں کے لئے توسع ان کے کام کا نصب العین تھا۔ اسی لئے آپ نے درس وتدریس، باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کے میدان کو بھی سر کرلیا اور عملاً ان دونوں اضداد کو جمع کر دکھلایا۔ اس جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا اور آپ کے ہزاروں شاگردوں نے جو ہندو بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس پر کام کیا۔ اسی لئے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقہ اور ہر قوم میں عام تھی، حتیٰ کہ جن حضرات کو آپ سے اختلاف رائے بھی تھا، ان کے قلوب بھی حضرت ممدوح کی عزت وعظمت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالات ظاہر وباطن کے معترف رہے۔

شیخ العرب والعجم...... حضرت ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب وعجم میں پھیلا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم سے فراغت پاکر حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس قرآن و حدیث اور تدریس علوم فنون کا آغاز فرمایا اور اٹھارہ برس اس سرچشمہ علوم نبوت میں بیٹھ کر علوم نبوت کی خدمت کی، جس سے عرب وعجم کے لوگ سیراب ہوئے۔ اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ٹرکی تک پہنچے، آخر کار عمر کے آخری حصہ میں ۳۴ برس کامل دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر فائز رہ کر مشرق ومغرب کے لوگوں کو علوم کے آب حیات سے سیراب فرمایا۔

سیاسی نقطۂ نظر...... ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور ایک زبردست انقلابی مجاہد تھے، جنہوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ آپ اس سلسلہ میں حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی، سیاسی فلسفہ و حکمت کے امین اور اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے حکیمانہ جوش عمل کے علمبردار تھے، جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا اور آخر کار جانشین شیخ الہند ہی کے لقب میں یاد کئے جانے لگے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں راہنما ہونا چاہئے۔ اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔

نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اس مرکب نظریہ کے ساتھ ملک کی آزادی انہیں ہر عزیز چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ جس کے لئے انہوں نے اپنی ہر

محبوب چیز کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انہیں عزیز تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ہندوستان کی آزادی کو وہ ایشیا اور مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا پیش خیمہ اور دروازہ جانتے تھے جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیاء کا قصرِ آزادی میں داخلہ ناممکن تھا۔

چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیاء بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ پھر اس ترقی آزادی کی وہ روح جوان کی روح میں پیوست تھی، صرف سطحی آزادی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ دنیا سے مغربی ممالک کا تسلط و اقتدار ختم ہوئے بغیر دنیا میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی، لامذہبیت، دہریت، الحاد، بے دینی اور بے قیدی جس نے مشرق کے روحانی چمنستاں کو اجاڑ اور اخلاقی تعمیروں کو ویرانہ بنا رکھا ہے کبھی نہیں مٹ سکتی اور اس فاسد مادہ کے استیصال کے بغیر دنیا کی حقیقی تندرستی اور اس کا اصل سکھ اور چین کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ انہیں یقیناً یہ احساس تھا کہ اس عمومی تنقیہ اور مسہل میں اجزائے فاسدہ کے ساتھ اجزائے اصلیہ پر بھی زد پڑے گی۔ لیکن یہ تنقیہ کا ایک طبعی تقاضا ہوگا۔ اگر تنقیہ ضروری ہے تو اس جزوی محرومی پر صبر بھی ضروری ہے۔

بہرحال ان کی آزادی کی جدوجہد سیاسی تھی اور اس کی روح اخلاقی، اسی لئے جہاں آزادی کی جنگ ان کے دست و بازو کا اثر تھی، وہیں اخلاق کی تعمیر سے قلوب کی تربیت اور فطرت الٰہیہ کی عطاء فرمودہ حدود و قیود کے دائروں میں انہیں محدود و مقید کرتے رہنے کی جدوجہد بھی ان کے عمل کا ایک مستقل محاذ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق و مغرب کے مزاج الگ الگ ہیں، لیکن فوجی اقتدار کے غلبہ نے مشرق کے مزاج کو فاسد کر دیا ہے، اگر یہ بیماری رفع ہوگئی تو بعد چندے مشرق کے اصل مزاج کی صحت عود کر آئے گی۔ یہی وہ نظریہ تھا جس پر شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بزرگوں کی ظاہر و باطنی رہنمائی میں کام کیا اور علم و تحقیق کا ایک نیا باب کھولا۔

اس طاقت ور نصب العین کے تحت انہوں نے ہر طرف سے نظر بند کر کے مغربی طاقتوں پر ایک زبردست وار کیا اور تیشہ چلا دیا۔ اس زور آزمائی اور کشاکش کا نتیجہ بہرحال اخلاقی قوتوں کی بیداری اور ایشیا و مشرق کے مزاج میں تبدیلی کی صورتوں میں رونما ہوا۔ کمزور ملک آزاد ہونے لگے اور حریت طلبی کا حوصلہ ان میں خاطر خواہ ابھر آیا۔ آج مغرب کی طاقتیں اگر کلیۃً نہیں ٹوٹیں، تو ان کو توڑنے والے اور اس نظریہ کو لے کر آگے چلنے والا ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔

بہرحال حضرت شیخؒ کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی، ایشیا کی آزادی اور آخر کار اخلاق و انسانیت کی آزادی تھی۔ یہ نظریہ ان کا عقیدہ تھا جو انہیں وراثت میں ان کے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا کہ مغرب کی ان مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی جوہری قدریں کبھی نہیں ابھر سکتیں۔

مرکب نصب العین ......اسی لئے وہ ایک طرف اگر کانگریس کے سرگرم ممبر تھے تو دوسری طرف جمعیت علماء ہند کے صدر بھی تھے۔ اور اگر وہ کانگریس کے خاص سیاسی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیت علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے اور جہاں یہ دو پلیٹ فارم ان کی

سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب وسنّت کی ترویج میں بھی اسی درجہ منہمک تھے اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدرنشین بھی تھے جس میں متوسلین کی علمی اور اخلاقی اصلاح وتربیت اور انہیں صحیح معنوں میں مسلم قانت بنانا ان کا نصب العین تھا۔

کوری سیاست کے لئے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لئے مدرسہ وخانقاہ کی چہار دیواری بس کرتی تھی، لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑ رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں تھا کہ ان کا نصب العین مرکب تھا جس کی سطح سیاسی اور ماہیت اخلاقی تھی۔ اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی ان کی بابت رائے قائم کی وہ رائے صحیح اور واقعاتی رائے ثابت ہوئی۔

مینارۂ نور...... بہرحال حضرت شیخ اس دور الحاد و بے دینی میں روشنی کا ایک مینار تھے اور اگر بقول امیر امان اللہ خان سابق بادشاہ افغانستان ''شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس نور کی ضیاء اور چمک تھے''

یہ نور ان سے منتشر ہو کر ان کے ماحول اور ملک میں پھیلا۔ ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رحیم مادہ کی قوتیں کارفرما ہوتی تھیں۔ منکرات پر جلال کے ساتھ نکیر فرماتے تھے اور عجیب تر یہ کہ اس جوش وجلال کے باوجود نہ ان کی محبوبیت میں فرق آتا تھا نہ مطلوبیت میں۔ کہنے والے بلکہ ملامت کرنے والے اپنا کام کرتے تھے جو سطح کے پیش نظر ہوتا تھا اور وہ اپنا کام کرتے تھے جو حقیقت کے پیش نظر پوری قوت سے جاری رہتا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کے نصف النہار کے قریب یہ جامع دولت ہم سے چھن گئی اور ۲ بجے کے قریب روح پرفتوح اس جسد خاکی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاوداں ہوگئی۔ ''رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً۔''

زندگی بھی خوب گذری اور موت بھی پاکیزہ رہی۔ بعد مردن چہرہ پر نورانیت اور چمک غیر معمولی تھی۔ روشنی میں چہرہ کی چمک دمک اور اس کا جمال نگاہوں کو سیر نہیں ہونے دیتا تھا، لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کی کیفیت الفاظ میں نہیں آسکتی۔ جو یقیناً مقبولیت عند اللہ اور اس کے ساتھ موت کے وقت بشاشت وطمانیت کی کھلی علامت تھی۔ جو مقبولیت زندگی میں تھی وہی موت کے بعد بھی ہے، مزار ہر وقت زیارت گاہ بنا رہتا ہے۔ حتی کہ رات کو ایک ایک بجے بھی جانے والے گئے تو مزار پر لوگوں کو پایا۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ وصال کی خبر آناً فاناً ہوا پر دوڑ گئی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک نے ریڈیو پر وصال کی خبر نشر کی اور ہندو بیرون ہند سے تعزیتی فون، تار، اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وصال کے بعد ایک بجے شب تک خدا ہی جانتا ہے کہ انسانوں کا ہجوم کہاں سے ٹوٹ پڑا کہ دارالعلوم کا وسیع احاطہ ہجوم سے ابل پڑا۔ ہجوم اور جنازہ پر کنٹرول دشوار ہوگیا، لوگ جس شخصیت کے اردگرد پروانہ وار جمع رہتے تھے اب اس کی ظاہری علامت پر پروانہ وار ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وابستگان حق اور محبوب القلوب ہستیاں زندگی اور موت دونوں ہی میں محبوب القلوب رہتی ہیں

اور دوسرے لفظوں میں اللہ والے حقیقتاً مرتے ہی نہیں، صدیاں گذر جانے پر بھی دلوں میں ان کی روح دوڑتی رہتی ہے اوران کی محبوبیت بدستور قائم رہتی ہے۔ جس کی بناء ان کا پیکر یا جثہ نہیں ہوتا جو مٹ جاتا ہے، بلکہ ان کی معنویت ہوتی ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں، اس لئے موت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ مر کر بھی باقی ہی رہتے ہیں۔

معنوی معیت...... آج حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہم میں موجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں غیر موجود بھی نہیں جبکہ ان کا مشن موجود، ان کا نمونہ عمل موجود، ان کا علم موجود، ان کی مجاہدانہ کارنامے موجود اوران کی محبوبیت موجود۔ اس لئے پسماندوں کے لئے جہاں حسی جدائی ایک مصیبت عظیمہ ہے۔ وہیں ان کی معنوی معیت وجہ سکون وقرار بھی ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے باوجود صد ہزار غم کسی مایوسی کا موقع نہیں ہے، ان کی معنویت موجود، اس سے استفادہ اوراس کا افادہ رفیق راہ بن سکتا ہے۔ دل کی تسلی کے لئے سب سے بڑی چیز قرآن حکیم ہے جو زبانوں پر جاری ہو کر دلوں کے لئے وجہ قرار و تسلی ہوگا۔ اور ایصال ثواب کے ذریعے حضرت مرحوم کے لئے وجہ سرور وانبساط ہوگا۔ اس لئے صدمہ رسیدہ قلوب اپنے اوران کے حق میں سکون وراحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس دنیا سے گذر جانے والا کتنی ہی بڑی شخصیت ہو پھر بھی اسے اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے آس بندھی رہتی ہے کہ کون اس کو دعاء وایصال ثواب میں یاد رکھتا ہے، اس لئے غم غلط کرنے اور حضرت اقدس کی آس کو پورا کرنے کا طریقہ غم محض یا غم کو لے کر بیٹھ جانا نہیں ہو سکتا بلکہ غم کو غلط کر کے ان مقاصد کے لئے کمر بستہ رہنا اور کام میں لگ جانا ہی ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہ، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مراتب ودرجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں انہیں مقام بلند عطا فرمائے اور وابستگان کو صبر جمیل، اجر جزیل اور ذوق تعمیل عطاء فرمائے۔

یہ چند منتشر سطریں حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی مناقب سرائی کے لئے نہیں لکھی گئیں کہ ان سطروں میں ان کے مناقب کب آسکتے تھے، بلکہ محض غم اور دل کو ہلکا کرنے اور ساتھ ہی ایک مقدس ہستی کے ذکر اور یاد سے ''اُذْکُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ'' کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس اور دینی اداروں میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے گا اور حضرت مرحوم کی اس آخری خدمت میں کسی قسم کا دریغ روا نہ رکھا جائے گا۔ (وَھُوَ الْبَاقِیْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ)

انٹرویو

قندیل راہنمائی......انسانی عظمت کی تعریف اور تعبیر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔کوئی دولت مند آدمی کو بڑا مانتا ہے، کسی کے نزدیک سیاست دان اور ارباب اقتدار بڑے آدمی ہوتے ہیں۔تو کوئی بڑی بڑی علمی ڈگریاں اور فنی ڈپلومے حاصل کرنے والوں کو بڑا سمجھتا ہے۔غرضیکہ ہر شخص اپنی ذہنی استعداد کے مطابق عظمت کی کسوٹیاں (معیار) بناتا ہے، لیکن بڑائی کا جو معیار مولانا قاری محمد طیب کو دیکھ کر دستیاب ہوتا ہے وہ اتنا جامع اور واضح ہے کہ اس کے بعد عظمت کا مفہوم تشریح طلب نہیں رہتا اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ خدائے ذوالجلال سے جو شخص جتنا قریب ہوگا وہ اتنا ہی بڑا انسان ہوگا۔کیوں کہ اس کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو سب سے بڑی لاثانی اور لافانی ہے۔

قاری محمد طیب عشق الٰہی کی تصویر اور خلق خدا کی ہدایت کے لئے راہنمائی کا نور ہیں۔وہ علم وعمل کا جیتا جاگتا پیکر ہیں۔دینی علوم پر ان کی نظر عالمانہ ہی نہیں محرمانہ بھی ہے۔انہیں قدرت نے قرآن فہمی کی غیر معمولی استعداد بخشی ہے۔علم حدیث میں ان کے ادراک کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔تاریخ کی دھوپ چھاؤں سے اچھی طرح آگاہ ہیں، زمانے اور زندگی کا ہر اتار چڑھاؤ جانتے ہیں اور قدیم وجدید کا ہر تیور پہچانتے ہیں۔خطابت ان کی لونڈی ہے، لاکھوں کے مجمع میں بولتے ہیں تو پورا مجمع خاموش ہو کر یوں گوش برآواز ہو جاتا ہے جیسے دور دور تک کوئی متنفس موجود نہ ہو۔کوئی سا موضوع ہو وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے بے تکان تقریر کرتے ہیں اور فکر ونظر کے دریچے کھولتے چلے جاتے ہیں۔

یہی محاسن ہیں جن کی بدولت وہ محض دارالعلوم دیوبند ہی کے لئے نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے قندیل راہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1......اسلام پاکستان کی تقدیر ہے۔ 2......پاکستان اسلام کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

3......اسلام ہی زندگی کا وہ واحد اور کامل دستور ہے جو پورے اعتماد سے ہمارے مادی اور روحانی تقاضے پورے کرتا ہے۔

جب تک اسلام نافذ نہیں ہوگا ہم زبوں حال رہیں گے

نفاذ اسلام کا مرحلۂ ترتیب......یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے خیالات کا اظہار بڑی مدت سے سب ہی

مسلسل کرتے چلے آرہے ہیں۔اصل سوال یہ ہے کہ اسلام کس طرح اور کس مرحلہ وار ترتیب سے نافذ ہو؟ یہ آج کے دور کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔خوش قسمتی سے قاری محمد طیب گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے تو خیال گزرا کہ متذکرہ بالا سوال پر ان کے علم ونظر سے استفادہ کیا جائے۔

یہ خواہش ہمیں کشاں کشاں قاری صاحب تک لئے گئی۔وہ ملتان روڈ کے ایک مکان پر تشریف فرما تھے۔ آس پاس بہت سے عقیدت مند بیٹھے تھے۔میں نے قاری صاحب سے اپنا مدعا عرض کیا تو بڑی شفقت اور بے تکلفی سے میرے سوالوں کا جواب مرحمت فرمانے لگے۔اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں فرمایا:"فی زمانہ اسلام کے نفاذ کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔(۱) اجتماعی سطح پر حکومت وقت قدم اٹھائے، مروجہ قوانین کا جائزہ لے اور وہ تمام قوانین یک قلم منسوخ کردے جو قرآن وسنّت کے منافی یا ان سے متحارب ہوں، مزید برآں ایسے قوانین بنائے جائیں جن کا مقصد کلی طور پر دین کا نفاذ اور اس پر عملدار آمد ہو۔ (۲) انفرادی سطح پر تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کی جلوہ گاہ بنائیں۔نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام الٰہی پر دل کی گہرائیوں سے کار بند ہوں۔رہن، سہن، شادی، بیاہ، خوشی، غمی، خرید وفروخت، لین دین، غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں انہی احکام کی پابندی کریں، جن کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے اور ان چیزوں سے باز رہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے"۔

علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت......ان دونوں امور کی تشریح کرتے ہوئے قاری صاحب نے بتایا کہ اسلام کی بنیاد علم پر ہے، اس لئے پہلی اور فوری ضرورت یہ ہے کہ دینی علوم کو اس قدر عام اور سہل الحصول بنا دیا جائے کہ کوئی بھی دین سے ناآشنا نہ رہے۔ضروری نہیں کہ ہر شخص عالم فاضل ہی بنے۔تاہم یہ ضروری ہے کہ دینی فرائض کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو بھرپور معلومات ہونی چاہئیں، اگر کوئی کسی معاملے کے بارے میں علم نہیں رکھتا تو وہ اہل علم سے رجوع کرے اور درپیش معاملے میں رہنمائی حاصل کرے۔

قرآن کریم کے سترہویں پارے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ﴿فَسْئَلُوْآ اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.﴾ ① "اگر تم نہیں جانتے تو اہل دانش سے دریافت کرو"۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ لگن پیدا کی جائے کہ وہ دینی علوم سیکھیں، جب دلوں میں یہ لگن پیدا ہو جائے گی تو وہ یقیناً عالمان دین سے رجوع کریں گے۔جب وہ دینی تقاضوں سے آگاہی حاصل کرلیں گے تو اس کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔اس طرح ماحول اور معاشرے میں خود بخود اصلاح کے رجحانات پیدا ہوں گے اور یہی رجحانات فلاحی برگ وبار لائیں گے۔خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا طرز عمل یہی تھا۔وہ جس چیز کے بارے میں لاعلم ہوتے تھے اس کا ایک

① پارہ:۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ:۷۔

ایک پہلو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرتے تھے اور پھر اسے حرزِ جان (عزیز سمجھنا) بنالیتے تھے۔

قاری صاحب نے فرمایا کہ: یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ماحول ٹھیک نہیں کیا جائے گا اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہیں ہوگا اور ماحول اسی صورت میں سنور سکتا ہے جبکہ پوری قوت اور مکمل فرض شناسی سے کام کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ماحول بہتر بنانے کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہئے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اصلاح اور دین پر عمل پیرا ہونے کا کام اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کرے۔

کسی محلے میں اگر ایک گھر عملاً اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بن جائے تو وہ گھر چراغ راہ ہو جاتا ہے جس کی کرنیں پڑوس کے گھروں کو بھی منور کرنے لگتی ہیں۔ سعادت اور فلاح کے دیئے اس طرح دھیرے دھیرے جلتے ہیں۔ جب ایک گھر میں اسلامی تعلیمات کی برکتیں جلوہ گر ہوں گی تو دوسرے گھرانے اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے یوں گلی گلی، محلے محلے، قریہ قریہ اور شہر در شہر دین کا اجالا پھیلتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ پورا ماحول اور معاشرہ دینی رنگ میں ڈھل کر بقعہ نور بن جائے گا۔

نفاذ اسلام کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری...... قاری صاحب نے بتایا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ہر چیز کی ذمہ داری حکومت وقت کے کندھوں پر ڈال دینا درست نہیں۔ نجی گھریلو، اور خاندانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا انقلاب لانا ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے جس میں کوئی خلل اندازی نہیں کر سکتا۔ اگر ہر فرد اپنی ذات اور خاندان میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ اٹل کر لے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے یا اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ لہٰذا اسلام کے عملی نفاذ کی پہلی اور بنیادی ذمہ داری فرد پر ہے۔

قاری صاحب نے کہا کہ آج کل ایک افسوسناک حالت یہ ہے کہ:

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

لوگ خود تو نیک عمل کرتے نہیں البتہ دوسروں کو نصیحت کرنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں، نیک عمل سے گریز مگر نیکی کی زبانی تبلیغ کار بے خیر ہے۔ کیوں کہ قول مؤثر نہیں ہوتا، اصل اور مؤثر قوت عمل ہے، صرف عمل۔

لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ پہلے وہ اسلامی معاشرت، اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کا علم حاصل کرے اور پھر اس کا عملی نمونہ بن جائے۔ اکل حلال کو اپنی زندگی کے لئے لازم جانے اور حرام کی کمائی سے دور بھاگے۔ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آپ ہی آپ ہموار ہوتی چلی جائے گی اور جب مسلمان اچھی طرح دینی رنگ میں ڈھل جائیں گے تو پھر حکومت کا کام معمولی رہ جائے گا۔

انفرادی زندگی میں اسلام کے نفاذ کے لئے حکومت ہی سے ہر مطالبہ کرنا سراسر غیر ضروری ہے۔ حکومت تو صرف اجتماعی سطح پر دین کے نفاذ کا اقدام یا اہتمام کر سکتی ہے۔ اولین ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو دینی معاشرت کا سچا نمونہ بنالیں۔

نفاذ اسلام میں حکومت کا کردار...... جہاں تک اجتماعی سطح پر حکومت کے کردار کا تعلق ہے۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ قانون سازی کا سرچشمہ صرف قرآن اور سنّت کو ٹھہرایا جائے، عوام قانون پر چلتے ہیں۔ لہٰذا ایسا کوئی قانون نہ تو برقرار رہنا چاہئے اور نہ ہی آئندہ بننا چاہئے جو منکرات پر مبنی ہو یا قرآن وسنّت کے احکام کی نفی کرتا ہو۔

ثانیاً حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس کے ابتدائی مدارج میں دینی عقائد، اخلاق اور معاملات کی کماحقہ تعلیم دی جائے۔ پرائمری اور ہائی اسکولوں میں طلباء کو وہ دعائیں اور ان کا مفہوم یاد کرایا جائے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔ اگر ہر بچے کو ایک ایک دعاء چار چار روز میں بھی یاد کرائی جائے تو چھ مہینے میں وہ ساری دعائیں اچھی طرح یاد کرلے گا۔ ان دعاؤں کی پہلی اور لازمی برکت یہ ہوگی کہ عملی توحید کا رنگ قائم ہوجائے گا اور ہماری نئی پود کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ شروع ہی سے راسخ ہوجائے گا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے یہ چیز اساسی اہمیت کی حامل ہے۔

بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطۂ نظر...... اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ: اسلام، انسان کی بنیادی ضرورتوں کا مکمل حل پیش کرتا ہے، شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''البدر'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: زندگی بسر کرنے کے لئے تین چیزیں لازمادرکار ہیں۔

1 کسرۂ خبز۔ روٹی کا ٹکڑا۔ **2** قطعۂ ثوب۔ بدن ڈھانپنے کا کپڑا۔ **3** قطعۂ ارض۔ رہنے کے لئے زمین کا ٹکڑا۔

اسلام کسی فرد کو اس کی بنیادی زندگی کی ضروریات سے محروم نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو رزق رسانی کے سلسلے میں اسلامی نظام کا حال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کمر پر غلے کی بوری لاد کر ضرورت مندوں کے جھونپڑوں تک پہنچایا کرتے تھے، جہاں تک کامل مساوات کا تعلق ہے تو وہ ایک غیر فطری چیز ہے۔ اسلام توازن اور اعتدال کا دین ہے۔ وہ کسی کا حد سے زیادہ امیر یا حد سے زیادہ غریب ہونا پسند نہیں کرتا، اس سلسلے میں اسلام کی غرض وغایت یہ ہے کہ جو لوگ دولت کے اعتبار سے بہت بلندی پر ہیں انھیں کچھ نیچے اتارا جائے اور جو مفلوک الحال انتہائی پستیوں میں ہیں انہیں کچھ اوپر اٹھایا جائے اس طرح توازن اور اعتدال کی فضاء قائم کی جائے۔

اتحادِ مسلم...... مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی ضرورت واہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ''مسلمانوں کے تمام فرقوں میں گہرا اتحاد بے حد ضروری ہے۔ ضمنی اختلافات کے باعث مسلمانوں کا آپس میں کوئی رنجش رکھنا سخت افسوسناک اور بے جواز چیز ہے۔ کیوں کہ ہمارا دین ہمیں جڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کٹنے اور بچھڑنے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں وحدت کے اسباب بے پناہ ہیں۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ آپس میں مقابلہ ومجادلہ نہ کرو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر فرقہ مثبت اور معروف پہلو پر اکٹھا ہوجائے اور ملت اسلامیہ کے مشترکہ مشن میں تعاون کرے۔ جہاں تک تمام فرقوں کے اپنے اپنے جداگانہ

لیکن ضمنی پہلوؤں کا تعلق ہے وہ ان پر اپنی اپنی حدود میں عمل پیرارہ کر بھی مضبوط دینی وحدت بن سکتے ہیں۔اس کے لئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ منفی اندازِ فکر ترک کر کے تکفیر کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی فراخدلی اور وسعت قلبی کا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ سرداران قریش کی تکریم کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیا کرتے تھے، جب ہمارے آقائے نامدار کا یہ سلوک کفار کے ساتھ تھا تو ہمارا اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہئے وہ محتاج وضاحت نہیں''۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کے حالیہ اقدامات کے بارے میں استفسار پر قاری صاحب نے کہا کہ: جو شخص یا جو حکومت اسلام کے عملی نفاذ کا اہتمام کرے گی وہ ہر حال میں قابل تکریم قرار پائے گی۔

اکابر دیوبند کا مشن...... مزید فرمایا کہ: دین کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ مجھ سے اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرے'' مزید فرمایا کہ اکابر دیوبند کا مسلک اور مشن یہی تھا، جس کے لئے وہ مدت العمر کوشاں رہے۔حتیٰ کہ انہوں نے اپنی جانیں اس مشن کی خاطر کھپادیں''۔

ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر...... ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں قاری صاحب نے بتایا کہ دینی غلبے اور اسلامی حمیت کے لحاظ سے وہ روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ان کی آواز میں یکسانیت اور خود اعتمادی کا لہجہ نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ مسلمانوں کے اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ سابق بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی صاف صاف یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوگئیں کہ ہم مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کریں گے۔بات مزید آگے بڑھی تو انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اہل پاکستان کی ترقی اور فلاح کے لئے دعا گو ہیں۔

پاکستان کے مسلمانوں سے ان کی محبت قدرتی ہے،اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بحیثیت ملت اسلامیہ مسلمانانِ ہند پورے عالم اسلام کے لئے دردمندی کے جذبات رکھتے ہیں اور پاکستان عالم اسلام کا ایک اہم ملک ہے۔ پاکستان سے ان کی محبت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ادھر اور ادھر دونوں طرف ایک دوسرے کے رشتہ دار شروع ہی سے موجود ہیں۔اس لحاظ سے وہ اپنے بھائیوں کی خوشحالی کی دعاء مانگتے رہتے ہیں، پھر پاکستان کے لئے ان کی خیر اندیشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نہایت قریبی ہمسائے ہیں اور دو آزاد اور خود مختار ہمسایہ ممالک کو جس انداز اور اخلاق سے رہنا چاہئے۔اس کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات تازہ اور بیدار رکھیں۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور قیام پاکستان...... شاید بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قاری صاحب اپنے عظیم مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اندازِ فکر کی پیروی میں قیام پاکستان کے حامی تھے۔ماضی کی کچھ باتیں چھیڑیں، تو راقم نے مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام کے

سیاسی افکار کا تذکرہ کیا اور قاری صاحب سے عرض کیا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ اپنی دینی وجاہت اور جہاد حریت کے باعث ہمارے ماضی کی رونق ہیں۔لیکن یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں قیام پاکستان کے خلاف تھیں۔آخر کیوں؟

اس پر قاری صاحب نے فرمایا کہ: فکری اور نظری اختلاف کسی بھی معاملے پر ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ قیام پاکستان کے حق میں نہ تھے۔تاہم جب پاکستان بن گیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب پاکستان کو مضبوط بنایا جائے۔حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو تو اس کے بارے میں اختلافات ہوسکتے ہیں۔اس کی ساخت بناوٹ اور موقع محل پر مختلف آرا ہوسکتی ہیں لیکن جب مسجد تعمیر ہو جائے تو پھر اس کی تقدیس کا خیال ہر دم لازم ہے۔ پھر مسجد کے بنانے یا نہ بنانے پر بحث نہیں کی جاسکتی یہی حال قیام پاکستان کا ہے۔حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب چونکہ پاکستان قائم ہوگیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میری رائے کا اختلاف بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی ختم ہوگیا تھا۔اب خدا تعالیٰ پاکستان کو مستحکم اور خوشحال بنائے۔

مولانا آزاد مرحوم اور پاکستان......مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ بٹوارے کے بعد پاکستان کے لئے کیا جذبات رکھتے تھے؟اس سلسلے میں قاری صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی معرفت پیغام ملا کر مولانا ابوالکلام مجھے یاد فرمارہے ہیں۔ میں دہلی پہنچا اور سیدھا ان کے دفتر گیا۔مولانا اپنے روایتی اخلاق کے مطابق نہایت تپاک سے پیش آئے۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کیوں یاد فرمایا؟انہوں نے فرمایا کہ اب پاکستان قائم ہوچکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھے اور لائق لوگ پاکستان چلے جائیں اور اس نوزائیدہ مملکت کا نظام سنبھال کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

اتنا فرمانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میں بخوشی آپ کو بھجوانے کا انتظام کرسکتا ہوں۔اس بارے میں آپ کو بلاجھجک اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہیے۔لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ اس سلسلے میں خفیہ طور پر پاکستانی ہائی کمشنر سے ملاقاتیں کی جائیں۔

قاری صاحب نے کہا کہ مولانا مرحوم کی یہ باتیں سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور ان سے کہا کہ یہ قطعی غلط اور جھوٹا الزام ہے۔اس پر مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ سوچ میں ڈوب گئے میں نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی نے حکومت کو ہمارے بارے میں جان بوجھ کر یا نادانستگی میں غلط اطلاع دی ہے۔اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے چندہ جمع کرنے والے سفیر چندہ کے سلسلہ میں پاکستان جانا چاہتے تھے۔اور اسی ضمن میں انہوں نے ہائی کمشنر سے رابطہ بھی قائم کیا تھا۔سی آئی ڈی والوں نے اس بات کو زیب داستان کے لئے بڑھایا اور یہ افسانہ بنا ڈالا کہ میں پاکستان منتقل ہونا چاہتا ہوں۔

قاری صاحب نے کہا کہ جب یہ حقیقت مولانا کے علم میں آئی تو وہ بہت متاسف ہوئے اور انٹیلی جنس کے

عملے پر بڑا ملال ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ یہی سی آئی ڈی کے جھوٹے لوگ تھے۔ جو ہمارے بارے میں بھی انگریزوں کو غلط اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

خدا حافظ...... قاری صاحب باتوں باتوں میں فکر ونظر اور علم وخبر کی پھول لٹا رہے تھے، خاصا وقت بیت چکا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی پھیلتی چلی جا رہی تھی راقم نے اجازت چاہی تو انہوں نے شفقت ومرحمت کے ایک نادر لمس کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور گراں قدر دعائیں دے کر خدا حافظ کہا اور میں یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ قاری صاحب ۸۶ برس کے لیل و نہار دیکھ چکے ہیں۔ خدا ایسی عظیم اور فیض رساں شخصیتوں کو تادیر زندہ اور باعث برکت بنائے رکھے۔ (آمین)

از: شاعر شیریں مقال

جناب انور صابری (مرحوم)

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب ''قدس اللہ سرّہٗ العزیز''

حیات تیری نئے جہاں میں وقار بخش علوم نو ہے
تری جبیں پر جبینِ قاسم کی دل نواز وحسین ضو ہے

تری صدا کو بصیرتوں کی فضا کا الہام کر دیا ہے
''حکیم الامّت'' نے ایک نظر میں حکیم الاسلام کر دیا ہے

خدا کے فضل وکرم سے دین کا مقام محمود مل گیا ہے
تو ہے وہ غنچہ جو زندگی کی خزاں سے ٹکرا کے کھل گیا ہے

ترے تفکر میں قرن اول کی عظمتوں کا نشان ملے گا
تری خطابت میں عبرتوں کا تصور جاوداں ملے گا

مری نظر میں نئے زمانے کا فخر مصر وحجاز تو ہے
کیا جسے منکشف مشیت نے وہ حقیقت کا راز تو ہے

رشید کے باغ آرزو کا نگاہ افروز پھول تو ہے
ملا دوام بہار جس کو گل ریاض رسول تو ہے

فریضہ حج کے بعد اپنے وطن میں باعز وشان آیا
لئے ہوئے دل میں معرفت کا تخیل نوجوان آیا

جہاں گیا تو وہیں اکابر کا رنگ اعزاز دیں بڑھایا
رہے گا تا عمر تیرے سر پہ خدا کی رحمت کا خاص سایہ

حوادثِ دہر تیری شہرت نہ زندگی بھر مٹا سکیں گے
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ

جلد — ۹

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشرز۔ کراچی۔ پاکستان

اساسی عبادات

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُفَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.٥

بنیادی عبادات...... بزرگانِ محترم! اسلام میں بنیادی طور پر عبادتیں، دو ہی ہیں۔ جن پر پورے اسلام کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، ایک نماز، دوسرے حج۔ وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی لامحدود صفاتِ کمال کو اگر اصول طور پر سمیٹا جائے تو دو ہی نوعوں میں سمٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک صفاتِ جمال اور دوسرے صفاتِ جلال۔

منشاءِ عبادات...... صفات جمال مہر ولطف کی صفات ہیں جیسے رحمت ورأفت، عفو وکرم، حلم وصبر، خلاقی ورزاقی، نگہداشت وحفاظت، راہنمائی وہدایت، ستاری ومغفرت، جود وعطاء، انعام واحسان، نصرت واعانت وغیرہ اور صفات جلال قہری صفتیں ہیں جیسے قہر وغضب، جبر وتشدد، مواخذہ وانتقام، غلبہ واستیلاء، عزت وجبروت، مالکیت و ملکیت، حکومت حاکمیت، سلب ومنع وغیرہ۔ قرآن حکیم نے حق تعالیٰ کی ان دونوں شانوں کی طرف جن کے نیچے یہ دونوعیں آئی ہوئیں ہیں، ان جامع اور معجزانہ الفاظ میں ارشارہ فرمایا ہے ﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِى الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ ① جلال کے نیچے قہری صفتیں آجاتی ہیں اور اکرام کے نیچے مہری صفات رہتی ہیں۔ ایک جگہ صراحت کے ساتھ ان دونوں شانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ ﴿نَبِّئْ عِبَادِىْٓ اَنِّىْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ٥ وَاَنَّ عَذَابِىْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾ ②

ایک جگہ فرمایا ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِى الطَّوْلِ ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ③ ایک جگہ صفاتِ جمال کے افعال بیان فرمائے گئے کہ ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ

① پارہ: ۲۷، سورۃ الرحمن، الآیۃ: ۷۸. ② پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۴۹، ۵۰.

③ پارہ: ۲۴، سورۃ الغافر، الآیۃ: ۳.

جَمِيعًا ﴾ ① اور اسی کے آگے صفات جلال کے افعال کا تذکرہ فرمایا گیا کہ ﴿وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ ② اسی طرح ایک موقع پر صفات مہر کے تحت امیدیں باندھتے رہنے کا حکم دیا اور مایوسی ختم فرمادی کہ ﴿اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ③ ''بلاشبہ کفار ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں''۔ اور صفاتِ قہر کے تحت بے خوف ہوجانے سے روکا گیا کہ ﴿فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ ④ ''اور (آدمی) مطمئن نہ ہو بیٹھے اللہ کی مخفی تدبیر سے''۔

منشاء جلال و جمال...... ایک جگہ صفاتِ جلال اور صفاتِ جمال دونوں کے منشاء پر مطلع فرمایا گیا کہ صفاتِ قہر کے ظہور کا منشاء جرائم ہیں اور صفات مہر کے نزول کا منشاء ایمان ہے۔ ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ⑤ ایک جگہ اولاً شان رحمت کے تحت افعال خیر پر انعام کا ذکر فرمایا گیا اور آگے اسی کے ساتھ شان غضب کے تحت شر پر سزا و انتقام کا ذکر کیا گیا ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا﴾ ﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ ⑥ بہرحال صفات کمالات کی یہی دو بنیادی نوعیں ہیں جن کے نیچے تمام صفات ربانی آئی ہوئی ہیں۔ جلال و جمال اور مہر و قہر، صفاتِ جمال کا سرچشمہ رحمت ہے۔ اور صفات جلال کا سر منشاء غضب ہے۔ اسی لئے اس کی ذات بابرکات رحمٰن بھی ہے اور غضبان بھی۔ رحمت کی شان سے کرم فرماتا ہے۔ اور غضب کی شان سے تنبیہ و مواخذہ۔ ظاہر ہے کہ بندوں کو دونوں ہی کی ضرورت ہے کیونکہ مخلوق خیر و شر کے دو مادوں سے مرکب ہے، بندہ کی خیر رحمت خداوندی کو جذب کرتی ہے اور اس کا شر غضب الٰہی کو اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں نوعوں کے جمع ہوئے بغیر ربوبیت اور پال پرورش کا کارخانہ نہیں چل سکتا۔ ماں ایک طرف بچے کو پیار بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اسے گھور کر طمانچے بھی مارتی ہے کیونکہ نرم اور گرم دونوں کے جمع کرنے سے ہی تربیت ہوتی ہے۔ ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ ⑦ ''(اس کے دونوں ہاتھ، مہر کے بھی اور قہر کے بھی) کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہے صَرف فرمائے''۔

جلال و جمال کے آثار و لوازم...... یہ دونوں شانیں چونکہ ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اس لئے ان کے آثار و لوازم اور تقاضوں میں بھی یہی تقابل اور تضاد کی شان پائی جاتی ہے صفات جمال یعنی مہر و لطف کا قدرتی اثر انس و محبت اور گرویدگی و شیفتگی ہے کہ بندہ رام ہو جائے' جھک جائے اور الفت میں سرشار ہو جائے، محو ہو مٹا ہوا ہو، نہ اپنا ارادہ ہو نہ خواہش، نہ اپنی خبر نہ اپنے نام لگے ہوؤں کی پروا، سوختہ جانی ہو اور سوختہ روانی۔ ربودگی میں نہ اپنا باہر کا ہوش ہو اور نہ اندر کا جوش۔ مطمع نظر اور مقصدِ دل ہمہ وقت محبوب ہو اور اس کی ادائیں، اس کی طرف دوڑنا اور

---

① پارہ: ۲۴، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۵۳۔ ② پارہ: ۲۴، سورۃ الزمر، الآیۃ: ۵۴۔ ③ پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۸۷۔

④ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۹۹۔ ⑤ پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۴۷۔

⑥ پارہ: ۲۰، سورۃ النمل، الآیۃ: ۸۹، ۹۰۔ ⑦ پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۶۴۔

اسی کی طرف بھاگنا، سوتے جاگتے اس کا دھیان اور اس کے تصور میں محویت و سرشاری ہو۔ کہ صفات جمال کا یہی قدرتی تقاضا ہے اور صفات جلال یعنی قہر و غضب کا قدرتی اثر رعب و ہیبت، فکر و مغلوبیت، سرنگونی اور سرافگنی ہے کہ بندہ خوفزدہ اور لرزاں و ترساں رہے، گردن جھکی ہوئی ہو، ناک نیچی ہو اور دربار شاہی (مسجد) میں حاضر ہو تو نگاہ اعضاء کا ادب پیش نظر ہو، زبان خاموش ہو، چال میں سکون و مسکنت ہو، چہرے سے خوف و خشیت نمایاں ہو، ادب سے دایاں قدم پہلے ہو اور بایاں پیچھے، قیام دست بستہ ہو، ہاتھ بندھے ہوئے ہوں، نشست ہو تو دوزانو ہو، کھڑا ہونا اور چلنا ہو تو سکون و تواضع سے ہو، نہ دوڑنا، بھاگنا، لپکنا، نہ تھرکنا، سکینت و متانت میں ہمہ وقت غرق اور جوش کے ساتھ ہوش میں ہو، ہر آن محو و مستغرق، غرض ہر نقل و حرکت اور ہیئت و وضع میں ادب و خاکساری، ذلت و انکساری اور عجز و نیاز مندی رچی ہوئی ہو۔

خلاصہ یہ کہ صفات قہر جلال چاہتی ہیں کہ اللہ کے بندے اس کے سامنے خوف و خشیت اور مرعوبیت کے ساتھ نیازمندانہ حاضر ہوں جن کے روئیں روئیں سے بندگی و مسکنت، غلامی و محکومی اور تمام ضوابط حکومت کی عاقلانہ پابندی ٹپکتی ہو اور صفات مہر و جمال چاہتی ہیں کہ خدا کے بندے اس کے سامنے انس و محبت، فنائیت و محویت اور استغراق و استہلاک کے ساتھ حاضر ہوں، جن کی ہر ایک نقل و حرکت سے ربودگی، خودگزاری از خودرفتگی، ذوق و شوق اور تسلیم و رضا، عاشقانہ انداز سے نمایاں ہو، پہلی صورت مہذب اور باادب محکوم کی ہے۔ دوسری صورت ایک از خود رفتہ اور از خودگزشتہ عاشق کی ہے یعنی ایک شان کے نیچے آدمی عاشق فناپسند ہوتا ہے۔ ایک کے نیچے عاقل فکرمند اس لئے اللہ کی ان دونوں صفات (جلال و جمال) کے تقاضوں سے انسان پر دو ہی قسم کی عبادتیں فرض ہوئیں۔ صفات جلال کے تحت اظہار عجز و نیاز اور مظاہرہ ذلت و مسکنت کی عبادت رکھی گئی جس کی صورت نماز ہے۔ اور صفاتِ جمال کے تحت اظہارِ عشق و محبت اور مظاہرہ محویت و فنائیت کی عبادت فرض ہوئی جس کی صورت حج ہے۔

نماز شان کبریائی کا مظہر...... چنانچہ نماز کے ایک ایک عمل سے اپنی ہی فدویت و عبدیت، لجاجت و سماجت اور مرعوبیت و ہیبت زدگی نمایاں کی جاتی ہے جس میں فکر و عقل کے ساتھ ادب و شائستگی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ ابتداء نماز ہی سے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بیزار ہونا اور اس کے ساتھ اپنے حاکم مطلق اور بادشاہ عالمین کی بڑائی کا اعلان کرنا ہے جس کا نام تکبیر تحریمہ ہے۔ پھر چاکروں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا جس کا نام قیام ہے۔ پھر ذلیلوں کی طرح سر کو جھکا دینا جس کا نام رکوع ہے پھر انتہائی پستی کے ساتھ ہاتھ، ناک اور پیشانی زمین پر ٹیک دینا جس کا نام سجدہ ہے۔

پھر انتہاء ادب و تعظیم کے ساتھ اس کی یکتائی کی شہادت دینا جس کا نام تشہد ہے۔ پھر انتہائی بے بسی اور محتاجگی کے ساتھ اسے پکارنا جس کا نام استغاثہ و فریاد ہے۔ پھر کمال ضعف و بے زوری اور انتہائی خوشامد کے ساتھ بھیک مانگنا جس کا نام دعا ہے پھر انتہائی تعلق و نیازمندی کے ساتھ اس کے نائبوں اور خلفاء (انبیاء و اولیاء) تک پر

صلوٰۃ وسلام بھیجنا جس کا نام درود اور صلوٰۃ وسلام ہے۔ پھر انتہائی عقیدت و نیاز سے حاضرین دربار (شرکاء جماعت اور ملائکہ) کو دوطرفہ سلام دے کر رخصت ہونا، جس کا نام تحلیل وتسلیم ہے وغیرہ وغیرہ، وہ عاجزانہ اور محکومانہ افعال ہیں جو بلحاظ حقیقت اللہ کی صفت حکومت و مالکیت اور حاکمیت و بادشاہت کا طبعی تقاضا ہیں۔ پس نماز اس کی شان کبریائی۔ اور شان جلال وحکمرانی کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بندہ میں خوف وخشیت کی تخم ریزی کرتی ہے جس سے وہ قانون الٰہی کی نافرمانی اور فواحش ومنکرات سے بچ کر مقرب بارگاہ بن جاتا ہے۔

حج، ذاتی محبوبیت کا مظہر...... ادھر حج کے ایک ایک رکن اور ایک ایک سنت وواجب سے عاشقی، محبت وانس اور محبوب پر مر مٹنے کا والہانہ اور شیدایانہ انداز سے ثبوت دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حج میں مشغول انسان کی عاشقانہ کیفیات اور از خود رفتگی کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے تن من دھن کی کچھ پروانہیں رہتی نہ کپڑوں کی خبر، نہ آرائش وزیبائش کی پروانہ وضعدار لباس نہ قطع وبرید کی بو پاس بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، لبیں پھیلی ہوئیں۔ رواں چکٹا ہوا، ننگے سر، ننگے پاؤں، کپڑے گرد آلود، بدن پر میل کچیل کی نمود، در محبوب پر سر بہ سجود، گھر سے بے گھر، تارک مال وزر نہ کھانے کی پروا، نہ پینے کی خبر، دل پر لذت نکاح کا اثر نہ تن پر آثار دولت وزر، نہ صفائی وستھرائی سے سروکار، نہ عطر وخوشبو کا روادار، نہ غسل کا دھیان نہ نظافت کا وہم وگمان، آثار محبت سے وارفتہ، گریہ وبُکا سے سوختہ۔ رسمی وقار سے دل گرفتہ، خانہ محبوب کے تصور میں ازخود رفتہ، حضوری ہوتو حاضر حاضر کہہ کر چلانا۔ غیبت ہوتو دم بخود ہو جانا اور محبوب سامنے آئے تو لپکنا، خانہ محبوب کے اردگرد چکر لگانا، در ودیوار کو چھونا، پردہ ہائے دیوار سے لپٹنا اور رونا کہیں شوق میں لپکنا، کہیں خوف سے تھمنا، کہیں ذوق سے دوڑنا کہیں رعب جمال سے رکنا، خدام محبوب نمایاں ہوں تو نعرہ مستانہ کے ساتھ سر جھکا دینا اور دشمنان محبوب کا تصور آئے تو اکڑنا اور سینہ تان لینا، تجلی محبوب نمایاں ہوتو سرنگوں ہو جانا اور دشمن محبوب (شیطان) کا مقام سامنے آجائے تو کنکر پتھر لے کر لپکنا اور مارنا، ہر لذت ہر زینت اور ہر رسمی صورت سے بیزار رہنا، کسی ایک جگہ قرار نہ پکڑنا، کوچہ ہائے محبوب کے در در کی خاک چھاننا، کبھی مکہ تو کبھی منیٰ، کبھی عرفات، کبھی مزدلفہ نہ چال میں سکوں، نہ انداز میں قرار کبھی یہاں اور کبھی وہاں۔ اپنے کو مٹا دینے کا جذبہ اور تن من دھن کو خاک میں ملا دینے کا داعیہ اور آخر فدائیت وجاں سپاری کی انتہا پر اپنے نفس کو بھی باذن محبوب فدیہ حیوان دے کر فدا کر دینا ذرا بھی کوتاہی ہو تو مال وزر دے کر خوشامد سے تلافی کرنا، وسیلہ محبوب کا دھیان آئے جس کی بدولت رسائی ممکن ہوتو سو جان سے وہاں حاضر ہونا، سلام کرنا، لجانا اور شوق وذوق سے عرض و معروض کر کے وسیلہ لینا وغیرہ وہ عاشقانہ افعال ہیں جو عشق ومحبت کے جذبہ میں فطرتاً عاشق سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی صفات جمال اور ذاتی محبوبیت کا مقتضا ہیں۔

حسنِ تعبیر...... ان میں سے ترک آسائش وآرائش اور ترک لذت وزیبائش کے مجموعہ کا نام احرام ہے خانہ محبوب کے اردگرد گھومنے کا نام طواف ہے۔ تصور اعداء کے موقعہ پر سینہ تان کر اکڑنے کا نام رمل ہے۔ ذوق وشوق میں

دوڑنے کا نام سعی ہے کوچہ ہائے محبوب کے دروں کی خاک چھاننے کے نام سیاحت حج ہے۔ خاک صحن پر ٹھہر کر گریہ وبکاء کرنے اور شوق وصال کے اظہار کا نام وقوف ہے۔ شیطان پر پتھر برسانے کا نام رمی ہے۔ اور فدیہ حیوان کے ذریعہ خود فدا ہو جانے کا نام نحر ہے ان میں سے کسی بھی عاشقانہ فعل میں فروگزاشت کا نام جنایت ہے۔ اور اس کے تدارک وتلافی کا نام صدقہ وکفارہ ہے۔ اور پھر افعال کے مجموعہ کا نام مناسک ہے۔ اور پھر وسیلہ محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار (مدینہ) میں حاضر ہو کر زیارت کرنے اور صلوۃ وسلام کے بعد ہزار خوشامد سے وسیلہ لینے کا نام زیارت وتوسل ہے۔

عجز وعشق کے مظاہر...... بہر حال پہلا مظاہرہ عجز ونیاز کا ہے جس کی صورت نماز ہے۔ اور دوسرا مظاہرہ عشق و محبت کا ہے جس کی صورت حج ہے۔ اس لئے یہ دو ہی عبادتیں اسلام کی اساس و بنیاد بنائی گئی ہیں۔ جب کہ تمام صفات خداوندی بھی دو نوعوں (جلال وجمال) میں سمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ کے حقوق کے ادائیگی انہی دو نوع صفات کے حقوق ادا کرنے سے ممکن تھی جن کی تشکیل کے لئے نماز اور حج کے افعال رکھے گئے۔ اس لئے اصولاً اسلام میں یہ دو ہی عبادتیں اصل ٹھہرتی ہیں کہ بلحاظ حقیقت ان کے سوا کوئی دوسری صورت عبادت کی ہے بھی نہیں، کہ عبادت کی متقاضی صفات کی نوعیں ہی یہ دو ہیں دو سے زائد نہیں۔

زکوٰۃ وروزہ کی حیثیت...... رہ گئی زکوٰۃ اور روزہ کہ عبادت انہیں بھی کہا گیا، بلکہ نماز وحج کی طرح مبانی اسلام میں شمار کرایا گیا ہے، سو بلاشبہ وہ عبادت ہیں اور اسلام کی اساسی ہی عبادت ہیں لیکن پھر بھی ان کے اور نماز حج کے عبادات ہونیکی نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہے غور کیا جائے تو زکوٰۃ اور روزہ خود اپنی ذات سے نہ عبادت ہے نہ اپنی ذات سے براہ راست مطلوب ہیں بلکہ نماز وحج کی خاطر مطلوب اور انہی کی بدولت عبادت بنی ہیں زکوٰۃ تو نماز کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت بنتی ہے اور روزہ حج کے تابع ہو کر اس کے وسیلہ کی حیثیت سے عبادت ہوتا ہے بالفاظ دیگر زکوٰۃ نماز کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور روزہ حج کے مبادی اور وسائل میں سے ہے اور وسیلہ چونکہ حکم میں مقصد ہی کے ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں بھی نماز وحج کی وجہ سے عبادت بنادی گئیں خود اپنی ذات سے عبادت نہیں ہیں۔

موانع نماز اور ان کا تدارک...... وجہ یہ ہے کہ نماز جیسی اہم عبادت میں اگر کوئی چیز حارج اور سدراہ ہے تو وہ سامان عیش اور وسائل عشرت ہیں جن کی لذتوں میں پڑ کر انسان میں نماز سے غفلت اور سستی وکسل پیدا ہوتا ہے اور آدمی جماعت سے ہی نہیں بلکہ نماز ہی سے بیگانہ ہو جاتا ہے کیونکہ نفس کی توجہ ایک آن میں دو طرف نہیں ہو سکتی ظاہر ہے کہ نفس کے مرغوبات جب نفس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے تو مرغوب روحانی کی طرف کیسے متوجہ ہو سکے گا؟ اس لئے اکثر وبیشتر امراء ہی نماز سے غافل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اردگرد جب اسباب عیش ونشاط اور لذات نفس کا ہجوم رہتا ہے تو انکے نفس کو طبعاً مسجد کی طرف دوڑنے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ نماز کی طرف رخ کریں،

البتہ غرباء قلیل العیش اور محروم الوسائل ہوتے ہیں اس لئے عموماً وہ تعیش سے فارغ رہتے ہیں تو ان کا فارغ نفس بھی بے تکلف نماز کی طرف دوڑ سکتا ہے۔

امراء نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

اس لئے شریعت نے مال وزر اور وسائل عیش وعشرت میں (جن میں لگ کر آدمی نماز اور مسجد سے غافل ہوتا ہے) توازن اور اعتدال پیدا کرنے اور انہیں کم کرنے اور دلوں سے ان کی محبت وشغف نکال دینے کے لئے زکوٰۃ و صدقات کی عبادت رکھی تا کہ مال دولت کو راہ خدا میں خرچ کرنے اور لٹانے کے علاقے سے انسانی نفس میں سے زر پرستی اور اس سے پیدا شدہ تعیش پسندی کے غیر معتدل جذبات نکل جائیں اور مال لٹانے کی سالانہ عبادت، پھر روز مرہ کے صدقات کی خوبیاں سے خود نفس کو بھی راہ خدا اور راہ عبادت میں لٹا دینے کے جذبات پیدا ہو جائیں۔

پھر چونکہ وسائل عیش کا تعلق صرف نقد وزر ہی سے نہیں بلکہ زمینی پیداوار اور پالتو جانور، سواریوں کے حیوانات، زرتار لباسوں، زریں برتنوں حتی کہ ہر تجارتی سامان سے ہے اس لئے شریعت نے زکوٰۃ کا دائرہ بھی صرف نقود سونا، چاندی اور دولت زر تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام وسائل عیش میں اپنی اپنی شرائط وحدود کے ساتھ زکوٰۃ رکھی، چنانچہ پالتو جانور، گھوڑے، اونٹ، گائے بھینس، بکری وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی۔ کھیتوں کی پیداوار وغیرہ میں زکوٰۃ رکھی جس کا نام عشر ہے معدنیات اور کانوں میں زکوۃ رکھی دفینہ اور ہاتھ آجانے والے خزانہ میں بھی زکوۃ رکھی جسکا نام خمس ہے، پھر ہر ایک مال تجارت پر زکوٰۃ رکھی خواہ وہ مٹی ہی کیوں نہ ہو۔ جس سے زر و مال بڑھنے اور اس کے بڑھنے سے وسائل عیش اور سامان راحت بڑھنے کا قدرتی تعلق ہے اور وہی تعلق نفس کو عیش پرستی میں مبتلا کر کے عبادت سے غافل اور بے تعلق بنا دیتا ہے، ظاہر ہے کہ جب رکاوٹ کے اسباب ہٹ جاتے ہیں تو شے وجود پذیر ہو جاتی ہے۔ پس جب راہ عبادت کا حارج یعنی زر و مال اور وسائل عیش وعشرت کو بہ صورت زکوٰۃ و صدقات راہ خدا میں فنا کر دینے کی عادت پڑ گئی اور دل میں ان کی رغبت میں شدت اور ہوس قائم نہ رہی تو نماز سے رکاوٹ ڈالنے والے اسباب ختم ہو گئے، اس لئے نماز آسان ہو گئی پس زکوٰۃ وصدقات درحقیقت نماز کو بروئے کار لانے کے لئے فرض کی گئی ہے، اس لیے وہ وسائل نماز میں سے ہوئی جو آدمی کو کھینچ تان کر نماز تک پہنچا دیتی ہیں اس لئے عبادت کی لائن میں نماز اصل ہوئی اور زکوٰۃ اس کے تابع ہو کر عبادت بنی جب کہ وسیلہ مقصود حکم میں مقصود ہی کے ہوتا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ زکوٰۃ مبادی نماز میں ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ملا کر ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ. اس انداز کی بکثرت آیتیں اس کی شاہد عدل ہیں۔

نماز کی تمہید...... یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کے پاس مال وزر نہ ہو اور وہ خود ہی نان شبینہ کا محتاج ہو تو اس پر زکوٰۃ کی فرضیت ہی نہیں حالانکہ نماز بدستور فرض رہتی ہے کیونکہ علاوہ تکلیف مالا یطاق کے یہاں زکوٰۃ کی ضرورت بھی نہیں

کیونکہ زکوٰۃ نماز کے موانع رفع کرنے کے لئے رکھی تھی، جب یہاں موانع صلوٰۃ ہی نہیں تو رفع موانع (زکوٰۃ) کی حاجت ہی کیا ہوسکتی ہے؟ چنانچہ اس قسم کے غریب مسکین انسان عام حالات میں نماز سے بھی بیگانہ نہیں ہوتے کیونکہ جب وسائل عیش ہی مفقود ہیں جو عبادت اور بالخصوص نماز میں حارج ہوتے تھے تو ایک بے زر اور بے پر آدمی طبعی طور پر خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور نماز میں کبھی سست نہیں ہوتا اسی لئے مسلم کو عام حالات میں زہد و قناعت کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ وہ جس قدر قلیل العیش ہوگا، اسی قدر طاعت و عبادت کی طرف رخ کئے ہوئے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی اسے زکوٰۃ سے بیگانہ بنانے کے ہوئے، اگر زکوٰۃ بذاتہ مقصود ہوتی تو بجائے زہد و قناعت کے تمول اور تکاثر مال کی ترغیب دی جاتی بہر حال دولت ہو تو اس پر اندرون حدود زکوٰۃ و صدقات کے احکام عائد ہو کر اسے قلیل العیش بنا دیتے ہیں اور نہ ہو تو اس پر احکام زکوٰۃ و صدقات اس لیے لاگو نہیں ہوتے وہ پہلے ہی قلیل العیش ہے۔ اس لئے ان دونوں ہی صورتوں میں آدمی اپنے مقصد تخلیق (عبادت) کی طرف توجہ کئے ہوتا ہے جس سے واضح ہے کہ دولت و مال چونکہ راہ عبادت میں حارج ہوتا ہے اور اس کے نہ ہونے یا کم ہونے کی صورت میں کارخانہ عبادت میں خلل نہیں پڑتا۔

اس لئے زہد و قناعت اور مال کو لٹانے یا گھٹانے کی ترغیبیں دی گئیں جس سے زکوٰۃ کا وسیلۂ عبادت اور بالخصوص وسیلۂ نماز ہونا نمایاں ہے۔ اور ثابت ہو جاتا کہ حقیقی عبادت اگر ہے تو وہ نماز ہی ہے جس کے بغیر تعلق مع اللہ پیدا نہیں ہوسکتا اور زکوٰۃ اس کا وسیلہ اور اسے بروئے کار لانے کی ایک تمہید ہے خود اصل نہیں۔

موانع حج اور ان کا تدارک...... ادھر حج کی عاشقانہ عبادت چونکہ مظاہر محبت ہے اور محبت میں سب سے پہلی چیز ماسوا اور غیر محبوب کا ترک ہے ورنہ اگر عاشق غیر محبوب کی طرف مائل ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ محبوب کی طرف اس کا میلان یا سرے سے ہے ہی نہیں یا ہے تو کمزور ہے تو اسے عاشق ہی کیوں کہیں گے۔

پس ایک حج کرنے والے عاشق خداوندی کا پہلا قدم خدا کے ماسویٰ کو ترک کر دینا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ماسویٰ اللہ مرغوبات نفس ہی ہو سکتے ہیں۔ جن میں بڑا مرغوب جس سے انسان کا دل اٹکا ہوا رہتا ہے۔ وہ کھانا پینا اور عورت سے لذت حاصل کرنا ہے کہ دنیا کے سارے جھگڑے انہیں چند مرغوبات نفس کے لئے آدمی سر لیتا ہے ظاہر ہے کہ جب تک دل میں ان چیزوں سے شغف اور کمال رغبت باقی رہے گا۔ محبوب حقیقی (حق تعالیٰ شانہ) کا شغف و عشق اس دل میں کہاں سے جگہ پا سکے گا؟ اس لئے اس محبت و عشق کی عبادت یعنی حج کے ابتدائی مراحل میں ایک عاشق خداوندی کے لئے سب سے پہلے کھانے پینے اور بیوی کی لذت اٹھانے کے شغف اور غیر معمولی لگاؤ سے الگ رہنا قدرتاً ضروری ہو جاتا ہے۔

ورنہ عشق الٰہی کا مظاہر جسے حج کہتے ہیں شروع ہی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے شریعت نے حج کے مہینوں سے قبل متصلاً ہی رمضان کا مہینہ رکھا تاکہ تیس دن تک نفس کے ان اولین مرغوبات کھانا پینا اور لذت جماع کی غیر معمولی

خواہش کو روزہ کے ذریعے کم سے کم کر دیا جائے۔ پس مہینہ کے تیس دنوں میں دن بھر تو یہ لذتیں روزہ کے ذریعہ بالکل ہی چھڑا دی جاتی ہیں اور بھوک پیاس سے کمزوری لاحق ہو جانے سے رمضان کی راتوں میں بھی آدمی ان لذتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہتا ادھر راتوں میں تراویح اور تلاوت قرآن پاک کا شغل مقرر کر دیا گیا جس سے ان لذات کے لئے کچھ وقت بھی پورا نہیں ملتا کہ آدمی کا دل ان میں پھنسے اس لئے یوں کہنا چاہئے کہ پورے ایک ماہ تک ان لذتوں سے بیگانہ رکھ کر رمضان میں یہ بنیادی لذتیں چھڑا دی جاتی ہیں تا کہ ان مرغوبات نفس کی خواہش ابھری ہوئی نہ رہے بلکہ ان کی محبت و رغبت کا دھیان دب جائے اور آدمی ان سے بیگانہ ہو کر محبت حق کے مظاہرہ کے قابل ہو جائے۔

حکمتِ اعتکاف...... لیکن اس کے بعد بھی گھر بار کی محبت بدستور باقی رہتی تھی مکان کی آسائش اور گھریلو سامان کی محبت جوں کی توں قائم تھی۔ حالانکہ یہ بھی وہی ماسوی اللہ ہے جو محبت الٰہی میں خلل انداز ہوتی ہے۔ خواہ دوسرے ہی درجہ میں سہی، اس لئے رمضان کے بیس دن گزرنے کے بعد عشرۂ آخر میں اعتکاف کی سنت کے ذریعہ گھر بھی چھڑا دیا جاتا ہے تا کہ آدمی گھریلو زندگی چھوڑ کر خانہ خدا میں پہنچے اور رات دن وہیں بسر کرے اور اس طرح کھانے پینے اور لذت جماع سے بیگانگی کے بعد وہ گھریلو سامان سے بھی دستبردار ہو جائے اور اس طرح نفس کے اور دوسرے محبوبات بھی ترک کرنے کی اس میں استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے۔

خطابِ حج...... پس! ماہ رمضان میں ان بنیادی لذات کے ترک کر دینے کی مشق سے جب آدمی کا دل محبوب حقیقی کی طرف بڑھ گیا اور اس کی طرف دوڑنے کی اس میں قریبی استعداد پیدا ہو گئی تو رمضان ختم ہوتے ہی اشہر حج (حج کے مہینے) شروع ہو جاتے ہیں اور افعال حج کے آغاز کا وقت آ جاتا ہے کہ آدمی دیار محبوب کی طرف دوڑ پڑے گویا اس عاشق خداوندی کی طرف کھانے پینے بیوی بچوں اور گھر بار سے دل ہٹا لیا تھا۔ شرعی خطاب متوجہ ہوتا ہے کہ اس عشق کی راہ میں کھانا پینا بیوی اور گھر چھوڑ دینا کافی نہیں ہے، اب وطن بھی ترک کر دو اور دیار محبوب کی طرف کوچ کرو کہ وطن بھی ایک بڑا بت ہے جو راہ خدا میں حارج ہوتا ہے۔

حکمتِ احرام...... پھر یہ عاشق خداوندی جب وطن چھوڑ کر جنگلوں بیابانوں اور پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوا اور سمندروں کو عبور کرتا ہوا دیار محبوب میں داخل ہو گیا تو حرم الٰہی کی میقات آتے ہی محبوب حقیقی کا حکم یہ ملا کہ یہ کھانے پینے زن و فرزند گھر بار اور وطن و ملک کا چھوڑ دینا بھی اس راہ عشق میں کافی نہیں بلکہ لباس زینت بھی ترک کرو سلے ہوئے کپڑے بھی چھوڑو کہ اس لذت کا شغل بھی محبوب حقیقی کے وصال میں حارج اور عشق کی غیرت کے خلاف ہے۔ صرف تن ڈھانکنے کی حد تک احرام کی کفنی پر قناعت کرو، ایک چادر بدن کا نصف بالا ڈھانکنے کے لئے اور ایک چادر بدن کا نصف زیریں۔ چھپانے کے لئے ہو نہ سر پر ٹوپی اور عمامہ ہو جو سر کو ڈھانپ دے نہ پیر میں کوئی گھیرا جوتا جو پورا ڈھانپ لے تا کہ جیسے رمضان میں اس عشق الٰہی کا باطن گرویدہ محبت ہو چکا تھا، اب اس کا اظہار

بھی آثار عشق سے ہو جائے اور اس عاشق الٰہی کو عشق میں تن من دھن کی کوئی خبر نہ رہے۔

عاشقانہ بول...... لیکن اس ظاہر و باطن کے درمیان کی ایک چیز ابھی باقی تھی جو ابھی تک آثار عشق سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور وہ زبان ہے جو کسی حد تک ظاہر ہے اور کسی حد تک باطن یعنی ظاہر و باطن کے درمیان ایک برزخ ہے جو باطن کی تو ترجمان ہے اور ظاہر کی نگہبان ہے اس لئے ضرورت تھی کہ اسے بھی اس عشق سے حصہ ملے اور ظاہر ہے کہ زبان کا حصہ قول اور بول ہی کی شکل کا ہو سکتا تھا اس لیے اسے عاشقانہ بول دیا گیا کہ وہ قدم قدم پر خود اپنی ترجمانی کی بجائے محبوب حقیقی کی محبت کی ترجمانی کرے اس لئے احرام باندھتے ہی زبان کو لبیک لبیک کے کلمہ سے ذکر محبوب کا پابند بنایا جاتا ہے تاکہ زبان کے ذریعے نفس اور خواہشات نفس کی ترجمانی نہ ہو بلکہ حضوری حق کے جذبات کی ترجمانی ہو اور اس قینچی کی طرح چلنے والی زبان کے تقاضے آزاد نہ رہیں کہ وہ جتنا چاہئے اور جو چاہے بولتی رہے اس لئے عاشق کے ان ایام عشق میں ہر تغیر اور ہر موڑ پر لبیک کا نعرہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر نیچائی اونچائی ہر پہاڑ ہر غار ہر قافلہ ہر جماعت کی مڈ بھیڑ پر یہی عاشقانہ و والہانہ نعرہ زبان پر چھایا ہوا رہے کہ لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک پس اس طرح کی آزاد لذت بھی اس عاشق حق سے ترک کرادی گئی اور یہ عاشق اپنی زبان اپنے دل اور اپنے تمام تر اعضاء و جوارح سے صرف اپنے محبوب حقیقی ہی میں مشغول و منہمک ہو گیا۔

حکمتِ طواف...... اب جب کہ خانہ محبوب تک رسائی ہو گئی۔ آدمی مکہ محترمہ اور حرم محترم میں پہنچ گیا اور خانہ خدا کے سامنے آ گیا جس میں جمالات حق تجلی ریز ہیں تو پھر شرعی خطاب متوجہ ہوا کہ تم نے اب تک محبوبات نفس گھر بار وسائل عیش اور اسباب راحت و عیش کی خاطر بہت چکر لگائے تھے اب یہ چال اور چکر ان سب چیزوں سے ختم کر کے خانہ محبوب کے لیئے مختص کر دو اور عشق کی وارفتگیوں میں غرق ہو کر محبوب کے گھر کے اردگرد پروانوں کی طرح چکر لگاؤ ایک دو پھیروں سے نہیں بلکہ سات پھیرے پھر وجوفن حساب کی رو سے عدد زائد ہے اور کبھی گھٹنے والا نہیں پھر طواف بھی ایک دو بار نہیں بلکہ ان پاک ایام اور مکہ کے قیام کی اعلیٰ ترین عبادت ہی یہ چکر لگانا اور خانہ محبوب کے اردگرد گھومتے پھرتے رہنا ہے جس کا نام طواف ہے۔

حکمتِ وُقوفِ عرفات...... پھر مکہ کے مقدس شہر کا قیام گو وطن کا قیام نہیں مگر بہر حال شہر کا قیام ضرور ہے۔ اس میں وطن کی عمارتیں نہ سہی بلدِ الٰہی کی ہی سہی جو شہری زندگی کی ساری راحتیں لذتیں اور زینتیں لئے ہوئے ہیں اور عاشق کی شان غیرت کے یہ بھی خلاف تھا کہ عاشق کا دل عمارتوں اور سامان عیش و تمدن میں کسی بھی درجہ میں اٹکا رہے اس لئے اصل حج کے لئے جو حقیقی طور پر شان عشق کا مظاہرہ تھا ایام حج میں حکم یہ ملا کہ مکہ کی شہری آبادی بھی ترک کرو اور عرفات کے ریگستان میں ننگے سر ننگے پاؤں کفنی پہنے ہوئے پہنچو کہ اصل حج یہی ہے کہ ایک چٹیل میدان میں گھر بار بیوی بچے سامان تمدن اور وسائل عیش کی متقاضی ہوتی ہے بلکہ ایک کپڑے کا مسافر خانہ یعنی خیمہ ہو اور تم ہو۔ تاکہ اعلیٰ ترین ترک لذات کا مقام حاصل ہو جائے جو ایک عاشق کے لئے سزاوار واجبات عشق کے لئے درکار ہے۔

فدیۂ جان...... ہاں مگر پھر بھی سب تروک کے بعد عاشق کا نفس ابھی عاشق کے پاس ہی تھا جس کی رو سے وہ اپنے کو "انا" اور "میں" کہہ سکتا تھا۔ درانحالیکہ کمالِ عشق کے لئے یہ بھی ایک چیلنج ہے کہ عاشق اپنی ہستی کو برقرار رکھ کر بمقابلہ محبوب اس کا تصور بھی دل میں قائم رکھے۔ بلکہ اس کا آخری فریضہ یہ ہے کہ راہِ محبوب میں اپنے نفس کو بھی ایثار کردے اور اس ظاہری ہستی سے بھی سبکدوش ہو جائے تو خطابِ شرعی متوجہ ہوا کہ عرفات سے لوٹ کر منیٰ پہنچو اور اس کے قطعہ جاں سپاری میں پہنچ کر جسے منحر کہتے ہیں نثار ہونے کے لئے اپنی جان بھی پیش کردو، یعنی اسے بھی ترک کرنے کا عزم باندھ لو، اب یہ محبوبِ حقیقی کا لطف وکرم ہے کہ اس سچے عاشق کی طرف سے جس نے اپنی ساری زندگی کی تمام لذات اور آخر کار خود زندگی ہی کو پیش کردیا، قبول فرما کر اس کی جان کے بدلے قربانی کے جانور کی جان بطور فدیہ قبول فرمالے اور اس کے بعد پھر گھر لوٹ جانے اور متروکہ وسائل عیش سے لذت اندوز ہونے کی اجازت عطا فرمائے۔ اس لئے منیٰ میں قربانی کا حکم ہوا کہ جان کا فدیہ جان سے دیدو۔ یہ خود تمہارا اپنے نفس کا فدا ہونا ہی سمجھا جائے گا پس محبوب کے لئے آخر میں جان بھی پیش کردی جاتی ہے جو عشق کا انتہائی مقام ہے۔

مقدمۂ حج...... بہرحال اس سے واضح ہے کہ حج تروک کا مجموعہ ہے، ترکِ لذت، ترکِ زینت، ترکِ راحت خانہ ترکِ لباس ترکِ وطن ترکِ جاہ۔ اور ترکِ مال وغیرہ جس کی ابتداء کھانے پینے اور عورت اور گھر کے ترک کرنے سے ہوتی ہے، یہی دنیوی زندگی کی لذات کا اعظم ترین حصہ ہے بلکہ دوسری لذات کا سرچشمہ ہے، جسے اشہرِ حج سے قبل کے مہینے (رمضان) میں حج کی خاطر چھڑا دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کے تروک کی استعداد پیدا ہو جائے، اگر کھانے پینے اور بیوی۔ سے کنارہ کشی کی استعداد پیدا نہ کی جائے تو اگلے کسی ترک پر بھی آدمی مستعد اور آمادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے روزہ کی عبادت درحقیقت حج کا مقدمہ ثابت ہوتی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی عبادت نماز کا مقدمہ ثابت ہوئی تھی جس سے پوری طرح کھل جاتا ہے کہ اسلام میں اصل عبادتیں دو ہی ہیں نماز اور حج۔ ایک صفاتِ جلال کا تقاضا ہے اور ایک صفاتِ جمال کا اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے وسائل اور مبادی میں سے ہیں۔ جنہیں ان دو کی وجہ سے عبادت بنادیا گیا ہے۔ خود بذاتہ عبادت کے بارہ میں اصل نہیں ہیں۔

زکوٰۃ وروزہ "عبادت لغیرہ" ہیں...... یہی وجہ ہے کہ جہاں نماز اور حج میں وسائل دولت یا وسائل لذت کے حارج ہونے کا امکان نہ ہو وہاں نماز اور حج تو ہوگا مگر زکوٰۃ وروزہ کی عبادت نہ ہوگی جیسے ملائکہ کو نماز بھی دی گئی ہے وہ ہر وقت رکوع وسجود اور قیام میں ہیں اور حج بھی دیا گیا ہے۔ کہ وہ روزانہ ساتویں آسمان پر "بیت المعمور" کا حج اور طواف کرتے ہیں بلکہ ہر آسمان میں بیت المعمور کی سیدھ میں ایک ایک قبلہ ہے جس کا اس آسمان کے باشندے طواف کرتے ہیں مگر ملائکہ میں چونکہ نہ مال ودولت کا قصہ ہے نہ شہوت وزینت اور غضب کا کہ وہ نماز اور حج سے روکیں اس لئے انہیں نہ زکوٰۃ کا پابند کیا گیا نہ روزہ کا کہ وہ خود ہی پاک ہیں، پھر مال دلوا کر اور روزہ رکھوا کر انہیں پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس سے صاف نمایاں ہے زکوٰۃ اور روزہ درحقیقت نماز اور حج ہی کے لئے رکھا گیا

ہے اور یہ ان کے مبادی میں سے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ نفس کو پاک اور صالح بنا کر نماز اور حج کے لئے مستعد بنایا جائے پاکی اور صفائی پہلے سے حاصل ہے وہاں نماز اور حج تو قائم رہے زکوٰۃ اور روزہ درمیان میں سے نکال لیا گیا، اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نماز اور حج تو صفات الٰہیہ کا تقاضا ہیں۔ ایک صفات جلال کا اور ایک صفات جمال کا لیکن زکوٰۃ اور روزہ صفات نفس کا تقاضا ہیں کہ جب تک زکوٰۃ اور روزہ کے ذریعے انسانی نفس کو پاک نہ کیا جائے وہ نماز اور حج کے قابل نہیں بنتا اور ظاہر ہے کہ حقیقی معنی میں عبادت وہی ہوتی ہے جس کا تقاضا معبود کی صفات کریں نہ کہ وہ جن کا تقاضا خود عابد کی صفات کریں، گو معبود ہی کے لئے کریں، اس لئے نماز اور حج تو بذاتہ یا خود عبادت ثابت ہوئیں اور زکوٰۃ اور روزہ بذاتہ عبادت نہیں بلکہ ان دو اصلی عبادتوں کا وسیلہ بن کر لغیرہ عبادت ثابت ہوئیں اور یہی مقصود تھا اس بیان کا۔

نماز و حج میں باہم نسبت تضاد...... اب ان دو اصل عبادتوں نماز اور حج میں مزید غور کیا جائے تو جیسے ان میں بلحاظ منشاء کے فرق ہے کہ ایک جلالی صفات سے پیدا شدہ ہے اور ایک جمالی صفات سے ایک میں گرمی ہے اور ایک میں نرمی ویسے ہی ان کے آثار ولوازم میں بھی کافی فرق بلکہ تضاد کی نسبت ہے، جو چیزیں نماز میں مستحسن اور ضروری ہیں وہ حج میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ ممنوع اور قبیح ہیں، اور جو باتیں حج میں مطلوب اور ضروری ہیں وہ نماز میں مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں۔

نماز چونکہ احکم الحاکمین کے شاہی دربار کی حاضری ہے اس لئے اس میں تو آداب شاہی کی رعایت کی گئی ہے پنج وقتہ وضو جو غسل کے قائم مقام ہے لباس کی صفائی اور ستھرائی اور اس پر خوشبویات کا استعمال، وقار اور متانت کے ساتھ مساجد کی حاضری کی بھاگتے دوڑتے نہ آویں بلکہ متین چال سے چل کر پہنچیں، سنجیدگی سے نشست و برخاست ہو، بے ڈھنگا پن نہ ہو، سکوت و خاموشی یا ذکر خفی کے ساتھ بیٹھنا ہو، شور و شغب یا آواز کی بلندی نہ ہو، بخلاف حج کے کہ وہ محبوب کے در پر عشاق کی حاضری ہے اس لئے وہاں عشق و محبت کی وارفتگی، سوز و گداز افروختن و سوختن و جامہ گذیدن اور بیتابی و تڑپ کے ساتھ وجدی حرکتیں مطلوب ہیں تا کہ عقل و مصلحت بینی کی باتیں یا اپنی آرائش و زیبائش اور زیب و زینت جس سے عاشق کو اپنی دھن میں مٹے رہنے کے سبب کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس لئے اگر نماز میں صفائی ستھرائی اصل تھی تو یہاں بے زیب و زینت رہنا اصل ہے کہ ''اَلْحَجُّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ'' ① وہاں لباس عمدگی کی مطلوب تھی تو یہاں سرے سے سلا ہو لباس ہی ممنوع ہے، وہاں لباس کی زینت مطلوب تھی تو یہاں ترک زینت مطلوب ہے وہاں خوشبو لگانا مستحسن تھا یہاں احرام کے بعد خوشبو حرام ہے، وہاں نمازوں اور بالخصوص جمعہ و عیدین کی نمازوں کے لئے بدن کی معتدل زینت ضروری تھی جو حجامت سے حاصل ہوتی

① السنن للترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فی فضل التلبیۃ والنحر. ص: ۱۷۲۹، رقم: ۸۲۷.

ہے۔ یہاں محرم کے لئے سرے سے بدن کی آرائش، اصلاح خط اور حجامت ہی ناجائز ہے، وہاں سکوت اور سرو خفا ضروری تھا یہاں لبیک لبیک کا شور ہے وہاں سکون اعضاء و جوارح ضروری تھا کہ ایک جگہ جم کر کھڑے رہیں یا فکر میں مستغرق رہیں اور بیٹھیں تو گردن جھکا کر سکون سے بیٹھے رہیں۔ یہاں نقل و حرکت بلکہ بھاگ دوڑ ضروری ہے۔ کہیں صفا مروہ پر دوڑنا کہیں طواف میں چکر کاٹنا، وہاں تواضع سے گردن جھکانا ضروری تھی اور یہاں سعی سے پہلے کے طواف میں گردن تاننا اور اکڑ اکڑ کر اور مونڈھے ہلا ہلا کر چلنا واجبات میں سے ہے، وہاں نمازوں کا اکثر حصہ جیسے سنتیں اور نفلیں گھر میں پڑھنا مستحب تھا، یہاں سرے سے گھر چھوڑ دیا محبوب میں آنا ضروری ہے کہ حج فرض ہو یا نفل گھر بیٹھ کر ہو ہی نہیں سکتا۔

وہاں خون گرانے سے بچنا ضروری تھا اور یہاں اہراق دم یعنی منیٰ میں خون بہانا ہی اصل عبادت ہے، وہاں شیطانی وسوسوں کا مقابلہ ناپسند بلکہ دفع الوقتی اور ادھر سے خیال ہٹا دینا ہی وسوسہ کا علاج ہے۔ یہاں خود شیطان کے مواقع و محل کے بھی مد مقابل آ کر اسے کنکروں سے سنگسار کرنا ضروری ہے، غرض وہاں افعال ہی افعال ہیں اور یہاں تروک ہی تروک۔

وہاں بقاؤ شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضاء ہے اور یہاں فناء و لحویت کی شان وھاں بقاء شعور کی شان کا غلبہ ضروری ہے جو عقل کا تقاضہ ہے اور یہاں فناو لحویت کی شان لازمی ہے جو عشق کا مقتضاء ہے غرض ان دونوں عبادتوں کے لوازم و آثار میں تضاد کی نسبت ہے، جیسا کہ عقل اور عشق کے تقاضوں میں تضاد کی نسبت ہے، بادشاہ کے دربار میں عقل و ہوش کے ساتھ آنا پڑتا ہے، اور محبوب کے در پر عقل و شعور سے بالا ہو کر محویت و ربودگی کے ساتھ حاضر ہونا ہوتا ہے غرض یہ واضح ہو گیا کہ ادھر حق تعالیٰ کی صفات کمال کی دو شانیں تھیں، صفات جلال اور صفات جمال اور ادھر ہر بندہ میں بھی دو ہی جوہر رکھے گئے تھے۔ ایک عقل اور ایک عشق یعنی اگر اللہ کی شانوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حاکم بھی ہو اور محبوب بھی۔ تو بندہ کے ان دو جوہروں کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا محکوم بھی ہو اور عاشق بھی۔

ان دونوں تقاضوں سے یہ دونوں عبادتیں مقرر ہوئیں، ایک نماز جس میں حاکم حقیقی کے سامنے اپنی محکومیت و فدویت اور نیاز مندی و عبدیت پیش کی جاتی ہے، اور ایک حج جس میں محبوب حقیقی کے سامنے اپنی محویت اور رلودگی اور جاں نثاری اور جاں سپاری پیش کی جاتی ہے، اس لئے دونوں عبادتیں اسلام کا بنیادی موضوع ثابت ہوتی ہیں۔ اسی لئے جن میں اسلام سمجھانے کے لئے تحریری مواد فراہم کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے وہ اولاً عبادات اور خصوصاً نماز و حج کے لئے سب سے پہلے مواد فراہم کرتے ہیں اور بلاشبہ یہ دونوں عبادتیں اسی کی مستحق بھی ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں۔ چنانچہ نماز پر بھی سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں جن میں نماز کے مسائل نماز کے افعال، نماز کی روح، نماز کے اسرار، نماز کے مصالح، نماز کی غرض و غایت، نماز کے ثمرات و نتائج وغیرہ جمع کئے گئے ہیں اور ایسی کتابوں کا ایک بڑا عدد تاریخ کے اوراق میں دستیاب ہوتا ہے۔

اسی طرح مناسک حج پر بھی کتابوں کا ایک ذخیرہ ملے گا جو اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے مرتب ہوا ہے۔ فضائل حج، مسائل حج، دلائل حج، اسرار حج، آثار حج، شعائر حج، مقامات حج، تاریخ حج، جغرافیہ حج، طریق حج وغیرہ پر ضخیم ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں۔ اور بلاشبہ یہ دونوں موضوع اسی کے مستحق بھی تھے کہ ان پر سفینے مرتب ہوں اور ان کے حقائق محض سینوں کی امانت نہ بنے رہیں جب کہ یہی دو عبادتیں اسلام کی اساس اور حقیقی عبادتیں تھیں جن سے دوسری عبادتوں نے جنم لیا، پھر اس میں بھی خصوصیت سے حج کی عبادت چونکہ نقل و حرکت اور سیر و سیاحت کی عبادت تھی جس میں ایک حاجی کو اپنی نظر و فکر کی مستعدی کی حد تک مختلف رنگ کے تجربات بھی حاصل ہوتے ہیں اس لئے حج سے متعلقہ تصانیف میں سفرناموں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے جو اہل علم حجاج نے بوقت سفر حج قلمبند کیا اور اپنے تجربات سے مابعد کے حجاج کو مستفید ہونے کا موقع بخشا تا کہ ان کے تجربات سے بعد کے لوگ مختلف معلوماتی فوائد بھی حاصل کریں اور پچھلوں کے تجربات اگلوں کے لئے راہ حج میں مدد اور آسانیوں کا ذریعہ ثابت ہوں۔

علمی حج...... خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے بھائی مگر بزرگ بھائی دوست اور مخلص دوست متدین اور متقی عالم مولانا محمود حسن صاحب گیاوی دام مجدہ فاضل دیو بند نے بھی اپنے سفر حج میں اپنے عملی حج کو علمی حج بنانے کی سعی مشکور فرمائی اور اپنے سفر حج کے کوائف و تجربات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سفرنامہ کی صورت میں مرتب فرمایا نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ شرعی اور فنی طور بھی حج کے مختلف پہلوؤں کو اپنے علم و عمل اور تجربہ کی روشنی میں جمع فرمایا ہے، جس کے عنوانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں حج کے تمام مَالَهٗ وَمَاعَلَيْهِ سے بحث کرتے ہوئے مسائل، فضائل، دلائل، شمائل، شعائر آثار، وقائع حوادث و ضروریات وغیرہ کا ایک معتدبہ اور بڑا ذخیرہ جمع فرما دیا ہے جو ان کے علم و عمل اور اخلاص و ایثار کا شاہکار ہے اس لئے یہ سفرنامہ تاریخ، تحقیق، فقہ، کلام، روایت اور درایت ہر پہلو سے حج کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے حج کو "آئینہ" بنا کر طالبوں کے سامنے رکھ دیا ہے اور خصوصیت سے یہ مصنف ممدوح کا خاص احسان ہے کہ انہوں نے مسائل کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات سے بھی دنیا کو فائدہ پہنچانے کی سعی فرمائی ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنَّا وَعَنْ جَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرَ الْجَزَآءِ.

آئینۂ حج اور آئینۂ نمائی...... محترم مصنف کی خواہش تھی کہ میں اس رسالہ "آئینہ حج" پر بطور مقدمہ چند سطریں لکھ کر پیش کروں میرے لئے سب سے بڑی مشکل وقت نکالنے کی تھی، پھر اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے ایسے اہم اسلامی موضوع پر قلم چلانے کی تھی اور اوپر سے کتاب اپنی جامعیت اور مکمل تفصیلات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے بھی مقدمہ و تمہید سے بے نیاز بھی تھی جب کہ اس میں جن کا پہلو خود ہی موجود ہے اس لئے تعمیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی پھر بھی یہ چند سطریں کسی نہ کسی طرح سفر و حضر میں تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر پوری کیں اور محض "آئینہ حج" پیش کر دینے کے لئے پیش کر دی گئیں تا کہ اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر لوگ خود ہی اس کا اور اپنا اندازہ لگا سکیں۔ ورنہ جہاں تک حج کے

پہلوؤں کا تعلق ہے یہ ''آئینہ'' سارے حج کا خود ہی آئینہ دار ہے، جس کے جوہروں میں حج کے سارے ہی پہلو جلوہ گر ہیں، نہ اس میں کسی کمی بیشی کی گنجائش ہے نہ اضافہ کی، نہ تمہید کی، نہ مقدمہ کی، پس یہ مقدمہ آئینہ حج میں خود اپنے کو دیکھنے کے لئے بطور آئینہ کے پیش کیا جارہا ہے نہ کہ حج کو دیکھنے کے لئے۔ کہ حج نمائی کا آئینہ بنانا۔

مصنف محترم جیسے عالم وفاضل کا کام تھا جنہوں نے آئینہ حقیقتاً بنا کر دنیا کو دکھادیا۔ میرا کام صرف آئینہ نمائی تھا جو برے بھلے انداز سے بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور مصنف ممدوح کو جزائے خیر عطا فرمائے اور سفرنامہ کی اس علمی سعی کو مشکور فرمائے۔ (آمین)

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

پس منظر...... جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی کے موقع پر ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ کو نماز جمعہ کے بعد جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس موقع پر امیر جامعہ اور منتظمین جلسہ کے اصرار پر حضرت مہتمم صاحب (رحمۃ اللہ) نے ایک نہایت ہی مختصر مگر نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا جو اس درجہ موثر ومقبول ہوا کہ اساتذہ کرام جامعہ ملیہ اور دیگر حضرات نے حضرت موصوف سے اس کے قلمبند کرنے کی فرمائش کی۔ تا کہ اشاعت کے ذریعہ اس کو غائبین تک بھی پہنچایا جائے اور وہ بھی اس سے اسی طرح مستفیض ومحظوظ ہوں جس طرح حاضرین نے فیض حاصل کیا۔ چونکہ وہاں مصروفیت زیادہ رہی اور قیام گاہ پر زائرین اور ملاقاتیوں کا برابر ہجوم رہا۔ اس لئے اس خطبہ کو قلمبند کرنے کا موقع نہ ملا۔

دیوبند مراجعت فرمانے کے بعد احقر کے اصرار پر باوجود انتہائی عدیم الفرحتی کے حضرت موصوف نے یہ خطبہ قلمبند فرما کر مرحمت فرمایا ہے کہ اگرچہ تقریر کا بعد از وقت بعینہ تحریر میں آجانا تو عادتاً ناممکن ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ چونکہ یہ تحریر حضرت موصوف کے قلم سے ہو کر شائع ہورہی ہے اس لئے ایک حد تک اصل تقریر کی غمازی کر سکے گی۔

(احقر: مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند)

اہمیت نماز

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْامَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

کائنات کا انتہائی مقصد...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی تقریر کرنا منظور نہیں ہے اور نہ اس کا پروگرام ہی ہے، مجھے امر کیا گیا ہے کہ میں آپ حضرات سے مسجد کے سنگ بنیاد کے سلسلہ میں دعا کراؤں یہ ظاہر ہے کہ دعا کرانے کی چیز نہیں ہے۔ کرنے کی چیز ہے۔ آپ بھی خود ہی دعا کریں گے اور یہ بھی دعا کرنے میں آپ کے ساتھ شامل ہوگا۔ اس لئے دعا کرانے کے لئے بھی میں نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ مقصد دعا سے پہلے دعا کے نقاط پر توجہ دلانا ہے کہ کن پہلوؤں پر دعا کریں گے۔ اور حق تعالیٰ سے کن مقاصد کا سوال کریں گے۔ کیونکہ اس وقت مطلقاً دعا مقصود نہیں ہے بلکہ دعا خاص مقصود ہے۔ سو اس دعا کے نقاط اور پہلوؤں پر اس طرح سے غور کیجئے کہ اس ساری کائنات کا پھل اور آخری مقصد انسان ہے جس کے لئے زمین و آسمان کا یہ سارا خیمہ تانا گیا ہے۔ اگر انسان کی تخلیق منظور نہ ہوتی تو کائنات کی تخلیق بھی عمل میں نہ آتی۔ پس ساری کائنات انسان کی خاطر بنائی گئی ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ. ② "ساری دنیا تمہارے لئے بنائی گئی ہے"۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ ③. "اور جو کچھ زمین میں ہے تمہارے ہی نفع کے لئے ہیں"۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۴۳.

② شعب الایمان، التاسع والثلاثون من شعب الایمان، فصل فیما یقول العاطس، ج: ۲۲، ص: ۶، رقم: ۱۰۱۸۵.

③ پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۹.

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ○ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ○ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ﴾ ①

''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی کو اتارا اور اس سے پھل اگائے تمہارے رزق کے لئے اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگایا تا کہ اس کے حکم سے وہ دریا میں چلیں اور دریا تمہارے کام میں لگائے اور آفتاب ماہتاب تمہارے کام میں جو چل رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے کام میں لگا دیا اور وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے اس سے مانگا۔ (خواہ دعا قولی سے یا دعا عملی یعنی اختیار واسباب سے)''

پس زمین وآسمان، رات دن کا لوٹ پھیر، شجر و حجر اور بحر و بر کا کارخانہ سب کچھ انسان ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے جس سے واضح ہے کہ تخلیق کائنات کا انتہائی مقصد انسان ہے۔ پھر یہ انسان کس لئے ہے؟ ظاہر ہے کہ کائنات کے لئے نہیں۔ ورنہ وسیلہ ہونے کی بجائے مقصد ہو جائے گا اور یہ خلاف نقل وعقل اور خلاف مشاہدہ ہے جیسا کہ واضح ہوا۔ اس لئے ایک ہی نتیجہ ہے کہ انسان کائنات کے لئے نہیں بلکہ خالق کائنات کے لئے ہے یعنی اس کی عبادت کے لئے۔ اس کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے اور اس کے آگے سر عبودیت خم کرنے کے لئے پس انسان کا مقصد تخلیق عبادت نکلا اور اب منطقی اصول پر نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات انسان کے لئے اور انسان عبادت کے لئے تو ساری کائنات کی یہ تنظیم وتخلیق صرف عبادت کے لئے عمل میں آئی ہے۔

عبادت کا فرد کامل...... عبادت پر اگر آپ غور کریں گے تو اس کا فرد کامل نماز ہے۔ گویا ساری دنیا نماز کے لئے بنائی گئی ہے کہ یہی عبادت کا فرد کامل اور مظہر اتم ہے بلکہ میں ترقی کر کے یہ عرض کروں گا کہ سلسلہ عبادت میں عبادت صرف نماز ہی ہے اور کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں۔ کیونکہ عبادت کے معنی غایت تذلل اور انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جو انتہائی عزت والے کے سامنے اختیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے نماز کے سوا کوئی چیز بذاتہ عبادت نہیں نکلتی۔ مثلاً روزہ اپنی ذات سے عبادت نہیں کیونکہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور تمام لذات نفسانیہ سے مستغنی ہو جانے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ غنا اور عدم احتیاج ذلت نہیں۔ کیونکہ غنا تو خود خالق کی شان ہے تو خالق کی شان اختیار کرنا عیاذاً باللہ ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یا صدقہ وزکوۃ دینا عطا ہے اور عطا تو خود اللہ کی صفت ہے اور معاذ اللہ ذلت کیسے ہوسکتی ہے؟ یا سچ بولنا خدا کی شان ہے تو اسے عبادت اور غایت تذلل کیسے کہ دیں گے۔ اسی طرح اور تمام اخلاق حسنہ اور اعمال فاضلہ بذاتہ ذلت نہیں کہ انہیں عبادت کہا جائے پھر بھی جو انہیں عبادت کہا جاتا ہے محض امتثال امر خداوندی کی وجہ سے نہ کہ بالذّات۔ ہاں نماز بالذّات عبادت ہے، کیونکہ اس کی ہیئت کذائی قیام، قعود، رکوع اور آخر کار سجدہ میں ناک اور پیشانی زمین پر ٹیکنا انتہائی ذلت اور عبودیت کا اظہار ہے، اس کے اذکار مشتمل ہیں یا اظہار فدویت نفس پر یا اعلان عزت رب پر۔ اور یہ خود شان تذلل ہے۔ غرض نماز کی

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۳۲، ۳۳.

ہیئت اور حقیقت سب مظہر ہے شؤن تذلل اور احوال عبودیت پر۔

حاصل یہ ہوا کہ کائنات کی تخلیق عبودیت یعنی نماز کے واسطے ہوئی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے نماز ہی کا ساری کائنات کو پابند ظاہر فرمایا ہے نہ کہ زکوٰۃ وحج اور صوم وصدقہ کا۔ فرمایا: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ﴾ ① ''ہر چیز نے (خلقۃً اور تکوینی ہدایت سے) اپنی نماز اور تسبیح (یعنی ہیئت نماز اور اذکار نماز) کو جان لیا ہے''۔ جس سے واضح ہے کہ ساری کائنات نمازی ہے، بھلا پھر انسان کو تو کیوں نہ نمازی بنایا جاتا۔ فرق اتنا ہے کہ اور مخلوق غیر عاقل ہے تو اس میں نماز کا داعیہ جبلی اور تکوینی طور پر رکھ دیا گیا ہے اور انسان ذی عقل وہوش ہے۔ تو اس کی نماز اختیاری ہے، جس کے لئے ہدایت ورہنمائی اور وعظ وپند کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس اگر انسان نمازی نہ ہو تو گویا اس نے اپنے مقصد تخلیق کو فوت اور ضائع کر دیا۔ اس لئے فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تمام رعایائے اسلام کے نام فرمان جاری فرمایا تھا کہ:

نماز ہے تو کل دین ہے...... إِنَّ أَهَمَّ أُمُوْرِكُمْ فِيْ دِيْنِكُمْ عِنْدِي الصَّلٰوةُ فَمَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَلَيْهَا حَفِظَ دِيْنَهٗ وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ ② ترجمہ: میرے نزدیک تمہارے دین میں سب سے زیادہ اہم چیز نماز ہے، جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسرے دینی کاموں کو اس سے بھی زیادہ ضائع کرے گا۔ اس سے واضح ہے کہ دین کے دوسرے کاموں کی بقاء بھی درحقیقت نماز ہی ہے۔ اسی سے اوقات کی پابندی ہوتی ہے، اسی سے عظمت حق دل میں جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی سے دین کے اوامر کی عظمت ہوتی ہے اور پھر ان کی تعمیل پر دل مجبور کرتا ہے۔ غرض نماز ہے تو کل دین ہے۔ اور وہ نہیں تو دین بھی نہیں، اور مسلمان کا دین ہے تو دنیا بھی ہے ورنہ دنیا بھی نہیں۔ پس نماز ہے تو جہان ہے ورنہ حرمان وخسران ہے۔ بس اسی مقصدِ نماز کی تکمیل کے لئے یہ سنگِ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ نماز اپنے مشروع طریق سے اسی مقدس جگہ میں ادا کی جائے۔

نماز تعلق مع اللہ کی مظہر اتم ہے...... اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اب تک تو جامعہ نے اپنے پروگراموں میں رسوم ادا کی ہیں اور اب حقیقت ادا کی ہے وہ سب چیزیں نمائشی تھیں۔ حقیقت اگر ہے تو صرف یہ، جیسے اس وقت انجام دے رہے ہیں کہ اس سے مقصد زندگی تکمیل پا رہا ہے۔ نماز مظہر اتم ہے تعلق مع اللہ کی۔ اگر نماز اور تعلق مع اللہ قائم ہے تب تو یہ ساری رسمیں جو ہم نے ادا کی ہیں باروح اور زندہ کہی جائیں گی، ورنہ یہ سب چیزیں جو رسم کی شکل سے ادا کی گئی ہیں ایک بے جان لاش ثابت ہوں گی۔ اور لاش کا انجام یہ ہے کہ وہ چند ہی دن بعد گلے، سڑے، پھولے اور پھٹے اور اس کی بدبو سے دماغ متعفن ہوں اور احساسات گندے ہو جائیں۔

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱۔

② المصنف لعبدالرزاق، ج: ۱ ص: ۵۲۶ رقم: ۲۰۳۸۔ مشکوۃ المصابیح کتاب الصلوۃ، الفصل الاول، ج: ۱، ص: ۱۲۹، رقم: ۵۸۵۔

نیز یہ تعلق مع اللہ ہے جو ان رسموں کی شکلوں کی بھی اصلاح کر سکتا ہے ورنہ بلا تعلق مع اللہ اور بلا واسطہ اوامر الٰہیہ کے یہ رسمیں بھونڈی اور بدشکل متصور ہوں گی پس اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھ کر اور نمازی بن کر در حقیقت ہم اس کا تہیہ کر رہے ہیں کہ اپنی رسوم کی صورتوں کی بھی اصلاح کریں اور اس میں حقیقت و روح بھی پیدا کریں۔ تا کہ ہمارا ہر عمل پائیدار اور عواقب کے لحاظ سے نتیجہ خیز ہو۔ اور بے جان لاش کی طرح ضائع اور بے جڑ درخت کی طرح بے ثمر نہ رہے۔

قیام نماز سے ایک خاص فضا پیدا کرنا مقصود ہے......اس لئے ہمیں دعا اس کی کرنی ہے کہ اے اللہ ہمیں نماز کی توفیق دے اور نماز کے لئے ہمارے اس مکان مقدس یعنی مسجد کی تکمیل کرا دے اور اس مسجد کو بنانے والوں، اس کی تعمیر کرنے والوں، اس میں امداد دینے والوں، اور اس کے منتظموں کا یہ عمل قبول فرما۔ ہمیں اللہ سے یہ مانگنا ہے کہ وہ اس نماز کے ذریعے ہمارے ہاتھوں جامعہ میں ایسی فضا پیدا کر دے کہ جس میں نیکیاں پھلیں پھولیں اور بدیاں اپنی موت مر جائیں۔ آج کا دور وہ ہے کہ نیک نیکی کر کے شرماتا اور منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ جیسے گویا اس نے کوئی بڑا بھاری جرم کیا ہے اور مجرم بدکاریاں کر کے فخر سے سر اونچا کرتا ہے کہ گویا اس نے دنیا کا کوئی محترم کام انجام دیا ہے۔ ہمیں اللہ سے واسطہ پیدا کر کے اور نماز کو قائم کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ نیکی کر کے نیک سر ابھارے اور مجرم اور بدکار خلاف شریعت امور کر کے منہ چھپاتا رہے اور اپنی برائی کو محسوس کرے۔

آج کے دور میں ایمان سے کورے آدمی کا لقب ہے دانا، عالی ظرف اور بہادر، اور ایماندار کا لقب ہے احمق بے وقوف مجنون اور دیوانہ۔ حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''يُقَالُ لِلرَّجُلِ مَآ اَعْقَلَهٗ وَمَآ اَظْرَفَهٗ وَمَآ اَجْلَدَهٗ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ'' (1) ''آدمی کے لئے کہا جائے گا کہ کس قدر دانا ہے کس قدر عالی ظرف ہے اور کیسا بہادر ہے۔ درانحالیکہ اس کے دل میں ذرہ برابر ایمان کا نشان نہ ہوگا''۔ اور دوسری روایات میں فرمایا گیا ہے کہ امین کو خائن کہا جائے گا اور خائن کو امین علم والے کی اتنی بھی عزت نہ رہے گی جتنی کہ ایک مردار گدھے کی لاش کی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں آج مشاہدہ میں آ رہی ہیں۔ اہل تقویٰ کا نام مذہبی دیوانے، احمق ملانے وغیرہ ہیں اور اہل فجور کے القاب اعقل، اظراف اور اجلا ہیں تو ہمیں تعلق مع اللہ والوں کی کثرت کر کے ایسی فضا پیدا کرنی ہے کہ ہر ایک کو اسی کے صحیح لقب سے یاد کیا جائے اور اسی کے مرتبہ کے مطابق اس سے معاملہ کیا جائے۔ پس دعا میں ایک نقطہ یہ بھی ہمیں لانا ہے کہ اے اللہ ہمیں اہل تقویٰ میں سے اور نمازی کر کے ہمیں اہل سعادت کر اور اہل سعادت کی عزت و توقیر اور شوکت دنیا میں قائم فرما۔ ہماری مادی شوکت اگر ہمیں حاصل ہو اور جس کا ہم فوجی انداز میں مظاہرہ کر کے گویا اس کی تحصیل کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں اس کا ثمرہ اور آخری غایت بھی نماز ہی ہے یعنی خدا سے تعلق۔

سلطنت اسلامی کا مقصود......حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة والایمان. ج: ۱، ص: ۴۴۷.

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ ① پس ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کا دنیوی عروج اور تمکین فی الارض یعنی سلطنت وامارت اس لئے نہیں کہ کیک، پیسٹری کی فکر میں مستغرق ہوں۔ کوٹھی بنگلوں کی تعمیر ان کا منتہائے نظر ہو اور انڈا مکھن ان کا آخری مطلب ہو۔ بلکہ ان کا عروج اس لئے ہوگا کہ وہ خدا کی چوکھٹ پر جھکیں اور اس کی مخلوق کو جھکا دیں۔ دنیا میں معروف اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برائی سے دنیا کو پاک کریں صدقہ وخیرات سے غریبوں کی غربت مٹا دیں سائلوں اور محتاجوں کے دلوں کو تھامیں۔ اخوۃ ہمدردی سے عالم کو بھر دیں۔ تفوق اور علو وفساد کا قلع قمع کریں۔

نمازی یا نماز کے ثمرات...... پس محض اس کی دعا کرنی ہے کہ خداوندا ہمیں عروج دے تا کہ ہم تیرے اس مقدس مکان میں جمع ہو کر تیری یاد کریں اور اس بھولی ہوئی اور غافل دنیا کو تیرے بارے میں ہوشیار بنا دیں۔ پس یہ کام ہم اس مسجد مقدس میں جماعتی حیثیت سے انجام دینے کی توفیق اللہ سے مانگنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہمیں اپنی دعا میں نمازکی، مکان نماز کی تکمیل کی توفیق، نماز کے شوکت کے وسائل قائم کرنیکی توفیق، نماز کے لئے مادی شوکت فراہم کرنیکی توفیق اور نماز کے ذریعے اپنی صورت وسیرت اور ہیئت وحقیقت کے پاکیزہ اور مطلوب انداز پر لانے کی توفیق مانگنا ہے۔ یعنی جو کچھ بھی مانگنا ہے وہ نمازی یا نماز کے ثمرات ہیں یا نماز کے مبادی اور وسائل ہیں۔ ہم صرف نماز ہی دنیا میں چاہتے ہیں اور نماز ہی کے لئے ہر کام بھی چاہتے ہیں۔

اگر حقیقتاً ہمیں یہ زندگی میسر ہو جائے تو اسی زندگی کا نام قرآن کی زبان میں حیات طیبہ ہے۔ اسی کا نام اسوہ حسنہ اور پاک سیرت ہے جس کے لئے اسلام آیا اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا گیا۔

پس دعا کے یہی چند نقاط تھے جن پر توجہ دلانے کے لئے میں کھڑا ہوا تھا، مجھے کوئی تقریر یا نماز کے موضوع پر کوئی سیر حاصل بحث کرنا منظور نہیں تھا۔ نہ اس کا وقت ہے اور نہ کوئی پروگرام اس لئے اب آپ سب حضرات ہاتھ اٹھائیں اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں ان مطلوبہ نقاط پر مخلصانہ دعا فرمائیں۔

① پارہ: ١٧، سورۃ الحج، الآیۃ: ٤١.

رمضان اور اس کے مقاصد و برکات

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ [1] (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ).

اصلاحِ طینت...... بزرگانِ محترم! ایک اعلیٰ ترین باغ کا بہار آفریں نشو ونما، اس کی دلکش اور نظر افروز سرسبزی شادابی، تازگی اور بار آوری اس وقت تک اپنے عروج کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کی زمین کو خود رو گھاس پھونس اور خس وخاشاک سے پاک نہ کر دیا جائے، اسی طرح ایک پاکیزہ برتن پر قلعی سے اس وقت تک چمک نہیں آئیگی جب تک اس کے جگری زنگ کو دور نہ کر دیا جائے اور اس پر چھائی ہوئی کدورتوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے ہو بہو اسی طرح ایک قیمتی کپڑے پر کوئی نظر فریب رنگ اس وقت تک کھل نہیں سکتا جب تک کہ میل کچیل اور آئے ہوئے دھبوں سے اسے صاف نہ کر دیا جائے۔ اصول یہ نکلا کہ کوئی شی بھی تہذیب وتمدن اور اصلاح عمل کے ذریعہ اعلیٰ جوہروں سے اس وقت تک شائستہ اور آراستہ نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کے اندر سے ابھرنے والی خرابیوں کے مادوں کو سنت سے مغلوب اور مضمحل کر کے اس کی طینت کو صاف نہ کر دیا جائے۔

سعادت کی بنیاد...... ٹھیک اسی فطری اصول کے مطابق اس کائنات کے اشرف اصول اور افضل ترین رکن انسان کو بھی دیکھو کہ اسے بھی سعادت وشرافت، بزرگی اور برتری اور ظاہر و باطن کے فضل وکمال سے اس وقت تک آراستہ نہیں کیا جاسکتا، جب تک کہ اس کے اندرونی شر وفساد اور جبلی عیبوں اور اخلاقی خرابیوں کے ناپاک مادوں سے اسے صاف نہ کر لیا جائے۔ اس میں پاکیزہ اخلاق اور نیکوکارانہ افعال کے مادے اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتے جب تک اس کے ظاہر و باطن کو زنگ خودی اور زنگ ہوا وہوس سے پاک نہ بنالیا جائے اور اس کے دل کی

---

[1] پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵۔

زمین میں ایمان و ہدایت کا شجرہ طیبہ اس وقت تک نشو ونما اور ثمر نہیں پاسکتا جب تک کہ اس میں سے خود رو وساوس واوہام ہوائے نفس اور فانی لذتوں کی ہولناکیاں کھرچ کر باہر نہ پھینک دی جائیں۔

تخلیہ وتحلیہ ......اس صورت میں قدرتی طور پر انسانی تہذیب و تربیت کے دو عمل قرار پائے جاتے ہیں، افعال اور تروک یعنی کچھ کرنے کی چیزیں جو اس سے کرائی جائیں گویا اس کے نفس میں بھری جائیں اور کچھ بچنے کے چیزیں جو اس سے چھڑائی جائیں گویا اس کے نفس میں سے نکالی جائیں کرنے کی چیزوں سے اس کا نفس خیر وخوبی سے آراستہ ہوگا اور بچنے کی چیزوں سے اس کا نفس شر اور شیطنت سے پاک ہوگا۔ اسی طرح تربیت انسانی دو عملوں کا مجموعہ بنتی ہے ایک تحلیہ اور ایک تخلیہ (یعنی خالی کرنا اور بھرنا) تخلیہ کے ذریعے اس رذائل نفس سے پاک کیا جاتا ہے اور تحلیہ کے ذریعے اس کو فضائل سے آراستہ کیا جاتا ہے جب تک کہ دونوں مثبت اور منفی عمل اس میں جاری نہ کئے جائیں نہ ان کی تہذیب مکمل ہوسکتی ہے اور نہ وہ سعادت ورشد کے نور سے روشن ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت خداوندی جو انسان کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے، دو ہی اجزاء سے مرکب ہو کر نازل ہوئی ہے، ایک امر، اور ایک نہی یعنی ایک حصہ اس میں مامورات کا ہے جن کے کرنیکا امر کیا گیا ہے تاکہ نفس کو اس کی سعادت ملجائے اور ایک حصہ منہیات کا ہے جن سے بچنے کا اسے پابند کیا گیا ہے، تاکہ نفس کی شقاوت دور ہو۔ پس مامورات کو از قسم افعال سمجھو اور منہیات کو از قسم تروک، یہی مامورات نیکیاں ہیں جن کا نوع اور اصل نام شریعت کی زبان میں معروف ہے اور یہی منہیات بدیاں ہیں۔ جن کا نوعی اور اصول نام اصطلاح شرع میں منکر ہے اور یہیں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغی اصطلاح بنتی ہے۔ جسے سب پہنچانتے ہیں۔

اور قرآن نے جابجا اس کی تاکید کی ہیں، کہیں اس کا امر کیا ہے۔ ﴿وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَکَ ۔ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ ① ”اچھی باتوں کا حکم کرو اور برائیوں کو روکو اور کچھ تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے“۔ کہیں امت کی خیریت اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دائر کردی ہے۔ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ② ”ان تمام امتوں میں تم بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے، بھلائیوں کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو“۔ کہیں رفعت و برتری اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا گیا ہے فرمایا گیا کہ ﴿اَلنَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ ③ ”نبی امی کہ جس کی بات وہ تورات وانجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو اچھی باتوں کا حکم کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے“۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمن، الآیۃ: ۱۷۔ ② پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۱۰۔
③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۷۔

نظام سعادت...... شریعت کے یہ تمام مامورات یا معروفات جس کا شمار نیک افعال میں ہے، اصلاح شریعت میں ان کے افعال کا نام بر ہے اور وہ تمام منہیات یا منکرات جواز قسم تروک ہیں ان سے بچنے کا اصطلاحی نام تقویٰ ہے اس لئے گویا پوری شریعت کا خلاصہ بر و تقویٰ نکل آتا ہے جس پر انسانی سعادت کا نظام قائم ہے۔

اگر افعال بر یا امور خیر کو معطل کر دیا جائے تو حصول خیر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس کو شرعی زبان میں اثــم کہتے ہیں اور یہ اثم یا گناہ ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور اگر تقویٰ کو معطل کر دیا جائے تو دفع شر کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ جس کا اصطلاحی نام "عُدْوَان" ہے (یعنی حدود سے تجاوز اور زیادتی) اور اللہ کی قائم کی ہوئی ان حدود سے تجاوز کرنا ہی تمام فساد انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کی جڑ ہے۔ پس کوئی انسان محض بر سے یا نیک کاموں سے کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس میں تقویٰ کے تروک نہ ہوں اور کوئی فرد بشر محض تروک تقویٰ سے کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک اس میں بر (نیکی) کے افعال اور تاثیرات نہ ہوں۔

اب چونکہ برّ و تقویٰ نیکی اختیار کرنے اور برائیوں سے بچنے کے اس مثبت و منفی عمل کے مجموعی نظم ہی سے دین اور تہذیب و تمدن کا نظام استوار ہوتا ہے، اس لئے شریعت اسلام نے ان دونوں میں باہمی تعاون کی اور انکی اضداد یعنی اثم و عدوان سے عدم تعاون کی دعوت دی ہے۔ قرآن حکیم نے یہ ساری بنیادی تفصیلات بلکہ پوری شریعت کے امر و نہی کے نظام کو ان دو جامع اور معجزانہ جملوں میں ادا کر دیا ہے جن سے ان انواع کے یہ اصطلاحی نام بھی متعین ہو جاتے ہیں۔ ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [1] "تعاون کرو نیکی اور تقویٰ پر اور گناہوں اور سرکشی پر تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والے ہیں"۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ بر و تقویٰ کے یہ افعال و تروک محض ان کے نظم (الفاظ) کی جوہری خوبی اور برتری سے انسانوں میں قائم نہیں ہو سکتے، جب تک کہ خود انسانوں میں بھی بر و تقویٰ کو قبول کرنے اور ان سے اثر پذیر ہونے کا مادہ اور صلاحیت نہ ہو۔ اور اس میں ایسی قوتیں رکھی ہوئی نہ ہوں جو اس بر و تقویٰ کے جذب کرنے پر جھکی ہوئی ہوں اور اسے برداشت کریں جس سے نفس انسانی پر بر و تقویٰ کا رنگ چڑھ سکے، ورنہ اگر اندرونی قابلیت کے بغیر ہی بر و تقویٰ کا خطاب صحیح ہوتا یا محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کو خوبی اور برتری ہی نفوس میں اسے جاگزیں کر دیا کرتی تو حیوانات آخر اس تکلیف شرعی سے الگ کیوں رکھے جاتے؟ ان کو بر و تقویٰ کا مکلّف نہ بنائے جانے کی اس کے سوا وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ان میں بار اور متقی نیک اور پرہیزگار بننے کی یا بر و تقویٰ قبول کرنے کی کوئی استعداد اور کوئی قوت موجود نہیں اس لئے محض بر و تقویٰ کے شرعی نظام کا اعلیٰ اور منضبط ہونا ان کے لئے کارآمد نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکل آنا قدرتی ہے کہ اگر خدا نے انسان کو بر و تقویٰ کا مکلّف ٹھہرایا ہے تو ضروری ہے کہ اس میں بھی بر و تقویٰ کے نظام کو

[1] پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۲۔

قبول کرلینے کی قوتیں بھی ہوں جن پر یہ نظام بر وتقویٰ اپنا عمل کرے اور انسان بار ومتقی ۔ نیکوکار اور پرہیز گار بنے ، اسی طرح انسان میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہونے ضروری ہیں جن سے وہ اثم وعدوان کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ ہوتا ہو اور شریعت اسے ان قبیح حرکات سے روکے ، ورنہ اس میں ان گناہ کاریوں کے مادے ہی نہ ہوتے تو وہ کبھی بھی اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہوسکتا اور ایسی صورت میں اسے اثم وعدوان سے باز رہنے کا حکم دیا جانا بالکل ایسا ہی حکم ہے جیسا کہ کسی جنگلی جانور شیر اور بھیڑیئے کہ کہا جائے کہ خبردار گناہ مت کرنا اور اثم وعدوان کا مرتکب نہ ہونا ۔ ظاہر ہے کہ جیسے یہ حکم غیر حکیمانہ ہے ایسی ہی اثم وعدوان کے مادے کے بغیر انسان کو یہ حکم دیا جانا لغو اور لایعنی ہوتا ہے ، جس سے اللہ کی شریعت بری ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان میں میں اثم وعدوان کے مادے بھی ہوں اور وہ ان قبیح حرکات کا مرتکب ہوسکتا ہو بلکہ ہوتا ہو اور پھر اسے روکا جائے جس سے وہ اپنے اختیار سے خود رکے ، تاکہ یہ رکنا شریعت کے لئے حکیمانہ فعل ثابت ہو اور رکنے والے کے لئے امر حسن باعثِ اجر وکمال بنے ۔

ایمان وامانت ...... اس اصول کے بعد سمجھئے کہ انسان میں جو قوت افعال بر کا تحمل کرتی ہے بلکہ افعال بر کا مصدر ہے جس سے یہ افعال صادر ہوتے ہیں ان کا نام شریعت کی اصطلاح میں امانت ہے اور جو قوت تقویٰ کا بوجھ اٹھاتی ہے اور اس سے متقیانہ تروک کا ظہور ہوتا ہے اس کا نام شریعت کی زبان میں حیاء ہے ۔ پس امانت امر حسن اور اچھے کام کی رغبت کے مادے کا نام ہے اور حیاء امر قبیح سے انقباض کے مادہ کا نام ہے ۔

پس ایمان اور اس کے سارے عملی شعبے عبادۃ ، اطاعۃ ، تفویض وغیرہ درحقیقت امانت کے کندھوں پر سوار ہو کر آگے بڑھتے ہیں ۔ اگر امانت نہ ہو یعنی دل میں ان امور حسنہ کی رغبت وقبول کا مادہ ہی نہ ہو تو آدمی نہ ایمان قبول کرسکتا ہے نہ عمل صالح نہ دین دیانت ۔

پس امانت کی وہی نوعیت ہے جو رنگریزوں پھٹکری کی ہوتی ہے کہ وہ ہر رنگ کے لئے زمین ہے اگر رنگ کو پھٹکری نہ دی جائے تو کوئی رنگ بھی نہ کپڑے پر چڑھ سکتا ہے نہ کھل سکتا ہے ۔ یا جیسا کہ عطاروں میں تل کے تیل کو ہوتی ہے کہ ہر خوشبو کے لئے یہ سادہ تیل زمین ہے جو گلاب ، چمبیلی اور کیوڑہ ہر خوشبو کو قبول کرلیتی ہے ، اور مختلف عطر بن جاتے ہیں ۔ اگر یہ زمین (تل کا تیل) نہ ہو تو کوئی عطر تیار نہ ہو ۔ ٹھیک اسی طرح امانت زمین ہے ، ایمان اور ایمانیات کے لئے جس پر ایمان کا رنگ چڑھ جاتا ہے یا ایمان اور ایمانیات کی خوشبو میں جم جاتی ہیں ، اگر قلب میں یہ امانت کا مادہ نہ ہو تو نہ ایمان ہو نہ ایمانیات ، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ۔ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ ...... ''اس میں ایمان ہی نہیں جس میں امانت نہ ہو'' ۔

پس ایمان وایمانیات کو امر حسن اور مرغوب سمجھوانے والی طاقت اور پھر اسے جذب کرنے والی قوۃ یہ امانت ہی کی قوۃ ہے ۔ امانت کی ضد بددیانتی اور خیانت ہے ۔ جس کے معنی ہیں امور خیر کی رغبت نہ کرنا انہیں مستحسن نہ سمجھنا اور قبول نہ کرنا اور نتیجہ کے طور پر لہو ولعب اور خرافات میں مبتلا رہنا اور زندگی کو برباد کردینا ۔ اس خیانت کی قوت کو جو

امور خیر کو بالا بالا دفع کر دیتی ہے۔شریعت کی اصطلاح میں فتنہ کہتے ہیں جو در حقیقت امانت کی ضد ہے۔پس امانت، ایمان اور عمل صالح کو جذب کرتی ہے اور فتنہ اسے دفع کرتا ہے۔فتنہ کا ماحصل بد دیانتی، اور خیانت ہے اور خیانت امر خیر میں ہوتی ہے۔امر شر کو دفع کرنے کا نام خیانت نہیں۔ایمان کے نظام صالح اور حسن معاشرت میں رخنہ اندازہ اور اس کے نظام میں افراتفری پھیلانا ہی خیانت ہے جسے فتنہ کہتے ہیں۔پس بر ہونے کی قوت کا مادہ امانت ہے اور ہر نیکی کو دفع کرنے کے اور توڑنے در ہم برہم کرنے کے مادہ کا نام فتنہ ہے اور دونوں مادے انسان میں موجود ہیں۔شریعت مادہ امانت کو اجاگر کرنے اور مادہ فتنہ کے استیصال کے لئے آئی ہے۔

جہاد و قتال انسانوں کے گلے کاٹنے کے لئے نہیں رکھا گیا بلکہ دفع فتنہ کے لئے رکھا گیا ہے۔تاکہ کوئی فتنہ زدہ قوم نظام صالح کو برباد نہ کر پائے۔یہ جدا بات ہے کہ اس کی بربادی اور رخنہ اندازی انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے تو وہ فتنوں کو مٹانے والی طاقت بالآخر ان ہی کی گردنوں پر مسلط ہوتی ہے ورنہ اصل مقصود دفع فتنہ ہے قتل انسان نہیں۔چنانچہ یہی فتنہ زدہ انسان اگر فتنہ سے ہٹ کر امانت پر آجائیں تو قتال فوراً بند ہو جاتا ہے۔

بہر حال امانت امور حسنہ کے امتحان کی قوت ہے اور فتنہ امور حسنہ کے استہجان و تخریب کی قوت ہے۔

حیا داری اور فحش کاری......تروک تقویٰ کو بروئے کار لانے والی قوت جو انسان کے باطن میں رکھی گئی ہے حیاء ہے جس سے انسان امر قبیح کے ارتکاب سے سکڑتا اور منقبض ہوتا ہے جس سے قبائح متروک ہو جاتے ہیں اگر حیاء کا مادہ نہ ہو تو امور قبیحہ سے رکنے بچنے کی صورت نہ ہو۔پس منکرات کو برا ثابت کرنے والی اور بچانے والی طاقت حیاء ہے حیاء کی عدم موجودگی میں نہ آدمی قبیح کو قبیح کہتا ہے اور نہ اس سے رک سکتا ہے اس لئے فرمایا گیا **اِذَا فَــاتَکَ الْـحَيَـاءُ فَـاصْـنَـعْ مَـاشِـئْـتَ** ① ''جب تجھ سے حیاء جاتی رہے تو جو تیرا جی چاہے کر''۔اسی لئے حدیث میں **اَلْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ** ② (حیاء کل کی کل خیر ہی خیر ہے) فرمایا گیا اور اسی لئے حیاء کو ایمان کا عظیم ترین شعبہ قرار دیا گیا ہے کہ خلاف ایمان حرکات سے بچاؤ اس قوت کے بغیر میسر آنا ممکن نہ تھا۔

حیاء کی ضد فحش ہے جو ہر امر قبیح پر بے حیائی اور بے غیرتی کی بات کو بروئے کار لاتی ہے اور حیاء دارانہ امور کا نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے، زنا کار، شراب خوری، جوئے بازی، نقب زنی، کذب بیانی اور بدگوئی وغیرہ سارے قبائح پر آمادگی اور ان کا ارتکاب اسی قوت فحش سے ہوتا ہے۔پس حیاء منکرات سے دور کرتی ہے اور فحش منکرات کے قریب لاتا ہے۔پس منکرات شرعیہ کا مصدر اور سرچشمہ فحش ہے اور ان سے بچاؤ کا سرچشمہ اور مصدر حیاء ہے۔

خلاصۂ کلام......خلاصہ یہ نکلا کہ امور خیر یعنی معروفات کی رغبت و تعمیل کا سرچشمہ امانت ہے اور ان کی خلاف ورزی اور درہمی برہم کا سرچشمہ فتنہ ہے اور تمام امور شر یعنی منکرات سے بچاؤ کا سرچشمہ حیاء ہے اور ان کے

---

① الصحيح للبخاری كتاب الادب، باب اذالم تستحی فاصنع ما شئت. ج: ١٩، ص: ٧٩.

② الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب بيان عدد شعب الايمان وافضلها، ج: ١ ص: ١٤٣.

ارتکاب اور سیہ کاری کا سر چشمہ فحش ہے۔ پس امانت و فتنہ حیاء و فحش کی یہی چار قوتیں ہیں جس سے معروف منکر اور بِر و تقویٰ کا تعلق ہے۔ اول دو طاقتوں کا تعلق افعال بر کے کرنے اور چھوڑنے سے ہے اور آخر کی دو قوتوں کا تعلق متروکاتِ تقویٰ کے ترک اور ارتکاب سے ہے۔ اس لئے شریعتِ الٰہی کا کام جو بنی آدم کی تہذیب و اصلاح کی کفیل بن کر آئی ہے۔ یہی ہوسکتا تھا کہ وہ افعال بر کا امر کر کے امانت کی طاقت کو مضبوط بنائے اور اس کی ضد فتنہ کا استیصال کرے اور تروک تقویٰ سے نہی کر کے حیاء کی طاقت کو مستحکم بنائے اور اس کی ضد فحش کا استیصال کر کے کہ یہی عین عدل و احسان ہے۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ ① ''اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا' اور روکتا ہے برے کاموں اور منکر سے' اور نصیحت کرتا ہے تم کو شاید کہ یاد کرو''۔

بِر و تقویٰ سے انقلابِ باطن...... پس یہ امر بالمعروف یا امر بالبر براہ راست قوت امانت پر اثر انداز ہوتا ہے جس سے آدمی امین بنتا ہے اور امین بن کر ایماندار ہوتا ہے ایماندار ہو کر مامون ہوتا ہے جس سے خیر کے عناصر ابھر جاتے ہیں اور فتنے دب جاتے ہیں اور نہی عن المنکر یا ہدایت و تقویٰ براہ راست قوت حیاء پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے آدمی باحیاء بنتا ہے اور حیاء دار بن کر برائیوں اور منکرات سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے شر کے عناصر دب جاتے ہیں اور ایمانداری کے موانع دور ہو کر ایمان اور عمل صالح کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

الحاصل بِر و تقویٰ کے عمل سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تا کہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بِر و تقویٰ اور لائحہ انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پشت کرتا ہے اور اصلاح کے اسی مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جس سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔ الحاصل بِر و تقویٰ کے عملی سلسلے پیش کرنے سے پہلے انسان کے ان چار اندرونی مادوں اور قوتوں کی تشریح ضروری تھی تا کہ یہ معلوم رہے کہ شریعت کا نظام بِر و تقویٰ اور لائحہ افعال و تروک انسان کی کن طاقتوں پر اثر انداز ہوتا ہے کن قوتوں کو ابھارتا ہے اور کن طاقتوں کو پست کرتا ہے اور اصلاح کے اس مثبت و منفی عمل سے انسان کے باطن میں کیا کیا انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ جسن سے اس کا نفس اور بگڑتا ہے۔

اب افعال و تروک یا بِر و تقویٰ (احکام اور امتناعی احکام نیکوکاری اور پرہیزگاری) کے اصولی نقشہ کے عملی پہلو پر نظر ڈالو۔ تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں ایمان باللہ۔ اخلاص للہ، ذکر اللہ تذکر بایام اللہ، تلاوت کلام اللہ، تعظیم شعائر اللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور حضور مع اللہ یا (نماز و دعا اور مجاہدہ و مراقبہ وغیرہ) ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ، اِنفاق فی سبیل اللہ، احسان للہ، اطعام لوجہ اللہ، اخوۃ فی اللہ اور النصح لدین اللہ یعنی عام خیر خواہی بنی

① پارہ: ۱۴، سورۃ النحل، الآیۃ: ۹۰۔

نوع انسان عدل وانصاف وفا عہد اور ایفائے عہد وغیرہ سب کے سب امور بر کے اجزاء ہیں جن کے کرنے سے انسانی نفس سر بلند مقبول اور محبوب خدا وخلق بنتا ہے عند اللہ اس کی وجاہت قائم ہوتی ہے، اور عند الناس اس کی بالا دستی اور برتری مسلم ہو جاتی ہے جس سے وہ دنیا وآخرت کے بلند مناصب ومقامات کا حق دار ہو کر ابرار واخیار کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ لیکن بر (نیکوکاری) کا یہ سارا لمبا چوڑا سلسلہ اس وقت تک کارگر اور موثر نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ نفس انسانی میں سے نفسانیت اور اس کے رذائل کا خاتمہ نہ ہو جو اس امور بر کے حق میں سم قاتل اور قوی مانع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور کسی طرح بھی انسان کو ان سر بلندیوں پر نہیں پہنچنے دیتے مثلاً جب تک انسانی نفس سے باہ کے رذائل جیسے حرص وہوا، ہوس رانی اور بدمستی سے کھانے پینے کی لذتوں میں غرقابی جنسی خواہشات اور نفسانی عیش میں ہمہ وقت سرگردانی کے جراثیم خارج نہ کئے جائیں یا جاہ کے رذائل جیسے ہوس اقتدار، نمائشی وقار کی ہمہ وقت بھوک، جذبات انانیت وخودی اور ہوس ریاست وامارت زائل نہ ہونگے۔

نفسانیت کا شر دور کئے بغیر ملکیت کی خیر قرار نہیں پکڑ سکتی...... خلاصہ یہ نکلا کہ ایک طرف زن، زر، زمین کی جاہ پسندانہ بدمستیوں اور دوسری طرف نفس وہوائے نفس کی جاہ پسندانہ خودی، خود بینی اور خود آرائیوں کا سودا انسان کے سر سے نہ نکالا جائے یا کم از کم ان کے ترک کا خوگر نہ بنایا جائے اس وقت تک انسان پر اعمال بر کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اگر بتکلف چڑھ بھی گیا' تو وہ جڑ نہیں پکڑ سکتا اور اگر اتفاقاً کچھ جم بھی گیا تو پختہ نہیں رہ سکتا۔ ایک ہی شوب میں اڑ جائیگا۔

بہر حال نفس میں روحانیت اور ملکیت کی خیر اس وقت تک جاگزیں نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں سے نفسانیت کا یہ جبلی شر کھرچ کر باہر نہ پھینک دیا جائے، بالفاظ دیگر افعال بر کی قلعی سے اس وقت تک نفس پر چمک دمک نہیں آ سکتی جب تک کہ تروک تقویٰ سے اس کا رنگ خودی اور زنگ انانیت اتارا نہ جائے اور اس تک قلب کے آئینہ میں انوار الٰہیہ منعکس نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس صیقل کر کے شفاف نہ کر لیا جائے ؎

دل را اگر تو صاف کنی ہمچو آئینہ ۔۔۔ درد لے جمال دوست بہ بینی چو آئینہ

عباداتی سال کا آغاز واختتام...... اس لئے شریعت نے اپنے آغاز کار سے لے کر انجام کار تک افعال وتروک اور (مثبت اور منفی احکام) کا رشتہ ملا جلا رکھا ہے۔ اور افعال بر کو تروک تقویٰ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہونے دیا چنانچہ شریعت کا آغاز نزول قرآن سے ہوتا ہے اور نزول قرآن ماہ رمضان سے ہے۔ اس لئے ماہ رمضان گویا شریعت اور اس کی عبادتوں کا سن آغاز سے بالکل اسی طرح جیسے اداروں وکارخانوں اور تعلیم گاہوں وغیرہ میں سال کا آغاز کسی خاص مہینہ سے مقرر کر لیا جاتا ہے، اور اسی ماہ سے اس کے کاروبار کا آغاز سمجھتے ہیں اور اسی سے رجسٹر دفتر اور بہی کھاتے شروع کرتے ہیں مثلاً اسلامی اداروں میں حسابی سال عموماً محرم سے شروع کر کے ذی الحجہ پر ختم کیا جاتا ہے تعلیم گاہوں میں تعلیمی سال عموماً شوال سے شروع کر کے رمضان میں ختم کیا جاتا ہے۔ انگریزی اداروں میں دفتر

سال جنوری سے شروع کر کے دسمبر پر ختم کیا جاتا ہے، ایسے ہی اسلامی شریعت کا دینی اور عباداتی سال ماہ رمضان سے شروع ہو کر شعبان پر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نزول قرآن جو اساس شریعت ہے، ماہ رمضان میں ہوا ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ① ''رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ اس میں قرآن اترا ہے''۔

اسی لئے رمضان گویا عباداتی سال کا نقطہ آغاز نکلا جس سے انسان کا ایمانی نشوونما متعلق ہے۔ اور شعبان نقطہ اختتام ثابت ہوا۔ جو اس ایمانی شباب کے بلوغ کی حد ہے۔ اس لئے بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے مہینے میں عمروں کے اختتام کا اعلان عالم غیب میں ہو جاتا ہے۔ جو درحقیقت اعمال کے انقطاع کا اعلان ہے کہ عمل کا تعلق عمر سے ہی ہے، بلکہ عمر دی ہی گئی ہے عمل کے لئے اس لئے جس آن یہ زندگی ختم ہوگی، اسی آن انسان کا عمل، رزق اور کسب وغیرہ سب منقطع ہو جائے گا۔ یوں بھی ہر سال پچھلے رزق کا حساب ختم کر کے نئے سال کے لئے روزی رزق اس کا ماہ میں تعین کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے۔ پس شعبان اعلان اختتام طاعات وانقطاع اعمال کا مہینہ نکلا جسے عباداتی ال کا نقطہ اختتام کہنا چاہئے۔ جس طرح کہ رمضان اس کا نقطہ افتتاح و آغاز تھا۔

ماہ رمضان نیکیوں کا مرکز اِتصال...... اب رمضان کو لیجئے تو اس میں افعال بر اور تروک تقویٰ کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح گوندھ دیا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ہلال رمضان نظر آتے ہیں اول شب ہی سے اس ماہ کا افتتاح دو چیزوں سے کیا گیا ہے جو اعمال بر کی جان ہیں یعنی تلاوت قرآن اور نماز تراویح۔ یہی دو چیزیں ہیں جس سے انسانی نفس کو قرب خداوندی اور لذت وصال کی دولت میسر آتی ہے۔ نماز تراویح سے تو انتہائی قرب ہوتا ہے۔ کیونکہ بنص قرآن و بتصریح حدیث سجدہ ہی کمال قرب کا ذریعہ ہے جو افعال صلوٰۃ کا اصلی مقصود ہے۔

ارشاد قرآنی ہے ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ ② ''سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ''۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ''اِنَّ اَقْرَبَ مَا یَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ'' ③ ''بے شک بندہ اپنے رب سے قریب تر اس وقت ہوتا ہے کہ وہ سجدے میں ہو''۔ اور قرب بمعنیٰ اتصال ہی نہیں بلکہ بمعنیٰ الصاق بھی ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تصریح ہے کہ بحالت سجدہ انسان کا سر اللہ کے قدموں پر گرتا ہے۔ پس اقربیت یعنی کمال قرب وبقا تو نماز سے ملا اور پھر اس کمال قرب کی بھی تکمیل اور باثمرہ ہو جانا روزانہ کے چالیس سجدوں سے ہو جائے گا۔ کیوں کہ بیس رکعت میں چالیس سجدے ہوتے ہیں اور چالیس کے عدد کو تکمیل شے میں خاص دخل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام و تو راۃ ۔ ینے کا وقت آیا تو چالیس دن کا چلہ کرا کر مناسبۃ مع الغیب کی تکمیل وتقویہ کرائی گئی۔ اور بنص حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلب سے حکمت کے چشمے پھوٹ نکلے یعنی قلب کی ایک خاص علمی تکمیل کے لئے چالیس دن کا مخلصانہ عمل تجویز فرمایا گیا جس سے حضرات صوفیاء کرام نے چلہ کشی کا اصول اخذ کیا۔ غرض چالیس کے عدد

---

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵۔ ② پارہ: ۳۰، سورۃ العلق، الآیۃ: ۱۹۔

③ الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب ما یقول فی الرکوع والسجود، ج: ۳، ص: ۲۹۔ ۱

کو تکمیل حال و خیال میں خاص دخل ہے۔ اس لئے رمضان کی تراویح میں روزانہ چالیس سجدے پیاپے کرائے گئے۔

بندہ و خدا میں ربط باطنی ...... پھر اس کمال قرب کو بے ثمر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ اس کے ساتھ کمال وصال کی سبیل تلاوت قرآن سے کی گئی کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن کو اللہ کے باطن کی چیز فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے "تَبَرَّکْ بِالْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ کَلَامُ اللّٰهِ وَخَرَجَ مِنْهُ" ① "قرآن سے برکت حاصل کرو، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے"۔ اس سے واضح ہوا کہ قرآن اللہ کے اندر سے نکلی ہوئی چیز ہے جو تلاوت کے ذریعے ہمارے اندر پہنچ جاتی ہے یعنی اس کے باطن سے چلتی ہے اور ہمارے باطن میں پہنچ جاتی ہے، جس سے اللہ اور اس کے بندے کے درمیان باطنی ربط پیدا ہوتا ہے۔

کامل ترین ملاپ ...... ادھر ایک دوسری حدیث میں تلاوت قرآن کو محادثہ مع اللہ یعنی اللہ سے باتیں کرنا بتلایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ بات کر کے متکلم اور مخاطب اپنا اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچا دیتے ہیں، جسے علمی قرب کی انتہائی منزل کہنا چاہئے۔

پس! تلاوت کے ذریعے ہمارے اور اس کے باطن کا ریل میل کچھ اس شان سے ہو جاتا ہے کہ اس سے زیادہ توافق اور تواصل کی دوسری صورت نہیں ہوسکتی کیونکہ جسمانی میل میلاپ اور وصل صرف اطراف بدن کے مل جانے کی حد تک ہوتا ہے ایک جسم دوسرے جسم میں سما نہیں سکتا، گویا جسمانی وصال بھی محض سطحی ہوتا ہے۔ اور اس میں لذت بھی اگر ہوتی ہے تو سطحی اور عارضی، لیکن روحانی ملاپ ہے کہ جسمانی میل ملاپ تو بجائے کود ہے، روحانی میل ملاپ تو بجائے، خود ہے، روحانی میل ملاپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ پھر اس وصل و وصال اور میل ملاپ کو بھی اگر دیکھا جئے تو وہ بھی وسیلہ ہی ہے۔ اصل مقصد قبول ہے نہ کہ وصول۔ اگر وصول ہوا اور قبول نہ ہو تو وہ وصول بے کار ہے۔ بادشاہ کے یہاں وصول تو شاگرد پیشہ اور کم مرتبہ ملازمین کو بھی ہو جاتا ہے مگر قبول نہیں ہوتا وزیر اعظم اور امراء شاہی اگر واصل ہوتے ہیں تو یہ محض وصول ہی نہیں بلکہ ان کا قبول بھی ہوتا ہے۔

اعترافِ قبولیت ...... سو اس تلاوت تراویح میں جبکہ فاتحہ کی تلاوت ضروری ہے اور ہر رکعت میں ضروری ہے۔ خواہ بلاواسطہ ہو یا بواسطہ امام، اور اس کی ایک آیت پر ادھر سے قبولیت کا بروقت اعتراف و اعلان کیا بھی جاتا ہے۔ بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری تعریف کی) وہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تو فرتے ہیں اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ، میرے بندہ نے میری ثناء وصفت بیان کی۔ جب یہ کہتا ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تو فوراً فرماتے ہیں مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ (میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی) جب یہ کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو فرماتے ہیں هٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ (یہ میرا اور بندہ کے درمیان کا معاملہ ہے) جب وہ سوال کرتا ہے اور اِهْدِنَا سے آخر تک پڑھ جاتا ہے تو

---

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

فوراً فرماتے ہیں۔ وَلِعَبْدِیْ مَاسَاَلَ (میرے بندہ کے لئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے مانگا ہے) تو یہ بروقت اقرار و اعتراف اور بندہ کو اپنا کہہ کر اس کی بات کو سراہنا ہی قبول ہے جس کے لئے وصول کی تمنا کرتے ہیں۔ ①

بشری عروج کا نقطۂ کمال...... پس تراویح و تلاوت میں ابتدائی مرتبہ قرب اتصال کا ہے جو نماز سے حاصل ہوتا ہے پھر قرب سے وصول و وصال کا ہے جو تلاوت سے حاصل ہوتا ہے اور پھر وصول سے قبول و رضا کا ہے جو تلاوت خاص کے مکالمہ سے حاصل ہوتا ہے غرض تراویح و تلاوت سے حضرت حق کی ہم نشینی، معانقہ اور مکالمہ، تراضی طرفین کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جس سے آگے بشری عروج و کمال کا کوئی اور مقام نہیں۔ لیکن نظر اس پر کیجئے کہ جہاں رمضان کی راتوں میں نماز و تلاوت سے وصول و قبول کی لذتیں دی جاتی ہیں۔ وہیں اس مبارک مہینہ کے دنوں میں نفس کی ہوسنا کیوں اور نفسانی لذات کو بھی قوت سے ترک کرایا جاتا ہے۔ کھانا پینا بھی ترک، مقاربت نسواں بھی بند حتیٰ کہ ان چیزوں سے خالی لذت لینا بھی ناپسندیدہ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ شب کی غیر معمولی لذۃ وصول و قبول، جو افعال بر میں سے فعل تراویح و تلاوت سے ملتی تھی بغیر ان تقوائی تروک کے میسر آنی ناممکن تھی۔

پس رمضان کے مہینہ میں دن بھر روزہ کے ذریعہ جو مجموعہ تروک ہے نفس کو مانجھا اور صاف کیا جاتا ہے اور شب کو اس صاف شدہ ظرف پر تلاوت و تراویح سے جو مجموعہ افعال بر ہے قلعی کی جاتی ہے جس سے وہ چمک اٹھتا ہے اور اس میں قرب و اتصال اور قبول و وصال کی اس چمک دمک سے انوار خداوندی منعکس ہونے لگتے ہیں گویا نفس انسان۔ میں نفس رحمان نظر آنے لگتا ہے۔ پس ماہ رمضان جیسے بر کا مہینہ ہے ویسے ہی تقویٰ کا بھی مہینہ ہے۔ اور جیسے اس میں اثم سے بچاؤ میسر آتا ہے ویسے ہی اس میں عدوان سے بچاؤ کی توفیق ملتی ہے۔

روزہ اور ماہِ روزہ کا ثمر...... اس لئے قرآن حکیم نے جب رمضان کے روزوں کا ذکر کیا تو اس کا سب سے بڑا ثمرہ تقویٰ بتلایا ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ② ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پچھلوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ''۔ اور جب خود ماہ رمضان کا ذکر کیا جس میں دنوں کے ساتھ راتیں بھی شامل ہیں تو نزول قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا سب سے بڑا ثمرہ نور ہدایت، نور دلائل اور نور معرفت ظاہر فرمایا جو در حقیقت انسانی نفس کی چمک دمک اور قلعی کا سب سے اعلیٰ سامان ہے۔ ﴿شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ﴾ ③ ''مہینہ رمضان کا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کے کھلے دلائل کا مجموعہ اور قوت تمیزی کا علم ہے''۔ گویا روزہ کا ثمرہ تقویٰ اور ماہ کا ثمرہ بر نکلا اور اس طرح قرآن کریم سے ماہ رمضان بر و تقویٰ کا مہینہ ثابت ہوا جس سے اثم و عدوان کا خاطر خواہ دفعیہ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب وجوب قراۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ. ج: ۲، ص: ۳۵۲.

② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۳. ③ پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۵.

اثم وعدوان کے چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ نفس کا دانہ پانی بند ہو جاتا ہے۔ اور شیاطن قید کر دیئے جاتے ہیں جو اثم وعدوان پر ابھارتے تھے۔ ایک دانا دشمن کی حیثیت سے اور ایک نادان دشمن کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ دونوں دشمنوں کے اسیر ہو جانے پر اثم وعدوان کا دفعیہ قدرتی تھا۔

صیام و قیام کا باہمی تناسب...... اس لئے روزہ تلاوت تراویح یعنی صیام و قیام کا تناسب اور ایک سے دوسرے کا رابطہ بھی واضح ہو گیا کہ ایک تخلیہ کا مقام ہے یعنی روزہ جو انسان کو رذائل نفس سے پاک کرتا ہے اور ایک تحلیہ کا مقام ہے یعنی قرآن اور تراویح جو نفس انسانی کو چمک دار اور نورانی بناتا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن صیام وقرآن کی شفاعت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں بطور قرین وعدیل کے ذکر فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ مضمون حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن صیام وقرآن دونوں مل کر بندہ کے شفاعت کریں گے۔ روزے کہیں گے کہ خداوندی! ہم نے دن بھر اس بندہ کو کھانے پینے اور شہوانی لذتوں سے محروم رکھا تو اس کے حق میں ہماری شفاعت کو قبول فرما، قرآن کہے گا۔ خداوند! میں نے اس بندہ کو راتوں میں نیند اور آرام سے محروم رکھا تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی شفاعت کا انجام سوائے قبولیت شفاعت کے دوسرا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قرآن کلام الٰہی اور صفت خداوندی ہے۔ تو اس کی شفاعت ایک صفت الٰہی کی شفاعت ذات سے ہے، جو ذات سے جدا نہیں۔ اس لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ خود ہی اپنی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے۔ تو کون ہے کہ اس شفاعت کو رد کر سکے؟ اور وہ خود کیسے رد فرمائے گے

چوں خدا از خود سوال و کد کند　　　پس دعائے خویشتن چوں رد کند

ادھر روزہ کو تمام عبادات میں حق تعالیٰ نے اپنی چیز فرمایا ہے۔ اور یہ کہ میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا اور ظاہر ہے کہ اپنی چیز کو آنا کہہ کر کون بے آبرو کیا کرتا ہے کہ اسے رد کرے۔ اس لئے صیام وقرآن کی شفاعتیں رد ہونی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس سے صاف واضح ہوا کہ شریعت نے اپنے عباداتی سال کا افتتاح افعال وتروک دونوں سے کیا ہے جو تربیت انسانی کے دربازو ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ دونوں میں ترک کو اصل رکھا اور افعال اس کے ضمن میں رکھے، اور راتوں میں افعال کو اصل قرار دیا اور تروک اس کے ضمن میں بقدر ضرورت آجاتے ہیں، جو بوقت تلاوت وصلوۃ قائم رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے اس کی راتیں روشنی میں دونوں سے کم نہیں ہیں بلکہ لَیْلُهَاوَ نَهَارُهَا سَوَآءٌ کی مصداق ہیں۔

ہلالِ عید...... جب رمضان کے یہ معدودے چند ایام اس شان سے پورے ہو جاتے ہیں کہ اس کے دن تروک میں مصروف اور اس کی راتیں افعال میں مشغول تو ہلال عید تکمیل عبادت کا مسرت بخش پیغام لے کر فضاء آسمان میں نمودار ہو جاتا ہے۔ گویا منجاب اللہ آسمان سے اطلاع دیجاتی ہے کہ اے بندگان الٰہی! تم نے وہ فرض پورا کر دیا جو ہلال رمضان نے تمہارے ذمہ عائد کیا تھا۔ تم نے اپنے دنوں کو نفسانی لذتوں (طعام وشراب اور مقاربت) سے بے نیاز رکھ کر خداوندی قرب ووصال کی لذتوں کو ترجیح دی اور اپنی راتوں کو لہو الحدیث اور قصہ کہانیوں میں گنوانے

کی بجائے خیر الحدیث اور احسن القصص کے کہنے اور سننے میں مشغول رکھا اس لئے تمہیں ہلال عید کے نورانی حروف کے ذریعے مبارک باد دی جاتی ہے کہ تم کامیاب ہوئے اور منزل تک پہنچ گئے اس پر بندوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے قدرداں اور مشکور پروردگار کا جان و مال سے شکریہ ادا کریں چنانچہ عید کی صبح ہوتے ہی اولاً صدقۂ فطر ادا کر کے مال سے اور پھر دوگانہ عید ادا کر کے جان و مال سے اپنے محسن رب اور منعم پروردگار کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے تیس دن کی یہ حقیر اور ناچیز قربانی قبول فرمائی اور دورانِ قربانی میں تو خصوصی طور پر لذتِ قرب و وصال سے نوازا۔ اور بعد تکمیل ہلالی حروف سے اپنی خوشنودی کا علان عام فرمایا۔

تتمۂ رمضان...... پس عید درحقیقت رمضان کے افعال و تروک کا ایک عملی شکریہ ہے جو بندوں کی جانب سے جنابِ خداوندی میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شکریہ پر حسب وعدہ الٰہی ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ ① (اگر تم شکر گزار ہو گے تو تمہاری نعمت میں اضافہ کروں گا) بسلسلہ اضافہ نعمت شش عید یعنی شوال کے ۶ روزوں کا مزید اضافہ کیا جاتا ہے جنہیں رمضان تو نہیں تتمہ رمضان کہا جائے گا۔ کیونکہ رمضان کی مدت ایک ماہ کی مدت جو ایک منضبط اور معتدل مدت ہے جس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی۔

سال سے کم اور ہفتہ سے زیادہ ایک درمیانی مدت ہے۔ اس میں اگر ایک دن کا بھی اضافہ ہو جاتا تو دوسرا ماہ لگ جانے سے رمضان کی مدت دو ماہ ہی کہلاتی۔ اور روزے ایک ماہ کی بجائے دو ماہ کے کہلائے جاتے جو یقیناً طبائع پر بھی شاق گذرتے، مدت بھی معتدل نہ رہتی اور اس میں کسر بڑھ جانے سے مدت کا انضباط بھی فوت ہو جاتا۔ اس لئے روزہ کا ایک ماہ پورا کرا کر اور درمیان میں ایک دن خوشی اور کھانے پینے کا دے کر بطور تتمہ رمضان ۶ روزے اور دیئے اور وہ بھی غایت رحمت سے اختیاری دیئے گئے جن میں کوئی جبر و اکراہ نہیں تاکہ بندوں پر بھاری بھی نہ ہو اور خدا کی طرف سے اس شکر گذاری پر حسب قانون الٰہی زیادت نعمت کا وعدہ بھی پورا ہو جائے۔ گویا اس طرح اس عباداتی سال کا افتتاح ۳۶ روزوں اور ۳۰ دن کی تراویح سے کر دیا گیا۔ یعنی ۳۶ تروک ۳۰ افعال سے انسانی عبادت کا سال شروع ہوتا ہے۔

عبادت کا ہمہ گیر نقطۂ آغاز...... غور کرو تو رمضان میں عبادت کا یہ جمع شدہ ذخیرہ رمضان ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ سال بھر تک یہی ذخیرہ توفیق و برکات کا کام دیتا ہے اگر یہ ذخیرہ اس ماہ میں جمع نہ ہوتا تو پورا سال عبادت سے بیگانگی اور برکات باطن سے محرومی میں بسر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اصولاً ہر شے کے نقطہ آغاز ہی میں اس کا انجام اور وسط پنہاں ہوتا ہے۔ وہ نقطہ پھیل کر وسط سے گذرتا ہوا انجام تک جا پہنچتا ہے یعنی آخر تک اسی کا نقطہ فیض کام کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ہر کلمہ اور کلام کا نقطہ آغاز حروف مقطعات (حروف تہجی) ہیں اس لئے ہر کلمہ و کلام اور لمبی سے لمبی عبارات میں فیض ان ہی حروف ہجا کا ہوتا ہے درخت کی ہر شاخ اور پھول پتی کا نقطہ آغاز اس کا تخم ہے، تو

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷۔

وہی تخمی مادہ پھیل پھیل کر پھول پتیاں اور برگ وبار بنتا رہتا ہے۔ وہ نہ ہوتو نہ شاخ ہو نہ برگ وبار، گویا سارے برگ وبار درحقیقت اس تخم کا فیض ہوتی ہیں۔

اعداد کا نقطۂ آغاز واحد ہے وہی (ایک) مکرر سہ کرر ہوکر دو اور تین اور سوا لاکھ بنتا رہتا ہے، وہ نہ ہوتو دو نہ ہوں نہ سو اور نہ لاکھ گویا ارب ہاراب اور کھرب در کھرب فیض صرف ایک ہی کا ہوتے ہیں۔ خود بذاتہ کچھ نہیں، اس اصول پر سمجھو کہ عباداتی سال کا نقطہ آغاز رمضان المبارک اور اس کے افعال وتروک ہیں۔ (جیسا کہ ابھی واضح ہوا) یہی ایک حصہ افعال وتروک کا ذخیرہ درحقیقت سال بھر کی عبادت کا نقطہ آغاز ہے اس لئے یہی مادہ عبادت پورے سال کی عبادت کا مادہ ہے جو رنگ بدل بدل کر مختلف طاعات میں ظہور کرتا رہے گا۔ گویا سال بھر کی مختلف الانواع عبادتیں اور بروتقویٰ کے مختلف مظاہر اس ماہ کے صبر واستقامت کا فیض ہوتے ہیں، یہ نہ ہوتو سال بھر کی توفیق وبرکت درجہ صفر میں رہ جائے۔ جیسا کہ روایات حدیث میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

ماہ رمضان کے اعداد کا اثر...... شاید اس لئے اس ماہ مبارک کے افعال وتروک کے اعداد کچھ ایسی مناسب سے رکھے گئے ہیں کہ برکۃً ہی نہیں عدداً بھی پورے سال پر پھیل سکیں۔ بلکہ ان کی ایک ایک اکائی دوسرے مہینوں کی دہائیوں کے برابر ثابت ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ آخر رمضان میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ کا ایک حصہ یہ ہے۔ ''يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ خَصْلَةً مِّنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فِيْمَا سِوَاهُ'' [1] ''اے لوگو! تم پر سایہ گستر ہوا ہے ایک عظمت والا مہینہ ایک برکت والا مہینہ، وہ مہینہ جس میں ایک رات، ہزار رات سے بہتر ہے اللہ نے اس میں روزے فرض کئے ہیں اور قیام لیل (تراویح) نفل رکھی ہے جس نے اس مہینے میں کوئی بھی بھلائی کی بات کی تو وہ ایسا ہے کہ کسی شخص نے ماسوا رمضان کے (بقیہ سال میں) کوئی فریضہ ادا کیا۔ اور جس نے اس ماہ میں فریضہ ادا کیا مثلاً (روزے رکھے) تو وہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے غیر رمضان میں (بقیہ سال) میں ستر فریضے ادا کئے''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اس ماہ کی نفل بقیہ سال کے فرض کے برابر ہے اور اس کا فرض بقیہ سال میں ستر فرائض کی برابر ہے۔ گویا بلحاظ برکت ہی نہیں بلکہ بلحاظ اجر اور عدد بھی اس مہینہ کی طاعت کی ایک اکائی دوسرے مہینوں کی طاعت کی دہائیوں کے برابر ہے۔ ماہ رمضان کے دنوں کو دیکھئے تو ان میں ۳۰ روزے رکھے گئے ہیں اور شریعت کی بخششیں بے کراں نے ایک نیکی کو دس نیکی کے برابر شمار کیا ہے۔ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [2] اس اصول پر یہ ۳۰ روزے ۳۰۰ ہو جاتے ہیں۔ اور ادھر عید کے بعد شش عید جو بطور تتمہ وتوابع رمضان کے ساتھ لاحق کئے گئے ہیں (گو بوجہ تسہیل ورحمت انہیں اختیار رکھا گیا اور جزو رمضان نہیں بنایا گیا) اصول مذکورہ

---

[1] شعب الایمان للبیهقی، فضائل شهر رمضان، ج:۸ ص:۱۲۰۔ [2] پارہ:۸، سورۃ الانعام، الآیۃ:۱۶۰۔

پر ۶۰ ہو جاتے ہیں تو رمضان کے اصل اور ملحقہ روزوں کا مجموعہ بھی وہی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اور اس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے تعداد ہے۔ اوراس کا حاصل بھی وہی نکلا کہ رمضان کے یہ انعامی ۳۶۰ روزے سال بھر کے اوپر ۳۶۰ دنوں کے مساوی ہیں اور رمضان کے یہ اصل اور توابع روزے پورے کر دینے والا سال کے تمام روزے رکھنے والا بن کر صائم الدہر بن جاتا ہے۔ اسی مضمون کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ ذیل میں ارشاد فرمایا ہے۔ جس کو حضرت انصاریؓ روایت فرمارہے ہیں "مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ" ① "جس نے رمضان کے روزے پورے رکھے۔ پھر شوال میں ۶ روزے ان کے ساتھ اور ملا لئے تو تو یہ عمر بھر روزے رکھنے کی مانند ہے" (رواہ مسلم)۔ ② حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے "اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ اِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ" ③ "پانچ نمازیں جمعے سے جمعہ رمضان سے رمضان تک درمیانی دنوں کے گناہوں کا کفارہ یہ رمضان ہی ادا کر دیتا ہے جبکہ کبیرہ گناہوں بچتا رہے"۔

اس سے واضح ہو گیا کہ رمضان ہی کی اطاعتوں اور مغفرتوں کا فیض سال بھر تک چلتا رہتا ہے۔ اور یہی فیض منتشر ہو کر سال بھر کے دنوں راتوں کی عبادت اور توفیق کی شکل اختیار کرتا رہتا ہے۔ نہ صرف برکۃً یا اثرًا بلکہ عدداً بھی رمضان سال عبادت کا نقطہ آغاز اور تخم توفیق تھا۔ اس لئے مادہ توفیق و طاعت سال بھر کی عبادت کے برگ و بار کی آبیاری کرتا ہے اور پورے سال پر چھایا ہوا رہتا ہے۔

رمضان اور اشہرِ حج کا باہمی ارتباط...... یہی وجہ ہے کہ رمضان کے ایام نے جن تروک (ترک طعام ترک شرب اور ترک خواہشات) کا پرداز ڈالا وہ رمضان ہی پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان تروک سے دوسرے اور تروک نشو نما پاتے ہیں اور تقویٰ کے آگے کی منزلیں سامنے چلی جاتی ہیں، جو اگر رمضان میں نہیں ہوتیں مگر رمضان ہی کے تروک کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ ماہ رمضان میں طلب حق نے محبت حق کی خاطر اپنے نفس کی عظیم آرزوؤں یعنی کھانے پینے اور لذت نفسانی کی چیز کو ترک کر کے ترک ہوائے نفس کی استعداد پیدا کر لی تو تروک کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ کھانے پینے اور قرب و وصال کی لذتوں کے سوا اور بھی بہت سی لذات ہیں جن کی خواہش نفس میں ہمہ وقت موجزن رہتی ہے یہ تو صرف باہ کے سلسلہ کی لذتیں تھیں۔ جنہیں رمضان نے ایک دم چھڑا کر فی الجملہ صبر کر لینے کی قوت انسان میں پیدا کر دی تھی۔ لیکن ان سے زیادہ سخت اور ہولناک جاہ کے سلسلہ کی لذتیں ہیں۔ جو انسان کو مغرور و متکبر بنا کر مشاہدہ حق ہی سے نہیں جادہ حق سے بھی بھٹکا دیتی ہیں۔ اور قرب و وصال کے درجات میں سدراہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب استحباب صوم ستة ايام من شوال... ج:٦ ص:٦٦.

② الصحيح لمسلم، كتاب الصيام، باب استحباب صوم ستة ايام من شوال ج:٦ ص:٦٦.

③ الصحيح لمسلم، كتاب الطهارة، باب الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة. ج:٢ ص:٢٣.

ہو جاتی ہیں کبھی مکان اور بلڈنگ سے اپنے کو باوقار کہلانے کی کوشش کرتا ہے کبھی اپنے قبیلے اور دوست احباب کے اجتماع اور جمگھٹوں سے اپنے لئے شیخی اور فکر کا سامان بہم پہنچا تا ہے کبھی اپنی متانت اور سنجیدگی و بامعنی خاموشی کی نمائش سے اپنے سے وقار کی نمائش کرتا ہے کبھی اپنی زینت وآرائش اور خوبصورتیوں پر گھمنڈ کر کے اپنے خیال میں بدقسمت ہو جاتا ہے اور پھر ان ہی جاہ پسندانہ اندازوں سے دوسروں پر ظلم و تعدی وغیرہ کی بنیادیں کھڑی ہوتی ہیں جن سے دنیا میں فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے اور دنیا امن وسکھ سے محروم ہو جاتی ہے۔

غرض جاہ پسندی اور دوسروں پر بڑا بننے اور عوام میں امتیازی شان نمایاں کرنے کے مختلف ڈھنگ ہیں اور مختلف راستے ہیں جس سے گزر کر ایک مغرور انسان قرب الٰہی اور وصال حق سے محروم ہو جاتا ہے اس لئے ان کا ترک ان تروک سے بھی زیادہ ضروری ہے جن کی رمضان نے مشق کرائی تھی۔

اس لئے جونہی ان باہی اور شہوانی لذات کے افراط سے نجات پا جانے کی استعداد پیدا کر کے رمضان رخصت ہو جاتا ہے ویسے ہی حج کے مہینے شروع ہو جاتے ہی، جو حج کا پیغام دیتے ہیں جس طرح ہلال رمضان نے اعلان کیا تھا کہ اگر دربار الٰہی میں حاضر ہو کر قرب ووصال شاہی منظور ہے تو شہوانی لذات سے پاک وصاف ہو کر اور انہیں ترک کر کے دربار شاہی (مساجد) میں تراویح وتلاوت کے لئے حاضر ہو جاؤ۔ اسی طرح ہلال شوال اعلان کرتا ہے کہ محل سرائے شاہی (حرم کعبہ) یعنی سید المساجد میں حاضری اور خلوت محبوب مطلوب ہے تو ان جاہ پسندیوں کو ترک کر کے عاشقانہ وارفتگی پیدا کرو اور خدا کے گھر کی طرف پروانہ وار بڑھو مگر ع

شرط اول قدم آن ست کہ مجنون باشی

یہ سامان وقار چھوڑو، اسباب جاہ ترک کرو۔ وسائل غرور وگھمنڈ کو خیر باد کہو اور دیوانہ وار محبوب حقیقی کی طرف چلو، سب سے پہلے گھربار اور وطن ترک کرو اور اپنا گھر چھوڑ کر محبوب کے گھر کی طرف کوچ کرو اپنا شہر چھوڑ کر خدا کے بلد امین کی طرف بڑھو عزیز واقرباء کی موانست مانع وصال الٰہی ہے تو اسے بھی چھوڑ دو مسافرت اور غربت اختیار کرو جتھے اور قبیلے کی طاقتوں پر بھروسہ تھا تو اسے بھی خیر باد کہو کسمپرسی اور بے کسی کی شان سے گھر سے نکل کھڑے ہو۔ پھر نکلو تو دیوانوں کی طرح عاشقوں کی طرح نکلو۔

عاشقی، درویشی اور سرشاری...... سب سے پہلا سامان وقار لباس اور اس کا فیشن ہے اس ترک کر کے احرام باندھو اور ایک لنگی کندھے پر اور ایک لنگی گھٹنوں میں یعنی شاہانہ رئیسانہ اور منعمانہ ٹھاٹھ چھوڑ کر فقیروں کا بھیس بھرو اور مسکینوں کی سی وضع بناؤ کپڑوں کی بو کا بھی دھیان نہ رہے۔ کہ خوشبو کی فکر ہو۔ عاشق کو ان نمائشی چیزوں سے کیا واسطہ اگر وہ عشق سے مغلوب ہے۔ بدن کی صفائی ستھرائی کے دھیان کو ترک کرو الحج العج والثج حج تو نام ہی ہے میلے کچیلے رہنے یعنی صفائی ستھرائی کے خیال کو غیر سمجھ کر ان سے بے نیاز ہو جانے کا بدن کے بناؤ سنگار کی فکریں چھوڑو نہ غسل کی پرواہ نہ حجامت کی خبر نہ خط کی اصلاح نہ ناخنوں کے بڑھے ہوئے کی فکر حتی کہ میلے بدن میں جوئیں بھی

پڑ جائیں تو انہیں بھی مت چھیڑو کہ تم محبوب کے عاشق بن کر چلے ہو تمہیں جانداروں کے قتل و غارت سے کیا سروکار؟ چہرہ غبار آلود پیر گرد آلود نہ سر پر ٹوپی نہ پیر میں جوتہ نہ کندھوں پر عباء وقباء نہ بال سنوارے ہوئے نہ مانگ نہ پٹی نہ ان میں تیل پھر بولنے میں نہ آواز بنانے کی فکر نہ الفاظ کے سنوارنے کی فکر نہ کلمات کی سجاوٹ، نہ عبادت کی زینت، بلکہ سرے سے ہی فضول کلام ترک کر دو، ورد زبان ہو لبیک کبھی پست آواز سے ہو تو کبھی بلند آواز سے کبھی آہستہ سے اور کبھی شور کے ساتھ یعنی آوازیں بھی عاشقانہ۔

مگر دیوانگی پیدا کرو۔ قافلے میں ہو تو لبیک لبیک کا شور ہو۔ زمین کی اونچ نیچ آ جائے تو چلا پڑو تا کہ آواز کا وقار جس کی بناوٹ اور سجاوٹ کی فکر تھی مٹ کر رہ جائے غرض نہ بات اپنی نہ کلام اپنا۔ بات ہو تو محبوب کی اور کلام ہو تو شوق محبوب اور ذوق عشق کا، یعنی زبان اور گلا صرف اسی کے لئے وقف ہو۔ محبوب کا گھر آ جائے تو آواز شوق بلند کرو، شوق و ذوق میں کبھی خانہ محبوب کے پتھروں کو چومو، کبھی پردہ دیوار کو تھام کر روؤ اور چیخو، کبھی اس گھر کے اردگرد پروانوں کی طرح گھومو، نثار ہو، کبھی یاد میں غرق ہو کر سرنگوں ہو اور کبھی بھکاری بن کر بانگ سے سرفراز ہو، کبھی فریاد اور کبھی یاد کرو، کبھی قرب کا شکریہ کبھی بعد کا شکوہ، پیر چکر میں ہوں اور زبان عشق کی حرکت میں، پھر ان چکروں میں چال بھی ایک انداز کی نہ ہو جس سے چال کی خوشنمائی کا وقار آ گے آئے، اگر چند پھیروں میں سیدھے چلو تو چند پھیروں میں اکڑ کر مونڈھے ہلا ہلا کر سینہ تان کر چلو۔ یعنی کبھی در محبوب کے مسکین بن جاؤ۔ اور کبھی محبوب کے سپاہی ہو جاؤ، صورت و سیرت ہی نہیں مرضی بھی تمہاری کوئی اپنی نہ ہو۔ ایک مرضی محبوب ہو اور تم ہو، مرضی حق ہو اور اس کی پیروی تا کہ اندرون میں کوئی شیخی و غرور نہ رہ جائے اور نہ بیرون پر کوئی اتراہٹ اور ناز و انداز کی نمود آئے۔

صورت وقار کی بھی ممانعت...... پھر یہ کفنی کا لباس بھی ان پھیروں میں کبھی ایک ہیئت و رنگ پر نہ ہو کہ صورت وقار پیدا ہو جائے اگر پہلے تین پھیروں میں وہ بر جائے خود نہ ہو۔ تو چار پھیروں میں اسے دائیں کندھے کے اوپر کو لیا جائے۔ تا کہ اس کفنی کے اوڑھنے اور پہننے میں بھی کوئی اتفاقی پھبن اور سجاوٹ پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی عاشقی کے شایاں نہیں یعنی اگر غیر اختیاری پھبن بھی سجاوٹ بن جائے تو وہ بھی یکسر مٹ کر رہ جائے۔ پھر ان گھومنے کے پھیروں میں گو دیوانگی تھی مگر چال ڈھال اور رفتار معمول کی مطابق تھی اس لئے اس کو بھی ختم کرو۔ صفا و مروہ پہنچو تو چال کہیں آہستہ ہو تو کہیں دوڑ بھاگ بھی ہوتا کہ چال کا انداز بھی ایک انداز پر باقی نہ رہے جیسا کہ طواف میں ہیئت بدن کا اپنا انداز مٹا دیا گیا تھا۔ غرض اسی طرح اس عاشق حق کے لباس، بدن، زینت، چال ڈھال، سیرت و صورت، کلام، آواز، رفتار، گفتار وغیرہ میں کوئی شائبہ نمائشی وقار و متانت کا باقی نہ رہ جائے۔

خانہ بدوشی...... پھر اگر چہ تم نے وطن اور وطن داروں کا انس چھوڑ دیا، بلد امین میں پہنچ گئے، مگر بلد امین بھی تو بہر حال آبادی ہے جس میں اپنا نہیں تو اس شہر والوں کا سامان زینت، لذت بخش، انکی آوازیں انس افزائے سمع و گوش اور ان کی ملاقاتیں، انس افزائے دید و دل تو ہوتی ہیں جو وصال یار میں حائل ہو سکتی ہیں۔

اس لئے مکہ کی آبادی بھی ترک کرو کہ وہ پھر وطن اقامت اور محل موانست ہے جنگل بیاباں میں بسر کرو جہاں نہ گھر ہو نہ در، نہ تمدن، نہ عمارت نہ سامان معاش، نہ اسباب رفاہیت، عرفات کے ریگستان میں جلتی دوپہر میں دھوپ کے سمندر میں گزارو، کسی کپڑے، خیمہ سے اگر دھوپ سے بچاؤ ہو جائے تو فبہا ورنہ سایہ کی لذت بھی ترک کر دو، تپش کو ترجیح دو اور خنکی کی راحت بھی چھوڑ دو، مسکن اور جائے سکون کی فکر میں مت رہو۔ ویرانہ نشین اور صحرا نورد ہو جاؤ۔ خانہ بدوشوں کی طرح یہ دن منیٰ میں گزارو تو رات مزدلفہ میں بسر ہو۔ نہ وہاں پورا دن، نہ یہاں پوری رات، پھر مزدلفہ کی رات بھی اس فکر کے ساتھ گزارو۔ کہ صبح ہی یہاں سے کوچ ہے، مزدلفہ بھی طلوع آفتاب سے پہلے چھوڑ دو، گویا عرفات کے دن کی طرح یہاں کی رات بھی بے فکری سے نہ گزارے کہ عاشق کو چین اور لطف اندوزیوں سے کیا واسطہ؟ پھر مزدلفہ کی آدھی تہائی رات میں خدمت محبوب پیش نظر رہے، علاوہ طاعت وعبادت کے اس میدان کی کنکریاں بھی چنو تا کہ اس میگزین سے دشمن الٰہی اور خود عشاق کے پشتینی دشمن شیطان رجیم کو سنگسار کر سکو جو راہ محبوب میں حائل اور ناصح نادان بن کر سامنے آتا ہے۔ مزدلفہ سے منی میں آؤ تو گویا وہاں دو تین شب قیام ہو، مگر اس کو بھی سفر در انجمن کا مصداق رکھو، ایک جگہ چین سے بسیرا نہ کرو۔ کبھی یہاں سے پھر در محبوب پر جاؤ۔ خانہ محبوب کے گرد پروانہ وار گھومو، واپس ہو تو روزانہ اس شیطان سے لڑائی مول لو جو راہ جاں سپاری میں حائل ہوتا ہے تا کہ صلح جوئی سے بیٹھے رہنے کا سکون وقار بھی ختم ہو جائے، اور وہ بھی رمی جمار سے تا کہ سپاہیانہ وقار کا غرور بھی مٹ جائے اور دنیا دیکھ لے تیر و تفنگ چلانے والا سپاہی آج چھوٹی چھوٹی کنکریاں مارنے پر اتر آیا ہے۔

فدیۂ جان......تو اب وقت آ گیا کہ سر سے اس نفس ہی کو راہ محبوب میں نثار کر دو اور خود اسی کے گلے پر چھری چلا دو، اگر سب کچھ کھو کر جان باقی رہ گئی تھی تو اس سے بھی دریغ نہ کرو، یہ الگ بات ہے کہ محبوب حقیقی محض اپنی شفقت بے پایاں سے ذبیحہ جان کا فدیہ ذبیحہ حیوان سے قبول فرما لے، ورنہ اس راہ میں یہ جان جان آفریں کے سامنے کوئی قیمت نہیں رکھتی اور وہ جب کہ اسی کو بخشی ہوئی ہو تو سودا بہت ہی ارزاں ہو جاتا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بہر حال شکر محبوب کے ساتھ اس کی مرضی کے مطابق منحر میں پہنچ کر اپنا فدیہ ایک جان کی قربانی سے دیدو کہ یہ آخری ترک ہے تروک میں سے جس کے ذریعے وصال محبوب کی آرزو کی جا سکتی ہے۔ بہر حال شہر رمضان نے اگر باہی لذات ترک کرائی تھیں تو اشہر حج نے جاہی لذات کے ترک کا پروگرام پیش کیا، جو ترک وطن، ترک مسکن اور ترک لباس، ترک زینت، ترک راحت، ترک فیشن، ترک نمائش، ترک وقار، ترک جاہ، ترک افتخار ترک نشاط اور ترک مال سے شروع ہو کر ترک جان پر ختم ہو جاتا ہے۔

ایام حج میں یاد رمضان......مگر ساتھ ہی ساتھ باہ کی ان لذات کے ترک سے بھی چشم پوشی نہیں کہ جو رمضان نے سکھلائی تھیں، بلکہ اشہر حج میں خاص تروک کے ساتھ رمضان کے تروک کو بروئے کار لانے کے لئے گویا

نصف ماہ رمضان کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ یعنی چھ روزے شوال کے اور نو روزے عشرہ ذی الحجہ کے اشہر حج میں رکھ کر پندرہ روزوں کا پروگرام اشہر حج میں رکھ دیا گیا ہے، تاکہ ان مہینوں میں بھی آدمی رمضان کو فراموش نہ کر سکے، حتیٰ کہ بعض روایات میں عشرہ ذی الحجہ کے دنوں کو رمضان کے دنوں پر فوقیت اور فضیلت دی گئی ہے۔ دونوں کی لذتوں کا سلسلہ منقطع کرایا جاتا ہے۔ تب آدمی خانہ محبوب کی حاضر باشی اور مشاہدہ حق کے قابل بنتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ رمضان ابتدائی تروک کا مہینہ ہے۔ اور اشہر حج ان تروک کی تکمیل وانتہا کے مہینے ہیں۔

حکمتِ عید قربان...... ہاں پھر جس طرح رمضان کے تروک وافعال کی تکمیل پر یکم شوال کو دوگانہ شکر ادا کیا گیا تھا اور مالی شکریہ میں صدقہ فطر سے عیال محبوب (غرباء واحباب) کی خدمت کی گئی تھی، اسی طرح یہاں بھی حج کے تروک وافعال کی تکمیل پر جو نویں ذوالحجہ تک ہوتا ہے دسویں ذی الحجہ کو اسی انداز سے بجان و دل دوگانہ شکر ادا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد صدقہ اضحیہ (قربانی) سے غربا واحباب کی خدمت کی جاتی ہے تاکہ مالی شکریہ بھی ادا ہو جائے۔

شانِ جلال و جمال کا شکریہ...... پس عیدین کے تہوار اسلام میں رنگ رلیاں منانے کے لئے نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ رنگ رلیوں کو مٹانے اور اس قسم کے تمام مادی اور نفسانی لذتوں اور خواہشوں کو ختم کر کے روحانی قرب و وصال کے شکریہ کے طور پر قائم کئے گئے ہیں، فرق اتنا ہے کہ رمضان کے تروک کے ساتھ افعال بر کے سلسلہ میں نماز (تراویح) کا فعل رکھ لیا گیا جو حق تعالیٰ کے جلال وعظمت کے سامنے اظہار نیاز وعبودیت کے لئے ہے تاکہ اس کی علی الاطلاق آقائی اور حکمرانی کے ساتھ اپنی علی الاطلاق ذلت و نیازمندی اور محکومیت کا ثبوت پیش کیا جائے اور اشہر حج کے تروک کے ساتھ افعال بر کے سلسلہ میں مناسک حج رکھے گئے جو حق تعالیٰ کے جمال ومحبوبیت کے سامنے اپنی شیفتگی اور گرویدگی اور اپنے عشق ومحبت کے جذبات پیش کرنے کے لئے ہیں تاکہ اس کے علی الاطلاق جمال وخوبی کے سامنے اپنا علی الاطلاق عشق ومحبت پیش کر دیا جائے۔

دوسرے رخ سے دیکھئے تو ترک کے سلسلہ میں محکوم اور غلام کو بسلسلہ حاضری ملازمت نفس کی مرغوبات اور خواہشات ترک کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ کھانے کمانے اور اڑانے کے کام کا نہیں رہتا۔ ورنہ اسے خدمت کا وقت کیسے ملتا اور عاشق ومحب کو محض خواہشات نفس ہی نہیں سرے سے نفس ہی کو تج دینا پڑتا ہے، نفس کی شخصیت اور تشخص ہی کو عشق میں گم کر دینا پڑتا ہے اسکی حیثیت عرفی اور طبعی، غرور وقار تو دور کی چیز ہے جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ نماز تو شاہی خدمات بجالانے کے لئے سرکاری طور پر حاضری دربار شاہی ہے جس کے لئے وقت اور عیش کی قربانی کافی ہے مگر شاہی آداب بجالانے کے ساتھ اور حج عاشقی کے جوش میں حرم سرائے شاہی میں شخصی حاضری ہے جس کے لئے جان ومال دونوں کی قربانی ضروری ہے۔ مگر آداب عشق کے ساتھ جس کا حاصل خودگزاری اور خود فراموشی ہے۔

نماز میں سکون ومتانت مطلوب ہے کہ دربار اور دفتر معبودیت میں حاضر ہوتی ہے اور حج سے اسی سکون

ومتانت کومٹایا جاتا ہے کہ عاشقانہ رنگ سے درمحبوب کی حاضری ہے، پس تلاوت وتراویح رمضان کے لئے تو باہی تروک رکھے گئے جن کا تعلق عیش سے تھا سکون ومتانت سے نہ تھا، اوراس کے لئے وقت کی قربانی کافی تھی، لیکن حرم سرائے میں پہنچ کر قرب ووصال کے لئے جاہی تروک بھی ضروری ہو گئے جن کا تعلق جاہ وباہ، عیش ووقار، متانت وہیبت سب ہی سے تھا، تاکہ عاشقی کی مسکنت اور خودگزاری پیدا ہو جائے تو اس کے لئے محض وقت کی قربانی کافی نہ تھی جب تک کہ عین نفس کی قربانی نہ کردی جائے۔

پس عیدالفطر سے شئونِ جلال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو غلام بننا میسر آ گیا اور عیدالاضحٰی سے شئونِ جمال کے حقوق کی ادائیگی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ بندوں کو عاشق ہونا میسر آ گیا۔

اصل عبادت صرف نماز اور حج ہے۔.....اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح حق تعالیٰ علی الاطلاق مالک الملک اور آقا وحاکم ہیں ایسے ہی وہ علی الاطلاق محبوب ومطلوب اور جمیل ومرغوب بھی ہیں اوراس لئے جہاں ایک بندہ کوان کے شاہی دربار (مساجد) میں حکمبر دار اور نیاز مند بن کر حاضر ہونا ضروری ہے وہیں اس کے لئے انکے شاہی حرم (مسجد حرام) میں عاشق وگرویدہ بن کر بھی پہنچنا ضروری ہے، یعنی اس کی بندگی تام وکامل نہیں ہوگی اگر ان میں سے ایک نوع بھی بندگی کی رہ جائے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام میں حج نہ ہوتا اسلام ناقص رہ جاتا کہ شئونِ جمال کے تقاضے منعدم رہ جاتے پس جہاں اسلام کی تکمیل وتتمیم نماز اور حج کے بغیر ممکن نہ تھی، وہیں مسلمان کی تکمیل بھی بغیر ادائیگی نماز وحج کے ممکن نہ تھی۔

اس لئے اسلام کی دو ہی بنیادی عبادتیں اصل نکلتی ہیں، نماز اور حج، ایک جلالی عبادت ہے اور ایک جمالی، بقیہ دو عبادتیں زکوٰۃ وصوم یہ خود اصل نہیں ہیں بلکہ ان دونوں اصلی عبادتوں کے تابع اوران کے مقدمہ وتمہید کے طور پر ہیں، زکوٰۃ مقدمہ نماز ہے جس سے نماز قائم ہوتی ہے کیونکہ نماز اور حاضری دربار میں اگر حارج ہے تو مال ومنال اوراسی کی عیش کوشیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے اس لئے اسے زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے ترک کرا کر دل سے اس کی محبت نکال جاتی ہے تاکہ موانع مرتفع ہو کر مقصود کا جمال سامنے آجائے۔

ادھر روزہ مقدمہ حج ہے سرائے شاہی میں حضوری اور قرب خاص سے لذت اندوزی میں اگر حارج ہے تو نفس اور نفسانیت کے تقاضے یعنی وہ جاہ واقتدار اور کبروغرور ہوتے ہیں۔ اس لئے روزہ سے تروک کی ابتداء کی جاتی ہے اور اشہرحج پر لا کر انہیں مختتم کر دیا جاتا ہے' تاکہ موانع ختم ہو کر مطلوب ہو جائے اس لئے اشہرحج کو رمضان سے متصل رکھا گیا کہ ابتدائی تروک ختم ہوتے ہی انتہائی آ لگیں اور تروک کا سلسلہ متصل رہے۔

پس اسلام میں بنیادی عبادتیں دو ہیں، نماز اور حج اور عبادتیں ان کے مقدمات اور تمہید ہیں یعنی زکوٰۃ اور صوم، بنیادی عبادتوں میں اصل حصہ افعال کا ہے جو مقصود اصلی ہیں اور نفس ان سے آراستہ ہوتا ہے اور تمہیدی عبادتیں یعنی زکوٰۃ اور صیام میں اصل حصہ تروک کا ہے جو مبادی ہیں جن سے نفس کا رذائل سے صاف ہونا ہے۔

اجتماعی دین...... اسلام چونکہ اجتماعی دین ہے اس لئے اس کی یہ اصل عبادتیں نماز اور حج تو اجتماعی رکھی گئیں چنانچہ دونوں میں اصل اجتماع ہے اور دونوں کے لئے امام و امیر ناگزیر ہے جو اجتماعی رنگ کا خاصہ لازمہ ہے اور تمہیدی عبادتیں چوں کہ محض ان اجتماعی عبادتوں کے لئے نفس کو تیار کرنے کے لئے تھیں اور نفس ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ دونوں عبادتیں (صوم وزکوٰۃ) بھی انفرادی رنگ کی رکھی گئیں چنانچہ ہر ایک کا مال اور اس کی مقدار الگ الگ ہے۔ اس لئے ہر ایک کی زکوٰۃ بھی مقدار و مدت کے لحاظ سے الگ الگ ہے۔ اسی طرح ترک طعام وشہوات بھی ہر ایک کا الگ الگ ہے۔ اس لئے روزہ بھی ہر شخص کا اپنا اپنا الگ ہے۔ غرض اسلام کے اجتماعی دن ہونے کا مقتضی بھی یہی تھا کہ اس کی بنیادی عبادتیں تو اجتماعی ہوں اور تمہیدی عبادتوں میں اجتماعیت کی شرط نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب و تربیت میں ایک مسلم کا عباداتی سال افعال و تروک اور بر و تقویٰ سے مخلوط اور ملا جلا رکھا گیا ہے اگر اس کی بنیاد عبادتوں میں سے دو عبادتیں افعال کی قسم سے رکھی گئی ہیں۔ یعنی نماز اور حج تو دو تروک کی قسم سے رکھی گئی ہیں یعنی صوم وزکوٰۃ اور اگر اس عباداتی سال کے ابتدائی مہینے (رمضان) میں افعال بر، تلاوت و تراویح وغیرہ رکھے گئے ہیں تو اسی ماہ میں تروک تقویٰ (ترک طعام وشہوات) بھی رکھے گئے۔

عباداتی سال کے درمیانی روزوں کی اہمیت...... اسی طرح اگر اس عباداتی سال کے درمیانی حصوں مثلاً اشہر حج میں بر، طواف و زیارت اور صلوٰۃ و تلاوت کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے تو ان ہی مہینوں میں جا بجا دونوں قسم کے انتہائی تروک بھی جمع کئے گئے ہیں جن میں صیام عشرہ ذی الحجہ اور بالخصوص صوم یوم عرفہ خاص اہمیت رکھتے ہیں یا مثلاً اشہر حج کے بعد محرم میں جہاں افعال بر تلاوت و نماز اور اذکار وغیرہ معمولا رکھے گئے ہیں۔ وہیں تروک کے سلسلہ میں یوم عاشورہ کا روزہ بھی اہمیت کے ساتھ رکھا جاتا ہے جس سے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جیسے ان درمیانی مہینوں میں بسلسلۂ افعال بر خاص فرائض ہی پر نہیں قناعت کی گئی' بلکہ عام نوافل و تطوعات بھی رکھے گئے ہیں ایسے ہی بسلسلہ تروک تقویٰ محض خاص روزوں صوم یوم عرفہ اور صوم یوم عاشورہ وغیرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر ماہ میں ایام بیض کے تین روزے اور ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کے روزے بھی رکھے گئے ہیں تاکہ درمیان سال کا کوئی مہینہ بھی افعال بر اور تروک تقویٰ سے خالی نہ رہے اور رمضان کی یاد فعل و ترک دونوں حیثیتوں سے تازہ ہوتی رہے، اسی طرح اسی عباداتی سال کے نقطہ اختتام یعنی شعبان میں شب برات کے افعال بر بصورت صلوٰۃ و تلاوت اور مجاہدہ مراقبہ رکھے گئے ہیں جس سے اس رات کا احیاء ہوتا ہے۔

تو وہیں یوم برات کا روزہ بھی سنت اسلام قرار دیا گیا اور پھر بطرز سابق اس خاص فعل و ترک ہی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ افعال بر کے ساتھ شعبان میں زیادہ روزے رکھنے کی تھی۔ گویا شعبان افعال و تروک سے بھرپور رہتا تھا۔ جس میں شب برات کے افعال اور یوم برات کے تروک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہ و سال کا توازن...... بہر حال سال جس کی ابتداء میں رمضان اور اس کے افعال و تروک ہوں اور جس کے

درمیانی مہینوں میں اشہر حج اور محرم وغیرہ کے جامع ترین افعال وتروک ہوں اور جس کی انتہا میں شعبان اوراس کے مخصوص افعال وتروک ہوں تو ظاہر ہے کہ اس سال کی برکت وہدایت اور نورانیت کی' کیا انتہا ہوسکتی ہے' کیونکہ جس چیز کا اول وآخر اور وسط درست وصحیح ہو وہ یقیناً محفوظ اور نجات یافتہ اور ہلاکت سے دور ہوتی ہے۔

پس جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مرحومہ کے اول وآخر اور وسط کا ذکر کر کے بحیثیت مجموعی امت کی نجات اور عدم ہلاکت کا یقین دلایا اور فرمایا: ''كَيْفَ تَهْلِكُ أُمَّةٌ أَنَا أَوَّلُهَا وَالْمَهْدِيُّ وَسَطُهَا وَالْمَسِيحُ آخِرُهَا''...... ''وہ امت کیسے ہلاک ہوسکتی ہے جس کا اول میں ہوں اور جس کے درمیان مہدی ہوں اور جس کا آخر حضرت مسیح علیہ السلام ہوں''۔ ① ایسے ہی بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرد مومن کیسے ہلاک ہوسکتا جس کے عباداتی سال کا اول رمضان المبارک ہو اور جس کا اوسط اشہر حج اور محرم الحرام ہو اور جس کا آخر شعبان معظم ہو۔ پس جس مومن کی عمر پر اس طرح کے سال گزرتے رہیں تا آنکہ اس کی عمر پوری ہوجائے تو یقیناً اس کے دل کی زمین اس اول وآخر اور وسط کے ساتھ جاہ وباہ کے تروک کے ذریعہ نفسانی خس وخاشاک سے پاک ہوگی اور افعال طاعت وعبودیت اور برکے ذریعہ نور وبرکت سے چمک اٹھے گی، اس کے رذائل زائل ہوں گے اوراس میں فضائل داخل ہوں گے۔ وہ نار سے بچ جائے گا اور نور سے سرفراز ہوگا جو حقیقی فوز وفلاح ہے۔ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ② ''جو نار سے نکالا گیا اور جنت (نور محض) میں داخل کردیا گیا تو وہ کامیاب ہوا۔ اور یہ دنیا کی زندگی سوائے دھوکہ کے سامان کے اور کچھ نہیں''۔

ان اوراق پریشان سے امید ہے کہ ناظرین پر رمضان عید اور مناسک حج کی حقیقتیں اور حکمتیں اوران کے آثار ونتائج ایک حد تک واضح ہوگئے ہوں گے جو ان سطور کا مقصد اوراس زیر نظر رسالہ کا نصب العین ہے۔ زیادہ تفصیلات کے یہ صفحات متحمل نہ تھے اس لئے اسی قدر قلیل پر قناعت کی گئی۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقِ

حضرت عبادہ بن صامتؓ نے بیان کیا۔ جب رمضان آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ان کلمات کی تعلیم دیتے۔ ''اَللّٰهُمَّ سَلِّمْنِيْ لِرَمَضَانَ وَسَلِّمْ رَمَضَانَ لِيْ وَسَلِّمْهُ لِيْ مُتَقَبَّلًا'' ③ ''اے میرے اللہ! مجھ کو رمضان کے لئے محفوظ کردے اور رمضان کو میرے لئے محفوظ کردے۔ اوراس رمضان کو بحفاظت میرے لئے قبول فرما''۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا. اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَأَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ آمِيْنَ يَارَبَّ الْعٰلَمِيْنَ.

① مشكوة المصابيح، كتاب المناقب، باب تسمية من سمى من اهل البدر، ج:۳، ص: ۱۷۳۱.

② پارہ:۴، سورۃ آل عمران، الآية: ۱۸۵.

③ كنز العمال، ج:۸ ص: ۵۸۴ رقم: ۲۴۲۷۷ (طب في الدعاء والديلمي وسنده حسن)

فضیلتِ تقویٰ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّابَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، إِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ أَمْرِهٖ، قَدْجَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

احوال واقعی...... بزرگانِ محترم! یہاں آنے کے بعد میں نے کچھ بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر بیماری کا سلسلہ شروع ہوگیا اور نزلہ زکام بخار وغیرہ کی وجہ سے کچھ کمزوری پیدا ہوئی تو میں نے معذرت کردی کہ بھائی! آج رہنے دو پھر دیکھی جاوے گی' چنانچہ ہمارے بھائی رشید نے یہ بھی فرمایا کہ واپسی میں ایک دن دیا جائے اس میں کچھ بیان وہ جائے گا۔ میں نے اس پر کہا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آج میں نے سوچا کہ شاید بھول گئے ہوں گے اور یہ دیکھ کر کوئی سامان بھی جلسہ واجلاس کا نہیں بالکل مطمئن تھا مگر اب معلوم ہوا کہ سب جمع ہیں تو اچانک ایک چیز سامنے آئی اور مجمع کے احترام کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کچھ بیان کردیا جائے چاہے ہومختصر ہی ہو۔ اس لئے زیادہ وقت بھی نہ لے سکوں گا۔ مختصر طریق پر چند باتیں گزارش کروں گا۔

طریقِ سلف اور وصیتِ تقویٰ...... سلفِ صالحین یعنی حضرات صحابہؓ اور حضرات تابعینؒ کی یہ عادت رہی ہے کہ جب ایک دوسرے سے رخصت ہوتے تو کہتے تھے کہ کچھ نصیحت کیجئے چھوٹے اپنے بڑوں سے نصیحت کی فرمائش کرتے تھے اور بڑے اپنے چھوٹوں سے نصیحت طلب کرتے تھے، عام طور سے سلف کی یہ نصیحت ہوتی تھی کہ اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ. "میں تمہیں تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں"۔

یہ سلف کا عام جواب ہوتا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے یہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو شخص

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲، ۳.

اللہ سے تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ اللہ اس کے لئے مشکلات میں ایسے راستے کھولتا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔ مشکل میں پھنسا ہوا ہے ہر طرف سے راستے بند ہیں غیب سے سامان ہوتا ہے اور راہ نکل آتی ہے اور وہ مشکل سے نکل جاتا ہے۔

نتائج تقویٰ......اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ ① ''تقویٰ پر مرتب شدہ پہلا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشکلات میں اس کے کام آتے ہیں''۔ اور دوسرا وعدہ یہ ہے کہ ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ ② ''حق تعالیٰ اس کو ایسے انداز سے رزق دیتے ہیں کہ اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ میرا رزق یہاں سے پہنچ جائے گا اور پہنچتا ہے وہیں سے''۔ تیسرا وعدہ یہ فرمایا ہے ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ﴾ ③ ''کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں''۔ اور چوتھا ثمرہ اور نتیجہ یہ بیان فرمایا ہے ﴿وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا﴾ ④ ''اللہ اس کے اجر وثواب۔ کو بہت بڑھا دیتا ہے''۔

تو تقویٰ اختیار کرنے پر ان آیات میں چار وعدے دیئے گئے ہیں مشکلات میں راستہ کھول دینا، رزق بے شان وگمان پہنچانا، معصیت کا کفارہ کر دینا، اجر وثواب کو بڑھا دینا، تقویٰ کے ایک معنی تو لغت میں ڈرنے اور خوف کے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ''اللہ سے ڈرو اور خوف وخشیۃ اختیار کرو''۔ کسی حالت میں بے فکر ہو کر مت بیٹھو، خواہ دولت مند ہو خواہ مفلس ہو۔ ہر حالت میں اللہ کا ڈر انسان کو رہنا چاہئے۔

تقویٰ، امن عالم کا ضامن ہے......اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی جرائم اور معصیتیں ہیں وہ اللہ کے ڈر سے ہی ختم ہوتی ہیں۔ جرائم کو نہ پولیس روک سکتی ہے نہ فوج روک سکتی ہے اور نہ ہتھیار روک سکتے ہیں۔ جب تک کہ دل میں ڈر اور خوف خداوندی نہ ہوگا۔ آدمی جرائم سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگر محض پولیس اور فوج کی طاقت سے جرائم بند ہو جایا کرتے تو آج کی دنیا سب سے زیادہ متقی ہوتی۔ اس لئے کہ آج نہ فوجوں کی کمی ہے اور نہ پولیس کی کمی ہے اور نہ ہتھیاروں کی کمی ہے بلکہ آج کل ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں کہ دنیا نے کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ توپیں بھی ہیں بم بھی ہیں، غرض ایسے ایسے ہتھیار موجود ہیں جن کے اثرات دور دور تک جاتے ہیں۔

ایک بم سے لاکھوں آدمی ختم ہو سکتے ہیں، اگر ان ذرائع سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا اور جرائم مٹ سکتے تو آج کی دنیا میں کوئی جرم باقی نہ رہتا، سب کے سب متقی اور پرہیزگار ہوتے لیکن جتنی پولیس بڑھتی جاتی ہے اور جتنی فوج اور ہتھیار بڑھائے جاتے ہیں اس سے دگنے جرائم بڑھتے جاتے ہیں اور عام طور سے دنیا میں فسق وفجور مار دھاڑ اور بدامنی، بدنیتی اور فسادات عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ارتکاب جرائم کی وجہ یہ نہیں کہ اس دور میں پولیس اور فوج کی کمی ہے، بلکہ دلوں میں اللہ کا ڈر اور خوف باقی نہیں ہے۔ اگر یہ ہو تو آدمی کو اتکارب جرائم کی ہمت ہی

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۲۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۳۔

③ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۵۔ ④ پارہ: ۲۸، سورۃ الطلاق، الآیۃ: ۵۔

نہیں ہوگی خواہ وہاں پولیس اور فوج ہو یا نہ ہو پھر چاہے تنہائی میں بھی ہو وہاں بھی گناہ سے بچے گا۔

تقویٰ کے بغیر قیام امن ناممکن ہے...... مثلاً آپ کے سامنے لاکھوں روپے کا خزانہ رکھا ہوا ہے اگر آپ اٹھا کر لے جانا چاہیں تو لے جاسکتے ہیں کیونکہ وہاں نہ پولیس ہے نہ فوج ہے مگر آپ اسے نہیں اٹھاتے! کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کا ڈر دل میں گھر کئے ہوئے ہے کہ میں نے اگر ایسا کیا تو اللہ کے سامنے قیامت کو کیا جواب دوں گا۔ جب پوچھا جائے گا کہ تو نے غیر کے مال میں بغیر اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا تھا۔ تو سب سے بڑی پولیس جو دلوں پر بیٹھی ہوتی ہے وہ خوف خداوندی ہے۔ وہی تمام جرائم سے بچانے والی ہے اور معصیت سے روکنے والی ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی صورت نہیں ہے جرائم سے روکنے کی اور جرائم سے بچنے کی۔ اسلام نے آخرت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو ہر وقت یہ تصورر ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اور ہر شخص سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ زندگی کس طرح سے گزاری۔ اس کا جواب دینا پڑے گا۔ تو یہ عقیدہ ایسا ہے کہ جس سے انسان حرکات ناشائستہ سے رک سکتا ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔ اور ہر شخص ارتکاب جرائم سے بچ سکتا ہے۔ اور کوئی صورت ایسی نہیں جس کے اختیار کرنے سے جرائم سے بچ سکتے۔

باطنی فساد بھی تقویٰ سے رفع ہوتا ہے...... جبلی طور پر انسان درندہ واقع ہوا ہے مارکاٹ چیر پھاڑ اس کا خاصہ ہے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اور حضرت حواؑ بھی اتریں تو فرمایا ﴿اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ① جاؤ تم دنیا کے اندر اور ایک دوسرے کی دشمنی تمہارے اندر ڈال دی گئی ہے۔ اس لئے انسان ایک دوسرے کا دشمن بھی ہے اور برا چاہنے والا بھی۔ اس کے قلوب میں کہیں حرص رکھی گئی ہے کہیں بغض رکھا گیا ہے کہیں حسد رکھا گیا ہے کہیں تکبر رکھا گیا ہے۔ ان اخلاق رذیلہ کی بناء پر جب آدمی حریص ہوگا تو دوسرے کے مال پر نگاہ ڈالے گا۔ اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا پھر اسے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ ہوگی، چوری ڈکیتی بے تحاشہ کرے گا، اس لئے کہ اس کے اندر حرص کا مادہ موجود ہے اور اگر انسان میں حسد کا مادہ موجود ہے تو وہ اپنے کسی بھائی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہے گا۔ دنیا میں کوئی عزت کے اعتبار سے ذرا بڑھا تو دلوں میں حسد شروع ہوجاتا ہے کہ یہ کیوں بڑھ گیا، لوگ اس پر تو غور نہیں کرتے کہ اس نے اپنی صلاحتیں استعمال کیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھا دیا۔ ہم بھی وہ صلاحتیں پیدا کریں مگر یہ نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ ترقیات و مراتب اس کے پاس نہ رہیں چاہے مجھے ملیں یا نہ ملیں، یہ حسد کا خاصہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کو زائل ہوتا دیکھ کر خوش ہو، چاہے خود بالکل محتاج اور مفلس کیوں نہ ہو۔

ایسے ہی تکبر، طمع لالچ وغیرہ ہیں۔ ان اشیاءِ رذیلہ پر اگر بریک لگانے والی کوئی چیز ہے تو وہ تقویٰ اور خوف خداوندی ہے اگر یہ نہ ہو تو سوائے ماردھاڑ کے اور ڈکیتی ڈالنے کے اور کیا کرے گا تو اس سے دنیا میں ایک عجیب

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۴۔

انار کی پھیل جائے گی۔ یہ اخلاق عام ہیں اور یہ انسان کی جبلت ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنا قانون اتارا کہ ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزارو۔

اس لئے حکم ہے کہ حسد ختم کرو اور ایثار اختیار کرو، اگر اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ دولت ملی ہے تو اس پر اتنے ہی خوش ہو جیسے کہ یہ دولت مجھے ہی مل گئی اور یہ سمجھو کہ وہ میری ہی دولت ہے اگر کسی کو عزت ملی ہے تو یہ سمجھو کہ یہ میری عزت ہے، اگر خدانخواستہ یہ ذلیل بنا تو یہ میری ذلت ہے۔ یہ جذبہ دین نے پیدا کیا ہے کہ حسد کو چھوڑ کر ایثار اختیار کرو۔ لالچ چھوڑ کر قناعت اختیار کرو کہ جتنا تمہیں اللہ نے دیا ہے اس پر خوش رہو، شکر کرتے رہو اللہ تعالیٰ اسے بڑھادے گا۔ اسی طرح کبر سے بچا کر دین نے تواضع کی تعلیم دی ہے کہ خاکساری برتو، ہر ایک کے سامنے چھوٹے بن کر پیش ہو کر تم بڑے ہو، میں چھوٹا ہوں۔ لڑائی دنگا جب بھی ہوتا ہے تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور قاعدہ ہے کہ دو بڑے ایک جگہ نہیں سما سکتے۔ یقیناً ایک گھٹے گا ایک بڑھے گا۔ ایک ختم ہوگا ایک آگے آئے گا۔ لیکن جب ہر ایک یوں سمجھے گا کہ میں بڑا نہیں۔ بڑا تو وہ ہے۔ جو یہ کہے کہ میں بڑا نہیں یہ بڑا ہے۔ تو پھر لڑائی جھگڑا کس چیز کا ہوگا؟

اس لئے امن وامان کا ذریعہ تواضع اور خاکساری ہے اور لڑائی جھگڑوں کا سبب تکبر اور نخوت ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان میں موجود ہیں ان کا علاج اگر کیا ہے تو دین نے کیا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دنیا میں آ کر اس کی تعلیم دی اس کے طریقے بتلائے ہیں کہ اگر یہ طرز اختیار کرو گے تو تمہاری حرص زائل ہو جائے گی اور یہ طریقہ اختیار کرو گے تو تمہارا حسد ختم ہو جائے گا۔ یہ تمام طریقے دین کے بتلائے ہوئے ہیں۔

تقویٰ محاسبۂ آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے...... یہ دو بنیادی باتیں ہیں ایک دل میں اللہ کا ڈر، دوسرے آخرت کے عقیدے میں مضبوطی اور پختگی کہ جو کچھ دنیا میں کر رہا ہوں مجھے جواب دینا ہے اور حق تعالیٰ کے پاس ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ حتیٰ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سردیوں میں گرم پانی نعمت ہے اسکا بھی احسان جتلایا جائے گا کہ ہم نے سردیوں میں گرم پانی دیا تم نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ گرمیوں میں ٹھنڈا پانی نعمت ہے اس کا حساب ہوگا کہ تم نے اس ٹھنڈے پانی کو استعمال کر کے کیا شکریہ ادا کیا۔ وہاں ایک ایک چیز کا حساب ہوگا۔ تمہیں اتنی عمر دی تھی تم نے کاہے میں صرف کی۔ تمہیں اتنی دولت دی گئی تھی تم نے اس کو کاہے میں صرف کیا۔ تو سب چیزوں کو الگ الگ پوچھا جائے گا۔

یہ نہیں کہ سارے نبی آدم سے مشترکہ طور پر سوال ہوگا اور وہ سب مل کر جواب دیں گے نہیں بلکہ ہر کسی کی پوری زندگی سامنے کر دی جائے گی اور پھر اسی کے مطابق حساب وکتاب ہوگا۔ یہ عقیدہ جب ایک مومن کے دل میں جما ہوا ہے تو وہ جرات وہمت نہیں کر سکتا۔ خیانت کی بددیانتی کی۔ اور جب بھی یہ حرکت کرے گا تو معلوم ہوگا کہ عقیدے میں ڈھیلا پن آ گیا ہے۔ وہ عقیدہ دل میں چھپ گیا ہے۔ سامنے نہیں رہا ہے لیکن اگر سامنے ہو تو پھر

یقیناً جرات نہیں ہوگی اور اگر کر ہی گزرے گا تو پھر جلدی سے توبہ کی توفیق ہوگی اور ندامت ہوگی کہ میں نے بہت بری حرکت کی ہے۔اس کے نیچے میں توبہ کرے گا، استغفار کرے گا۔ یہ ندامت توبہ واستغفار اسی وجہ سے کہ یہ دو بنیادیں ہیں اس کے ذہن میں۔

تقویٰ میں احتیاط کا پہلو......تقویٰ کے ایک معنی ہیں ڈرنے کے کہ آدمی اللہ سے ڈرے اور یہ ہی گویا جرائم سے انسداد کا طریقہ ہے۔تقویٰ کے دوسرے معنی ہیں احتیاط۔کہ میں آدمی محتاط زندگی بسر کرے جس میں بڑے جرائم سے بچنے کے لئے چھوٹے جرائم کو چھوڑ دے کہ اگر میں نے مکروہ فعل کیا تو ممکن ہے کہ کل کو فعل حرام کروں اور مکروہ سے بچنے کے لئے بعض جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑتی ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ جائز میں گھر گھرا کر مکروہ میں مبتلا ہو جاؤں۔شریعت کی اصطلاح میں اسی کا نام سد ذرائع ہے یعنی ذرائع اور وسائل کو ترک کردو تا کہ ناجائز مقاصد تک پہنچنے نہ پاؤں اور پہلے ہی رک جاؤں۔

مثلاً زناکاری ایک فعل خبیث ہے اور حرام ہے۔اس سے بچانے کے لئے فرمایا گیا کہ اجنبی عورت پر نگاہ بھی مت ڈالو۔اجنبی عورت سے خلوت بھی مت اختیار کرو۔اجنبی عورت کی آواز پر کان بھی مت لگاؤ یہ ساری چیزیں سد ذرائع ہیں۔جو ان چیزوں میں پڑا تو اندیشہ ہے کہ مبتلا ہو جائے گا۔اصل گناہ سے بچانے کے لئے شریعت نے یہاں سے روکنا شروع کیا کہ نگاہ ہی مت ڈالو کان ہی مت لگاؤ۔ اور اگر عورت خوشبو لگائے ہوئے ہو تو اپنی ناک کو موڑ لو۔گویا ہم خوشبو نہیں سونگھ رہے ہیں۔کیونکہ بعض دفعہ خوشبو ذریعہ بنتی ہے خیال کے متوجہ ہونے کا۔یہ ہے احتیاط جسے فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر عورت وضو کرے اور اس کا بچا ہوا پانی لوٹے میں موجود ہے اس سے وضو مت کرو۔دوسرا نیا پانی لو۔اس لئے کہ اس کے بچے ہوئے پان سے دھیان جا سکتا ہے کہ یہ فلاں عورت کا وضو ہے۔اس خیال کو اگر متوجہ کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ دل کے اندر فتنہ پیدا ہو جائے۔اس لئے شریعت نے احتیاط کی رو سے حکم دیا کہ تم اس پانی کو چھوڑ دو نیا پانی الگ لو۔کیوں اپنے خیال کو گندہ کرتے ہو۔خیال گندہ ہوا تو ارادہ گندہ ہوگا اور ارادہ گندہ ہوگا تو فعل ناپاک ہو جائے گا۔اس لئے شروع اور ابتداء ہی سے بچتے ہیں۔

زنا گناہ کبیرہ ہے اور یہ جو ابتدائی وسائل ہیں ان کو صغیرہ گناہ کہتے ہیں۔اور صغیرہ گناہوں سے اس لئے بچایا گیا ہے کہ کبیرہ تک نہ پہنچنے پائے۔یہ احتیاط کی زندگی ہے۔چوری کے اندر جو اصل فعل ہے اور جس کی ممانعت ہے وہ یہ ہے کہ غیر کے مال کو بلا اس کی مرضی کے اٹھالائے لیکن شریعت نے اس سے بچانے کے لئے ایک سلسلہ قائم کیا ہے کہ کسی کے گھر میں جاؤ تو اس کے سامان کو مت دیکھو ممکن ہے خیال پیدا ہو کہ آنکھ بچا کر اٹھا لوں یہ تاک جھانک پیش خیمہ ہے اور چوری تو انجام کار اور آخری فعل ہے جو اصل میں ممنوع ہے۔اس سے بچانے کے لئے یہ لمبا سلسلہ قائم کیا ہے۔ہاں اگر خود مالک ہی دکھلائے کہ مجھے اللہ نے یہ نعمت دی ہے تو آدمی شوق سے دیکھے اور دیکھ کر شکریہ ادا کرے اور خوشی کا اظہار کرے گویا کہ یہ جو کچھ اللہ نے آپ کو دیا ہے ہمیں ہی دیا ہے لیکن از خود تاک

جھانک کرنا یا یہ غور کرنا کہ کس مکان میں ہے مال اور یہ دھیان جائے کہ اگر نقب لگاؤں تو یہاں سے مناسب رہے گا یہاں سے یہ نقب لگانے کا دھیان اور تانک جھانک کرنا اور نگاہ ڈالنا۔ صغیرہ گناہ ہیں۔ شریعت نے ان صغیرہ گناہوں سے روکا ہے تاکہ اصل گناہ جو کہ چوری ہے اس تک نہ جانے پائے۔ اسی کو کہتے ہیں سد ذرائع اور وسائل پر پابندی تاکہ اصل مقصد تک نہ پہنچنے پائے۔

درجاتِ تقویٰ...... یہ ہی ہے وہ سد ذرائع کہ ابتداء میں جو ہلکی صورت ہے اسے بھی اختیار مت کرو تاکہ بڑی صورت تک نہ پہنچ سکو۔ تو شریعت اسلام نے ایک سلسلہ کبائر کا رکھا ہے۔ کہ یہ حرام ہے مثلاً زناکاری، چوری، بے ایمانی اور کچھ اس کے دواعی واسباب ہیں ان تک کو روکا ہے تاکہ اصل مقصد تک پہنچنے نہ پائے، اب اگر تقویٰ کے لغوی معنی بھی مراد لئے جاویں۔ یعنی ڈرنے کے تو بھی اپنی جگہ درست ہیں اس لئے کہ ڈر سے معاصی چھوٹ جاتے ہیں اور اگر تقویٰ سے احتیاط کے معنی لئے جاویں تو بدرجہ اولیٰ معصیت سے حفاظت ہو جائے گی کہ بعض جائز چیزیں بھی چھوٹ جاتی ہیں۔

پھر اس کے بعد آدمی کی زندگی پاک بن جاتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو دنیا کی تمام آلائشوں اور گندگیوں سے پاک ہو جاتی ہے اور آدمی کو جہنم سے ہٹا کر جنت میں ابدالاباد والی نعمتوں میں داخل کر دیتی ہے اور آدمی کو اللہ کا مقرب بنا دیتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اس درجہ کا حصول موقوف ہے بادشاہ حقیقی کے مرتبے کے معلوم ہونے پر یہ محتاط زندگی والا تقویٰ تو بڑوں کا نصیب ہے۔ ہم اور آپ جیسے بہت مشکل سے اس کی طرف جاسکیں گے کہ ناجائز سے بچنے کے لئے جائز چیزوں کو بھی ترک کر دیں یہ تو بہت اونچا مقام ہے مگر ابتدائی درجہ ہر ایک کے بس کا ہے کہ اللہ سے ڈرے۔

حصولِ تقویٰ...... اور ڈرنے کی صورت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اقتدار اور قبضے کو تصور میں لاتا رہے کہ وہ مالک ہے جس طرح چاہے کرے۔ جب چاہے موت دیدے جب چاہے حیات دے، جب چاہے صحت دے دے، جب چاہے بیماری مسلط کر دے، جب چاہے امن دے دے اور جب چاہے بدامنی مسلط کر دے۔ اسی کی یہ قدرت ہے اور اس کی اس قدرت کا جب دھیان ہوتا ہے تو ڈر پیدا ہوتا ہے کہ میں بڑے قادر کے قبضے میں ہوں معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ تو آدمی حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور کرتا رہے اس سے ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔

جاہل مقامِ تقویٰ سے ناآشنا ہے...... اگر کوئی بالکل انجام اور جاہل محض ہے اسے کبھی بھی ڈر نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے بادشاہ کے اقتدار سے۔ ایک دیہاتی اگر بادشاہ کے دربار میں آئے تو وہ زیادہ نہیں ڈرے گا۔ اس لئے کہ وہ واقف ہی نہیں ہے کہ بادشاہ کے اختیارات کیا ہیں اس کا اقتدار کیا ہے؟ بادشاہ کو یوں ہی سمجھے گا کہ مجھ جیسا ایک آدمی ہے۔ مگر وزیر اعظم تھرائیگا، کپکپائے گا۔ اس لئے کہ وہ بادشاہ کے اختیار واقتدار کو جانتا ہے۔ وہ آنکھ نیچی رکھے گا۔ ادھر ادھر بھی نہیں دیکھے گا کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے۔ میری گردن نہ ماردی

جائے۔ تو جس کو علم اور پہچان ہوگی باری تعالیٰ کی بڑائی اور اقتدار کی اور اس کے جلال کی' اس کے دل کے اندر خوف پیدا ہوگا۔ اور جو جاہل ہے اس کے دل کے اندر کچھ بھی پیدا نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ اکبر بادشاہ نے مشاعرہ کی مجلس کی کہ شعراء آئیں اور اپنا اپنا کلام سنائیں اور اعلان کیا کہ جس کی نظم عمدہ ہوگی اسے انعام دیا جائے گا۔ سینکڑوں شعراء نے نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بہت بڑا دربار ہوا۔ گاؤں کے ایک دیہاتی نے بھی ارادہ کیا کہ میں بھی کچھ تک بندی کر کے لے جاؤں تو مجھے بھی بادشاہ انعام دے گا۔ تو چودھری صاحب بھی دربار میں کچھ لکھ کر لائے۔ وزیر اعظم نے دیہاتی آدمی سمجھ کر اسے بلایا اور پوچھا کہ تو کیا لایا ہے اسے شبہ ہوا کہ پتہ نہیں کیا اناپ شناپ لکھ کر لایا ہوگا، الٹا بادشاہ ناراض ہو کر اس کی گردن نہ مار دے۔ اس بنا پر وزیر اعظم نے دیہاتی سے کہا۔ کہ چودھری صاحب! تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی مجھے سنادو۔ اس نے کہا اچھا سن لو۔ چودھری صاحب نے وہ قطعہ سنایا۔ قطعہ یہ تھا کہ ؎

سب درکھت ماں بجرگ بڑ ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

یعنی سارے درختوں میں جو بڑا درخت ہے وہ بڑ کا درخت ہے جس کی ڈاڑھی اور چھالیں لٹکی رہتی ہیں اور اس کے سبز سبز پتے ہوتے ہیں اور سرخ سرخ پھل ہوتے ہیں۔ گویا یہ قطعہ کہا اور اس قطعہ کے اخیر میں کہا کہ ؎

اکبر بادشاہ گیدی خر

یعنی اکبر بادشاہ حرام زادہ ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم تو کانپ گیا کہ اس کمبخت نے خود بھی جان کوئی اور مجھے بھی پٹوائے گا، تو خیر وزیر اعظم نے کہا کہ چودھری صاحب! شعر بڑے عمدہ ہیں مگر یہ جو اخیر کا شعر ہے (اکبر بادشاہ گیدی خر) یہ نہ لکھو۔ اس نے کہا کہ اور کیا لکھوں؟ وزیر اعظم نے کہا کہ یہ لکھو کہ......

اکبر بادشاہ بحرو برّ

یعنی اکبر، بحرو برّ کا بادشاہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑا اونچا بادشاہ ہے۔ اس نے کہا جی اچھا کہہ دوں گا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ شعراء نے اپنی اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ اعلان ہوا کہ چودھری صاحب بھی ایک قطعہ پڑھیں گے۔ چودھری صاحب نے کھڑے ہو کر ایک قطعہ پڑھا کہ

سب درکھت ماں بجرگ بڑ ہرے ہرے پتوا میں لال لال پھل

اکبر بادشاہ بحرو بر

اکبر نے کہا چودھری صاحب! یہ مصرع تو بہت عمدہ ہے مگر یہ اخیر کا مصرع ہے ؎

اکبر بادشاہ بحرو بر

یہ بہت بڑا مصرع ہے۔ اکبر سمجھ گیا کہ مصرعہ اس کا نہیں ہے۔ یہ اس کو کسی نے بتایا ہے تو چودھری نے وہیں کھڑے کھڑے وزیر اعظم کو ماں کی گالی دے کر کہا کہ اس حرام زادے نے کہا تھا کہ اس طرح کہنا ورنہ میں تو یوں

لکھ کر لایا تھا۔

اکبر بادشاہ گیدی خر

اکبر بادشاہ نے کہا یہ بہت عمدہ ہے وہ ٹھیک نہیں تھا۔

چودھری صاحب نے کہا جی ہاں! میرا تو یہ ہی مصرعہ ہے پھر اس کو بادشاہ کی طرف سے بہت انعام واکرام ملا۔اس نے یہ مصرعہ ''اکبر بادشاہ گیدی خر'' کیوں کہا تھا؟ اس لئے کہ وہ دیہاتی ہے۔نہ اکبر کی جاہ وجلال سے واقف اور نہ اس کی عظمت واقتدار سے واقف فقط ایک دیہات کا رہنے والا ہے۔تو دیہاتی لوگ بیچارے بالکل سادہ ہوتے ہیں۔ان میں چھل فریب مکروفریب دغابازی دھوکہ دہی کچھ نہیں ہوتی ہے۔سادہ زندگی ہوتی ہے جو دل میں آیا بے تکلف کہہ دیا۔

قدرِ تقویٰ بقدرِ عظمت......اس واسطے احادیث میں آیا ہے کہ حضرات صحابہؓ انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آئے اور آ کر سوال کرے تا کہ علوم کھلیں اور ہم سب کو اس کی بدولت تازہ علوم حاصل ہوں۔صحابہؓ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ وجلال کی عظمت غالب تھی اس لئے ہر ایک کو سوال کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔چونکہ شان نبوت سے واقف تھے۔اس لئے ان کی دل پر ہیبت تھی اور خوف تھا۔اور دیہات والے بیچارے سادے لوگ ہوتے ہیں۔انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی جو چاہے آ کر پوچھ لیا جو چاہے آ کر کہہ دیا۔جیسے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے ایک دیہاتی بھی آ گیا اس کو دینے میں دیر لگی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوروں کو دے رہے تھے۔اس نے کھڑے ہو کر فوراً کہا کہ ''اے محمد! یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے اس میں ہمارا بھی تو حق ہے''۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''چودھری صاحب تمہیں بھی ملے گا گھبراؤ مت''۔

یہ کہہ دینا کہ یہ مال تیرا نہیں اور نہ تیرے باپ کا ہے۔یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جسے شان نبوت کا پتہ نہ ہو۔اس لئے صحابہؓ منتظر رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی آ جائے اور آ کے سوال کرے حضورؐ جواب دیں گے اور ہمارا علم بڑھے گا، جتنا جلال وعظمت دل میں پیدا ہوگی اور ڈر بڑھتا چلا جائے گا۔اور عظمت خداوندی سے جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی آزاد ہوگا جو چاہے کر گزرے۔

تقویٰ کا اعلیٰ ترین ذریعہ......تو اس کے لئے اعلیٰ ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل میں خوف خداوندی پیدا کریں تا کہ جرائم سے بچیں اور خوف پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ ہم تصور کریں کہ اللہ مالک الملک ہے۔بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔موت وحیات اسی کے قبضے میں ہے۔صحت وبیماری اسی کے ہاتھ میں ہے۔تونگری ومفلسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔''جو کچھ وہ کر دے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ یہ کیوں کیا ہے؟''۔وہ بری ہے ان سب چیزوں سے تو جب یہ یقین وتصور ہوگا بندہ کو کہ وہ غنی مطلق ہے جو چاہے کرے، تو دل میں ہیبت پیدا ہوگی کہ میں ایک بندہ ذرہ بے مقدار ہوں اور مالک الملک کے سامنے ہوں۔ایسا نہ ہو کوئی بے ادبی ہو جائے۔تو دل میں ڈر بیٹھ جائے گا

تو پہلا درجہ یہ ہے تقویٰ کا جس کے معنی خوف کے ہیں کہ دل میں اللہ کا ڈر اختیار کرے تا کہ معصیت سے بچ جائے۔

فقر وغنا میں تقویٰ کی ضرورت...... بہرحال خوف خدا جب دل میں ہوگا تو آدمی مالداری میں بھی گناہ سے بچے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور کیسی پاک نصیحت ارشاد فرمائی ہے۔ حدیث قدسی ہے آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اپنے بندوں سے کہ ''اے بندے! تونگری اور دولت مندی کے زمانے میں تو مجھے یاد رکھ تا کہ تیری مفلسی کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانے میں مجھے یاد رکھ تا کہ میں تیری بیماری کے زمانے میں تجھے یاد رکھوں''۔

اس سے معلوم ہوا کہ تونگری کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے اور مفلسی کی حالت میں ہو تو جب بھی خوف خدا ضروری ہے۔ اگر تونگری میں خوف خدا نہیں تو ڈر ہے کہ تونگری چھن جائے اور اگر مفلسی میں خوف ہے تو ممکن ہے کہ وہ تونگر بن جائے۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہے جسے چاہے دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔ جس کو دینا بہتر سمجھتے ہیں اس کو دے دیتے ہیں مگر دیتے ہیں اسی حد تک جس حد تک باری تعالیٰ کی حکمت و مصلحت اجازت دیتی ہے۔ معاذ اللہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جسے چاہیں لکھ پتی بنادیں اور جسے چاہیں مفلس۔

تقسیم دولت احوالِ قلوب کے مُطابق ہے...... اس نے جیسی خلقت بنائی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کو یہ دینا مصلحت ہے اور اس کو نہ دینا مصلحت ہے اسے تونگر بنانا حکمت ہے اور اسے مفلس بنانا مصلحت ہے۔ قلوب کی حالت کو وہی بہتر جانتا ہے جس نے خلقت بنائی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ چار پیسے ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتے ہی اور دوسروں کو حقیر جاننے لگتے ہیں ایسوں کو اگر دنیا کی دولت دیدی جائے تو ظلم کا کارخانہ کھل جائے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لاکھوں روپے آجائیں پھر بھی انسان بنے ہوئے ہیں پھر بھی ان میں وہی دینداری ہے پھر بھی ان میں وہی جذبہ ہے۔ پھر حق تعالیٰ ان کو دولت دنیا میں ترقی دیتے ہیں۔ تو باری تعالیٰ جسے دولت دیتے ہیں اسے جانتے ہیں کہ کس مصلحت کے تحت اسے دولت دی گئی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا.'' ① بعض دفعہ فقر وفاقہ کفر کا ذریعہ بن جاتا ہے اور آدمی اللہ کی شکایتیں کرنے لگتا ہے اور ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو پیسے دے دیئے جائیں تا کہ ایمان محفوظ رہے اور بعض ایسے ہیں کہ چار پیسے ہاتھ میں آئے وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں انہیں مفلس رکھا جاتا ہے تا کہ وہ آپے میں رہیں۔

تو مفلس اور تونگری من جانب اللہ ہے۔ جیسی جیسی جس کی خلقت بنائی ہے اس کی مناسبت سے اسے دیتے ہیں۔ ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ② ہم نے ہی رزق تقسیم کیا ہے ہم نے ہی معاش تقسیم کی ہے اور ہم نے ہی درجے قائم کئے ہیں بعضوں کو اونچا بنایا بعضوں کو نیچا بنایا۔ اب اونچے کا کام یہ ہے

---

① شعب الایمان للبیهقی، الثالث والاربعون من شعب الایمان وهو باب فی الحث علی ترک، ج:۱۴ ص:۱۲۵، مشكوة المصابيح، كتاب الآداب، باب السلام، الفصل الاول، ج:۳ ص:۹۵ رقم: ۵۰۵۱. ② پاره:۲۵، سورة الزخرف، الآية:۳۲.

کہ وہ جھکے اور شکر کرے اور نیچے کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کے ساتھ دعاء کرے اور مانگے۔اس سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔اللہ نے دونوں کے لئے راستہ رکھ دیا ہے۔تونگر بھی نجات پائے اور مفلس بھی نجات پائے۔

باطنی دولت...... حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک کے کچھ درجات ہیں، کچھ نعمتیں دولت مندوں کو بھی ملیں گی اور کچھ مفلسوں کو بھی ملیں گی یعنی مایوس نہ ہوں کہ ہمیں کچھ ملا ہی نہیں بلکہ ان کے بڑھنے کی دوسری چیزیں ان کو دے دیں۔ایک روایت میں ہے کہ آپ نے صدقات وخیرات کے فضائل بیان فرمائے کہ صدقات دیں گے، زکوٰۃ دیں گے، دین کا کام ان سے چلے گا۔وہ بہت دین کا کام کریں گے انکا مال آخرت کا ذریعہ بنے گا، درجات کمائیں گے، ان فضائل سے مفلسوں کا دل ٹوٹنے لگا۔کہ بھائی یہ تونگر تو بڑے اچھے رہے کہ دنیا میں بھی انہوں نے مزے کی زندگی گزاری اور آخرت میں بھی ان کے درجات بلند ہیں اور ہم نے دنیا میں بھی مصیبت جھیلی اور آخرت میں بھی ہمارے لئے کچھ نہیں۔یہ مالدار لوگ بڑھ گئے اور ہم رہ گئے۔تو یہ گروہ مفلسین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ۔''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! سَبَقَ اَھْلُ الْاَمْوَالِ الدُّثُورِ بِالْاَجْرِ''. (1) یہ مالدار تو جیت گئے ہم سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مالدار اپنی دولت کا حساب دیتے رہ جائیں اور تم پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو''۔

انہوں نے کہا کہ بس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لئے کافی ہے۔ہمیں دولت نہیں چاہئے تو بہت سی دولتیں مفلسوں کو بھی دی گئی ہیں۔یہ بات نہیں ہے کہ تونگروں کو ہی نعمتیں دی گئی ہیں۔نہیں بلکہ سب کو دی گئی ہیں۔کسی کو یہاں دی گئی ہے کسی کو وہاں کیا گیا سب کو برابر۔یہ مالک کی حکمت ہے کہ کسی کو یہاں بڑھا دیا مگر فیضان سب کے اوپر عام ہے'اگر کسی کی ظاہری دولت بڑھا دی تو کسی کی باطنی بڑھا دی۔وہ اپنے رنگ میں خوش ہے یہ اپنے رنگ میں خوش اور بسا اوقات باطنی نعمت مال سے بھی بڑھ جاتی ہے۔اگر ایمان کی دولت مضبوط ہے اور توکل کی دولت مضبوط ہے تو ہزاروں مال اس کے نیچے دب جاتے ہیں اور یہ دولت سب اونچی ہو جاتی ہے۔

دولتِ معرفت کا تفوق......ایک بزرگ کسی شہر میں پہنچے۔بڑا شہر تھا اور قلعہ بند تھا۔دیکھا کہ سارے دروازے بند ہیں۔اور ہزاروں مال گاڑیاں ادھر رکی ہوئی کھڑی ہیں اور ہزاروں مال گاڑیاں اندر رکی ہوئی کھڑی ہیں۔دن کا وقت ہے اور شہر میں بالکل آمدورفت نہیں ہے۔انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا تجارتی شہر ہے کہ کروڑوں کا بیوپار ہے اس میں اور دروازے بند ہیں۔انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی شہر کے دروازے کیوں بند ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ صاحب! بادشاہ کا باز گم ہو گیا ہے (باز ایک شکاری پرندہ ہوتا ہے) اس لئے بادشاہ نے کہا ہے کہ شہر کے دروازے بند کردو کہیں باہر نہ جاسکے اور پھر ڈھونڈتے پھریں۔

بزرگ بڑی حیرت میں رہ گئے کہ بادشاہ بے وقوف ہے کہ ایک پرندہ کے لئے دروازے بند ہیں۔بھلا وہ

(1) مسند الحمیدی، احادیث ابی ذرؓ، ج:۳، ص:۲۹۷. حدیث صحیح ہے۔دیکھئے: السلسلة الصحیحة ج: ۳ص:۱۱۷.

اڑ کر نہیں جا سکتا چھتوں کے اوپر سے؟ دل ہی دل میں کہا کہ بڑا بیوقوف ہے بادشاہ اور اللہ میاں سے عرض کیا کہ ''خدایا تیری قدرت! کہ کندہ ناتراش کو تو نے بنا دیا بادشاہ' جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ جانور کو روکنے کے لئے جال ڈالنے کی ضرورت ہے یا شہر پناہ کے دروازے بند کرنے کی۔ اسے تو نے ملک دے دیا اور ہم جیسا فضل جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے جس کے اندر علم بھی ہے' معرفت بھی اور کمالات بھی بھرے ہوئے ہیں ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں، ایک وقت کھالیا اور ایک وقت فاقہ ہے۔ تو جس میں یہ دولت موجود ہے وہ جوتیاں چٹخاتا پھرے اور جو ایسے احمق اور کندہ ناتراش ہیں وہ تختِ سلطنت پر بیٹھ جاویں۔ آپ کی عجیب قدرت ہے''۔

یہ گویا ایک سوال اور خلجان اللہ کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اچھا کیا۔ تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم، تمہاری معرفت، تمہارا ایمان چھین کہ اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی ساری سلطنت تمہیں دیدیں۔ تیار ہو؟ انہوں نے کہا نہیں اس پر تیار نہیں ہوں۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی قوت زیادہ تھی اور توکل کی قوت زیادہ تھی دولت سے ورنہ راضی ہو جاتے کہ میں نے علم بھی دیا ایمان بھی دیا۔ لائیے مجھے تختِ سلطنت دیجئے نہیں بلکہ تختِ سلطنت پر لات ماردی اور ایمان و علم اور معرفت نہیں چھوڑی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑی دولت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دونوں دولتیں دے دے کہ مال کی دولت بھی ہو اور ایمان کی قوت بھی ہو اور اللہ پر بھروسہ بھی ہو تو اس کے پاس اللہ نے دین دنیا دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے دے دے۔ تو بہرحال دولت دنیا بھی ایک نعمت ہے اور دولت دین اس سے بڑھ کر نعمت ہے اور جمع ہو جاویں تو سب نعمتوں سے بڑھ کر نعمت ہے۔

صبر و شکر کے ذریعے ترقی درجات دونوں کے بچاؤ کی صورت یہ ہے کہ مالداری کے اندر آدمی غرور میں نہ پڑے اور ہر وقت شکر گزار رہے اپنے پروردگار کا اس لئے کہ جو کچھ اسے ملا ہے وہ اس کا حق نہیں تھا بلکہ محض عطاء خداوندی ہے۔ اللہ کے اوپر کسی کا حق نہیں۔ جب فضل سے ملے تو شکر واجب ہوتا ہے لہٰذا ملنے پر شکر ادا کرے اور جس کو مفلسی دی ہے وہ عدل سے دی۔ گویا حکمت وانصاف کا یہی تقاضا تھا کہ اس کو اس حالت میں رکھا جائے تاکہ وہ صبر کرے کیونکہ دونوں ہی راستے جنت کی طرف لے جاتے ہیں۔ صبر اپنے راستے سے جنت میں پہنچائے گا اور شکر اپنے راستے سے جنت کی طرف لے جائے گا، ہیں دونوں کامیاب اور ناجی! اور محبوب خداوندی شاکر بھی ہے اور صابر بھی۔ علماء میں ایک عالم گذرے ہیں فن نحو کے بہت بڑے امام جن کا نام ہے اشم اور انتہائی درجہ بدصورت تھے۔ جتنی بدصورتی کی علامتیں ہیں وہ سب ان میں جمع تھیں، رنگ بے حد کالا، دانت بہت چوڑے چوڑے، آنکھیں نہایت چھوٹی اور کرنجی اور آنکھوں میں چیڑے لگے ہوئے، دانتوں میں زردری لگی ہوئی غرض جتنی بدصورت کی علامتیں ہو سکتی ہیں ساری ان میں جمع تھیں اور علم و ہنر کا یہ عالم کہ بہت اونچا اور بہت بلند، ان کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی کہ دور دور تک اس کی نظر نہیں تھی، جب خاوند اور بیوی آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے

دھوپ چھاؤں، کہ ایک طرف دھوپ نکل رہی ہے اور ایک طرف سایہ ہے اور ایک طرف نور اور ایک طرف ظلمت۔

تو آمنے سامنے بیٹھ کر بیوی سے کہتے ہیں کہ میں بھی قطعی جنتی ہوں اور تو بھی قطعی جنتی۔ بیوی کہتی کہ کیا بات ہے۔ فرماتے کہ میں تو اس لئے جنتی کہ تجھ جیسی مجھے بیوی ملی میں رات دن شکر ادا کرتا ہوں اس شکر کے راستے سے جنت میں پہنچوں گا اور تو اس لئے جنتی کہ مجھ جیسا بد صورت خاوند تجھے ملا تو رات دن صبر کرتی ہے کہ کس بلا میں گرفتار ہوگئی۔ اسلئے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچے گی۔ تو میں نے بھی جنتی اور تو بھی جنتی۔ اس بناء پر دولت مند کے لئے اللہ نے شکر کا راستہ رکھا ہے اور وعدہ ہے۔ ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّكُمۡ﴾ ① ''جتنا تم شکر کرو گے اتنا ہی میں اس نعمت کو بڑھاتا چلا جاؤں گا''۔ یہ صاحب دولت کے لئے ترقی درجات کا ذریعہ ہے۔

غریب اور مفلس کو حکم ہے کہ تو کسی دولت مند کی دولت پر نگاہ مت کر، صرف میرے اوپر نگاہ رکھ اور صبر اختیار کر میں نے کتنی دولت تیرے لئے جمع کر رکھی ہے۔ تجھے معلوم نہیں ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عنقریب ملنے والی ہے۔ حدیث صحیح میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے دے، مجھے دولت دے دے، فاقے اتر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ دعا پوری نہیں ہوتی مہینے گزر گئے، برس گزر گئے، حتیٰ کہ عمر گزر گئی۔ اب اس نے کہا کہ کچھ بھی میری قسمت میں نہیں ہے، مانگتے مانگتے تھک گیا، نہیں ملا، قیامت میں جب میدان محشر میں پہنچے گا تو دیکھے گا کہ اجر و ثواب کے ڈھیر کے ڈھیر بھرے ہوئے ہیں، ہزاروں، لاکھوں کو وہ نعمتیں نہیں ملیں جو اس کے لئے جمع ہیں۔

عرض کرے گا کہ اے اللہ یہ نعمتیں کہاں سے آئی ہیں۔ میں نے تو کوئی عمل نہیں کیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ کیا تو دعائیں نہیں مانگا کرتا تھا؟ اس دعا کو ہم نے پالا پرورش کیا، بڑھایا۔ یہ تیری ان دعاؤں کے ثمرات ہیں۔ وہاں دنیا میں اگر دیدیتے تو تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے تیری دعا کو ذخیرہ کیا۔ اب تو ابدی طور پر عیش و آرام کر تیرے لئے انتہائی درجات ہیں۔ تو غریب کے لئے موقعہ مایوسی کا نہیں اور امیر کے لئے موقعہ کفران نعمت کا نہیں، اس پر شکر واجب ہے، اس پر صبر واجب ہے اور دونوں کے اوپر اعتماد علی اللہ واجب ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے تو میرا کوئی حق نہیں محض اپنے فضل و کرم سے دیا ہے اسے اگر نہیں دیا تو کوئی ظلم نہیں ہے وہ عدل ہے جس کہ وجہ سے نہیں دیا ہے، دونوں انشاء اللہ کامیاب ہیں۔ باقی جسے بھی جو ملتا ہے وہ ملتا ہے، فضل خداوندی سے کسی کا کوئی حق اللہ کا اوپر نہیں کہ وہ مجبور کرے بھلا اللہ پر کس کا جبر چل سکتا ہے، بہر حال تقویٰ اور اس کی فضیلت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں میں نے عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین!

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اعمال صالحہ کی توفیق عطاء فرمائے۔ خاتمہ بالخیر فرمائے۔ اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے۔ (آمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ.)

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ ابراھیم، الآیۃ: ۷.

اسلام میں عید کا تصور

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْعِيْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِيْدَ لَا لِمَنْ لَّبِسَ الْجَدِيْدَ (صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

اجتماعیّتِ عامّہ!...... بزرگانِ محترم! دنیا کی ہر قوم تہوار رکھتی ہے، اور اپنی حد تک اسے شاندار طریقے سے مناتی ہے، پارسیوں میں نوروز اور مہر جان کی عیدیں ہیں، عیسائیوں میں کرسمس اور بڑے دن وغیرہ کے نام سے عید ہے، ہندوؤں میں ہولی، دیوالی وغیرہ وغیرہ سینکڑوں تہوار اور آئے دن کے میلے ٹھیلے ہیں۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے عیدین (عید الفطر اور عید قربان) کے تہوار عطاء فرمائے، فرق یہ ہے کہ اقوام عالم میں عید اور تہوار کے معنی رنگ رلیاں منانے یا اپنی قومیت کو مستحکم کرنے اور یا کسی مقتدا شخصیت کی یاد تازہ کرنے کے ہیں۔ اسلام میں عید اور تہوار کے معنی اجتماعی طور پر خدا کی یاد کرنے، اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کے نام پر غریبوں کی مدد کرنے کے ہیں۔ تاکہ اجتماعیت عامہ کا ظہور عادت اور عبادت دونوں میں ہو جائے، پس اگر مذاہب کے ناموں کے سلسلہ میں ہر مذہب کا نام اس کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے، ہندومت کے لفظ سے طنیت پر روشنی پڑتی ہے، عیسائیت کے لفظ سے ایک ہادی اعظم کی شخصیت سامنے آتی ہے، یہودیت کے لفظ سے ایک قومیت کا تصور بندھتا ہے، پارسیتا سے ایک ملک کا دھیان دلوں میں جمتا ہے جس کا حاصل حدود بندی اور محدودیت ہے تو اسلام کے لفظ سے نہ وطن سامنے آتا ہے نہ ملک، قوم نہ شخصیت بلکہ اطاعت حق میں فنائیت اور مالک الملک میں محویت کے جذبات کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اس کی طرف صاف اشارہ ہے کہ دنیا کے مذاہب نسل وقوم، وطن اور شخصیت پرستی کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے لیکن اسلام نے اپنے سادہ عنوان

① مرقاۃ المفاتیح، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ العیدین، وانما قال: لیس العید لمن لبس الجدید انما العید لمن أمن الوعید، ج:۵، ص:۱۲۳۔

ہی سے ان تمام حد بندیوں کو توڑ کر ایک عالمگیر تصور سامنے رکھا اور وہ اطاعت حق ہے کیوں کہ حق خود لامحدود اور وسیع ہے اس کی اطاعت کا دم بھرنے والی قوم بھی اپنے کو مسلم کہہ کر عبادت گزار بن کر اور عبادت غیر سے منقطع ہو کر گویا اعلان کرتی ہے کہ وہ ایسی ذات سے تعلق رکھتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہے دنیا کی پوری زمین اور اس کے رقبے اور رقبوں پر بسنے والی قومیں اپنی حد بندیوں سے اس کی لامحدود وسعتوں میں خلل انداز نہیں ہوسکتیں۔

حکمتِ دوگانہ...... ٹھیک اسی طرح تہواروں اور عیدوں کے سلسلہ میں اپنے تہواروں سے ہر قوم اگر یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں منہمک ہو کر اپنی نفسیات کی پابند ہے یا کسی بڑی شخصیت کا میلاد منا کر وہ صرف اس عظمت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے جو اس کے دل میں اس شخص کو موجزن ہے گویا وہ اپنی شخصی عقیدت مندیوں کی پابند ہے یا کسی وطن اور قوم کا نام اجاگر کر کے اپنے کی اس کا اسیر اور پابند دکھانا چاہتی ہے۔ تو مسلم قوم عیدوں کے تہواروں میں خدا کی جناب میں دوگانہ ادا کر کے اور اسکے نام پر قربانی دے کر حاجت مندوں پر فطرہ کا صدقہ اور قربانی کا صدقہ بانٹ کر گویا یہ بتلانا چاہتی ہے کہ ایک طرف تو وہ صرف خدائی نام لیوا ہے اور اس کی عظمتوں کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہے۔

حکمتِ فطرانہ وقربانی...... اور دوسری طرف دنیا کے مفلوک الحال انسانوں کو اس خوشی کے موقع پر صدقہ اور خیرات دے کر یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ ایک عوامی اور عالمی قوم ہے جس کو نہ قبیلے تقسیم کر سکتے ہیں نہ ملکوں کی حد بندیاں بانٹ سکتی ہیں۔ نہ شخصیتوں کی عقیدت مندیاں اسے دوسری شخصیتوں کی عظمت وعقیدت سے روک سکتی ہیں۔ اور یہ ہی وہ جماعت کبری ہے جسے لے کر اسلام دنیا میں آیا ہے اور جس کا اعلان اس نے اپنے نام اور اپنے کام سے قدم قدم پر کیا ہے۔

روحِ عید...... بہر حال اسلامی تہوار نفسیانی یا قومیتی یا شخصیاتی تصورات کے آئینہ دار نہیں بلکہ اجتماعیت عامہ کے حامل ہیں اور یہ اجتماعیت عامہ وطن، قوم، نسل شخصیت کے تصور سے نہیں بن سکتی تھی بلکہ ان سب سے بالاتر اور مافوق ذات سے وابستگی سے ہی بن سکتی تھی جس کا نام پاک اللہ رب العزت ہے۔ تو ان تہواروں کی روح اسی کا نام اور اسی کی عظمتِ مطلقہ قرار دی گئی ہے چنانچہ عید کی نماز کے لئے جب مسلمان چلتے ہیں تو رنگ پھینکتے ہوئے۔ یا کسی شخصیت یا قومیت کے نعرے لگاتے اور جے کار کرتے ہوئے نہیں چلتے بلکہ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

عید الفطر میں آہستہ آہستہ اور عید قربان میں بآواز بلند تہوار کے لئے روانگی ہوتی ہے تو تکبیر یا والہٰی عظمتِ خداوندی اور توحید کے اعلان کے ساتھ ہوتی ہے اس میں نہ شور ہے نہ شر نہ ہنگامہ آرائی نہ میلوں، ٹھیلوں کی شان ہے بلکہ قدوسیوں، سبوحیوں اور مقدس ملائکہ کی صفوں کی طرح تسبیح الٰہی اور تقدس ربانی کہتے ہوئے روانہ ہوتے ہیں عید گاہ میں پہنچ کر بھی تسبیح وتہلیل جاری رہتی ہے اس کے بعد امام آگے بڑھتا ہے اس کے تکبیر تحریمہ کہتے ہیں مکبر

تکبیرات کی آوازیں بلند کرتے ہیں، تلاوت قرآن ہوتی ہے سب مقتدی سکون وخشوع کے ساتھ اسے سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رکوع وسجود سے اپنے مالک کے سامنے بندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور آخر کار سلام پھیر کر پھر تکبیرات کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔

عظیم اجتماعیت...... نماز سے فارغ ہوتے ہی امام خطیب کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور ممبر پر کھڑے ہو کر وعظ ونصیحت اور احکام سناتا ہے، جس کو تمام مقتدی سماع عظمت وقبول سے سنتے ہیں۔ اس عبادت سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اس خوشی کے موقع پر جبکہ ہر طرف چہل پہل اور روحانی مسرتوں کا دلوں پر ہجوم ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ اس میں کسی نفسانی تفریح یا دنیاداری کے جذبات کی آمیزش ہو جائے، تو ان تہوار منانے والوں کے لئے مسنون کیا گیا کہ قبرستان میں جا کر اپنے مردہ بھائیوں کی ارواح سے ملاقات کریں۔ ان کو ثواب پہنچائیں ان سے قریب تر ہوں تا کہ ان کو آخرت کے گھرانے دیکھ کر خود بخود اپنی آخرت کی یاد تازہ ہو جائے اور دنیا میں اس خوشی کے موقع پر ادھر سے دھیان نہ ہٹ جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ بتلانا ہے کہ مسلمان اجتماعیت کبریٰ کو لے کر اٹھا ہے اس کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ عالم برزخ کے اربوں کھربوں انسان بھی اس کی اجتماعیت کے ممبر ہوں اس کی بنیاد ڈالی ہے جو دنیا سے گزر کر برزخ سے گزر کر عالم حشر تک جا پہنچتی ہے جس میں دنیا کے کسی ایک قرن کے ہی انسان نہ ہوں گے۔ بلکہ آدمؑ کی ساری اولاد اور اولین وآخرین کی ساری شخصیتیں مجتمع ہوں گی۔

عوالم گیر اجتماعیت...... پس جو لوگ مسلمانوں سے سن کر اجتماعیت کا نام لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ علمی اجتماعیت کا دم بھریں گے اور وہ بھی صرف اپنے زمانے کے ملکوں اور قوموں سے کوئی سیاسی رابطہ قائم کرلیں گے۔ لیکن حقیقتاً جو قوم اجتماعیت کے لئے دنیا میں برپا کی گئی ہے وہ عید کے وظائف کی رو سے گویا اس اجتماعیت کو پھر ایک غیر محدود اجتماعیت ظاہر کرتی ہے اور اس کا رابطہ اجتماعی دنیا سے اتر کر برزخ کے ان تمام پاکباز انسانوں سے قائم ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ اس عالم سے گزر کر اس عالم میں پہنچ گئے ہیں اور گویا وہ محض دنیا والے بھائی بھائی کا نعرہ لگاتے ہیں مگر اس ساری اجتماعیت کی حقیقی روح جس سے یہ عالم گیر ہی نہیں عوالم گیر اجتماعیت بن جاتی ہے۔ خدا کا نام ہے کہ اس سے زیادہ واسع اور وسیع کوئی نہیں۔ اس لئے عید کے لئے جیسے اس دنیا میں ایمان کی قید ہے ایسے آخرت کے باشندوں کی ملاقات کے لئے بھی وہی ایمان کی شرط ہے اور ایمان کے معنی بجز اس کے دوسرے نہیں کہ اللہ رب العزت کی ذات وصفات، افعال واوامر ونواہی اور اس کے قوانین کو مانا جائے کیونکہ اس کے بغیر یہ وسعت واجتماعیت قائم ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے زیادہ وسیع رشتہ اور معیار ہی دوسرا نہیں۔

خوش قسمت قوم...... اس لئے عید تہوار تو ہے، مگر محض لفظ ''تہوار'' کی وجہ سے اسے دنیا کی عام اقوام کے تہواروں کی نظر سے نہ دیکھا جائے، کہ اس کی غیر معمولی وسعتیں ان دوسرے ظرفوں میں کسی طرح نہیں سما سکتیں۔

پس خوش قسمت ہے وہ قوم جسے ایسے تہوار دیئے جائیں اور خوش نصیب ہیں وہ افراد، جو ان تہواروں میں ان کی شرعی حدود و شروط کے مطابق شرکت کریں، تہوار عید بندگی حق اور خدمت خلق ہے۔ نہ کہ محض نیا اور فاخرہ لباس، عطر و خوشبو اور شیریں چیزیں کھا پی لینا۔ اسی لئے حدیث نبوی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ واصحابہ وسلم) میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ "اَلْعِیْدُ لِمَنْ خَافَ الْوَعِیْدَ لَا لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِیْدَ"...... ترجمہ: "یہ عید اس کے لئے ہے جو خدا سے ڈرا اور اس کی طرف جھکا نہ کہ اس کی جس نے عمدہ اور نئے کپڑے پہن لئے"۔

عید کا اصلِ اصول...... پس عید کا حاصل؟ ذکر الٰہی، ذکر ربانی، خدمت خلق اللہ، روح اجتماعیت دنیا میں رہ کر آخرت کو نہ بھولنا اور زندوں کے ساتھ ہی اموات سے بھی رشتہ جوڑے رکھنا اور ان میں سے ہر چیز کی روح اور معیار ایمان کو قرار دینا نہ کہ ظاہر داری اور دنیا سازی، تا کہ خلق اللہ کے ساتھ اللہ سے وابستگی اصل اصول ثابت ہو۔

سال بھر کے لئے نورانی اثرات...... ساتھ ہی یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عبادتیں دو طرح کی ہیں ایک فعلی اور ایک ترکی، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ فعلی ہیں جس میں کچھ افعال ادا کرنے پڑتے ہیں۔ ترکی عبادت روزہ ہے جس میں ترک اکل، ترک شرب اور ترک لذات ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پورے ایک ماہ تک محبت حق میں دنیا کے اس معظم حصے کو ترک کئے رہنا کوئی معمولی مجاہدہ نہیں بلکہ نفس کی ایک عظیم قربانی ہے۔ جیسے بغیر مدد خداوندی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ ماہ رمضان المبارک میں دن بھر اس مجاہدے سے نفس کو رگڑ کر اور مانجھ کر اس میں صفائی پیدا کی جاتی ہے لیکن کسی ظرف میں محض صفائی آ جانا اور میل کچیل دور ہو جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں آب نہ آ جائے اور وہ چمک نہ اٹھے ایک قلعی گر بھی برتن کو اول رگڑتا اور مانجھتا ہے، اینٹ، پتھر سے برتن کو رگڑ کر اپنے پیرول تک اسے پامال کرتا ہے تا کہ برتن کا میل صاف اور زنگ دور ہو جائے لیکن محض صفائی کے لئے برتن قلعی گر کے یہاں نہیں بھیجا جاتا بلکہ اصل مقصود اس کی آراستگی اور جگمگاہٹ ہوتی ہے چنانچہ قلعی گر بھی اس صفائی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ صاف برتن کو آنچ دیتا ہے اور تپا کر جب صاف شدہ برتن پر قلعی پھیرتا ہے تو اسی دم برتن چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے اور قلعی گر کے پاس برتن بھیجنے کا مقصد اب آ کر پورا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ظرف قلب کو صاف کرنے کے لئے تو رمضان کے روزے رکھے گئے ہیں تا کہ نفس کی محبوبیت اس سے چھڑا کر اسے رگڑ دیا جائے اور غیر اللہ کی محبت والفت کی ان آلائش سے اسے صاف کیا جائے پس روزے کے یہ تروک نفس کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے اینٹ، پتھر اور مٹی کام کرتی ہے۔ دن بھر جبکہ نفس کی رگڑائی ہوئی اس کا دانہ پانی بند کر کے اس کی نفسانی لذات کے دروازے بند کر دیئے گئے اور اس عمل سے اس کی روحانی آلائشوں کا میل کچیل نکال دیا گیا تو شب کو اس پر قلعی کا سامان تراویح اور تلاوت قرآن سے کیا جاتا ہے تا کہ دن بھر تپائے ہوئے نفس پر کلام خداوندی کی قلعی سے آب اور چمک پیدا کر دی جائے اور اس کی روح نور الٰہی سے جگمگا اٹھے۔ یہ تیس کے تیس دن دن بھر کی کمائی رگڑائی اور منجھائی اور پھر شب بھر قلعی ایک ماہ میں انسانی

نفس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس چمک دمک سے فائدہ اٹھاتا رہے اور میل کچیل سے مبرا رہ کر ان نورانی اثرات کو سال بھر تک استعمال کرے بشرطیکہ اس مجاہدہ کے اثرات کو سال بھر باقی رکھنے میں ساعی رہے۔

اجتماعیاتی صلاحیت کا شکرانہ...... بہر حال یہ ایک ماہ سال بھر کی نورانیت کی کفالت کرتا ہے اور بندے کے خدا سے قریب تر ہونے کے تمام موانع کو دور کر دیتا ہے تا کہ اس سے قریب ہو کر بندہ وسیع الظرف اور وسعت عامہ کا اہل ہو جائے اور اس کی ذات اسلام کی اجتماعیت کبریٰ کی طویل و عریض زنجیر کی ایک مضبوط کڑی ثابت ہو۔ پورے ایک ماہ کی اس مشقت محنت اور اس پر مرتب شدہ اجتماعیاتی صلاحیت جیسی عظیم نعمت ملنے پر جو محض خدا کی مدد اور اس کی توفیق ہی سے اسے میسر ہو سکتی تھی، اتنی ہی بڑی شکر گزاری کا فریضہ بندے پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ادائے شکر کا طریقہ دوگانہ عید کو قرار دیا تا کہ ادھر رمضان کامیاب ہو کر ختم ہوا ادھر اسی دم ہلال عید آسمان سے سر نکال کر یہ اعلان کرے "اے بندو! اس عظیم کامیابی پر جو تمہیں اجتماعیت کبریٰ کی صلاحیتوں کے ملنے کی صورت میں حاصل ہوئی ہے۔ اپنے مالک کا شکر ادا کرو، یا بالفاظ دیگر رمضان میں جو صلاحیتیں تمہیں عطاء کر دی گئی ہیں ان کو عید کے میدان میں فعلیت میں لا کر ان صلاحیتوں کا عملی ثبوت دو اور اجتماعیت عامہ کی صورت اور حقیقت اجتماع عید میں توجہ الی اللہ کے ساتھ نمایاں کر کے دکھلاؤ۔

حقیقتِ رمضان...... پس رمضان المبارک صلاحیتیں پیدا کرنے کا مہینہ ہے اور ماہ عید اُن صلاحیتوں کے عملی آغاز کا مہینہ ہے، جس کا سلسلہ سال بھر تک جاری رہتا ہے، اس درمیان میں اگر کچھ کمی یا کوتاہی راہ پاتی ہے تو اگلا رمضان پھر اگلے سال کے لئے ان کوتاہیوں کو دور کر کے ان صلاحیتوں کی تجدید کر دیتا ہے تا کہ نہ مجاہدے کا سلسلہ ختم ہو، نہ اجتماعیت کی روح مضمحل ہونے پائے اور انسانی عمر اسی مبارک سلسلہ میں ختم ہو جائے۔

فرد مسلم کا درجہ اُمت...... تا کہ جب وہ اپنے رب سے ملے تو تنہا اپنا نفس ہی ساتھ نہ لے جائے بلکہ اس کے ساتھ اجتماعی نسبتوں کی ایک عظیم کمک ہو۔ لاکھوں دعائیں ہوں جو اس اجتماع میں مل کر کی گئی تھیں۔ ہزاروں ایصال ثواب ہوں جو عید کے موقع پر اموات تک پہنچائے گئے تھے۔ کروڑوں باطنی ہمتیں ہوں جو صف بندیوں میں ایک کی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور دنیا و برزخ کے تعلقات کے بے شمار رشتے ہوں جو اس کے لئے جناب باری میں سفارشی اور مساعی ہوں تا کہ اس فرد پر جو اجتماعی صلاحیتوں سے ایک امت بن کر اپنے خدا کے پاس پہنچ رہا ہے۔ اللہ کی لاکھوں رحمتیں متوجہ ہوں اور وہ اسی طرح اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر کے سرخروئی کے ساتھ اپنے مالک سے جا ملے۔

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (۱)

---

(۱) پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۸۵.

محبّت ومعیّت

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِ يْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ وَقَالَ اللّٰهُ جَلَّ ذِكْرُهٗ: فَلَاوَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَايَجِدُوْافِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ.

حقیقت ہرشی...... بزرگانِ محترم! دنیا کی ہر چیز بلکہ ہم اور آپ بھی دو چیزوں سے مرکب ہیں۔ایک ہمارا ظاہری حصہ ہے جس کو ہم بدن کہتے ہیں یہ ہیئت وشکل ہے مثلاً آنکھ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کی شکل وصورت دیکھ کر پہچانتے ہیں۔یہ ظاہری حصہ اور ظاہری پیکر ہے اور ایک اس کے اندر پوشیدہ حقیقت ہے۔وہی درحقیقت انسان ہے۔اس صورت ظاہری کا نام انسان نہیں۔انسان حقیقت کا نام ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے اس کے دکھلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ صورت بنادی ہے جو کہ دراصل ذریعہ تعارف ہے اصل مقصود نہیں ہے۔پھر مقصود کہاں ہے؟ شریعت اسلام پتہ دیتی ہے کہ اندرون باطن ایک قلب ہے اسی میں ساری حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں اور اسی کا نام انسان ہے،اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے جب پھیلایا اور صورت وشکل دی تو قالب نمودار ہوگیا۔شکل بن گئی۔اب اسے دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ فلاں ہے یہ فلاں ورنہ حقیقت میں انسان قلب ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ پوشیدہ ہے۔

تائید ونکتہ چینی......حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا فرمایا اور بدن بنایا۔ابھی اس میں روح بھی نہیں ڈالی تھی تو ملائکہ علیہم السلام اس کی زیارت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے عجیب شکل وصورت بنائی ہے اور بہت ہی عمدہ ہے اور سب کے دل میں ایک عظمت ومحبت اس صورت کی بیٹھ گئی۔ادھر ابلیس کو بھی حکم ہوا کہ تو بھی اس صورت کو جا کر دیکھ۔اس کے دل میں عداوت چھپی ہوئی تھی،اس نے جا کر دیکھا اور حضرت آدمؑ کے پتلے کے اندر گھسا

① پارہ: ۵،سورۃ النساء،الآیۃ: ۶۵.

اور ریزے ریزے میں سرایت کی، بعد میں اس نے کہا کہ کوئی عجیب چیز نہیں ہے اور کہا کہ نَفْسٌ لَا تَتَمَلَّکُ یہ تو اندر سے کھوکھلا ہے خود کو بھی نہیں سنبھال سکتا ہے جب تک کہ باہر سے اس کی مدد نہ ہو اور غذا، ہوا، گرمی باہر سے نہ پہنچے اس کے اندر کوئی طاقت نہیں۔ اس ابلیس نے اپنی شیطنت اور عداوت کے مطابق رپورٹ دی۔

سارے ملائکہ نے تو تائید کی اور مدحت کی اور اس کمبخت نے آ کر نکتہ چینی کی مگر یہ کہا کہ میں نے سارے بدن میں گھس کر دیکھا ہے یہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہے البتہ اس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی ہے اس میں سب کچھ ہوگا اگر ہوا۔ وہاں میں گھس نہ سکا۔ اشارہ تھا قلب کی طرف کہ جو کچھ حقیقت ہے وہ اس قلب میں رکھی گئی ہے اس کی حقیقت اس لعین کے سامنے نہ کھل سکی وہاں جا کر مجبور ہو گیا۔

اقلیم بدن کا بادشاہ...... چنانچہ سب سے بڑی چیز انسان میں قلب ہے۔ اور باقی جتنے اعضاء ہیں سب اس کے خدام ہیں۔ قلب میں جو جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ سب خدام اس کے مطابق عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اگر دل میں آیا کہ کسی چیز کو دیکھوں تو دل آنکھ کو زبان سے آرڈر نہیں دیتا کہ تو دیکھ بلکہ دل میں خیال آتے ہی آنکھ اپنا کام شروع کر دیتی ہے، دل میں خیال آیا کہ میں چلوں، تو دل کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ پاؤں کو زبان سے حکم دے کہ چلو، بلکہ دل کا منشاء ہوا اور پیروں نے حرکت شروع کر دی۔ دل نے کسی چیز کو پکڑنا چاہا تو دل ہاتھوں کو لفظوں میں حکم نہیں دے گا کہ اے ہاتھو! تم پکڑو۔ بلکہ دل میں جذبہ آیا اور ہاتھوں نے اپنا کام شروع کر دیا تو انسان کے تمام اعضاء خدام ہیں۔ اصل حاکم اعلیٰ اور اس اقلیم بدن کا سلطان وہ دل ہے اور دل میں ہی سب کچھ ہے۔

قلب اصل ہے یا دماغ؟...... اس میں اطباء اور موجودہ زمانے کے ڈاکٹروں کا اختلاف ہوا ہے کہ اصل انسان میں دماغ ہے یا قلب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اصل انسان میں دماغ ہے کیونکہ اسی سے تمام چیزیں چلتی ہیں اسی میں شعور ہے، اسی میں ادراک ہے، اسی میں علم ہے، اسی میں احساس ہے اور قلب صرف ایک آلہ ہے جو خون کے ذریعے سے دماغ کو بنا دیتا ہے اور دماغ کے اندر کچھ چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہرحال وہ کہتے ہیں کہ قلب آلہ کار ہے اصل نہیں ہے۔ یہ بعض اطباء کا بھی خیال ہے اور اس زمانے کے ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ بالکل غلط ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ بالکل صحیح ہے۔ بہت سی اس میں صحت بھی ہے اور بہت سی اس میں غلطیاں بھی ہیں۔

مدارِ اعمال قلب ہے...... چنانچہ ہم بنانے والے کی طرف رجوع کریں گے کہ اس نے کس چیز کو اصل کہا ہے حق تعالیٰ خالق ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز بنائی ہے اور کس لئے بنائی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کی اصلاح کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو علم دیا گیا ہے اس بات کا کہ دل کیا ہے اور دماغ کیا ہے اور ہاتھ پیر کیا ہیں اس لئے ہم نے رجوع کیا کہ بنانے والے سے پوچھو کہ اصل کیا چیز ہے قلب ہی اصل ہے یا دماغ اصل ہے۔ تو شریعت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلب ہی اصل ہے وہی حاکم مطلق ہے اس اقلیم بدن کا۔ بدن کی ساری حکومت اسی سے چل رہی ہے۔ حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ

صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ" ① "انسان کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے وہ اگر صحیح ہو تو سارا انسان صحیح ہے وہ اگر غلط ہے تو سارا انسان غلط ہے اور فرمایا کہ وہ قلب ہے"۔

تو انسان کی خوبی وخرابی کا دارومدار قلب پر ہوتا ہے۔ دل ہی کے اندر نیت پیدا ہوتی ہے اور نیت سے سارے اعمال بنتے ہیں اور فرمایا گیا کہ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" ② "سارے اعمال کا مدار نیت پر ہے"۔ نیت اچھی ہے تو عمل بھی اچھا ہے اور نیت اگر بری ہے تو عمل بھی برا ہوگا اور نیت کا دارومدار قلب کے اوپر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ سارے کے سارے اعمال وافعال کا دارومدار انسان کے قلب پر ٹھہر گیا اور فی الحقیقت زندگی بھی قلب ہی سے چلتی ہے۔

مدارِ حیات قلب ہے...... جیسے اعمال کا مدار قلب پر ہے ایسے ہی حیات کا مدار قلب پر ہے، کیونکہ قلب پہلے زندہ ہوتا ہے پھر حیات دماغ میں پہنچتی ہے۔ تو اس بناء پر مدار حیات دل کے اوپر رکھا گیا ہے اور اطباء بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں۔ اطبّاء کہتے ہیں کہ آدمی جو غذا کھاتا ہے وہ اولاً معدے کے اندر پہنچتی ہے۔ معدے کے اندر خار ہوتے ہیں جو اسے پیستے ہیں اور پیس کر حریرہ بنا دیتے ہیں۔ اس میں جو حصہ فضلات کا ہے وہ زائد ہے وہ انتڑیوں میں چلا جاتا ہے اور بول وبراز ہو کر نکل جاتا ہے اور جو رقیق جوہر ہے اس کو قلب معدے کی طرف سے جگر کی طرف بھیجتا ہے۔ معدے کی طرف سے جگر کی طرف کو جانیوالی نالیوں کی شکل کی چھوٹی چھوٹی رگیں ہیں ان کے ذریعے سے وہ غذا جگر میں پہنچتی ہے۔

جگر کو کہتے ہیں کہ وہ طباخ اور بدن کا باورچی ہے' جگر میں گرمی اور حرارت ہے وہ اس گرمی سے حریرے کو پکاتا ہے اور خوب گرمی پہنچاتا ہے جب وہ ہنڈیا پکتی ہے تو اس میں ایک حصہ ابال کا آتا ہے جھاگ کی شکل میں ایک حصہ نیچے بیٹھ جاتا ہے جسے تلچھٹ کہتے ہیں۔ ایک حصہ بیچ میں پانی میں رہتا ہے وہ کھولتا رہتا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ جو اوپر کا حصہ ہے جھاگ کا وہ بلغم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور نیچے کا حصہ جو تلچھٹ ہے سیاہ ہوتا ہے اسے سوداء کہتے ہیں اور بیچ میں جو رقیق اور پتلا حصہ ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ وہ صفراء ہے۔

تو سوداء' صفراء' بلغم. یہ تین حصے ہیں جن کو جگر تیار کرتا ہے اور پکاتا ہے ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے خون بنتا ہے تو جگر کا کام ہے خون بنانا، معدہ کا کام تھا غذا کو پیسنا۔ پھر جگر اسی خون کو بھیجتا ہے قلب کی طرف۔ جگر سے قلب کی طرف جانے والی بہت باریک رگیں ہیں جن کو طب کی اصطلاح میں شرائین کہتے ہیں (شرائین جمع ہے شریان کی) ان ہی باریک رگوں سے خون قلب کے طرف پہنچتا ہے۔ اور قلب کی شکل تو مڑی کی سی ہے کہ اوپر سے پتلا، بیچ میں سے موٹا، پھر نیچے سے پتلا۔

اوپر کے حصے کو کہتے ہیں بطن عالی اور نیچے کے حصے کو بطن سافل۔ ان میں باریک اور رقیق خون پہنچتا ہے اور قلب

---

① الصحيح للبخارى، كتاب الايمان، باب فضل من استبرأ لدينه، ج: ١، ص: ٩٠.

② الصحيح للبخارى، كتاب بدء الوحى، باب كيف كان بدء الوحى، ص: ١ رقم: ١.

ستھرا شہر ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا۔ دوست کہے گا کہ خدا کے بندے آنکھیں تیری کھلی ہوئی تھیں۔ چیزیں سامنے تھیں اور تو ہتا ہے کہ نہیں دیکھیں تو جواب میں کہتا ہے کہ اوفوہ میرا دھیان دوسری طرف تھا، مجھے خبر نہیں ہوئی کہ میرے سامنے کیا چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں نہیں دیکھتی بلکہ دل دیکھتا ہے اگر دل ہی دھیان نہ کریں تو آنکھوں کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی گھنٹے بج رہے ہیں آوازیں آرہی ہیں۔لوگ سارے سن رہے ہیں مگر آپ کو سمجھ میں کچھ نہیں آرہالوگ کہتے ہیں کہ بہت گھنٹے بجے آوازیں آئیں، آپ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ہم نے تو سب کچھ سنا ہے، وہ کہتا ہے کہ اوفوہ اصل میں میرا خیال دوسری طرف متوجہ تھا، مجھے سننے کا خیال ہی نہیں آیا۔

معلوم ہوا کہ کان نہیں سنتا بلکہ دل سنتا ہے۔ دل متوجہ ہو جائے تو ساری آوازیں کان میں آئیں گی اگر دل ہی متوجہ نہیں تو کوئی چیز بھی کان میں نہیں آئے گی ذائقہ ہے وہ بھی دل ہی کا کام ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ غذائیں کھائیں اور دل متوجہ ہو دوسری طرف نہ کھٹے کا پتہ چلے گا نہ میٹھے کا پتہ چلے گا۔ اگر کوئی کھٹے میٹھے کا پتہ پوچھے گا تو کہے گا کہ بھائی میرا دل تو دوسری طرف تھا مجھے کچھ خبر نہیں۔

مجھے ذائقہ پر ایک حکایت یاد آ گئی کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کے ایک سالے تھے حاجی مقبول صاحب بہت نیک صالح تھے اور حضرت ہی کے یہاں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اتفاق سے چار پانچ روز تک مسلسل چنے کی دال پکتی رہی۔ اور روزانہ تو آدمی سے پلاؤ کھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے جب تک کہ غذا نہ بدلے۔انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ کیا تمام دالیں مٹ مٹا کر ایک ہی چنے کی دال رہ گئی ہے ہفتہ بھر ہو گیا ہے اس ایک دال کو ہی کھاتے ہوئے اور جی بھر گیا کبھی دوسری دال بھی پکالیا کرو۔ انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکائی۔ کھانے کے بعد کہنے لگے۔ آج پھر وہی چنے کی دال پکائی۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ مار کر کہا آنکھیں ہیں کہ نہیں چنے کی دال ہے یا ماش کی؟ تو کہنے لگے کہ مجھے کچھ دھیان نہیں رہا میں سمجھا کہ وہی چنے کی دال کھا رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چکھنا دل سے ہوتا ہے۔ زبان نہیں چکھتی۔ کھٹے میٹھے کا ذائقہ اس کا احساس اور اس کا ادراک یہ سب دل سے متعلق ہے۔ اس لئے اصل چیز انسان کے بدن میں دل ہے اور باقی سب اعضاء اس کے تابع ہیں۔

مرکزِ اصلاح قلب ہے ...... دماغ بہت اعلیٰ چیز ہے مگر دماغ تفصیل کرتا ہے اس علم کی جو قلب کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ قلب اپنے اس علم اجمالی کو دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے وہ دماغ کی نالیوں میں چکر کھاتا ہے پھر نظریہ بن جاتا ہے اور نظریہ سے پروگرام بن جاتا ہے پروگرام سے اس کی اشاعت ہو کر پارٹی بن جاتی ہے۔ قلب اگر دماغ کے اندر علم نہ بھیجتا تو نہ نظریہ بنتا، نہ پارٹی وجود میں آتی۔ اسی لئے شریعت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ دل اصل ہے دماغ اس کے تابع ہے۔ ہاتھ پیر بھی اس کے تابع ہیں۔ پیٹ اور پیٹھ بھی اس کے تابع ہیں۔

اسی بناء پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اصلاح کا مرکز دل کو بنایا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نگاہ بھی

میں گرمی، جگر سے بھی زیادہ ہے اور دل پھر اس لطیف جوہر کو پکاتا ہے اور پکانے سے ایک لطیف بھاپ اٹھتی ہے، جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی وہ بھاپ رگ و پے میں سرایت کرتی ہے اسے اطباء کہتے ہیں کہ یہ روح حیوانی ہے اسی روح سے آدمی میں حس ہے، احساس ہے عقل ہے زندگی ہے۔ اطباء کی اصطلاح میں اس کو روح حیوانی کہتے ہیں۔

اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام روح نَسَمَۃ ہے اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ نفس کے معنے پھونکنے اور پھیلنے کے ہیں چونکہ یہ پورے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اس بناء پر اس کو نفس بھی کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل پر مدار ہے۔ انسان کی زندگی کا، وہی حیوانی پیدا کرتا ہے، جس سے انسان کے بدن میں حس، حرارت اور احساس وغیرہ طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بدن میں قلب اصل ہے دماغ اصل نہیں ہے۔ تمام اعضاء کا تعلق قلب سے ہے دماغ سے نہیں اور زندگی کا مدار بھی دل ہی پر ہے۔ عمل کا جذبہ بھی دل ہی سے ابھرتا ہے۔ محبت اور عدوات بھی دل ہی سے متعلق ہے۔ جس سے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں۔

دماغ قلب کے تابع ہے...... تو شریعت کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز انسان میں قلب ہے دماغ نہیں بلکہ دماغ قلب کا تابع ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ قلب میں جو علم اور شعور ہے وہ اجمالی ہے، مختصر ہے اور مجمل ہے۔ دماغ میں جا کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور پھیل کر جزئیات نکلتی ہیں۔ پھر آدمی ان سے نظریات قائم کرتا ہے۔ نظریات سے پھر پروگرام بنتے ہیں۔ تو علم اجمالی قلب میں ہے دماغ میں آ کر اس کی تفصیل ہوتی ہے اور چونکہ تفصیل ہوتی ہے اجمال کیلئے اس لئے دماغ تابع ہے قلب کے، برعکس نہیں۔ یہ شریعت کا منشاء ہے اس لئے شریعت اسلام کا موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دل کی اصلاح کی جاوے، اگر دل درست ہو گیا تو دماغ بھی درست ہے۔ ہاتھ پیر بھی درست ہیں۔ اخلاق بھی درست ہیں۔ اگر انسان کا دل بگڑ جائے تو نہ زندگی ہے اور نہ عمل ہے، نہ ہنر ہے نہ کمال ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دل زندہ ہے تو سارا انسان زندہ ہے۔ دل مردہ ہے تو سارا انسان مردہ ہے تو دار و مدار حقیقت میں دل ہی کے اوپر ہے کیونکہ ہر چیز دل سے چلتی ہے، اس لئے شریعت نے دل کو اپنا موضوع بنالیا ہے اگر دل درست ہوگا تو اعمال شرعیہ بھی درست ہوں گے اور سارا بدن درست ہو جائے گا اور دماغ بھی صحیح ہو جائے گا اور اگر قلب بگڑ گیا تو دماغ بھی خراب رہے گا اور تمام اعضاء بھی خراب رہیں گے۔

مُدرکِ حقیقی قلب ہے...... یہ ہی وجہ ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔ تو اطباء کہتے ہیں کہ یہ سارا دماغ سے ہوتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بھی دل سے ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بھرے بازار میں جائیں اور اچھی اچھی بلڈنگیں دیکھیں بڑے اچھے اچھے مناظر سامنے ہیں۔ جب آپ واپس آئیں گے تو آپ کا دوست کہے گا کہ بھائی! آج تو بڑی بڑی عمدہ عمدہ بلڈنگیں دیکھی ہیں۔ یہاں تو بڑے اعلیٰ اعلیٰ مناظر ہیں۔ بڑی بہترین سڑکیں ہیں، صاف

ٹھیک ہو جاتی ہے کان بھی درست، ناک بھی درست، یہ غلط ہے تو ساری چیزیں غلط ہیں۔ اگر دل میں خرابی ہے اور نیت بری ہے تو نگاہ بھی لامحالہ غلط جگہ پر پڑے گی اور دل میں تقدس، تقویٰ اور طہارت ہے تو نگاہ بھی غلط جگہ نہیں جائے گی۔ اگر دل میں صلاح تقویٰ ہے تو غلط قسم کی آوازیں باجے گاجے کبھی نہ سنے گا۔ اس طرف توجہ بھی نہ کرے گا اور اگر دل میں دیانت وتقویٰ نہیں ہے تو اس کے لئے جائز و ناجائز سب برابر ہے۔ باجے گاجے بھی سنے گا، حرام آوازیں بھی سنے گا، حلال آوازیں بھی سنے گا۔ اگر دل میں دین ہے تو راستہ درست رہے گا، اچھی چیزوں کی طرف طبیعت جائے گی بری چیزوں سے ہٹ جائے گی۔

افتائے قلب...... چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ ''اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ'' ① کہ جب تمہیں کوئی معاملہ درپیش ہو تو تم اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو، دل آدمی کا مخلص ہوتا ہے وہ بتاتا ہے کہ بات صحیح ہے کہ غلط ہے۔ آپ نے دوست کے اوپر دعویٰ کر دیا کہ یہ جائیداد میری ہے فلاں کی نہیں۔ حالانکہ دل سے جانتا ہے کہ یہ اسی کی ہے میری نہیں ہے۔ آپ نے قانونی طور پر مقدمہ بنایا تاکہ جائیداد میرے نام پر آجائے۔ اس پر وکلاء بحث کریں گے، ممکن ہے آپ کامیاب بھی ہو جائیں، جائیداد آپ کی ہو جائے گی، مگر دل آپ کا ملامت کرے گا کہ کمبخت تو غیر کا حق مار رہا ہے۔ دل فتویٰ دے رہا ہے کہ زمین تیری نہیں ہے۔ اگر آدمی دل کی طرف متوجہ ہو جائے تو سارے قصے ختم ہو جائیں لیکن بات تو یہ ہے کہ لوگ مطلب کے پیچھے رہتے ہیں۔

ایک عالم نے فتویٰ دیا جو کہ مرضی کے خلاف تھا۔ اب اس سوال کا دوسرا رخ بدل کر فتویٰ بھیج دیا۔ اب اس فتوے کا دوسرا جواب آ گیا وہ بھی مرضی کے مطابق نہ تھا۔ اب پھر تیسرے مفتی کے پاس بھیج دیا تو جو فتویٰ مرضی کے مطابق ہوا اس پر عمل کر لیا اور جو مرضی کے مطابق نہ ہوا اس پر عمل نہ کیا۔ یہ کوئی شریعت کا حکم ہے؟ یہ کیا شریعت کا پیرو ہے؟ یہ تو اپنے نفس کا تابع ہے، نفس میں جو چیز آ گئی چاہتا ہے کہ اس کے مطابق فتویٰ مل جائے، اس لئے شریعت نے کہا کہ مفتیوں سے فتویٰ بعد میں لینا پہلے اپنے دل سے فتویٰ لے لو، دل انسان کا مخلص ہے وہ سچا مشورہ دے گا اور صحیح فتویٰ دے گا۔

ایمان کا موردِ اوّل قلب ہے...... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلام نے دل کو پکڑا ہے اور اسی کا اعتبار کیا ہے کہ انسان کے ضمیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حق ہوتا ہے اور بحث سے اور نفسانی خواہشات سے جو بھی رائے قائم کرے دل اس کو جانتا ہے کہ وہ غلط ہے، ہاتھ چوری کرتا ہے مگر دل ملامت کرتا ہے کہ تجھے حق نہیں دوسرے کے مال چرانے کا، اگر دل کی بات مانے تو کبھی چوری نہ کرے۔ بہر حال دل انسان کا اصل ہے اس لئے شریعت نے دل کو تاکا ہے کہ اس کی اصلاح کر دو، بنیاد درست ہو جائے تو سارا انسان ہی درست ہو جاتا ہے اور بغیر اس کے انسان درست نہیں ہو سکتا۔

---

① مسند الامام احمد، حدیث وابصة بن معبد الاسدی ج: ۳۶ ص: ۴۴۳۔

شریعت نے دل کی اصلاح کے لئے ایمان رکھا ہے، اس لحاظ سے ایمان کا محل بھی قلب انسان ہے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی دل کے اندر ہوتی ہے یہی محبت آدمی سے عمل کراتی ہے۔ دل کے اندر جذبے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی جذبے کے مطابق انسان چلتا ہے۔ تو اولاً ایمان قلب انسان پر وارد ہوتا ہے۔ وہاں سے وہ ترقی کر کے دوسرے مقامات پر پہنچتا ہے، اس کی تاثیر سارے بدن پر پہنچتی ہے تو پھر ہاتھ بھی مومن بن جاتا ہے اور کان بھی مومن بن جاتا ہے اور سب اعضاء میں ایمانداری پیدا ہو جاتی ہے، اگر دل میں بے ایمانی گھسی ہوئی ہو تو ہاتھ پیر بھی بے ایمان ہوں گے اور بے ایمانی کی حرکتیں کریں گے اور دماغ بھی بے ایمان ہو جائیگا، سوچے گا تو بے ایمانی کی باتیں سوچے گا اس لئے کہ دل کی نیت خراب ہے۔

چنانچہ دل کو اصل قرار دے کر انبیاء اسی کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے ہیں کہ اس کے اندر نور و چمک پیدا کریں تا کہ اس کے اندر علم غیب کی چیزیں روشن ہو جائیں اور یہ اسی وقت ہوگا جب کہ قلب پر ایمان وارد ہو۔ اور قلب چونکہ پاک ظرف ہے اس لئے اس میں پاک چیز یعنی ایمان داخل ہوتا ہے اور پھر عمل بھی ویسا ہی ظاہر ہوتا ہے اگر دل میں خوشی ہے تو چہرے پر بھی خوشی کے آثار ظاہر ہوں گے چونکہ خوشی درحقیقت قلب کی صفت ہے، مگر چہرے سے نظر آتی ہے۔ دل میں اگر غم بھرا ہوا ہے تو چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آج تم بڑے غمگین نظر آتے ہو حالانکہ غم چھپی ہوئی چیز ہے وہ آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے چوں کہ دل کا اثر چہرے پر پڑتا ہے تو ہر جاننے والا جان لیتا ہے کہ یہ غم زدہ ہے اور واقعی وہ غم زدہ ہوتا ہے۔ تو غمی و خوشی، محبت و عداوت اور کرنا نہ کرنا یہ چیزیں انسان کے قلب سے متعلق ہیں۔ اگر دل درست ہے سب چیزیں درست ہیں۔ اگر دل خراب ہے تو اس کی وجہ سے سب چیزیں خراب ہیں اور اسی وجہ سے ہاتھ پیر پر اثر پڑتا ہے اور وہ اثر جو قلب پر وارد ہوتا ہے وہ متعدی ہو کر اعضاء و جوارح پر طاری ہوتا ہے، اچھا ہو یا برا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی کے انتقال کا وقت قریب آتا ہے اور ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ہاتھوں اور پیروں کو سونگھتے ہیں اور دماغ کو دیگر بدن کو بھی سونگھتے ہیں اور ایمان کی خوشبو سونگھنا چاہتے ہیں۔ دل میں اگر ایمان ہے تو ہاتھ پیر میں بھی ان کے اثرات رچے ہوئے ہوتے ہیں، ہاتھوں کو بھی سونگھتے ہیں کہ ان میں بھی ایمان کی خوشبو ہے یا نہیں، اصل خوشبو کا مرکز تو دل ہے مگر اعضاء پر اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں، جیسے خوشبو کا مخزن تو باغ ہے اور پھول ہے مگر کپڑوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے اور باغ والی خوشبو کے اثرات سے جہاں جہاں ہوا پہنچے گی وہ شے معطر ہوتی چلی جائے گی۔ بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر دل اصل ہے اس کو درست کیا جائے اور اسکی درستگی کی پہلی بنیاد ایمان ہے، ایمان رہتا ہے کہ قلب کے اندر اور ان کے اثرات ہاتھ پر عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

محل اسلام...... اس سے معلوم ہوا کہ دل ایمان کی جگہ ہے اور ہاتھ پیر اسلام کی جگہ ہیں۔ ایمان چھپی ہوئی شے

ہے جو دل میں رہتا ہے اور اسلام کھلی ہوئی شئے ہے جو ہاتھ اور پیروں پر آتا ہے۔ آپ نے نماز پڑھی ہاتھ پاؤں سے پڑھی۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے نماز پڑھی مگر اس فعل کا سرچشمہ قلب کے اندر ہے۔ اگر اس میں جذبہ عقیدت کا، محبت کا اور اللہ کی چاہت کا پیدا نہ ہوتا تو کبھی نماز نہ پڑھتے۔ معلوم ہوا کہ اصل میں نماز پڑھنے والا دل ہے لیکن عمل کی صورت ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتی ہے، ایمان کا محل دل ہوتا ہے اس کے اثرات جب ہاتھ پاؤں پر آتے ہیں تو وہ اسلام بنجاتے ہیں۔

چونکہ ایمان پوشیدہ شے ہے اور اسلام ظاہر شئے ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ اَلْاِیْمَانُ سِرٌّ وَالْاِسْلَامُ عَلَانِیَةٌ...... کہ ایمان چھپی ہوئی چیز ہے جس کو دل لئے ہوئے ہے اور اسلام کھلی ہوئی شے ہے جو ہاتھ پاؤں پر ظاہر ہوتی ہے۔ تو وہی اندرونی شئے جب تک چھپی رہتی ہے اسے ہی ایمان کہتے ہیں اور وہی شئے جب ہاتھ پاؤں پر آتی ہے تو اسے اسلام کہتے ہیں۔

حقیقت ایمانیہ...... ایمان کے معنٰی کیا ہیں؟ اور کس طرح سے ہمارے اندر آتا ہے؟ اور اس کے آثار کیا ہیں؟ اور کیسے پہچانا جاتا ہے؟ تو سنئے! ایمان کی حقیقت ہے محبت اگر اللہ کی محبت کامل ہے تو کہیں گے کہ اس کا ایمان کامل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل میں رچ گئی ہے تو کہیں گے کہ ایمان آ گیا۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ ① جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں اللہ کی محبت اور عشق سرایت کئے ہوئے ہے۔ اگر عشق ومحبت نہ ہوتا تو ایمان کبھی نہ آتا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کے رگ وپے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بس گئی ہے اور اللہ کی محبت جم گئی ہے۔

تو محبت درحقیقت ایمان کا دوسرا نام ہے۔ ایمان نہیں محبت نہیں۔ محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ اصل چیز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔ یہی چیز ایمان بناتی ہے یہی اعتقاد قائم کرتی ہے۔ اسی کو فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ل "اَیُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ". ② کوئی بھی تم میں مومن نہیں بنے گا جب تک قلب میں میری اتنی محبت نہ ہو کہ اس کو اتنی نہ اپنے ماں باپ سے اور نہ اولاد سے محبت ہو اور نہ کسی اور سے اتنی محبت ہو۔ بغیر حب نبی کے ایمان کامل نہیں ہوتا۔

آثارِ ایمانیہ...... علامت اس کی یہ ہے کہ ایک طرف تو ہے اولاد کی محبت ایک طرف اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، جب ٹکرا جائیں تو اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اختیار کرے اور اولاد کی محبت چھوڑ دے، یہ علامت ہوگی کہ واقعی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے اگر آدمی نے اولاد کی محبت کو اختیار کیا اور رسول کی محبت کو چھوڑ دیا تو کہا جائے گا کہ رسول سے محبت نہیں بلکہ اولاد سے محبت ہے تو ٹکراؤ سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی محبت

---

① پارہ: ۲، سورة البقرة، الآیة: ۱۶۵.

② الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، ص: ۳، رقم: ۱۴.

غالب ہے، مثلاً آپ لحاف میں آرام سے پڑے ہوئے ہیں بڑی خوشگوار نیند آرہی ہے۔اچانک مؤذن نے آواز دی: حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ. حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ. ...... ''دوڑو نماز کی طرف' دوڑو کامیابی کی طرف''۔آپ نے لبیک نہیں کہا تو کہیں گے کہ نفس کی محبت غالب ہے اور اگر آرام چھوڑ کر کھڑے ہوئے اور وضو کیا اور مسجد میں گئے نماز پڑھی تو کہیں گے کہ محبت خدا اور رسول غالب ہے۔تو ٹکراؤ کے وقت ہی آدمی جدھر مائل ہوتا ہے اسی طرف کی محبت کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم مومن نہیں بن سکتے جب تک میری محبت اولاد، ماں باپ وغیرہ سب کی محبت سے غالب نہ ہو جائے کہ جب ماں باپ کی محبت میری محبت سے ٹکرائے تو مجھے اختیار کرو، ماں باپ کو چھوڑ دو اور جب میری محبت اولاد کی محبت ۔سے ٹکرا جائے تو مجھے اختیار کرو، اولاد کی محبت کو چھوڑ دو۔یہی وجہ ہے حضرات صحابہ کرامؓ میں محبت نبوی اتنی غالب تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی تو صحابہؓ نے بھی اس محبت کی وجہ سے وطن چھوڑا۔گھر بار چھوڑا۔عزیز و اقارب چھوڑے، جائیدادیں چھوڑیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو لئے مکہ میں ساری تجارتیں ترک کیں اور مدینہ میں غربت کی زندگی اختیار کی ان کو کس چیز نے مجبور کیا؟ یہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی تو تھی۔اس محبت کی وجہ سے عیش و آرام کا سب سامان ترک کیا، مفلس و قلاش ہو کر رہنا گوارہ کیا مگر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا۔

مقام صدیقیت ......حدیث میں ایک واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ غزوہ بدر میں ۳۱۳ صحابیؓ شریک تھے۔ان میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بیٹے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے بعد میں وہ ایمان لائے وہ اس غزوہ میں کفار کی طرف سے لڑنے کے لئے آئے تھے' ایمان لانے کے بعد ایک روز صدیق اکبرؓ سے عرض کیا کہ ابا جان غزوہ بدر کے موقع پر کئی موقعے ایسے آئے کہ آپ بالکل میری تلوار کی زد پر تھے اگر میں وار کرتا تو آپ بچ نہیں سکتے تھے۔مگر نے سوچا میرے باپ ہیں کس طرح ان پر حملہ کروں تو میں ایک طرف ہو گیا، یہ بات بیٹے نے باپ سے کہی: ''حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اچھا یہ موقعے آئے ہیں کہ میں اور تو آمنے سامنے آگئے تھے۔بیٹے نے کہا ہاں۔فرمایا کہ مجھے خبر نہ ہوئی اگر تو میری زد پر آتا تو میں سب سے پہلے تجھے قتل کرتا۔اس واسطے کہ تو دشمن تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور رسول کی محبت کے مقابلے میں اولاد کی محبت کوئی چیز نہیں ہے''۔

غلبۂ محبت ......معلوم ہوا ہے کہ ایمان جب کسی کے دل میں گھر کر جاتا ہے اور محبت غالب آجاتی ہے تو اپنے کو اس محبت کے بدلے فروخت کر دیتا ہے۔پھر محبوب کی ہر ادا سے محبت ہو جاتی ہے اس کے مقابل میں نہ اولاد سے محبت رہتی ہے اور نہ ماں باپ کی محبت کوئی حیثیت رکھتی ہے۔سب کی محبتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی محبت غالب آتی ہے۔صحابہ کرامؓ نے ہجرتیں کیں۔جائیدادیں چھوڑیں، تجارتیں ترک کیں، یہ سب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی

محبت کا نتیجہ تھا۔ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ کی اس لئے کہ رسول کی محبت غالب تھی۔

تو پہلا حق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ محبت ہو۔محبت نہیں تو ایمان نہیں۔ایمان نہیں تو پھر اسلام ہی نہیں۔تو بنیادی چیز محبت ہے۔اسی واسطے محبت پر زور دیا گیا ہے۔یہی صحابہؓ کا طریق تھا اور یہی بعد میں اہل اللہ کا طریق رہا ہے۔یہ قاعدے کی بات ہے کہ جس شخص کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں۔اس کا چلنا پھرنا بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا لباس بھی محبوب بن جاتا ہے اور اس کا ذکر اور چرچا بھی محبوب بن جاتا ہے۔فقط محبوب سے ہی محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کے نام سے جو چیز منسوب ہوجاتی ہے، اس سے بھی محبت ہوجاتی ہے۔

کسی نے مجنوں کو دیکھا کہ لیلیٰ کے مکانوں کی اینٹ اینٹ کو چومتا پھر رہا ہے کسی نے کہا۔احمق! تو یہ کیا کر رہا ہے اینٹوں میں کیا رکھا ہوا ہے اور اینٹوں کو چومنے سے کیا فائدہ ہے؟اس نے دوشعر میں جواب دیا۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی ‏ ‏ ‏ ‏ اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَذَا الْجِدَارَا

کہ میں لیلیٰ کے مکان پر جب گزرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس اینٹ کو چومتا ہوں۔کبھی اس دہلیز کو چومتا ہوں اور کیوں چومتا ہوں۔

وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ ‏ ‏ ‏ ‏ وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ نَّزَلَ الدِّیَارَا

مجھے ان اینٹوں سے محبت نہیں ہے وہ جو ان اینٹوں میں بیٹھی ہوئی ہے اس سے محبت ہے اس کی وجہ سے ان اینٹوں سے محبت ہوگئی ہے، اس کے کتے سے محبت ہوگئی ہے۔اس کی بلائیں لینے کو بھی تیار ہوں۔تو جب محبت ہوتی ہے تو ایک محبوب ہی سے محبت نہیں ہوتی بلکہ جو چیز اس کے نام سے لگ جاتی ہے وہ بھی محبوب بن جاتی ہے۔

چونکہ آپ کو محبت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو گنبد خضراء بھی محبوب ہوگا۔اس کی زیارت کو آپ عبادت سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ایک آنکھ گنبد پر پڑ جائے تو دنیا وآخرت کی سعادت مل جائے گی۔وہ کیوں؟اس لئے کہ گنبد خضرا خود محبوب نہیں بلکہ اس میں جو آرام فرما ہیں اصل میں وہ محبوب ہیں۔چونکہ اس گنبد پر نام لگ گیا ہے ان کا اس لئے وہ بھی محبوب ہوگیا گنبد تو پھر قریب ہے، مدینہ سے محبت ہے، شہر اء کو دیکھو تو مدینہ تو صرف ایک شہر ہے جیسے ہمارے یہاں شہر ہیں۔یہ شہر زیادہ خوبصورت ہیں، وہ شہر اتنا خوبصورت بھی نہیں مگر پھر بھی محبت ہے اصل میں محبت ہے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے گنبد خضراء بھی محبوب ہوا۔اس محبت کی وجہ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی محبوب ہوئی اسی محبت کی وجہ سے مدینہ بھی محبوب ہوا۔تو سلسلہ بسلسلہ ہر چیز تک محبت پہنچ جاتی ہے۔

آپ بیت اللہ شریف کی اینٹ اینٹ کو چومتے ہیں۔کیوں؟اس لئے کہ بیت اللہ کے مقام پر تجلی ربانی اتری ہوئی ہے۔اصل میں محبت اللہ سے ہے چونکہ بیت اللہ اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے اس لئے اس سے بھی محبت ہوئی ہے اور جب خانہ کعبہ محبوب ہوا تو پوری مسجد حرام بھی محبوب ہوگئی اور اس کی محبت ظاہر ہوئی اس طرح پر کہ آپ اس

کی عظمت کرتے ہیں۔اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، جب مسجد حرام محبوب ہوئی تو مکہ محبوب بن گیا کہ وہ شہر پناہ ہے اس مسجد حرام کا، لہٰذا وہ شہر بھی محبوب بن گیا۔اور چونکہ حجاز میں واقع ہے تو ہم حجاز مقدس کہتے ہیں کیونکہ سارے حجاز سے محبت ہوگئی ہے۔تو حجاز کے جتنے باشندے ہیں ان سب سے محبت ہوگئی۔یہ پڑوسی ہے اس کا لہٰذا یہ بھی محبوب ہے تو جب آدمی کے دل میں محبت آتی ہے تو فقط ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا، بلکہ محبوب کی ساری ادائیں محبوب بن جاتی ہیں، چال ڈھال بھی محبوب، لباس بھی محبوب، کھانے کا طرز بھی محبوب، رہن سہن کا طرز بھی محبوب، وہ تمام چیزیں محبوب بن جاتی ہیں جو محبوب کی پسندیدہ اور محبوب ہیں۔

آثارِ محبت...... بہر حال یہیں سے اتباع سنت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ محبت کا اثر ہے اگر محبت ہے تو اتباع سنت اختیار کرے گا ورنہ نہیں۔محبت ہی آمادہ کرتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کرنے پر کہ جس طرح آپ بیٹھ کر کھاتے تھے۔اسی طرح بیٹھ کر کھانا کھایئے۔جس طرح آپ آرام فرماتے تھے اسی ڈھنگ سے آرام ہو۔جس ڈھنگ سے دشمنوں سے برتاؤ کرتے تھے وہی ڈھنگ تم بھی اختیار کرو۔ان چیزوں سے اتباع سنت کا جذبہ غالب ہو جائے گا۔

اگر محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ غالب ہے تو بدعات سے نفرت ہو جائے گی، سنت کی پیروی سے محبت ہوگی کیونکہ محبوب کی ذات محبوب ہے اور جب ذات محبوب ہے تو ذات کی ادا بھی محبوب ہوں گی۔آپ کا طرز سلام وکلام بھی محبوب ہوگا۔ہر چیز محبت کے نیچے آتی چلی گئی اس کا نام اتباع سنت ہے کہ ہر شعبہ میں پیروی ہو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی اس میں خیر و برکت ہے حتیٰ کہ معاملات ومعاشرت میں بھی جب پیروی کریں گے تو صدیق بن جائیں گے۔

سونے کا مسنون طریق اور قوت ارادی...... میں کہتا ہوں۔مثال کے طور پر ہم سوتے ہیں اس میں بھی ہم آزاد نہیں ہیں پابند ہیں سنت کے کہ اس طرح سے سوئیں جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے۔سونا تو ہے لیکن حضور کے طریقے پر سوئیں گے تو عبادت بن جائے گا۔اور آدمی چار طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر سوئے گا۔چت لیٹ کر سوئے آیا اوندھا لیٹ کر یا دائیں کروٹ یا بائیں کروٹ پر سوئے گا۔بس یہی چار طریقے سونے کے ہیں۔کوئی الٹا لٹک کر تو سونے سے رہا۔ان چار طریقوں میں ہم آزاد نہیں بنائے گئے بلکہ پابند ہیں سنت کے۔

اوندھا لیٹنے کو شریعت میں مکروہ سمجھا گیا ہے۔حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ مسجد میں اوندھے لیٹے ہوئے سو رہے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیروں سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابو ہریرہ اوندھے لیٹ کر مت سوؤ اس لئے کہ یہ دوزخیوں کی ہیئت ہے کہ ان کو اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔اس لئے مومن کا کام نہیں کہ وہ جہنمیوں کی ہیئت اختیار کرنے اور جہنمیوں سے مشابہت اختیار کرے۔اور پھر اوندھا لیٹنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔اس سے انتڑیاں الٹ پلٹ ہو جاتی ہیں ممکن ہے کہ کسی انتڑی میں گرہ لگ جائے اور

پیٹ میں درد شروع ہو جائے یا کوئی تکلیف ہو جائے اس لئے شریعت نے مکروہ سمجھا ہے۔ اگر سوتے سوتے اوندھا ہو جائے وہ دوسری بات ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اپنے ارادے سے آدمی اوندھا نہ لیٹے۔ ①

اب رہ گیا چت لیٹنا تو چت لیٹ کر سونا جائز تو ہے۔ شرعاً ممنوع نہیں حرام نہیں مگر شریعت کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس واسطے کہ چت لیٹنا بے قابو ہو جانے کی علامت ہے۔ اور جب آدمی بے بس ہو جاتا ہے تو چت لیٹ جاتا ہے اسی واسطے اگر کوئی پہلوان کسی کو پچھاڑ دے تو کہتے ہیں کہ چاروں شانے چت گرا۔ کوئی نہیں کہتا کہ چاروں شانے پٹ گرا کیونکہ جو پٹ ہوتا ہے وہ اندھا ہوتا ہے اسے کچھ قابو ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جائے۔ مگر چت لیٹنے والا بالکل بے قابو ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لئے ضعیفوں کی ہیئت پسند نہیں کی گئی، مومن کا کام ہے مضبوط ہونا، مومن کا کام بیماروں کی طرح پڑنا نہیں ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے: "اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ" ② قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے، قوت ہوگی تو جہاد کرے گا، قوت ہوگی تو مجاہدہ کرے گا اور ضعیف بیچارہ چار پائی پر بس پڑا ہوا ہے۔ نہ جہاد کے کام کا، نہ جنگ وجدل کے کام کا، نہ مجاہدے کے کام کا کسی کام کا نہیں، یہ شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ پسند کیا ہے کہ ہر معاملہ میں بہادرانہ افعال صادر ہونے چاہئیں۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے: آدمی مریضوں اور ضعیفوں کی چال نہ چلے بلکہ اس طرح چلے بلکہ اس طرح چلے کہ دیکھنے والا دیکھے کہ اس کے بدن میں کچھ جان ہے، کچھ قوت ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوتے تو رکاب میں پیر رکھ کر سوار نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی ایک قسم کی محتاجگی ہے کہ آدمی بغیر رکاب کے سوار نہ ہو سکے بلکہ کود اور اچھل کر سوار ہوتے تھے تاکہ شجاعت اور بہادری ظاہر ہو۔

بہر حال اسلام نے مومن کے لئے کوئی ایسی حرکت پسند نہیں کی جس سے ضعف ٹپکتا ہو۔ مجبوری ظاہر ہوتی ہے اور چونکہ چت لیٹنا بے قابو ہونے کی علامت ہے۔ ضعیفوں اور بیماروں کی علامت ہے اس لئے جائز تو ہے۔ شریعت نے اس کی ممانعت نہیں کی مگر اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔ اب رہ گیا بائیں کروٹ سونا تو مخالفت تو اس کی بھی نہیں، جائز ہے مگر پسندیدہ یہ بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ بائیں جانب قلب ہے۔ جب بائیں کروٹ پر سوئے گا تو آدمی کے قلب کو راحت زیادہ ملے گی اور جب راحت زیادہ ملے گی تو نیند گہری آئے گی اور جب نیند گہری آئے گی تو اندیشہ ہے کہ تہجد قضا ہو جائے اور صبح کی نماز بھی قضا ہو جائے۔ اور دوسرے معمولات قضا ہو جائیں۔ اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ آدمی اتنی زیادہ راحت کرے کہ گھوڑے بیچ کر سو جائے اور مردوں سے شرط باندھ کر سو جائے۔ آدمی کو چوکنا ہو کر سونا چاہئے تاکہ جس وقت چاہے آنکھ کھلے۔ آدمی کا قلب مضبوط ہو۔

---

① السنن لابن ماجه، كتاب الادب، باب النهى عن الاضطجاع على الوجه، ص: ٢٦٩٩، رقم: ٣٧٢٥. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحيح وضعيف ابن ماجه ج: ٨ ص: ٢٢٣. ② السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب التوكل واليقين ،ص: ٢٧٣٠، رقم: ٤١٦٨، وزاد: المؤمن القوى خير و احب الى الله.

راحت میں غرق ہوکر بے قابو نہ بنے۔

اسی واسطے عزم پیدا گیا کہ اگر آدمی سوتے وقت یہ ارادہ کر کے سوئے کہ ہماری آنکھ صبح کو چھ بجے کھلنی چاہئے تا کہ جماعت قضا نہ ہوتو ٹھیک چھ بجے آنکھ کھلے گی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نہ کھلے۔ اٹھنا نہ اٹھنا تو آدمی کے نفس کی بات ہے۔ سستی سے نہ اٹھے مگر آنکھ ضرور کھل جائے گی۔ تو مضبوط عزم وارادہ ضرور کام کرتا ہے اس کے لئے شریعت نے طریقہ یہ بھی رکھا ہے کہ سورۂ کہف کی جو آخری آیتیں ہیں وہ پڑھ کر سویا کریں ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴾ ① تا آخر سورۃ۔ ان آیتوں کا اثر یہ ہے کہ اگر ان آیتوں کو پڑھ کر ارادہ کرے کہ فلاں وقت اٹھنا ہے تو ضرور آنکھ کھلے گی۔ مگر پہلی چیز عزم اور عزیمت ہے کہ ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے اٹھنا ہے اور اگر ارادہ کر کے سوئے کہ مجھے تو سونا ہے چاہے اٹھے نہ اٹھے تو آٹھ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلے گی۔ انسان کے ارادے کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت دی ہے، انسان کی عزیمت کو بڑی طاقت بخشی ہے۔ ارادے پر ان آیتوں کو بھی پڑھ لے تو زیادہ مدد ہوگی۔ بہر حال شریعت کا منشاء یہ ہے کہ گہری نیند مت سوؤ کہ سارے اذکار، سارے اعمال، ساری نمازیں نیند کی نذر ہو جائیں، اس لئے شریعت نے پسند نہیں کیا کہ انسان بائیں کروٹ پر سوئے اور گہری نیند سوئے۔

اب دائیں کروٹ رہ جاتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا طریقہ ہے اور یہی سارے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے۔ آپ دایاں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر سوتے تھے۔ جب آدمی دائیں کروٹ سوئے گا تو قلب معلق رہے گا اور جب دل لٹک گیا تو زیادہ راحت نہیں ملے گی قلب چوکنا رہے گا۔ ایسی نیند نہیں آئے گی کہ جس میں آدمی غرق ہو جائے اس لئے دائیں کروٹ پر لیٹنے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دیا ہے اور دوسری ہیئتوں کو ممنوع قرار تو نہیں فرمایا مگر پسندیدہ نہیں فرمایا کیونکہ دوسری ہیئتوں میں مومن کا مقصد اصلی فوت ہو جاتا ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز روزہ تو بجائے خود عبادت ہے مگر عام زندگی میں بھی آپ آزاد نہیں پیدا کئے گئے بلکہ قانون خداوندی کے پابند بنائے گئے ہیں کہ سوتو اسی ہیئت سے سو جس ہیئت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سوتے تھے، کھانے بیٹھو تو اسی ہیئت سے کھاؤ جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر کھاتے تھے۔ جب آپ کوئی کام کریں تو اسی ہیئت سے کریں جس ہیئت سے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کو کرتے تھے۔

اِبتدا بالتیمن...... چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی جیسے کہ روایت میں ہے: ''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ'' ② آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے کاموں میں ہمیشہ دائیں جانب کو پسند فرماتے تھے۔ اگر کنگھا کرتے تو پہلے دائیں جانب پھر بائیں جانب، اگر جوتا پہنتے تو پہلے دائیں پیر میں پھر

① پارہ: ١٦، سورۃ الکھف، الآیۃ: ١٠٧. ② السنن للنسائی، کتاب الزینۃ، باب التیامن فی الترجل، ص: ٢٤٢٣، رقم: ٥٢٤٢. حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی ج: ١ ص: ٢٥٦.

بائیں پیر میں اگر کرتہ پہنتے تو پہلے آستین میں دایاں ہاتھ ڈالتے پھر بایاں۔ دانتوں میں اگر مسواک کرتے تو پہلے دائیں جانب لے جاتے پھر بائیں جانب۔ ہر اچھی چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب کو پہلے اختیار فرماتے تھے۔ یہی کام مومن کا ہونا چاہئے کہ ہر اچھے کام میں دائیں جانب کو پہلے اختیار کرے گا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں کوئی چیز آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تقسیم فرماتے تو دائیں جانب سے شروع فرماتے۔ دائیں جانب تقسیم فرما کر پھر بائیں جانب متوجہ ہوتے۔ اور ہر بری اور خسیس ترین شئے کی ابتداء بائیں جانب سے فرماتے ناک صاف کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے استنجا کرتے تو بایاں ہاتھ استعمال کرتے۔ یہ ہے سنت، اگر آپ سنت پر عمل کریں تو آپ کی ساری دنیا دین بن جائے گی، نہ یہ کھانا پینا، رہنا سہنا اتباع سنت کی وجہ سے دین بنتا چلا جائے گا۔ اور اتباع سنت کب ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے محبت کے غلبے کی وجہ سے اگر محبت غالب نہ ہو تو آدمی کبھی بھی اتباع سنت نہ کرے بس یہ سوچے گا کہ مطلب نکل جانا چاہئے، کہاں کی محبت اور کہاں کا اتباع محبت غالب رہے گی تو قدم قدم پر خیال رہے گا۔

معیار عقل..... حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ تھے وہ سہارنپور سے سوار ہوئے۔ جانا تھا ان کو کانپور، پہلے سہارنپور کے گنے بہت مشہور تھے۔ اب وہ گنا نہیں ہوتا وہ گنے بہت ملائم۔ بہت میٹھے اور بڑے ہی عمدہ ہوتے تھے، تحفے کے طور پر لوگ بہت دور دور تک لے جاتے تھے تو انہوں نے بھی گنے خریدے کہ کانپور جا کر احباب میں تحفے کے طور پر تقسیم کردوں گا۔ مگر گنوں کا وزن چالیس سیر سے بھی زیادہ تھا اور ایک ٹکٹ سے اتنا وزن نہیں لے جاسکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ زائد محصول دے دوں گا۔ بابو سے انہوں نے ذکر کیا تو بابو نے ایک نیک صورت دیکھ کر کہ بھولا بھالا ہے۔ بڑا مقدس آدمی ہے، کہا کہ آپ لے جائیں۔ کوئی محصول وغیرہ نہیں ہے۔ گویا اس نے اپنے نزدیک بڑی عقیدت سے کام لیا کہ نیک صالح آدمی ہے کیا اس سے پیسے لئے جاویں۔ اس نے کہا کہ معاف ہے آپ لے جائیں۔

انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! آپ محصول لے لیں اگر ریل میں چیکر آ گیا تو محصول بھی لے گا اور جرمانہ الگ وصول کرے گا۔ وہاں ڈبل دینا پڑے گا۔ اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ بھی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! جب میں غازی آباد اسٹیشن پر دوسری گاڑی بدلوں گا تو دوسرا چیکر آئے گا، وہ جرمانہ وصول کرے گا۔ مال زیادہ ہے ٹکٹ میں اتنی گنجائش نہیں۔ سفر جتنا زیادہ لمبا ہوگا اتنا ہی جرمانہ بھی ہوگا تو وہاں مجھے چوگنا دینا پڑے گا۔ آپ مجھ سے یہیں لے لیں اس نے کہا کہ ہم چیکر سے کہہ دیں گے وہ اس چیکر سے کہہ دے گا۔ وہ آپ کو کچھ نہ کہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا جب میں کانپور میں اتروں گا اور گیٹ سے پاس ہوں گا تو وہ گیٹ بابو کہے گا کہ بلٹی (BUILETY)؟ وہ میرے پاس ہوگی نہیں وہ مجھ سے چوگنے وصول کرے گا اتنے میری جیب میں ہوں گے بھی نہیں۔ اس بابو نے کہا کہ اس چیکر سے کہلوادیں گے وہ اس گیٹ بابو سے کہہ دیں گے وہ آپ کو کچھ نہیں

کہیں گے۔انہوں نے کہا کہ پھر کیا ہوگا؟ بابو نے کہا پھر تمہارا گھر آ جائے گا۔انہوں نے کہا کہ گھر تو گر جائے گا۔

مگر خداوند عالم نے اگر یوں پوچھ لیا کہ ریلوے کی چوری کیوں کی تھی تو میں کیا جواب دوں گا۔تو اب وہ بے چارہ خاموش ہوا اس بابو نے کہا کہ یہ بیچارہ مجنوں معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اس کو مجنوں ہی کہتے ہیں۔

اہل دنیا عقلمند اس کو کہتے ہیں جو بے ایمانی زیادہ کرے، چالاکیاں زیادہ کرے، دھوکہ زیادہ دے اسے کہتے ہیں کہ بڑا بھاری دانشمند ہے۔اور اگر بے چارہ بھولا بھالا سیدھا ایمانداری اور امانتداری سے پیش آئے اسے کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے۔پہلے زمانہ کی روح اس میں آگئی ہے مگر حقیقت میں عقلمند وہی ہے جو اپنی آخرت کو پیش نظر رکھے۔وہ عقلمند نہیں جو انجام کو بھلادے اور بعد میں مصیبتیں اٹھائے جس کو مولانا رومیؒ نے کہا ہے کہ ۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد   اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

دیوانہ وہی ہے جو کہ دیوانہ نہ بنا اور عقلمند، وہ ہے جو عقلمند بننا نہیں چاہتا۔اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیوانگی ہی چاہتا ہے۔حقیقت میں دانشمندی وہی ہے جو شخص اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کا نام زیادہ لے گا وہی لقب پائے گا مجنونوں کا خبطیوں کا۔اور جو شخص چالاکیاں زیادہ کرے گا وہ لقب پائے گا اہل دنیا کے نزدیک دانشمند اور عقلمند ہونے کا۔ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:''یُقَالُ لِلرَّجُلِ مَآ اَعْقَلَهٗ وَمَآ اَظْرَفَهٗ وَمَآ اَجْلَدَهٗ وَلَيْسَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ'' (١) ''ایک آدمی کو کہا جائے گا کہ کتنا بڑا دانشمند ہے اور کتنا بڑا عقلمند ہے اور کیا وسیع الظرف ہے اور کیسا دانا ہے اور کیسا مدبر ہے حالانکہ اس کے قلب میں ذرہ برابر ایمان نہ ہوگا''۔اور دنیا کہے گی کہ بڑا عقلمند ہے بڑا دانش مند ہے، مگر چونکہ اس میں ایمان کا نشان بھی نہ ہوگا جو کچھ ہوگی وہ خود غرضی ہوگی۔دنیا داری اور دنیا سازی ہوگی اس لئے وہ عقلمند نہیں ہے۔شریعت اسے عقلمند کہتی ہے جو اپنے انجام کو سوچے اور دنیا کے بارے میں خیال کرے کہ بھلی بری جیسی بھی ہوگی گزر جائے گی وہاں جو مصیبت ہے وہ ابدی ہے وہ ہمیشہ جھیلنی پڑے گی جو کہ قابل برداشت نہیں ہے نہ یہاں کی مصیبت باقی رہنے والی ہے اور نہ یہاں کی نعمت باقی رہنے والی ہے۔اس لئے جو آدمی آخرت کے مصائب کی رعایت کر کے دنیا کے مصائب کا تحمل کرے وہ عقلمند ہے۔فرمایا گیا:

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى﴾ (٢) ''آخرت کا عذاب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور شدید ہے''۔اور یہاں کی مصیبت نہ شدید ہے اور نہ دیر تک باقی رہنے والی ہے۔

راستے کا رنج و راحت اور منزلِ مقصود......اکبر نے کیا خوب بات کہی ہے اور بڑی عمدہ بات کہی ہے لقب ہی اس کا لسان العصر ہے۔اس بناء پر ان کی بات بڑی حکمت کی بات ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ ۔

---

(١) الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب رفع الامانة والایمان من بعض القلوب، ص: ٢٠٧، رقم: ٣٦٧.

(٢) پارہ: ١٦، سورۃ طه، الآیة: ١٢٧.

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ۔ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

یہ کام تمہیں بھی کرنا ہے اور مجھے بھی کرنا ہے اور سب کو کرنا ہے کیونکہ سب ہی کو جینا اور مرنا ہے۔ آگے کہتا ہے۔

رہ گئی بحث رنج و راحت کی ۔ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

رنج بھی گزر جائے گا اور راحت بھی گزر جائے گی، بڑی ہی حکیمانہ بات کہی ہے کہ راستہ کے رنج و راحت پر نظر مت رکھو اور انجام پر نظر رکھو۔ منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اگر منزل پر پہنچ کر مصیبت میں مبتلا رہے تو وہ نا قابل برداشت ہے۔ تو اکبرؒ نے کہا ہے کہ راستے کا رنج و راحت فقط وقت کے گزر جانے کا نام ہے۔

یہاں میرے دل میں ایک خلجان یہ پیدا ہوا کہ بات تو بڑی حکیمانہ کہی ہے راستے کے رنج و راحت کا خیال مت کرو مگر منزل مقصود نہیں بتلائی کہ جانا کہاں ہے۔ اسی بناء پر دو تین شعر میں نے اس میں جوڑ دیئے ہیں اپنی طرف سے اکبر نے راستہ کا پتہ دیا ہے، میں منزل کا پتہ بتا دیتا ہوں میں کوئی شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر کہنا میرا مشغلہ ہے، پھر اکبر جیسا شاعر اور اس کے شعر میں اپنا شعر ملانا ایسا ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیں۔ بس ایک تک بندی ہے جو میں نے کردی ہے اور میں نے اکبر کے اشعار پر اضافہ کر دیا ہے۔ تو دو ان میں راستے ہی کے بارے میں ہیں ان میں ایک آخری منزل کے بارے میں۔ اکبرؒ نے تو کہا ہے کہ۔

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے ۔ یعنی جینا ہے اور مرنا ہے

رہ گئی بحث رنج و راحت کی ۔ وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

آگے میں کہتا ہوں۔

رہ گیا عز و جاہ کا جھگڑا ۔ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

یعنی عزت ہم کہتے ہیں یہ فقط خیالی شئے ہے اور خیال بھی دوسرے کا۔ اگر ہمارے خیال سے ہماری عزت ہو تو چوبیس گھنٹے ہم خیال کئے بیٹھے رہیں کہ ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دوسرا بڑا مانیں تو عزت ہوتی ہے ہمارے خیال باندھنے سے عزت نہیں ہوتی اور دوسروں کا خیال آپ کے قبضے میں نہیں۔ اگر خیال بدل گیا بس جب ہی ذلیل ہو گئے۔ آج خیال یہ ہے کہ فلاں آدمی بہت بڑا ہے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیتے ہیں، لیڈر بن جاتے ہیں اور کل کو خیال بدل گیا تو دوسرے کے گلے میں ڈال دیا۔ پہلے کی ساری عزت ختم ہو گئی۔ بس ذلیل ہو گیا یہ صرف خیالی عزت ہے۔

اصل عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [1] تو اصل عزت یہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت کر دی ہے، اس لئے میں نے کہا کہ۔

رہ گیا عز و جاں کا جھگڑا ۔ یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے

---

[1] پارہ: ۲۸، سورۃ المنافقون، الآیۃ: ۸.

اور میں آگے کہتا ہوں۔

قابلِ ذکر ہی نہیں خورد نوش　　یہ بہیمی کی خو سے لڑنا ہے

کھانا پینا یہ کوئی قابل ذکر نہیں اس لئے کہ یہ کوئی کمال کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ چوپائے بھی کھاتے پیتے ہیں اگر آدمی نے کھالیا تو کونسا کمال کیا ہے۔ جانور کی حد سے نہیں نکلے گا۔ وہ بھی کھاتے ہیں تو کھانا کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ بہرحال تین چیزیں ہوگئیں اکبر نے کہا تھا کہ راستے کے رنج وراحت کی پرواہ مت کرو، یہ گزر جانے والی ہے، میں کہتا ہوں کہ کھانے پینے کا خیال مت کرو یہ تو جانوروں کی علامت ہے نہ عزت وذلت کا خیال کرو کیونکہ وہ خیالی شے ہے بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کا ارادہ کرو اور کوشش کرو۔ آخری شعر میں اسی کا پتہ دیا ہے:

مقصدِ زندگی ہے طاعتِ حق　　نہ کہ فکرِ جہاں میں پڑنا ہے

مدارِ نجات...... اصل مقصد اطاعتِ خداوندی ہے یہ مل گیا تو سب کچھ مل گیا اگر محنت کر کے دنیا کا جغرافیہ یاد کرلیا اور اس پر عبور بھی ہوگیا کہ بنگلور میں اتنے درخت ہیں، فلاں شہر ایسا ہے، آخرت میں ایک بھی نہ پوچھا جائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کونسی سنت پر عمل کیا۔ علم دین کیا سیکھا تو آپ کہیں کہ حضور! عبادت تو نہیں کی البتہ دنیا کا جغرافیہ لے کر آیا ہوں یہ کام نہیں دے گا کیونکہ اس سے نجات نہ ہو سکے آپ کہیں گے کہ معلوم کر کے آیا ہوں کہ دنیا میں اتنے پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں دنیا میں پہاڑ گننے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ تم کو طاعت وعبادت کے لئے بھیجا تھا۔ قانونِ خداوندی کی پابندی کے لئے بھیجا گیا تھا، وہ بتاؤ کتنی کی ہے۔ نجات کا مدار اسی پر ہے نہ جغرافیہ پر نہ سائنس پر نہ جدید تعلیم پر اس آخری شعر میں مقصد زندگی اور منزل کا پتہ دیا گیا ہے۔

محبت کی تلخیاں...... میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر محبت سے ایمان بنتا ہے پھر اس ایمان ہی کی وجہ سے اعمال ہاتھ پیر پر آتے ہیں اور انسان کی زندگی بنتی ہے۔ محبت سے ہی سارا کام چلتا ہے۔ آدمی اس محبت میں مصائب بھی جھیلتا ہے۔ تکلیفیں بھی اٹھاتا ہے، مگر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب ہے تو پرواہ بھی نہیں ہوتی کسی چیز کی۔ اہلُ اللہ جیل خانے میں بھی گئے مگر انہیں پرواہ نہیں ہوئی کیونکہ تعلق مع اللہ قومی ہے۔ فقر وفاقہ آیا مگر انہیں پرواہ تک بھی نہیں اس لئے کہ دل میں تعلق موجود ہے۔ قلب مطمئن ہے اور اگر دل کا تعلق اللہ سے نہ ہو تو انسان ہمیشہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ ہمیشہ اس پریشانی اور پراگندگی وتشتت میں ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کا سکون صرف اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے۔ کسی اور چیز میں نہیں۔

کروڑوں کا مالک ہو اس کو بھی سکون نہیں ملے گا۔ بلکہ قلب بے سکون، غیر مطمئن، پریشان، پراگندہ ہی رہے گا کہ اس کی حفاظت کیسے کروں اسے ڈاکو نہ لے جائیں کہیں پہریدار ہیں۔ کہیں چپراسی ہیں کہ چوروں سے حفاظت کرتے ہیں، مگر قانونی چوری بھی تو ہوتی ہے اس سے کیسے حفاظت کرے گا؟

بہت سے لوگ قانون کے دائرے میں رہ کر چوری کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں مثلاً کہیں فیس کی شکل میں

رقم وکلاء کے پاس جارہی ہے۔ کہیں بیرسٹروں کے پاس جارہی ہے۔ کہیں ڈاکٹروں کے پاس جارہی ہے۔ غرض روپیہ کیا ایک وبال جان بنا ہوا ہے ہر وقت پریشانی ہی پریشانی ہے۔ نہ اس سے سکون ملتا ہے نہ بلڈنگ سے سکون ملتا ہے اگر سکون ملتا ہے تو صرف اللہ کے نام میں ملتا ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① ''اللہ ہی کے ذکر سے دل چین پاتے ہیں''۔

دنیا کے ذکر سے چین نہیں ملتا وہ تو استعمال کی چیز ہے اسے کھاؤ پیو، استعمال کرو مگر مقصود مت بناؤ۔ اس سے محبت مت کرو۔ اس میں دل مت لگاؤ اس کو جائز طریق پر استعمال کرو۔ اچھا کھانا بھی کھاؤ۔ اچھے مکان میں بھی رہو۔ مگر مکان کو خدا مت سمجھو۔ لباس کو کعبہ مت بناؤ، خادم سمجھو، محبت کے لئے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اختیار کرو۔ ہماری زندگی یہ ہے'' کہ دل بیار دست بکار'' ہاتھ اور پاؤں کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور دل لگا ہوا ہے خالق ومالک کے اندر کہ دنیا میں رہو تجارت بھی کرو، زراعت بھی کرو۔ جب تک انسان دنیا میں رہے گا سب ہی کام کرے گا اور کرنے بھی چاہئیں مگر دل کی توجہ اللہ کی طرف رہنی چاہئے، اس سے تجارت بھی بابرکت بنے گی۔ سب چیزیں عبادت بنتی چلی جاویں گی۔ تو اصل چیز ہے قانون کی پیروی اور وہ ہو نہیں سکتی جب تک محبت نہ ہو۔ تو محبت اصل ایمان اور اصل اسلام ہے اور۔

در محبت تلخہا شیریں بود

یعنی محبت میں تلخیاں بھی شیریں بن جاتی ہیں کیونکہ آدمی کا دھیان محبوب کی طرف رہتا ہے تلخیوں کی طرف نہیں رہتا، اس لئے وہ شیریں ہو جاتی ہیں۔ اور محبوب کی ہر ادا محبوب بن جاتی ہے۔

غلبۂ ادب ...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ جو ہماری ساری جماعت دیوبند کے شیخ طریقت ہیں اکابر اولیاء میں سے ہیں سن ۱۸۵۷ میں انہوں نے جہاد کیا ہے پھر حضرت نے مکہ معظّمہ کی طرف ہجرت فرمائی وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مکہ معظّمہ میں پہنچ کر پوری عمر کبھی سیاہ جوتا نہیں پہنا۔ لوگوں نے شروع شروع میں تو اتفاقی بات سمجھا مگر جب کالے رنگ کا جوتہ لاتے تو ان سے فرماتے کہ دوسرے رنگ کا لاؤ یا سفید لاؤ یہ جوتا نہیں پہنوں گا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرت کا طریقہ ہے تو پوچھا کہ حضرت! سیاہ جوتے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا کہ بیت اللہ شریف کا غلاف سیاہ ہے ادب مانع ہوتا ہے کہ وہ رنگ میں اپنے پیروں میں استعمال کروں، حالانکہ سیاہ جوتا پہننا شرعاً جائز ہے کوئی قباحت ونقصان نہیں ہے مگر چونکہ ادب کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو آدمی بعض جائز چیزوں کو بھی ترک دیتا ہے کیونکہ اس جائز چیز کے استعمال کرنے میں ادب مانع ہوتا ہے۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ مجھے حیا آتی ہے۔ ہے کہ وہ رنگ جو بیت اللہ کے غلاف کا ہے اس کو پاؤں میں ڈالوں۔

تو ظاہر بات ہے کہ جائز وناجائز کی بحث نہیں یہ تو محبت کا غلبہ ہے چونکہ محبت خداوندی اتنی غالب تھی اسی

---

① پارہ:۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ:۲۸.

کے مطابق محبت کعبہ بھی اسی قدر غالب تھی کہ اس رنگ کو پاؤں میں لانا گوارہ نہ کیا۔ کیا ادب کی انتہاء تھی۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کلیر شریف جاتے تھے۔ حضرت صابر کلیریؒ کے مزار کی زیارت کرنے کے واسطے۔ کلیر، رڑکی سے پانچ میل دور ہے، نہر کی پٹری پٹری پر چلے جاتے تھے۔ اب تو سواری کا بھی انتظام ہے اس زمانے میں لوگ عموماً پیدل ہی جاتے تھے، تو حضرت جب نہر کی پٹری پر جاتے اور سامنے کلیر ہوتا تو جوتے اتار کر بغل میں دبا لیتے اور ننگے پیروں جاتے۔ تو کیا جوتے پہن کر جانا ناجائز تھا؟ نہیں بلکہ محبت کا غلبہ تھا۔ حضرت صابر کلیریؒ کی محبت دل میں جاگزیں تھی۔ ادب کا غلبہ تھا۔ جب روضہ نظر آتا تھا تو جوتا پہن کر جانا پسند نہیں کرتے تھے ننگے پیروں جاتے تھے۔ چونکہ ادب کا غلبہ تھا۔ اور ادب غالب ہوتا ہے محبت کے غلبہ سے۔

جب حضرت نانوتویؒ نے حج کیا تو بڑے بڑے اکابر ساتھ تھے۔ مثلاً حضرت گنگوہیؒ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ اور دوسرے بڑے بڑے اکابر اور بزرگوں کا ایک مجمع تھا۔ آخری منزل جس کے بعد مدینہ طیبہ بالکل سامنے آجاتا ہے اور حرم شریف کے مینارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس آخری منزل کا نام ہے ''بیرِ علی'' یہاں ایک پہاڑی ہے جہاں اس پر چڑھے اور حرم شریف کے مینارے سامنے آجاتے ہیں۔ تو یہ قافلہ جب ''بیرِ علی'' پر پہنچا اور حرم شریف کے مینارے سامنے نظر پڑے تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ایک دم اونٹ سے اچھل کر کرز میں پر گر پڑے جوتے اتار کر رکھے اونٹ کے کجاوے میں اور ننگے پیر چلنا شروع کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت غالب تھی اس لئے عاشقانہ اشعار پڑھتے ہوئے اور اپنے حال میں مست اور ننگے سر چلے جارہے تھے۔ عرب کی کنکریاں جو ہیں وہ نوکیلی ہیں۔ پیروں میں ایسے چبھتی ہیں جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پاؤں لہولہان ہوگئے۔ مگر حضرت محبت وعشق کی وجہ سے اپنے حال میں مست ہیں۔

دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اونٹوں۔ سے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ یہ احمق کیوں نیچے اتر کر چلنے لگے ان پر تو محبت اور عشق کی وجہ سے حال طاری ہے۔ یہ نقالی کہاں تک کریں گے۔ اس لئے کوئی بیس قدم پر چل کر رک گیا۔ کوئی سو قدم چل کر رک گیا کیونکہ ان کنکریوں پر چلنا مشکل ہے مگر جو اپنے حال میں مست ہے وہ معذور ہے اسے تو کچھ خبر نہیں رہتی چاہے اس پر تیر پڑیں چاہے تلواریں پڑیں۔ لیکن جن کے ہوش و حواس باقی ہیں وہ اس طریقے سے چلیں وہ پورے نہیں اتر سکتے۔ اسی لئے کوئی پچاس قدم چل کر بیٹھ گیا۔ اور کوئی سو قدم چل کر بیٹھ گیا اور حضرتؒ حرم تک پیدل چلے اور پیروں میں کنکریاں چبھ چبھ کر لہولہان اور خون خون بھی ہو گئے تو۔ در محبت تلخہا شیریں بود۔ یعنی محبت کی وجہ سے تلخیاں بھی شیریں ہو جاتی ہیں اور آدمی ان کو بخوشی جھیل لیتا ہے۔

اِستغراقِ محبت...... غزوۂ اُحد میں جنگ شروع ہوئی۔ اُحد کے پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر چالیس تیر اندازوں کو مقرر کیا اور حکم دیا کہ وہ یہاں بیٹھے رہیں، فتح ہو خواہ شکست ہو۔ ہر صورت میں وہاں سے بغیر اجازت نہ ہٹیں۔ چنانچہ صحابہؓ وہاں بیٹھے رہے، جنگ شروع ہوگئی۔ ان حضرات نے سوچا کہ ہم خالی

بیٹھے ہیں کچھ کام ہی کرلیں، دوسرے حضرات نے کہا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ صرف بیٹھے رہیں۔ بعض نے کہا کہ ایسے بیٹھنے سے تو عبادت میں لگنا اچھا ہوگا۔ یہ سوچ کر نفلوں کی نیت باندھ لی اور نفلیں پڑھنا شروع کردیں ترکیب یہ کی کہ چار نفلیں پڑھیں اور باقی حفاظت کریں۔ اسی طریقے سے رات گزاری اور نوافل پڑھتے رہے۔

مشرکین مکہ نے تاک لیا کہ یہ صحابہؓ بیٹھے ہوئے ہیں، کفار نے ان پر تیروں کی بارش کی، جو لوگ نماز میں مصروف تھے وہ سامنے تھے، اسی لئے کسی کی گردن میں لگا، کسی کے سینے میں لگا اور کسی کی پیٹھ میں لگا، بدن لہولہان ہوگئے اور کپڑے خون میں رنگ گئے مگر ان کو کچھ خبر نہیں وہ اپنی نماز میں مستغرق ہیں۔ نہ تیروں کی خبر اور نہ نیزوں کی خبر جب اخیر شب میں سلام پھیرا تو معلوم ہوا کہ کپڑے رنگے ہوئے ہے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی تیر یہاں گھسا ہوا ہے۔ کوئی تیر سینے میں۔ کوئی تیر پشت میں، پورا بدن چھلنی ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین مکہ نے تیر مارے ہیں۔

اتنا استغراق اور غلبہ تھا محبت کا نہ انہیں تیروں کا پتا چلا اور نہ انہیں نیزوں کا پتہ چلا، نماز کے اندر غرق ہے اور حق تعالیٰ کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تو آدمی ساری تلخیاں جھیل جاتا ہے جب محبت کا غلبہ ہوتا ہے پھر نہ زخم کی پرواہ نہ تلواروں کی نہ نیزوں کی پرواہ ہوتی ہے یہی شان اہل اللہ کی بھی ہوتی ہے کہ جب محبت خداوندی اور محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم غالب آجاتی ہے تو نہ عیش کی پرواہ نہ آرام وراحت کی پرواہ ساری چیزوں کو تج دیتے ہیں۔

ظرفِ محبت...... چنانچہ میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی چیز محبت ہے اور محبت کا ظرف دل ہے جب دل میں اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آجائے گی تو ہاتھ پاؤں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوں گے اور اعمالِ صالحہ بھی صادر ہوں گے اور اگر دل میں محبت نہیں تو نہ ایمان نبے گا اور نہ اعمال بنیں گے۔ مسلم نام کے تو ہوں گے مگر کام اسلام کے نہیں ہوں گے۔ جب دل میں ایمان ہوگا جب ہی کام اسلام کا ہوگا۔ اس لئے ہمیں نام کا مسلمان نہیں ہونا چاہئے، دل میں محبت رچی ہو اور ہاتھ پیر پر عمل ہو یہی عمل شہادت دے گا ایمان ایک چیز ہے جو اندر چھپی ہوئی ہے۔

دعویٔ محبّت کا ثبوت...... جب قیامت میں آدمی اپنے مومن ہونے کا دعوی کرے گا تو اس سے دلیل طلب کی جائے گی کیونکہ کوئی دعویٰ بلا دلیل کے قابل سماعت ہوتا نہیں۔ اس بنا پر اس سے پوچھا جائے گا کہ تیرے ایمان کا ثبوت کیا ہے وہ کہے گا کہ میں نے نمازیں پڑھی ہیں، روزے رکھے ہیں، زکوٰۃ دی ہے، حج کئے ہیں، یہ ثبوت ہوگا ایمان کا پھر اسے نجات ہوگئی۔ مگر آپ نے اپنے مومن ہونے کا دعویٰ کیا اور دلیل طلب کی گئی مگر وہاں نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوٰۃ ہے، نہ حج ہے۔ تو یہ دعویٰ بغیر دلیل کے رہ جائے گا وہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ اس کی گردن ناپی جائے گی اور اس کے دعوے کی تکذیب کی جائے گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہوں تمہارے اندر ایمان کہاں ہے، اگر ایمان ہوتا تو اس کے آثار ہاتھ پیر پر ظاہر ہوتے، حالانکہ کوئی اثر ظاہر نہیں اس لئے کہ اندر کچھ نہیں۔ لہٰذا انتہائی ذلیل ہوگا اور کہا جائے گا کہ اپنے کئے کو بھگتو۔ پھر وہاں کی سزائیں دی جائیں گی۔ مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے گا۔ اس لئے جب دعویٰ ہو تو اس کی دلیل بھی مہیا ہونی چاہئے۔ اطاعت، عبادت، اتباع سنت حضور

کی پیروی ہونی چاہئے۔ آگے قبول کرنا نہ کرنا مالک کا کام ہے مگر ہمیں ثبوت مہیا کر دینا چاہئے اور اس ثبوت پر ناز نہ ہو کہ میں نے اتنی عبادت کی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

بڑوں کی بڑی بات...... حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد اولیاء کبار میں سے ہیں وہ رات دن طاعت وعبادت میں لگے رہتے ہیں لوگوں نے ان سے عرض کی کہ حضرت آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں کہ راتوں کو ذکر اللہ دن بھر ذکر اللہ۔ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟

جب ہم نے یہ سوال پڑھا تو ہم یہ سمجھے کہ حضرت نے یہ جواب دیا ہوگا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں اس لئے میں یہ عمل کر رہا ہوں مگر یہ جواب نہیں دیا بلکہ جواب اور ہے۔ یہ تو ہمارے فہم کی رسائی تھی حضرتؒ نے وہ جواب دیا جو ہماری فہم سے بالاتر ہے اور اپنے مرتبے کے مطابق جواب دیا کیونکہ بڑوں کی بات بڑی ہی ہوتی ہے۔ حضرتؒ نے ان پوچھنے والوں کو جواب دیا کہ میں رات دن اس لئے عمل کرتا ہوں کہ میں پیدا ہی کیا گیا ہوں عمل کرنے کی خاطر۔ یعنی مقصد زندگی ہی میرا یہ ہے، راضی ہونا نہ ہونا ان کا کام ہے۔ راضی ہونا یا ناراض ہونا یہ فعلِ خداوندی ہے۔ ہم کون ہیں ان کے فعل میں دخل دینے والے۔ ہمارا کام تو ہونا چاہئے جس کے لئے ہم پیدا کئے ہیں اور ہم پیدا کئے گئے ہیں طاعت وعبادت کے لئے، بس ہم اپنا کام کئے جائیں۔ اگر وہ راضی ہوں تو ان کا فضل ہے اگر وہ ناراض ہوں تو ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ اس سے فریادی ہوں۔ تم اللہ تعالیٰ کے کاموں میں دخل مت دو۔ صرف اپنا کام کرتے رہو۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن

اپنے کاموں میں لگے رہو قبول کرنا نہ کرنا اس کا کام ہے۔

محبت آمیز عمل...... یحییٰ بن اکثم بہت بڑے عالم گزرے ہیں امام کے درجے کے عالم ہیں ان کی وفات ہوئی تو بعض اہل اللہ نے انہیں خواب میں دیکھا اور خواب بھی کشف جیسا تھا۔ یہ دیکھا کہ ان کی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوئی ہے۔ ''حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے یحییٰ! کیا چیز لے کر آئے ہو ہمارے لئے؟ جواب دیا کہ اے اللہ تعالیٰ میں نے پچپن ۵۵ حج کئے ہیں۔ فرمایا: ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ انہوں نے کہا: باری تعالیٰ میں نے ایک سو باون ۱۵۲ قرآن ختم کئے ہیں۔ فرمایا ہمیں ایک بھی قبول نہیں۔ پوری زندگی کے اعمال ذکر کئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک بھی قبول نہیں۔ اور بتاؤ کیا لے کر آئے ہو۔ آپ عاجز ہو گئے۔ آخر میں کہا کہ اے اللہ! بس تیری رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ لے کر نہیں آیا۔ فرمایا کہ اب بات تو نے ٹھیک کہی ہے۔ وَجَبَتْ لَکَ رَحْمَتِیْ میری رحمت تیرے لئے واجب ہو گئی ہے جا تیرے لئے جنت اور مغفرت ہے'' تو اس عمل کے ساتھ ساتھ رضاء خداوندی اور رحمت خداوندی کی توقع اور امید بھی ہونی چاہئے، اعمال پر گھمنڈ اور ناز نہیں ہونا چاہئے، جس عمل میں محبت کی آمیزش اور رحمت کی امید نہ ہو وہ عمل قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اصل چیز محبت ہے پھر

اس کے بعد عمل کا مرتبہ ہے۔ اوراس محبت سے ہی عمل پیدا ہوتا ہے عمل ہی محبت کی علامت ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دل میں محبت ہے یا نہیں۔

دوام معیّتِ نبوی کی بشارت...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: ''مَنْ اَحَبَّنِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ اَطَاعَنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ'' ① ''جو مجھ سے محبت کرے گا وہ میری اطاعت بھی کرے گا اور میری سنتوں کی پیروی بھی کرے گا اور جو میری سنتوں کی پیروی کرے گا وہ میرے ساتھ بھی جنت میں وہ میرے سے الگ نہیں رہے گا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیاد قرار دیا ہے محبت کو۔ کہ مجھ سے محبت کرنا علامت ہے اس بات کی کہ وہ میری اطاعت کر رہا ہے اور میری اطاعت کرنا علامت ہے اس بات کی ہے وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل تو محبت ہے مگر محبت پہچاننے کی علامت اطاعت اور اتباعِ سنت ہے جب یہ ہوگی تو معلوم ہوگا کہ محبت میں سچا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ.'' ② '' تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن کامل نہیں بن سکتا جب تک کہ میری اس آدمی کو اتنی محبت نہ ہو کہ اتنی اس کی نہ اپنے ماں باپ سے ہو، نہ اپنی اولاد سے ہو، نہ اپنے سامان سے ہو، نہ اتنی محبت اس کو اپنے عزیز واقارب سے ہو''۔ جب دو محبتوں کا ٹکراؤ ہو تو ترجیح دے میری محبت کو، تو کہا جائے گا کہ یہ مومنِ کامل ہے کہ اصل شے محبت ہی ہے۔

محبت وخواہش کا ٹکراؤ!...... ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ'' ③ ''کہ تم میں سے کوئی شخص مومن کامل نہیں بن سکتا اس وقت تک جب تک کہ اس کی خواہشات نفس میرے لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں''۔ ایک طرف شریعت ہے اور ایک طرف خواہش نفس ہے۔ اگر خواہش نفس کو ترجیح دی تو معلوم ہوا کہ خواہش کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی مرضی کو ترجیح دی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر اس لئے یہ خواہشات نفس اور ہوائے نفس کا تابع ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہوتا تو اسی کو ترجیح دیتا۔ اسی لئے فرمایا کہ وہ مومن کامل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا تابع ہونا چاہئے۔ جو کچھ کرے اتباع میں کرے، نماز پڑھے تو اتباع میں پڑھے روزہ رکھے تو اتباع سے، سوئے تو اتباع سے، جاگے تو اتباع سے، کھائے پیئے تو اتباع میں، غرض یہ کہ پوری زندگی پر اتباع چھا جائے جب ہی اس کے ایمان میں کمال آئے گا اور اس کو مؤمن کامل کہیں گے۔

صُدورِ معصیت اور تقاضائے محبّت...... اب رہی بات غلطی سے گناہ کا صادر ہونا تو بندہ بشر ہے۔ معصوم تو

---

① السنن للترمذی، ابواب العلم عن الرسول، باب ماجاء فی الاخذ بالسنۃ.

② الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ، ص: ۲۸۸، رقم: ۱۶۹

③ مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام، ج: ۱ ص: ۳۶، رقم: ۱۶۷.

صرف انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ ہم تو دن رات سینکڑوں گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اور گناہ بے شک ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا حل یہ فرمایا کہ جب گناہ ہو جائے تو توبہ کر لے پھر اتباع شریعت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اتباع کر رہے ہیں اور درمیان میں گناہ ہو گیا کہ یا اللہ میری توبہ پھر نہیں کرونگا۔ اللہ تعالیٰ سے عہد کیا۔ پھر اتباع میں مصروف ہو گئے۔ اتباعِ سنت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کبھی بھی غلطی نہ ہو اور گناہ نہ ہو۔ یہ شان تو انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ ہم سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور ہم گناہ کرتے بھی ہیں مگر اس کا حل یہ ہے کہ فوراً توبہ کر لے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے: اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ. (1) گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ توبہ کرتے ہی اس کا ریکارڈ صاف ہو گیا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کی وہ گناہ پھر باقی نہیں رکھا جاتا۔ اسی لئے جب بھی کوئی گناہ ہو جائے فوراً توبہ کر کے پاک ہو جائے۔ یہ مومن کی شان ہے اور یہ محبت اور ایمان کی کمال ہے۔ بس دعاء کیجئے کہ اللہ رب العالمین اپنی رضا نصیب فرمائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور معیت عطا فرمائے اور اپنے نیک بندوں میں شامل فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان کامل پر فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(1) السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبه، ص: ۲۷۳۵، رقم: ۴۲۵۰. حدیث حسن ہے۔ دیکھئے: صحيح الترغيب والترهيب ج: ۳ ص: ۱۲۲.

تعلیم جدید

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَاوَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ o وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ﴾ [1] صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ.

بے انتہا خوشی...... بزرگانِ محترم! خیال یہ تھا کہ اس وقت کالج کی جو جدید عمارت تیار کرائی جارہی ہے، اس کو دیکھنا اس سے مستفید ہونا اور مسرور ہونا ہے۔ اسی غرض سے حاضری ہوئی تھی، جلسہ کا کوئی تصور اور اس میں بھی کسی تقریری اور خطاب کا کوئی گمان حاشیہ خیال نہیں تھا۔ بہر حال جب جلسہ کی صورت بن گئی ہے تو اس کے کچھ نہ کچھ لوازم پورے کرنے پڑیں گے اور ذمہ داروں نے اپنے محبت اور خلوص سے جو شکل پیدا کر دی ہے اس کا احترام تو کرنا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی جدید عمارت میں حاضر ہو کر غیر معمولی مسرت ہوئی اور شارم کے زندہ دل مسلمانوں کے حوصلے اور جذبات خیر سامنے آئے اس سے بھی بے انتہا خوشی ہوئی۔

تعمیر معنوی کی علامت...... ظاہر میں یہ ایک تعمیر ہے جو اینٹ اور پتھر سے کی جاری ہے۔ اور سیمنٹ اور چونا ہی میں ڈالا جارہا ہے لیکن اگر حقیقت پر نگاہ کی جائے تو یہ علم کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔ یہ تعمیر دراصل علم کی ہے۔ درسگاہ کا وجود حقیقۃً علم کے لئے ہے۔ اس لئے یہ حسی تعمیر علامت ہے معنوی تعمیر کی جو اس کے اندر کی جائے گی ظاہر تعمیر سے قوالب کی ایک ہیئت بنائی جارہی ہے اور معنوی تعمیر سے قلوب کی ایک ہیئت بنائی جارہی ہے۔ اس ہیئت ظاہری میں نفسانی اخلاق و جذبات کی اصلاح کی جائے گی اس اعتبار سے یہ بہت مستحسن اقدام اور مبارک عمل ہے۔

---

[1] پارہ: ۲۲،سورۃ الفاطر،الآیۃ:۲۷،۲۸.

اقسام علم......امام شافعیؒ کا مشہور مقولہ ہے۔ اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمُ الْاَدْیَانِ وَعِلْمُ الْاَبْدَانِ......یعنی اللہ کی طرف سے جو علم دنیا کے اندر آئے وہ دو طرح کے ہیں ایک ادیان کا علم۔ جس کا نام شریعت ہے اور ابدان کا علم جس کا تعلق انسان کے ظواہر بدن اور اس کے عوارض بدن سے ہے لیکن حقیقت میں یہ دونوں علم جزء ہیں شریعت کے۔ شریعت اسلامی نے جس طرح سے شریعت اور دین کے علم کی طرف توجہ دلائی ہے اسی طرح سے ابدان کا علم اور ضرورت زندگی کے علوم مثلاً سائنس اور فلسفہ وغیرہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیان کا علم اصل مقصود ہے اور ابدان کا علم اس کے لئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے اور دونوں کا مقصد ہے معرفت خداوندی۔ حدیث شریف میں ہے رَأْسُ الْعِلْمِ مَعْرِفَةُ اللّٰهِ. یعنی علم کا رائس المال اور خلاصہ خدا کی معرفت اور اس کی پہچان ہے۔

علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است!

جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ حقیقت میں جہالت ہے اس کو صورت علم کہا جائے گا۔ حقیقت علم نہیں کہا جا سکتا۔

علم دین کے ساتھ علم دنیا کی ضرورت......جس طرح حقائق کا علم ضروری ہے اسی طرح معاشیات و معاشرت اور کائنات کے علم کے سلسلہ میں ان علوم کی بھی ضرورت ہے جن کو آج کل علم سائنس، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں جو آیت ہے ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا.﴾ (۱) اس میں حصر کر دیا گیا ہے کہ علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ یعنی خوف وخشیت انہیں کے قلوب میں ہے۔ یہاں علماء سے مراد علماء فقہ ہی نہیں ہیں جو جائز و ناجائز اور حلال وحرام کے مسائل سے واقف ہوں۔ بلکہ قرآن کریم کے ان نشانوں سے بھی واقف ہوں جو ضروریات زندگی کے سلسلے میں دنیوی علوم کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس میں ستاروں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اس زمین کے مخفی عجائبات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن خلاوفضا کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور ان کی طرف اشارات بھی کئے گئے ہیں۔

نظام محکم کی شہادت......ان سب کا مقصد بھی درحقیقت معرفت الٰہی اور اللہ کو پہچاننا ہے اس کہ آثار کو دیکھ کر ہی ذی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کہیں دھواں دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہاں آگ موجود ہے ورنہ دھواں نہ ہوتا۔ کہیں آپ رطوبت اور ٹھنڈک محسوس کریں گے ضرور یقین کریں گے کہ قریب میں کوئی دریا موجود ہے ورنہ برودت نہ ہوتی تو آثار کو دیکھ کر موثر کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کائنات کے نظام محکم اور عجیب وغریب انتظامات کو دیکھ کر دل خود بخود شاہد ہوتا ہے اور گواہی دیتا ہے کہ کوئی بہت بڑا اصناع اور حکیم ہے جس نے یہ نظام کائنات بنایا ہے اور عجائبات قدرت کو نمایاں کیا۔ یہ محض مادہ اور اس کی حرکت کا کام نہیں ہے اس لئے کہ مادہ خود اندھا اور بہرہ ہے نہ اس کو اپنی خبر اور پر نہ دوسرے کی خبر۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایک اندھی بہری اور اپاہج چیز کوئی نظام محکم تیار نہیں کر سکتی۔

(۱) پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸.

اور مادہ کی حرکت بھی وہ ہے کہ بغیر محرک کے وہ واقع نہیں ہوسکتی۔ حرکت ایک وصف ہے وہ اسی وقت پایا جائیگا جب اس کا موصوف موجود ہوا اگر وہ ذات موجود نہ ہو جو موصوف ہے تو صفت یعنی وہ حرکت بھی نہیں پائی جائے گی۔ تو چونکہ مادہ اپاہج اور لایعقل ہے اس لئے اگر حرکت تعلق مادہ سے ہوگا تو عجائبات اور نظام علم کی نئی نئی چیزیں نہیں پیدا ہوں گی جب تک کہ علم اللہ اور قدرت الٰہی اس کے اندر شامل نہ ہو۔ بہر حال عجائب کی طرف بھی قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ روحانی عجائبات ہیں جن کو ارباب حقیقت نے کھولا ہے اور معرفت و بصیرت سے ذات خداوندی کا پتہ چلایا ہے۔

متقدمین کی بنیاد پر متاخرین کی تعمیر...... اسی طرح سے مادیات میں عجائبات رکھے ہوئے ہیں وہ تدریجاً کھلتے ہیں اور کھل رہے ہیں۔ جس طرح سے قرآن کے عجائبات دور نبوت میں ظاہر ہوئے وہ سب اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے عقدے صحابہؓ نے کھولے اور ان کے بعد تابعینؒ نے ان کو کھولا اور اس میں شاخیں پیدا ہوئیں۔ تابعین کے بعد تبع تابعینؒ متوجہ ہوئے اور ان عجائبات میں علمی عجائبات نکالے۔ یہاں تک کہ بے شمار تصانیف وجود میں آ گئیں جن میں ان علوم کو مدون کیا گیا جنکے اندر یہ عجائبات اور حقائق الٰہیہ تھے اسی طرح سے کائنات کے سلسلے میں بھی ابتداء سادہ سادہ تحقیقات تھیں۔ ان سادہ تحقیقات پر اگلوں نے دوسری تعمیر کھڑی کی کہ اس کے اندر سے اور عجائبات نکلے یہاں تک کہ صدیاں اور قرون گزرنے کے بعد اب اس میں اتنی شاخیں پیدا ہوگئیں کہ انسان زمین میں ہی نہیں بلکہ فضا میں گھوم رہا ہے۔ فضا میں ہی نہیں آسمانوں کے قریب پہنچ رہا ہے اور چاند تک اس کی پرواز ہو چکی ہے تو فضا کے عجائبات بھی قرآن شریف کی روشنی میں سامنے ہیں یہ اتنا جو کچھ ہوا پچھلوں کی تحقیقات پر تعمیر کی گئی ہے۔ اگر پچھلے بنیاد نہ رکھتے تو اگلی تعمیریں نہیں ہوسکتیں تھیں جس طرح سے حقائق الٰہیہ کے بارے میں بھی پچھلوں نے بنیادیں رکھیں اس پر بعد والوں نے تعمیریں کیں اور نئے نئے حقائق کھولے۔

اسی طرح مادی حقائق کے بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ بھی درحقیقت انہیں پچھلوں کا طفیل اور صدقہ ہے۔ اور انہیں کے فکر کا ثمرہ ہے انہوں نے بنیادیں قائم کیں اور اس سے آگے ہم نے دیواریں اٹھائیں اور دیواروں پر چھتیں ڈالیں اور پھر دو منزلہ، سہ منزلہ تعمیر کی، اگر بنیاد رکھنے والے بنیاد نہ رکھتے تو ہم آج یہ تعمیریں نہیں بنا سکتے تھے۔

دونوں علوم کا حقیقی نقطہ...... تو اس پوری گفتگو سے معلوم ہوا کہ دونوں علوم کا حقیقی نقطہ یہ ہے بنانے والے کو پہچانا جائے اور یہ تمام ثمرات و آثار دلالت کرتے ہیں اس موثر حقیقی کی معرفت پر تا کہ اس کی طرف جھکا جائے اور اس کے قانون پر چلا جائے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دوسو کے قریب آیتیں ذکر کیں جن میں عجائبات کائنات ذکر کئے ہیں۔ کہ زمینوں سے لے کر فضاؤں اور آسمانوں تک اور زمین کی گہرائیوں میں اور آسمان کی بلندیوں میں عجائبات قدرت پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری قسم کی آیتوں میں حقائق الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسری قسم کی آیتوں میں احکامات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے اور چوتھی قسم کی آیت میں قصص و عبر اور امثال بیان کی گئیں ہیں تا کہ لوگ

عبرت پکڑیں نصیحت حاصل کریں۔

حقائق شریعت اور عجائبات کائنات کا باہمی تعلق...... بہر حال مقصد یہ ہے کہ کسی سکول یا کالج میں صرف ایک چیز کا ہونا کافی نہیں اس لئے کہ شریعت اسلام اور اس کے حقائق کا تعلق کائنات کے ساتھ چولی اور دامن کا ہے۔ اگر ان عجائبات قدرت کی طرف توجہ نہ کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان دوسری آیتوں کو نہیں سمجھ سکیں گے جن میں مادی کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی اور علماء نے اس میں تحقیقات کی ہیں۔ علم ابدان اور علم ادیان میں سے ہر ایک کے مختلف گوشے ہیں۔

مثلاً مختلف ضروریات بدن ہیں جن کا ایک علم بن گیا کہ اگر بدن کو بیماری یا کوئی روگ لاحق ہو جائے اس کے علاج کا کیا طریقہ ہے؟ اس کے لئے علم طب ہے تا کہ اصل بدن کی اصلاح کی جائے۔ اگر اس کی اصلاح نہ ہوگی تو ظاہر بات ہے کہ بدن جو روحانیت کا سفر کر رہا ہے وہ نہیں کر سکتا۔ بدن ہی تو اس کے لئے سواری ہے۔ بدن کا یہ گھوڑا اگر چلنے والا نہ ہو تو شرعی اعمال بھی انجام نہیں پا سکتے۔ پھر طب کے سلسلے میں ہزاروں حقائق ہیں جو انسان کی تکوین سے متعلق ہیں کہ کس طرح انسان پیدا ہوا اور باری تعالیٰ نے کن عجائبات میں سے اس کو ظاہر کیا یہ چیزیں سامنے نہ ہوں تو بہت سے حقائق شریعت نہیں کھل سکتے جن کا مدار ان طبی تحقیقات کے کھلنے پر ہے تو انسان میں سب سے پہلے بدن کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ صلاح اور صحت ہے اور وہ موقوف ہے علم طب پر۔ اس بناء پر اس کے لئے علم طب ضروری ہے۔

اور علم طب انبیاء علیہم السلام پر بھی اترا ہے۔ وحی کے ذریعہ اس کے اصول آئے ہیں اور پھر تجربہ کاروں نے اس کو بڑھایا۔ اسی طرح بدن کے دوسرے عوارض ہیں مثلاً تن ڈھانپنے کا قصہ ہے اس کے لئے کپڑا ابننا یا بنانا ہے۔ اسی طرح سے اثاث البیت ہے کہ انسان کی بہت سی ضروریات ہیں۔ کھانے پینے سے رہنے سے۔ مکان بنانے سے متعلق قران کریم میں ان چیزوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور احسانات خداوندی کے تحت مکانات کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ﴾ (1) یعنی کپڑوں کے گھر اور اینٹ پتھر کے گھر اور پہاڑوں کے گھر دیئے گئے تا کہ ان میں سکونت حاصل کرو تم۔ اسی طرح قرآن کریم نے ہر چیز کی طرف توجہ فرمائی ہے خواہ لباس ہو، خواہ کھانے پینے کی شئے ہو خواہ رہن سہن اور صحت و مرض، اور تمام مستقل فن بن گئی ہیں اور ہر فن ایک مستقل موضوع پر مشتمل ہے اور ان کے احکام الگ ہیں اس کے عوارض الگ ہیں اس کے احوال الگ ہیں۔ تو کالج کے اندر جہاں اس کی ضرورت ہے کہ کائناتی اشیاء کو سمجھا جائے وہیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس کا آخری نقطہ خدا کی معرفت ہو، اسلام نے ان چیزوں کی طرف

(1) پارہ: ۱۴، سورة النحل، الآية: ۸۰.

توجہ محض عیش کرنے کے لئے نہیں دلائی۔ عیش وعشرت کوئی دوامی چیز نہیں، یہ تو چند روزہ قصہ ہے۔

منزل مقصود اور اس کائنات کی حقیقت...... آدمی دنیا میں آیا ہے مسافر کی طرح سے اس کو ایک بڑی منزل تک جانا ہے۔ اگر وہ اصل منزل کو گنوا بیٹھا تو اس نے کائنات کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ یہ تو راستہ اور رہ گزر ہے مگر چونکہ راستے کے نشیب وفراز کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آدمی راستہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی آدمی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس دنیا کے عجائبات کا دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی تو راستہ ہے کہ جس پر چل کر آدمی اپنے خدا کی معرفت تک پہنچتا ہے۔ تو ہماری منزل بھی آخرت ہے وہ اسی دنیا میں سے بنتی ہے۔ یہ تصور غلط ہوگا کہ آخرت کا کوئی مکان الگ ہے اور دنیا کا مکان الگ ہے۔ بلکہ اسی دنیا میں سے آخرت نکلتی ہے۔ اور اسی میں سے وہ اعمال پیدا ہوتے ہیں کہ جس سے آدمی اپنے خدا تک پہنچتا ہے، مثلاً دولت کمائے گا تو اسی دولت کے ذریعہ وہ زکوۃ صدقات دے گا۔ اور دیگر کارِ خیر انجام دے گا۔ تو دولت میں سے ہی اس کی آخرت نکل رہی ہے۔ اگر دولت سامنے نہ ہوتی تو یہ آخرت کا محل کیسے تعمیر ہوتا۔ اسی طرح سے دوسری چیزیں ہیں۔ بدن کی صحت ہے اگر بدن صحیح نہ ہوگا تو آخرت کے اعمال کیسے انجام پائیں گے۔ اسی لئے دنیا کو رہ گزر فرمایا ہے اسی بناء پر راستہ کے نشیب وفراز سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ رہنے کا طریقہ جاننا بھی ضروری ہے۔

انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد...... بلڈنگ انسانوں کے لئے بنتی ہے۔ اور انسان اخلاق سے بنتا ہے۔ جب تک انسان کا کردار اور کریکٹر اچھا نہ ہو اور اونچا نہ ہو اور اس کی اخلاقی حالت بلند نہ ہو اس وقت تک وہ انسان نہیں ہے۔ انسان اچھے کپڑوں کا نام نہیں ہے۔ انسان نام ہے اچھے کردار کا اچھے کریکٹر کا اور سب سے پہلی چیز ہے انسانیت اور انسانیت کی سب سے پہلی بنیاد ہے انس ومودۃ اور اخوت کا باہمی سلوک کہ تمام آدمی بھائی بھائی بن کر رہیں اور آدمی ایک دوسرے کی ہمدردی میں غرق ہو اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کے لئے مستعد ہو اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ ہو کہ میں خود تکلیف اٹھالوں گا اپنے بھائی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر کے خود راحت اٹھانا انسانیت نہیں اور نہ حقیقت میں راحت ہے بلکہ اس کا نام خود غرضی ہے۔

معرفت الٰہی...... غرض ان تمام چیزوں کا مقصد معرفت الٰہی ہے اور معرفت الٰہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ معرفت نفس نہ ہو اس لئے کہ صوفیاء کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ'' ① جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس کو پروردگار کی معرفت حاصل ہوگئی۔

اسی ذیل میں ایک مستقل علم وجود میں آیا جس کا نام علم النفس ہے جس سے نفس کے اتار چڑھاؤ نشیب و

① مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر، ج: ۱، ص: ۳۵۰. علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: قال النووی: غیر ثابت، وقال ابن السعانی: ھو من کلام یحی بن معاذ الرازی رضی اللہ عنہ دیکھئے: الدرالمنتشرۃ فی الاحادیث المشتھرہ حرف المیم ج: ۱ ص: ۸۱.

فراز کو پہچانا جائے کہ کیا کیا چیزیں اس میں چھپی ہوئی ہیں۔ان علوم سے نفس کی کمزوریوں اورانسانی طبائع کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے ان کا حاصل کرنا مفید ہے اگر نقطہ نظر صحیح ہواور کسی علم وفن کی اصل بناء میں کوئی فساد نہ ہوتو اس علم کو کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اوراصل نقطہ کو سامنے رکھ کران علوم کو وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں!

متاع مشترک...... بہرحال اس کی بہت زیادہ مسرت اورخوشی ہوئی کہ مسلمانان میل شارم نے اپنی حوصلہ مندی سے اوراپنے ظرف کی وسعتوں سے ایک اتنی بڑی تعمیر کھڑی کردی۔یہ علامت ہے اس بات کی کہ وہ معنوی تعمیر کو بھی اونچا دیکھنا چاہتے ہیں۔انسانیت اورعلم کی تعمیر کو بھی اونچا لے جانا چاہتے ہیں۔حق تعالیٰ شانہٗ ان کے ارادوں میں برکت دے،آمین۔اور جو جوان کے مقاصد ہیں ان کی تکمیل فرمائے۔اس سے نہ صرف میل شارم کے لوگوں کوخواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں بلکہ آس پاس کے علاقہ اورتمام لوگوں کوتوفیق دے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔تعلیم گاہ درحقیقت سب کے لئے ہوتی ہے علم کسی خاص قوم کی وراثت نہیں بلکہ علم سارے انسانوں کی ایک مشترک پونجی ہے۔مسلم ہوغیرمسلم ہو۔کسی بھی ملت کا ہوعلم سب کی ایک مشترک متاع ہے۔کسی کالج یا سکول کا قیام اسی لئے ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کوفائدہ پہنچایا جائے۔خواہ وہ کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔تو ایک بڑی خوشی کی بات ہے کہ میل شارم میں اس قسم کا کالج قائم ہوا۔

اور جہاں تک میرے علم میں آیا اس کا فیضان عام ہے کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بلاامتیاز مذہب وملت ہرقوم کے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔اس کی ضرورت بھی ہے اوردعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے مقاصد حسنہ میں کامیاب کرے اوران مقاصد کی تکمیل فرمائے۔آمین۔

شہ کا مصاحب...... میں آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں ذمہ داران کالج کا کہ انہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو یاد فرمایا۔میرا تعارف اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔اس کے سوااور کچھ میری اصلیت نہیں اورنہ کوئی تعارف ہے۔اگر کوئی کام بن پڑتا ہے تو وہ درحقیقت اثر ان اکابراوران بزرگوں کا ہی ہے۔

بقول غالب کے علماء کے لئے ان کا ایک شعر کافی ہے۔اس نے کہا۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرا ہے اتراتا ۔۔۔ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

توحقیقت یہ ہے کہ ہماری ذاتی اورشخصی کوئی آبرونہیں ہے۔البتہ بڑوں کی ایک جماعت ہے۔اوروہ جماعت بین الاقوامی بزرگوں کی ہے۔ان کی شخصیتیں بہت بلند ہیں۔ان سے وابستگی اوران سے نسبت ایک بڑی چیز ہے۔ذرے کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ہے۔

نسبت کی عظمت...... لیکن چونکہ اس کونسبت ہے آفتاب سے اوروہ نسبت بڑی ہے اس لئے اس درجہ کی بھی بڑی حیثیت ہوتی ہے اوروہی ہم بھی کہتے ہیں۔

اگرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم

ہم تو خورد اور لاشی ہیں لیکن نسبت ایک بڑی چیز سے قائم ہے اور وہ نسبت بڑی ہے جو اس کے لپیٹ میں آ جائے گا وہ بڑا دکھائی دے گا۔ حقیقت میں بڑائی انہیں بزرگوں کی ہے۔ ہماری کوئی بڑائی نہیں۔ مخلص بزرگوں کی ایک جماعت ہے وہ بہت سچے لوگ تھے ان کی سچائی آج تک چل رہی ہے۔ اخلاص سے جو روح انہوں نے پھونکی وہ اسی شان سے قائم ہے، اسی کی چمک اور روشنی میں جو آ گیا بن گیا۔ اس کے نتیجے میں اہل علم بنے اہل فضل بنے، اہل کمال بنے۔

تو ہمارا اس سے زیادہ تعارف کچھ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند سے اور وہاں کے بزرگوں سے ایک تعلق ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی قدر دانی اور قدر افزائی فرمائی درحقیقت ان ہی کی قدر فرمائی ہے۔ میں صرف ایک واسطہ ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدردانی انہیں بزرگوں کی طرف جا رہی ہے۔ آپ نے جو کچھ اچھے اور اونچے کلمات فرمائے۔ درحقیقت میں واسطہ ضرور ہوں میرے ذریعہ سے یہ کلمات خیر وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور میں اخیر میں پھر مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں آپ حضرات کا کہ یاد فرمایا اور کچھ خیالات ظاہر کرنے کا بھی موقع عنایت فرمایا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مرکز سعادت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِ يْرًا ، وَّدَ اعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!......عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْهُوْ مَانِ لَا يَشْبَعَانِ مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَا يَشْبَعُ مِنْهُ وَمَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا لَا يَشْبَعُ مِنْهَا.(صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

فاتحۃ الکلام...... بزرگانِ محترم، برادرانِ عزیز! آپ حضرات کی دعوت پر میں حاضر تو ہو گیا لیکن سوچتا ہوں کہ آپ کے سامنے کیا کہوں۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ کہوں گا وہ آپ جانتے ہیں۔ ایسی کوئی نئی بات سمجھ میں نہیں آتی جو آپ کے علم میں نہ ہو اور میں اسے علم میں لاؤں۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں علم کی دولت سب سے بڑی دولت ہے اور علم کی روشنی سب سے بڑی روشنی ہے۔ آپ کو سورج کی روشنی سب سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ پورے عالم میں پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس کے ذریعہ صرف رنگ اور صورت کا علم ہوتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی اسلام اور کفر کا فرق بتلاتی ہے، سنت اور بدعت میں امتیاز سکھاتی ہے۔ حق و باطل کی پہچان کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا طفیل ہے۔ ان کی جوتیوں کا صدقہ ہے اور ان حضرات کا لاکھ لاکھ کرم و احسان ہے کہ انہوں نے علم کی روشنی پیش کی جو ہمارے لئے اچھائی، برائی، بھلے اور برے کے درمیان تمیز کا ذریعہ بنی۔

تحصیل حاصل...... آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ علم، تعلیم سے آتا ہے اور آپ سب ہی حضرات تعلیم میں مشغول ہیں۔ اسباق میں حاضری ہے، مطالعہ ہے، آپس میں مذاکرہ ہے۔ غرضیکہ رات دن آپ علم ہی کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔ اس لئے اسکی نصیحت کرنا تحصیل حاصل ہے اور اگر عمل کے سلسلے میں کچھ کہا جائے تو آپ کہیں گے کہ سب سے بڑا عمل خود علم کا حصول ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کے درمیان جب یہ بحث ہوئی کہ کثرت نوافل افضل ہے یا زیادت علم۔

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

تو کثرت سے فقہاء زیادت علم ہی کی افضلیت کے قائل ہوئے۔ آپ حضرات تحصیل علم میں لگے ہوئے ہیں، جو سب سے بڑا عمل ہے۔ اس کے علاوہ فرائض وغیرہ کی ادائیگی میں بھی آپ کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی۔ نماز کے لئے آپ جوق در جوق آتے ہیں، ہر وقت مسجد بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دارالعلوم کی مسجد تو آپ سے پر رہتی ہی ہے۔ شہر کی مسجدیں بھی آپ لوگوں سے آباد ہیں، لہٰذا اگر عمل کے سلسلے میں کچھ عرض کروں تو بھی آپ کہیں گے کہ عمل تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

جہاں تک آپ لوگوں کی اخلاقی حیثیت کا تعلق ہے وہ بھی درست ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر ہم پچھلوں کے اخلاق سے موازنہ کرتے ہیں تو کچھ کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن اگر ہم دور حاضر کے دوسرے طبقوں کے اخلاق و کریکٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں نہ صرف یہ کہ آپ لوگوں کے اخلاق کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، بلکہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ حضرات ہی کا وہ طبقہ ہے جو اس اخلاقی قحط کے دور میں بھی اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کچھ کہنا فائدے سے خالی ہی ہوگا اور اصولی و نوعی طور پر یہی کچھ دائرے تھے کہ جن کے متعلق کچھ کہا جا سکتا تھا اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ ساری چیزیں آپ کو حاصل ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی چیز آپ کے سامنے رکھی جائے جو مفید ہو۔

محروم القسمت کا حال...... اس وقت مجھے مولانا گنگوہیؒ کا واقعہ اور مقولہ یاد آیا وہ یہ کہ آپ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہو کر واپس ہوئے تو کافی عرصے تک کوئی خط و کتابت نہیں کی۔ آخر کار حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا کے پاس ایک خط لکھا، کہ جملہ متوسلین کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جس سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایک مدت گزری آپ کی کوئی حالت معلوم نہ ہو سکی، اپنے حالات لکھئے تا کہ اندازہ ہو سکے۔ مولانا نے جواب دیا اور ابتداء اس طرح کی: ''حضرت مجھ محروم القسمت کا تو کوئی حال ہی نہیں اگر کوئی حال ہوتا تو عرض کرتا''۔ پھر اخیر میں لکھا کہ البتہ حضرت کی جوتیوں کے طفیل میں تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں۔ ایک یہ کہ امور شرعیہ امور طبعیہ بن گئے ہیں، گویا نماز، روزہ اور دوسری عبادات ادا کرنے کے لئے ایسا مجبور ہوں جیسے بھوک کے وقت کھانے کے لئے اور پیاس میں پانی کے لئے۔ دوسری بات یہ کہ مدح و ذم یکساں نظر آتے ہیں کوئی ہزار تعریف کرے، ہزار مذمت کرے نفس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ گویا مخلوق کچھ بھی کہتی رہے اس کی نہ کچھ پرواہ ہوتی ہے اور نہ قلب پر کوئی اثر ہوتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض نہیں معلوم ہوتا۔ تعارض تو کیا موزونیت اتنی معلوم ہوتی ہے کہ ہر کلی اپنی جگہ پر ٹھیک اور درست دکھائی دیتی ہے۔

مرکز سعادت...... امور شرعیہ امور طبعیہ بن جائیں یہ قوت عملیہ سے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی تعریف و برائی کا یکساں معلوم ہونا قوت اخلاقی کا تقاضا ہے۔ قوت عملی کی انتہا یہ ہے کہ آدمی میں طاعت کی رغبت اس درجہ پیدا ہو جائے کہ بغیر اس کے کئے ہوئے چین ہی نہ آئے۔ قوت اخلاقی کی انتہا یہ ہے کہ اس درجہ غنا پیدا ہو جائے کہ

لوگوں کی تعریف اور برائی یکساں معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح قوت علمی کی انتہا یہ ہے کہ قران وسنت کی ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل درست اور ٹھیک معلوم ہو اور شریعت اسلامیہ ایک گلدستہ نظر آتی ہو۔ سعادت انسانی کے لئے انہیں تین چیزوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ (۱) علمی قوت (۲) عملی قوت (۳) اخلاقی قوت اور آپ ایسی جگہ میں ہیں جو علمی، عملی، اخلاقی قوتوں کا مرکز ہے۔ جہاں ایسی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جو ہر اعتبار سے کامل و مکمل تھیں۔ میں اپنی بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایسی باکمال شخصیتوں کی شکلیں دیکھی ہیں۔ بعض سے کچھ استفادہ کا بھی موقعہ ملا۔ استاذ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ اللہ ''اکبر'' چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ اتباع سنت کا یہ حال کہ ان کے عمل کو دیکھ کر مسائل نکالے جاتے تھے۔ ایسے ہی حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ، ان تمام حضرات کی زیارت کے شرف کے ساتھ ساتھ ان سے کچھ استفادہ کا بھی موقع ملا۔ استاذ محترم حضرت تھانویؒ کی زیارت بھی نصیب ہوئی اور حسب توفیق استفادہ کا بھی شرف نصیب ہوا۔ یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں کا ایک ایک شخص پوری پوری قوم کے برابر ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ملک کے گوشے گوشے میں مواعظ کہے اور ایک ہزار کے قریب تصانیف کیں۔ بہت سے علماء مل کر بیٹھیں تو بھی اتنا کام مشکل سے ہو سکے گا۔ حق تعالیٰ نے آپ سے ایسے کام لئے جس کا ایک قوم اور ایک جماعت سے ہونا اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

جائے بزرگان بجائے بزرگان!...... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان بزرگوں کے اثرات اس جگہ اور اس ادارہ میں نہ ہوں ایک پھول کپڑے کو لگ جاتا ہے تو اس پر اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دیر تک کپڑے سے خوشبو آتی رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شجرۃ الرضوان کے نیچے بیٹھ کر چودہ سو صحابہؓ سے بیعت لی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تھوڑے سے قیام کی وجہ سے اس جگہ کو آپ سے ایک نسبت حاصل ہوئی تھی اور وہ جگہ مقدس و متبرک ہوگئی تھی۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ ان برکات کو محسوس کرتے تھے، اس درخت کے نیچے بیٹھتے تھے دعائیں مانگتے تھے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ابھی تو خیر القرون ہے اور اس درخت کے ساتھ امت کی عقیدت کا یہ حال ہے، بہت ممکن ہے کہ کل کو ایسی نسلیں آئیں جو عقیدت میں غلو سے کام لیں اور اس کی وجہ سے شرک و بدعت کا دروازہ کھل جائے اس درخت کو کٹوا دیا۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ بتانا تھا کہ جائے بزرگان بجائے بزرگان، والا مقولہ بالکل صحیح ہے۔ پس یہ ادارہ جہاں اکابر اولیاء اور اپنے وقت کے مسلم قطب اور ولی رہ چکے ہیں ان کے پاکیزہ اثرات سے اس کے درودیوار کب خالی رہ سکتے ہیں۔

حاصل یہ کہ آپ ایک ایسے ادارے میں ہیں جسے طرح طرح کی نسبتیں اور تقدس حاصل ہے جو برکات یہاں ملتی ہے وہ دوسری جگہ نظر نہیں آتیں۔ دارالعلوم کی ایک ایک جگہ کے بارے میں اکابرین کے مکاشفات ہیں۔ نودرہ کی عمارت کے بارے میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ عرش سے ایک مسلسل لڑی ہے جو نودرہ کی درسگاہوں تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ تجربہ یہ ہے کہ جتنا یہاں بیٹھ کر کتابیں سمجھ میں آتی ہیں۔

دوسری جگہ نہیں آتیں۔ نودرہ کے سامنے کی جگہ جہاں جنازہ رکھا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ علیہ کا مکاشفہ ہے کہ جس جنازے کی نماز یہاں ہو جائے وہ مغفور ہوتا ہے۔

الہامی درسگاہ...... بھائی! یہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا ہے۔ اس کی تعمیر بھی الہام سے ہوئی اور طلباء کا داخلہ بھی الہام سے ہی ہوتا ہے، بلکہ بعض واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کے اساتذہ کا تقرر اور تعین بھی خاص زاویوں میں ہوتا ہے اور یہاں کی خدمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس مدرسہ کا آغاز اور مدرسوں کی طرح کی رسمی مشورے سے نہیں ہوا بلکہ وقت کے اکابر ومشائخ کا ایک اجماع سا ہے۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس کے وقت میں کسی کو کشف ہوا کہ یہاں پر ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔ کسی نے خواب میں دیکھا کہ یہاں پر ایک مدرسہ کا قیام ہونا چاہئے۔ کسی پر القا ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام کا تحفظ دینی اداروں سے ہی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح تعمیر کے وقت بنیاد کھودنے کے لئے کچھ نشانات لگادیئے گئے۔ جتنا اب ہے اس سے آدھے پر نشان لگایا گیا تھا۔

الہامی اہتمام...... دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تارک الدنیا اور نہایت ہی قوی النسبت بزرگ تھے۔ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ کتاب پڑھ سکتے تھے۔ مولانا نانوتویؒ نے انہیں بلایا اور اہتمام پیش کیا، آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نہ تو لکھنا جانتا ہوں، نہ پڑھنا، مجھے مہتمم بنا کر کیا کیجئے گا۔ حضرتؒ نے فرمایا نہیں۔ منجانب اللہ یہی مقدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اہتمام قبول کریں۔ چنانچہ آپ نے قبول فرمالیا۔

الہامی طلباء..... حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ مولسری کے احاطہ میں جو کنواں ہے اس کی منڈیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور دودھ تقسیم فرمارہے ہیں۔ دودھ لینے والوں میں سے بعض کے ہاتھ میں پیالہ ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ ہاتھ پھیلا کر چلو ہی سے پی لیتا ہے۔ حضرت جب بیدار ہوئے تو مراقبہ فرمایا کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔ کچھ دیر مراقب رہنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ دودھ صورت مثالی علم کی ہے۔ اور قاسم العلوم نبی اکریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ علم تقسیم فرمارہے ہیں اور طلباء فرق مراتب کے ساتھ علم حاصل کررہے ہیں۔ اس واقعہ کا علم لوگوں کو اس طرح ہوا کہ ایک بار شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ احاطہ مولسری میں کھڑے تھے ایک طالب علم شوربہ کا پیالہ آپ کے سامنے لے کر آیا اور اسے پھینک کر کہنے لگا۔ ''نہ اس میں گھی ہے اور نہ مصالحہ ہے اور شاید مفتی صاحب اس سے وضو کے جواز کا فتویٰ بھی دیدیں یہ ہے آپ کا اہتمام؟''

جب وہ طالب علم چلا گیا تو آپ نے پوچھا کیا یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں حضرت! یہ مدرسہ دیوبند ہی کا طالب علم ہے اور مطبخ سے اس کا کھانا ہے اور مطبخ کے رجسٹر میں اس کا نام درج ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں! یہ مدرسہ کا طالب علم معلوم نہیں ہوتا۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسی نام کا ایک دوسرا طالب علم

ہے۔اصل میں کھانا اس کا تھا۔لیکن نام میں اشتراک کی بناء پر غلطی سے ٹکٹ اسے مل گیا تھا۔طلبہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: حضرت! بات تو وہ ہوئی جو آپ نے فرمایا تھا۔مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ اس پر آپ نے دودھ والا واقعہ بیان فرمایا اور اس کے بعد جو عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ جب شوال میں طلباء داخل ہوتے ہیں تو میں ایک ایک کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا۔اس طالب علم پر میں نے تین مرتبہ نگاہ ڈالی تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ اس مجمع میں شریک نہیں تھا۔بہر حال میں یہ عرض کرر ہا تھا کہ یہ مدرسہ الہامی مدرسہ ہے اس کا آغاز بھی الہام سے ہوا اور طلباء کا انتخاب بھی الہام سے ہوتا ہے۔

الہامی سنگ بنیاد......اور اس کا سنگ بنیاد بھی الہام ہی سے رکھا گیا۔بنیاد کے لئے لوگوں نے جو نشان لگایا تھا اس پر ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے خواب دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔عصائے مبارک ہاتھ میں ہے اور فرماتے ہیں کہ ''یہ احاطہ تنگ رہے گا کافی نہیں ہوگا''۔

چنانچہ آپ نے مولانا نصیر احمد صاحب کی درسگاہ کے پاس نشان لگایا۔حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نیند سے بیدار ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ لکیریں بالکل اسی طرح موجود ہیں۔پھر شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بنیاد اسی پر کھودی جائے گی،اب مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حقائق و کیفیات کا فرق......آپ حضرات ایک ایسے مقام پر ہیں کہ جسے سینکڑوں بزرگوں کی نسبتیں حاصل ہیں۔مجموعی اور غیر شعوری طور پر وہ ساری نسبتیں کام کررہی ہیں۔اس لئے میں نے ابھی آپ سے کہا تھا کہ جو علم اور جو خیر و برکت یہاں ہے دوسری جگہ نظر نہیں آتی،کتابیں وہی ہوتی ہیں،الفاظ وہی ہوتے ہیں،مگر حقائق و کیفیات میں فرق ہو جاتا ہے۔

میں نے مشکوۃ شریف اپنے والد مرحوم مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے پڑھی ہے۔والد صاحبؒ جس وقت برزخ،موت،قیامت،حشر ونشر سے متعلق احادیث پر پہنچے اور تقریر شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدان قیامت سامنے ہے،یہ قبر ہے،حساب،کتاب ہے،عذاب وثواب ہے۔اس انداز اور ایسی کیفیت سے تعلیم ہوتی کہ ہم محسوس کرتے کہ یہی حالات ہمارے اوپر طاری ہورہے ہیں۔

نسبتوں کا چمن......دارالعلوم پر ایک وقت وہ بھی گزرا ہے کہ مہتمم سے لے کر دربان تک سب اہل نسبت بزرگ تھے۔حاجی عبداللہ صاحبؒ دربان تھے۔نوشت وخواند کچھ نہ تھی،لیکن صاحب نسبت بزرگ تھے۔صبح صادق پر جو دارالعلوم میں گھنٹہ بجتا ہے،اس کے بجانے کا کام انہی کے سپرد تھا۔پہلی ضرب لگاتے تو زبان پر سبحان اللہ ہوتا،دوسری پر الحمد للہ اور تیسری پر اللہ اکبر کے ایک نعرہ کے ساتھ پھر یہ شعر زبان پر عجیب کیفیت سے لاتے۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں ۔۔۔ اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

یہ منظر کچھ ایسا ہوتا کہ جو سنتا بے اختیار اس پر بکاء طاری ہو جاتا۔حاصل یہ کہ یہ ایک مثالی جگہ ہے۔اسے نہ جانے

کیسی کیسی نسبتیں حاصل ہیں۔ یہاں کم سے کم درجے کا طالبعلم آتا ہے، اس کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے، اس جگہ پر رہ کر محروم رہنے کا کوئی سوال نہیں۔ تو بھائی اگر نسبتوں کے بارے میں کچھ بات کی جائے تو بفضلہ تعالیٰ وہ بھی موجود ہے۔

زیادۃ فی العلم...... مگر ہاں اسی کے ساتھ ساتھ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ ایک تو اصل علم اور راس العلم ہے، جسے آپ حاصل کر رہے ہیں اور جو آٹھ دس سال میں حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ اضافہ کی برابر کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ جس طرح اصل علم مطلوب ہے ویسے ہی زیادۃ فی العلم بھی مطلوب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے ﴿رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ ① حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ علوم دیئے گئے تھے جو ساری کائنات میں سے کسی کو نہیں دیئے گئے، چونکہ یہ انسان کی صفت نہیں ہے بلکہ اللہ کی صفت ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات غیر محدود ہیں اس لئے آپ جتنا بھی علم حاصل کرتے جائیں گے، جہالت دور ہوتی چلی جائے گی اور آگے میدان مزید نظر آئے گا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ مرضِ وفات میں ہیں۔ ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ آپ مطالعہ نہ فرمایا کیجئے۔ مگر جب ڈاکٹر چلے جاتے تو آپ فوراً مطالعہ میں مشغول ہو جاتے لوگ کہتے کہ حضرت! ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ تو فرماتے بھائی! کیا کروں یہ مرضِ مطالعہ کا بالکل لاعلاج مرض لگا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ چند ساعت ہی ترکِ مطالعہ کرتے۔ اس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ آپ کی دلالت اولیٰ مطالعہ پر ہی تھی، حضرت کو زیادۃ فی العلم کی ایک دھن لگی ہوئی تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حفظ اتنا قوی دیا تھا کہ جو چیز ایک بار دیکھ لیتے تو عمر بھر کے لئے کافی ہو جاتی۔ خود ایک بار درس میں فرمایا کہ جو چیز نظر سے گزر جاتی ہے پھر فراموش نہیں ہوتی۔ درس میں مشہور و معروف کتب تو در کنار غیر متعارف قلمی نادر کتب کا حوالہ بقیہ صفحات و سطور اس طرح دیتے کہ محسوس ہوتا کہ شاید گذشتہ رات ہی حضرتؒ نے ان کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے۔ اس قدر قوتِ حفظ کے ہوتے ہوئے حضرتؒ نے تیرہ بار فتح الباری کا از اول تا آخر مطالعہ کیا تھا۔ بتایئے کہ جس کے ایک بار کتاب دیکھ لینے کے بعد یہ عالم ہو کہ سالہا سال کے بعد بھی مستحضر، تو تیرہ بار فتح الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا عالم ہوگا۔ آپ کے یہاں حدیث کا درس ہوتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ سارے ہی فنون کا درس ہوتا تھا۔ افسوس کہ آپ کی بتائی ہوئی باتیں اور تقریر محفوظ نہ رکھ سکا۔

علم کی دھن...... تو بھائی! علم آدمی کو محنت سے ملتا ہے، دھن سے ملتا ہے۔ یہ دھن پیدا ہو جانی چاہئے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس کو سود در سود کر کے بڑھاتے ہی چلے جانا ہے۔ جب دھن پیدا ہو جائیگی تو آپ زیادہ سے زیادہ کتب بینی کریں گے اور جب آپ کتب بینی کے عادی ہو جائیں گے، تو پھر آپ میں تفقہ پیدا ہوگا۔ اور جب تفقہ پیدا ہو جائے گا، تو آپ کسی شے کے محض حکم ہی پر قناعت نہ کریں گے بلکہ اس کی حکمت کو بھی معلوم کرنے کی

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۱۱۴۔

کوشش کریں گے۔اور جب حکمت معلوم کرلیں گے تو اس سے بڑھ کر علت معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور جب علت معلوم ہوجائے گی تو آپ اسی پر قناعت نہیں کریں گے بلکہ اس وقت آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس علت کا رابطہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کس صفت سے ہے۔

علم وعمل کی سند......ایک بات آپ حضرات سے کہدوں کہ جس طرح آپ علم حاصل کرنے کے لئے مجاہدہ کرتے ہیں، مشقتیں برداشت کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی عملی اور اخلاقی قوت مضبوط نہیں ہوگی، علم کام نہیں دے گا، جب تک سلسلہ عمل کو بھی متصل نہ کیا جائے۔ایک عالم میں اگر کبر ہو، حسد ہو، بغض ہو، کینہ ہو، حب جاہ ہو، تو وہ خود بھی ذلیل ہوگا اور علم کو بھی ذلیل کرے گا۔اسلاف جب علم سیکھ لیتے تھے تو اس کے بعد مستقل طور پر عمل بھی سیکھتے تھے۔خود دارالعلوم پر نصف صدی ایسی گزری تاوقتیکہ شیخ کامل سے اجازت نہ ہوتی دارالعلوم اپنی علمی سند نہ دیتا گویا علم وعمل کی تکمیل کا نام سند تھا۔

علم وخشیت......میں نے آپ کے سامنے جو حدیث پڑھی تھی۔یعنی نہ تو کوئی طالبعلم کبھی سیر ہوتا ہے اور نہ طالب دنیا سیر ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ کسی طالب مال کو کسی حد پر قناعت ہوتی ہے۔اور نہ طالب علم کو بلکہ حرص بڑھتی ہی جاتی ہے۔اگر کسی کے پاس سو روپیہ ہے تو وہ دو سو کی خواہش میں لگا ہوتا ہے۔اگر دو سو ہیں تو چار سو کی خواہش ہوتی ہے۔اسی طرح کسی عالم کو اگر سو مسئلے معلوم ہوگئے تو دو سو معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔جب علم کی طلب اس درجہ تک پہنچ جائے گی تو علم خود ہی عمل کو دعوت دے گا، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ ① جس قدر علم بڑھتا جائے گا خشیت بڑھتی جائے گی۔اور جب خشیت بڑھے گی تو آپ یقیناً طاعت کی جانب مائل ہوں گے۔اس لئے کہ علم کے لوازم میں عمل ہے۔

راہنمائی کی تیاری کا زمانہ......اب تو آپ حضرات کا طالب علمی کا زمانہ ہے ابھی آپ دوسروں کی نگرانی میں رہتے ہیں۔اور یہاں رہ کر آپ صالح بن رہے ہیں۔مگر یہاں سے جانے کے بعد آپ خود نگران بنیں گے اور آپ کو مصلح بننا ہوگا پھر آپ کے سامنے مختلف قسم کے مسائل آئیں گے اور اس کے مطابق آپ کو تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی، آپ کے سامنے ملک وقوم کے حالات ہوں گے اور آپکو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت قوم میں کون سی بیماریاں ہیں؟ کیا کوتاہیاں ہیں؟ ان کے اسباب کیا ہیں؟ اور ازالہ کی تدابیر کیا ہوں گی؟

ایسے ہی یہاں سے نکلنے کے بعد آپکے سامنے شرک وبدعت کا میدان ہوگا اور عیسائیت ویہودیت سے بھی مقابلہ رہے گا۔اگر آپ نے ان کاموں کے لئے ابھی سے تیاری نہ کی اور محنت ومشقت کر کے میدان کو ہموار نہ کر لیا، تو آگے چل کر آپ کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ظاہر ہے۔

میری خواہش ہے کہ آپ یہاں سے صرف عالم اور صالح بن کر نہ نکلیں بلکہ معلم اور مصلح بن کر نکلنے کی کوشش

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۲۸۔

کریں۔اس لئے کہ قوم منتظر ہے کہ ہمارے نونہال دارالعلوم میں پڑھنے گئے ہیں، وہ آئیں گے ہماری اصلاح کریں گے۔ہمیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگائیں گے اور ہماری پریشانیوں کا حل ہوں گے۔لہٰذا پہلے ان چیزوں کے سلسلے میں خود بھی سوچیں۔اس کا حل نکالیں۔اپنے اساتذہ سے سوالات کریں پھر نہ آپ کو ایسا وقت ملے گا نہ ایسے اساتذہ ملیں گے۔اور اگر آپ یہ کہیں کہ ہم یہ سب کرتے رہتے ہیں تو خیر کوئی حرج نہیں، اس لئے میں نے یہ چند باتیں آپ لوگوں سے عرض کر دیں۔

خلوص ومحبت کا شکریہ...... آپ نے جس محبت وخلوص سے یاد فرمایا میں اس کا شکر گزار ہوں اور صرف شکر گزار ہی نہیں اس لئے کہ یہ تو ایک وقتی اور رسمی چیز ہوگئی ہے۔میں آپ حضرات کے لئے خلوص قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے۔میں کیا ہوں کچھ بھی تو نہیں۔بس ایک نام ایک نسبت لگ گئی ہے، ان بزرگوں کے ساتھ جن کے طفیل میں ہم اور آپ آج یہاں موجود ہیں۔غالب نے کہا ہے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا ... وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہمارا تو جو کچھ بھی ہے انہیں بزرگوں کی وجہ سے ہے۔ہمیں تو روٹیاں بھی مل رہی ہیں۔تو انہیں بزرگوں کے طفیل میں، سپاسنامے اور تعارف میں تو اکثر مبالغے ہی سے کام لیا جاتا ہے۔اور اس میں ایران توران کی باتیں کہی جاتی ہیں۔آپ لوگوں کی جانب سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا ہے اس میں بھی مجھے ہر طرح سے اچھا اور لائق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔مگر کیا عجب ہے کہ جب اتنے لائق لوگ ایک نالائق کو لائق کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اتنے لائقوں کی لاج رکھ لیں اور یہی میری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

امتیازِ دارالعلوم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

أَمَّـــا بَعْـــدُ ! فَأَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَمَاکَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْاکَآفَّۃً ، فَلَوْلَا نَفَرَمِنْ کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَارَجَعُوْآ اِلَیْھِمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ o﴾صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.①

ایک بڑی کمی...... بزرگانِ محترم اور برادرانِ عزیز طلبہ! پروگرام میں عربی تقریروں اور نظموں کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا نمبر تھا۔ افسوس ہے کہ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں ورنہ ارشادات گرامی سے مستفیض فرماتے۔ اگر حضرت موجود ہوتے تو ہم سب کے لئے کار آمد اور مفید ہوتا۔ میں نے حضرت مولاناؒ سے عرض کیا تھا کہ اگر آپ جلسہ انعام کی تاریخوں میں شرکت نہ فرما سکیں تو جلسہ کو موخر کیا جائے۔ مگر حضرت نے پسند نہ فرمایا اور وعدہ کیا کہ حتی الامکان شرکت کی سعی فرمائیں گے۔ اس وقت ہمیں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی ہے جلسہ کی غرض و غایت تقسیم انعام اور طلباء کی حوصلہ افزائی ہے۔ اور جس شعبہ کے طلبہ کو یہ انعام دیا جاتا ہے اس شعبہ کے صدر حضرت مولاناؒ ہیں۔

مہمانوں کا شکریہ...... جلسہ کے واجبات کے متعلق چند ضروری باتیں بھی مجھے عرض کرنا ہیں۔ دارالعلوم کی جانب سے باہر سے تشریف لانے والے مہمانوں کا شکر گزار ہوں کہ اس سخت اور تکلیف دہ گرمی کے موسم میں انہوں نے شرکت کے لئے زحمت گوارہ فرمائی۔ بالخصوص دہلی سے آنے والے حضرات کاروباری لوگ ہیں۔ وہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر ہماری طلب پر تشریف لائے ہیں۔ اس لئے یہ حضرات ہمارے شکریہ کے بہت زیادہ مستحق ہیں۔ ان حضرات کا یہاں آنا کسی مالی غرض کی بناء پر نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس کا سبب وہ محبت ہے جو انہیں دارالعلوم سے ہے۔

امسال جلسہ کے انعقاد میں کچھ موانع تھے اور خیال تھا کہ جلسہ نہ ہو سکے گا مگر ابھی چند دن ہوئے کہ یہ ارادہ ہوا۔ اس لئے بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ وقت بہت کم ہے اس لئے دعوت مختصر دی جائے۔ مجھے آپ

① پارہ: ۱۱،سورۃ التوبۃ،الآیۃ: ۱۲۲.

حضرات سے دارالعلوم کا تعارف کرانا نہیں ہے اور نہ آج دارالعلوم کسی تعارف کا محتاج ہے۔

تاسیسِ دارالعلوم کا امتیاز...... مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ دارالعلوم کی تاسیس دوسرے اداروں سے بالکل مختلف ہے۔ جو ادارہ قائم ہوتا ہے اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ چند اہل الرائے ایک جگہ جمع ہو کر باہمی مشورہ سے سوچ کر ایک چیز طے کرتے ہیں۔ مگر دارالعلوم کی تاسیس اس سے مختلف ہے۔ دارالعلوم الہام غیب اور اہل اللہ کے قلوب پر انکشاف واردات کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے تواتر کے ساتھ سنا ہے کہ اس زمانہ میں جس قدر اہل اللہ اور بزرگ تھے ان سب کے قلوب پر یہ منکشف ہوا۔ غرض یہ کہ اس طور پر ان حضرات میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انکشاف اور منجانب اللہ الہام کا اظہار فرمایا۔ اس طرح پر یہ ادارہ قائم ہوا ہے۔ دارالعلوم کی بنا الہامی طور پر ہے رسمی اور حسی طور پر نہیں ہے۔ دارالعلوم کے پہلے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ تھے جو اگرچہ امی محض تھے مگر نہایت باکمال اور صاحب حال بزرگ تھے۔ دارالعلوم کے لئے جب بنیادیں کھودی گئیں تو وہ احاطہ جو اس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا بہت مختصر تھا۔ رات کو حضرت مولانا خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔ یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے احاطہ کا طویل وعریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے۔ بلا کسی مشورہ کے ان ہی نشانات پر بنیاد کھدوا کر تعمیر کا کام شروع کرا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جس ادارہ کی بنیاد الہامات پر قائم ہو اس کی کیفیت یقیناً دوسرے اداروں سے مختلف ہوگی۔

طلباءِ کرام کا امتیاز...... یہاں سے جو طلباء فارغ ہو کر جاتے ہیں ان کا تعین بھی منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو طلباء یہاں پڑھتے ہیں وہ بھی منجانب اللہ منتخب ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک طالب علم مطبخ سے کھانا لیکر آیا اور شوربہ کا پیالہ مولانا کے سامنے اوندھا کر کے کہنے لگا کہ ''یہ شوربا کھانے کے لئے ہے یا وضو کے لئے؟'' اس طرح تند و تیز باتیں کر کے چلا گیا۔ مولاناؒ نے دریافت فرمایا یہ کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں طالب علم ہے۔ مولاناؒ نے وثوق کے لہجے میں فرمایا کہ یہ طالب علم نہیں ہے اور نہ یہ طالب علم ہو سکتا ہے چنانچہ تفتیش کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے فرضی طالب علم ظاہر کر کے دھوکہ سے کسی طرح مطبخ کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوالیا ہے اور فی الحقیقت طالب علم نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد لوگوں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ نے وثوق کے ساتھ کس طرح اس کے طالب علم ہونے سے انکار کیا تھا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ یہاں جس قدر طالب علم پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان سب کی شکلیں مجھے دکھلا دی گئی ہیں۔ چنانچہ جب میں نے اس شخص کو بغور دیکھا تو دکھلائی ہوئی شکلوں میں اس صورت کا کوئی شخص نہیں تھا۔ اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ہرگز طالب علم نہیں ہے۔

حصولِ علم کا امتیاز...... احاطہ مولسری میں جو کنواں ہے اس کے متعلق مولاناؒ نے خواب میں دیکھا کہ کنواں

دودھ سے بھرا ہوا ہے۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیالہ سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔ بعض کے پاس چھوٹے برتن میں اور بعض کے پاس بڑے برتن ہیں۔ ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کر لے جاتا ہے۔ مولاناؒ نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی تعبیر یہ فرمائی کہ اس سے ہر شخص کا ظرف علم مراد ہے۔ جس شخص کا جس قدر ظرف ہے اس مقدار میں علم اس کے نصیب وحصہ میں آئے گا۔

دار العلوم کے انتظام وانصرام کا امتیاز......اس ادارہ کے اصول وفروع بھی الہامی طور پر واقع ہوئے ہیں۔ مجھے اپنے ۲۵۔۲۶ سال کے زمانہ اہتمام کا تجربہ ہے۔ اس دوران یہ چیز نہایت شدت سے محسوس ہوتی رہی ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو اس ادارہ کو چلا رہی ہے اور اس کا دار ومدار ظاہری جد وجہد سے بالاتر کوئی باطنی قوت ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے، ہمارے اندر بہت سی خامیاں ہیں مگر اکابر کا فیض ہے کہ کام برابر چل رہا ہے ورنہ آج کے دور میں علوم دینیہ کا ذوق رکھنا ایسا ہی ہے جیسے پہلے زمانہ میں ملامیہ فرقہ تھا۔ اسی طرح آج جس کو ملامت سننی ہو وہ مولوی ہو جائے۔ عدم اعتناء دین کے اس دور میں جب کہ علوم دینیہ سے شدید بعد پیدا ہو چکا ہے۔ اس دار العلوم کا قائم رہنا اور ترقی کرتے رہنا یہ اس کی علامت ہے کہ یہ منجانب اللہ قائم ہے۔ چنانچہ جب کبھی مخالفین کی جانب سے ایسی سعی کی گئی کہ چندہ نہ آئے تو اس سال نسبتاً زیادہ آیا اور مخالفین کو اپنے مقصد میں شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور پرفتن میں دار العلوم کا قائم رہنا اسباب کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ غیبی امداد واعانت ہے جو اس کو چلا رہی ہے۔

غالباً سن ۴۹ ہجری کا واقعہ ہے اور یہ پہلا سال ہے میرے اہتمام کا، مولوی گل محمد خان صاحبؒ جو خزانہ کے تحویلدار اور تقسیم تنخواہ کے ذمہ دار تھے۔ رجب کی آخری تاریخ میں میرے پاس آئے اور بتلایا کہ خزانہ میں ایک پائی نہیں ہے اور کل پرسوں کو ڈھائی ہزار روپیہ تنخواہ کی صورت میں تقسیم کرنا ہے۔ میں نے کہا فکر کی کیا بات ہے جس کا کام ہے وہ خود چلائے گا۔ ان کو رخصت کر کے حضرات مدرسین کو میں نے کوٹھی پر بلا کر دریافت کیا کہ آپ دار العلوم مین کیوں پڑے ہوئے ہیں اور کیا مقصد ہے؟ آیا دین کی خدمت مقصود ہے یا تنخواہ حاصل کرنا۔

مُدرّسینِ کرام کا امتیاز......سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا کہ ہمارا مقصد اس مقدس امانت کی خدمت ہے جو اکابر نے ہمیں سونپی ہے۔ حاشا وکلا تنخواہ پر کبھی ہماری نظر نہیں رہی۔ میں نے کہا اگر تنخواہ نہ ملے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ فاقہ کریں گے اور پڑھائیں گے۔ میں نے کہا الحمد للہ اب آپ مطمئن رہیں۔ دار العلوم بھی انشاء اللہ چلے گا اور آپ کی تنخواہیں بھی ملتی رہیں گی خزانہ میں اس وقت ایک پیسہ نہیں ہے۔ دعاء کیجئے کہ اکابر کی اس امانت کے باقی رکھنے مین اللہ تعالیٰ ہمیں رسوائی سے بچائے۔ سب نے مل کر خشوع خضوع کے ساتھ دعا کی جس کا اگلے دن یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ ابھی تنخواہ کا وقت نہ آیا کہ حق تعالیٰ نے ڈھائی ہزار روپیہ بھیج دیئے۔ دو ہزار روپے کلکتہ کے ایک تاجر کی طرف سے تھے اور پانچ سو میرٹھ کے مشہور رئیس خان صاحب شیخ رشید خان صاحب آرمی کنٹرکٹر کے جو اتفاقیہ دہرہ دون جاتے ہوئے دیوبند تشریف لائے اور پانچ سو کا عطیہ دے گئے۔ غرض یہ کہ

دارالعلوم کی بناء بھی غیبی امور کے اوپر ہے اور کاموں کا انصرام بھی منجانب اللہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ترقیات کے ساتھ روز بروز دارالعلوم آگے بڑھ رہا ہے۔ عرصہ سے یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ جلسہ انعام عظیم الشان پیمانہ پر کیا جائے اور ملک کے تمام بہی خواہوں کو دعوت دی جائے اور قدیم طلبہ کو بھی بلایا جائے۔ مگر ملک کے ہنگامی موانع نے ہمیں باز رہنے پر مجبور رکھا۔ بہت ممکن ہے کہ سال آئندہ ہم اس میں کامیاب ہو جائیں۔

روح دارالعلوم...... تعلیمی اداروں کی اصل قابل اعتناء چیز روح ہے عمارات نہیں ہیں۔ یہاں کی اصل روح تعلیم ہے۔ اگر دارالعلوم تعلیمی مقاصد میں کامیاب ہے تو اس نے اپنے مقصد کو پورا کر دیا اور اس روپیہ کو ٹھکانے لگا دیا جو قوم نے اس کو دیا تھا۔ اس کا اندازہ امتحانات کے نتائج سے ہو سکے گا جو ابھی آپ کے سامنے بیان کئے جانے والے ہیں۔ اس سال دارالعلوم میں تین مزید شعبوں کا اضافہ ہوا ہے۔ ایک شعبہ صناع کا ہے جو طلبہ کو صناع سکھلائے گا۔ عام طور پر علماء کا نفقہ قوم پر ہے۔ جو لوگ فی سبیل اللہ کار خیر میں محبوس ہیں قوم کا فرض ہے کہ وہ ان کی امداد کرے۔ مگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کو ان کی معاش سے مطمئن کر دیا جائے۔ اس شعبہ میں ۷ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا جز فن کتابت ہے۔ اس کی بنیاد سن ۶۴ ہجری میں ڈالدی گئی تھی۔ اس شعبہ میں اس وقت ۴ آدمی کتابت کا فن سکھلا رہے ہیں۔

دوسرا شعبہ ورزش کا ہے روحانی غذا کے ساتھ جسمانی غذا کے لئے شعبہ ورزش کھولا گیا اس شعبہ میں دو استاد کام کر رہے ہیں۔ آج صبح اس شعبہ کے معائنہ میں دہلی کے حاجی محمد یوسف صاحب نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے تیس روپے بطور انعام کے طلبہ کو دیئے ہیں۔

تیسرا شعبہ جمعیت الطلبہ کا ہے۔ یہ سلسلہ تو بہت قدیم ہے مگر اس سال اس کو باضابطہ بنا دیا گیا ہے۔ سال آئندہ اس کی کارگذاری تفصیل کے ساتھ معائنہ کرائی جاسکے گی۔ اس کے چار شعبے ہیں۔ 1 عربی تحریر 1 اردو تحریر 3 عربی تقریر 4 اردو تقریر

طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے اب انعام تقسیم کیا جائے گا۔ تاکہ کامیاب طلبہ میں شوق اور ترغیب پیدا ہو اور جو لوگ ناکام رہے وہ شرمندہ اور خجل ہو کر آئندہ محنت سے تعلیمی امور میں منہمک ہوں۔ اگر چہ یہ سلسلہ نہایت غیر دلچسپ اور خشک ہے مگر اصل میں یہی تعلیم کے نتائج کا نچوڑ اور معیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پوری توجہ سے اسے ملاحظہ فرمائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

آزادی ہند کا خاموش راہنما

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. أَمَّا بَعْدُ!

آزادی کی خوشی کی تکمیل...... آج ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء ہے جو ہندوستان کا یوم آزادی ہے۔ ملک کا ہر ایک باشندہ خوشیاں منا رہا ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ آزادی سے بڑھ کر خوشی منانے کی اور کوئی چیز ہو بھی نہیں سکتی، جبکہ آزادی ہی ہر خوشی کا سرچشمہ ہے لیکن یہ آزادی ہمیں اچانک نہیں مل گئی۔ اور آسمان سے بارش کی طرح ایک دم برس نہیں گئی، بلکہ کتنے ہی صبر آزما دنوں مہینوں اور سالوں، کتنے ہی دار و رسن کے ہنگاموں اور قید و بند کے ہیبت ناک کٹہروں بلکہ کتنی ہی تڑپتی ہوئی لاشوں سے گزر گزر کر یہ آزادی کی دولت ہم تک پہنچی ہے۔ گو آج کی تاریخ میں آزادی کا پارسل سمندروں سے گزرتا ہوا ہندوستان پہنچا، کتنے طوفانوں میں سے نکلا اور کتنی خطرناک خلیجیں اس کی راہ میں حائل ہوئیں جن کا آہنی قسم کے انسانوں نے مقابلہ کیا۔ ایسے اہم سوالات ہیں جن سے ہماری تاریخ وابستہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے آزادی کی خوشی کے ساتھ اگر ان غموں کی اور غم سہنے والی عظیم المرتبت شخصیتوں کی داستان سامنے نہ لائی جائے جو آزادی کے اولین علم بردار تھے تو نہ آزادی کی خوشی ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ اور نہ یوم آزادی کوئی روشن دن ہی بن سکتا ہے کیونکہ ہماری خوشی کی تعمیر ان ہی کے غموں اور غم خواریوں کی اساس پر کھڑی ہوئی ہے۔ اگر وہ قید و بند اور دار و رسن کا غم نہ کھاتے تو یہ آزادی کی خوشبو ہمارے دماغ تک نہ پہنچتی۔ اس لئے ہماری خوشی ان کی آزادی خواہانہ روشوں کا تذکرہ کئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔

آزادی کا ہیرو...... ایسی بلند پایہ شخصیتیں کافی تعداد رکھتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے موقعہ پر سرفروشی کے جوہر دکھلائے اور ایثار قربانی سے گو اپنے کو ختم کرلیا۔ مگر آنے والی نسلوں کے لئے آزادی کی خوشیاں منانے کی فضائیں ہموار کر گئے، ان میں متعدد شخصیتیں آزادی کے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تذکروں سے تاریخ کا دامن بھرپور ہے۔ میں اس موقعہ پر اس نامور اور عظیم القدر شخصیت اور اس کی اُصولی شاہراہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف ذاتی طور پر حصہ ہی لیا اور نہ صرف ایک ہیرو بلکہ امیر لشکر و سپہ سالار فوج

کی حیثیت سے شاملی کے میدان جنگ میں پیش قدمی کی کہ اس میں اور شخصیتیں بھی پیچھے نظر نہیں آتیں بلکہ جنگ کی فتح وشکست کو آنکھوں میں رکھ کر آزادی پسندی اور آزادی خواہی کی ایک ایسی اصولی شاہراہ ڈال دی جس سے جماعتیں آزادی ضمیر، آزادی زبان وقلم اور آزادی ملک وملت کے جذبات کی اساس راہ پر پڑ گئیں اور جو فتح شاملی کا میدان کارزار تیغ وسناں سے نہیں پا سکا تھا' وہ ان اصولوں کے ہتھیاروں سے قلم وزبان کے میدان میں نظر آ گئی اور نظر بازوں سے ہمکنار ہوگئی۔

میری مراد اس سے حضرت اقدس حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ بانی دارالعلوم دیوبند کی ذات گرامی ہے۔ جو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ کے دل ودماغ کے علماً وعملاً امداد اللّٰہی لسان کی حیثیت سے اولاً شاملی کے ۵۷ء کے میدان میں سامنے آئے اور اس ہنگامہ رست وخیز کے خاتمہ پر انہوں نے علم کی رونمائیوں کے لئے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی۔

شاملی کے میدان کی تلافی...... گویا شاملی کا میدان اور دارالعلوم کی زمین ایک ہی حقیقت کے دورخ تھے۔ فرق تیغ وسناں اور قلم وزبان کا تھا۔ وہاں تشدد کے ساتھ آزادی ملک وملت اور آزادی مذہب ودین کا نصب العین سامنے تھا۔ اور یہاں عدم تشدد کے ساتھ علمی اخلاقی اور آئینی رنگ میں وہی منصوبہ پیش نظر تھا وہاں اس نصبُ العین کے لئے افراد استعمال کئے جا رہے تھے۔ اور یہاں اس کے افراد بنائے جانے لگے۔ وہاں نام میدان جنگ کا تھا اور یہاں نام مدرسہ، مکتب امن وصلح کا تھا۔ وہاں قلب ودماغ کے اشاروں پر ہاتھ پیر کام کر رہے تھے اور یہاں براہ راست دل ودماغ نے خود اپنے تصرفات دکھلائے۔ غرض حضرت والا نے میدان شاملی کے نتائج پیش نظر رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اور اس کے اصول اور نظام کار کو ایسے انداز میں اٹھایا کہ شاملی کے میدان کی تلافی ہو اور جو منصوبہ اس وقت کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا تھا وہ اب ہو جائے۔

سیاسی محکومیت کے ازالہ کی واحد تدبیر...... حضرت والا نے دارالعلوم دیوبند بلکہ ۵۷ کے بعد تمام دینی مدارس کے لئے آٹھ اصول کا ایک دستور اساسی مرتّب فرمایا۔ جو دارالعلوم کی معنوی تاسیس تھی۔ اس کی ہشت گانہ دفعات میں اپنے ذہن کا وہ جمہوری نظام جس کو آپ وقت کی پکار سمجھ رہے تھے۔ جو ایک طرف اگر علاقہ کے خواص پر مشتمل تھا تو دوسری طرف اس کی روح رابطہ عوام سے تھی، ذہن سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا۔ حضرت والا ان اصول کے راستہ سے قوم کو حکومت وقت اور امراء عصر سے بے نیاز کر کے حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے، کیونکہ جو قوم خود اپنی قدرت سے قادر نہ ہو وہ ہمیشہ دوسروں کے رحم وکرم پر جیتی ہے۔ اور وہ جینا زندگی نہیں، موت بصورت حیات ہے۔

حضرت نے ۱۸۵۷ء کے بعد بھانپ لیا تھا کہ اگر قوم میں ملک وسیاست کے ساتھ علم واخلاق اور ذہن وفکر میں بھی حق خود ارادیت باقی نہ رہا' تو اس قوم کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی۔ اور وہ کبھی بھی اجتماعی طور پر خود اختیار

بن کر نہ ابھر سکے گی۔ اس لئے حضرت والا کے نزدیک قوم کی سیاسی محکومی اور اجتماعی غلامی کے ازالہ کی واحد تدبیر ہی یہ تھی اور واقعۃً یہی تھی کہ قوم کو علم و دین کے راستے سے اجتماعیت کی لائنوں پر ڈال دیا جائے۔ اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تعلیم و تربیت کے نظام کو شخصیاتی لائن کے بجائے جماعتی اصول پر قائم کیا جائے تا کہ ایک طرف تو عوام کی قوت اس کے ساتھ ہو جائے۔ اور دوسری طرف اس تعلیم اور نظام تعلیم کے پروردوں میں دینی حدود کے ساتھ جمہوری تنظیم کا مذاق پیدا ہو جائے۔

حضرت والا دل کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ زمانہ عوام کو ابھارنے والا ہے۔ حکمرانی کی قوتیں عوام کی طرف منتقل ہونے والی ہیں۔ اگر یہ صورت حال خود رو طریق پر ہوئی تو اس عوامیت میں لادینی کے جراثیم کارفرما ہو جائیں گے جس سے اس دین شعار قوم کی حقیقی بنیادیں ہی ختم ہو جائیں گی۔ اور اس کا قومی وجود ہی سرے سے باقی نہ رہے گا۔ اس لئے آپ نے اس ادارہ میں تعلیم تو خالص دین کی جاری فرمائی۔ اور نظام تعلیم یعنی نظم ادارہ کے اصول اجتماعی اور جمہوری رنگ کے رکھے، تا کہ دین اور نظم دونوں کے مجموعہ سے قوم میں دینی خود اختیاری قوت پیدا ہو جائے کہ اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْأَمَانِ (ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں) ایک سے دوسرا جدا نہیں ہو سکتا۔

جہادِ شاملی کے رُخ کی تبدیلی...... حضرت والا کے ان اصول ہشت گانہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصول لکھتے وقت آپ گویا شاملی کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ قوم کی ہزیمت و شکست کا منظر آپ کے سامنے ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت متسلطہ شکست خوردہ قوم کے حقوق آزادی کو کچل رہی ہے۔ اور اس کے بنیادی تشخص اور حق خود ارادیت کو ساتھ ہی اس کے مذہب اور قومی بنیادوں کو جن پر اس کی قومی شخصیت کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی جن کا سلسلہ ۵۷ء سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

حضرت والا نے ۵۷ء کی شکست کے بعد محسوس کیا کہ اب تلوار سے مقابلے کا وقت نہیں ہے۔ تو آپ لوہے کی تلوار میان میں کر لیتے ہیں۔ اور تعلیمی لائن کے ہتھیار میان سے نکال کر میدان مقابلہ میں آ جاتے ہیں، گویا شاملی کا جہاد ابھی ختم نہیں ہوا صرف رخ بدلا ہے۔ اور ہتھیاروں کی نوعیت تبدیل ہوئی ہے۔ اس ٹھنڈے مقابلہ کا پہلا قدم قوم کی سنبھال اور رکھوالی تھی، جبکہ اسے ناتربیتی اور لاتعلیمی ہی کی وجہ سے شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اس لئے اس جدید اقدام میں تعلیم و تربیت کے راستے سے قدیم ناتربیتی اور لاتعلیمی کے اثرات زائل کرنے تھے۔ احساس کمتری کو دلوں سے دور رکھنا تھا تا کہ حوصلوں میں فرق نہ آ جائے۔

آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ...... دوسرا قدم دین کی اخلاقی تربیت پاکیزگی نفس اور جذبات حب فی اللہ اور بغض فی اللہ سے قوم کی تعمیر تھی تا کہ آزادی ضمیر کی روح اس میں مستحکم ہو جائے۔ تیسرا قدم علم و عمل اور اخلاق کے ان سانچوں میں حریت نفس اور آزادی ملک و ملت کے ایسے جذبات کا رنگ بھرنا تھا جن میں فکر و بصیرت کے ساتھ اخلاص و ایثار اور قوم پروری کی روح دوڑ رہی ہو۔

دارالعلوم کے یہ بنیادی اصول اجتماعی روح کے ساتھ حضرت نے اس وقت واضح فرمائے، جبکہ نئے تسلط و اقتدار کے زیر اثر سر برآوردگان ملک عوام کے جذبات سے الگ ہو کر طاقت متسلطہ کی گود میں اپنے کو ڈال رہے تھے ''حریت کاری'' کے بجائے ''وفاداری'' کا خمار خود سروں کے سروں میں بھر چکا تھا۔ اور قومی رشتے حکومتی رشتوں پر بھینٹ چڑھائے جارہے تھے۔ حضرت نے اس وقت ان آٹھ اصولوں کے راستہ سے استغنائی رنگ میں اس ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اور اس علمی تنظیم سے خواص کے ذریعہ عوام کو ابھارنے اور مضبوط بنانے کا پرداز ڈالا۔ اور ملک کے اونچے طبقہ سے ہٹ کر جو حکومت کی گود کی طرف بڑھ رہا تھا ایک آزاد نظام برپا کرنے کا فیصلہ ان اصول کے راستہ سے کرلیا۔ ان اصول اور ان کے بنائے ہوئے علمی اداروں یعنی دارالعلوم دیوبند اور اس کی فروعات سے ملک کی علمی اور دینی خدمات کیا ہوئیں؟ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے ایک ایک کونے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں علم اور اخلاق اور قال اللہ وقال الرسول کی روشنی کس حد تک پہنچی اور پھیلی؟ اس تحریر میں میرا موضوع بحث نہیں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ اس کے علاوہ اجتماعی رجحانات اور ان کے علمی نتائج کس حد تک ظاہر ہوئے؟

خاموش راہنمائی کے آٹھ اُصول...... سو ان کا اجمالی خاکہ سامنے لانے کے لئے پہلے ان اُصولِ ہشت گانہ کا متن پڑھیے اور پھر ان کے پیدا کردہ ذوق اور ذوق سے پیدا شدہ عملی آثار کو دیکھئے! اُصول کا متن جو حضرت والا کے قلم کا لکھا ہوا خزانہ دارالعلوم میں محفوظ ہے۔ حسب ذیل عنوان سے شروع ہوتا ہے: وہ اُصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس عنوان کے نیچے حسب ذیل آٹھ اُصول قلم بند فرمائے گئے ہیں۔

1 ...... اصل اوّل یہ ہے کہ تامقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیراندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

2 ...... اِبقاءِ طعام طلبہ مل کر افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی تر رہیں۔

3 ...... مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اُسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنا پر تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اسکی پس پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کی سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہماری مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم اُمورِ مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔ یا کوئی وارد صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیراندیش ہو۔ اور اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہلِ مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش

نہ ہو کہ مجھ کو کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

4 ...... یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں۔ اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

5 ......خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

6 ......اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ اِنشاء اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع اِلی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

7 ......سرکار کی شرکت اور اُمرا کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

8 ......تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

جمہور کا ادارہ اور عوام سے رابطہ...... ان اصول ہشت گانہ کی رو سے حضرت والا نے: 1 سب سے پہلے اس ادارہ کو عوامی اور جمہوری قرار دیا اور اس کی کفالت کا بار عوامی چندوں پر رکھا تا کہ یہ ادارہ سرکاری یا کسی مخصوص پارٹی کا کہلانے کی بجائے جمہوری اور عوامی کہلائے۔ پھر اس کی ضروریات کی اپیل بھی براہ راست عوام ہی سے رکھی۔ جس کا سلسلہ واسطہ بلا واسطہ قائم رکھنے کی ہدایت فرمائی تا کہ کسی وقت بھی ادارہ عوام اور جمہور سے مستغنی نہ ہو اور عوام کی توجہ کسی آن ادارہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ساتھ ہی تکثیرِ چندہ کی مساعی جاری رکھنے کی بھی تلقین فرمائی، جس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تا کہ جس رفتار سے چندہ بڑھے اسی رفتار سے ادارہ کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوتا چلا جائے اور زیادہ سے زیادہ عوام کا رابطہ اس سے قائم ہوتا رہے۔

چنانچہ اسی اصول کی روشنی میں اس ادارہ کی مجلس شوریٰ کو (جو اس نظم و نسق کی ذمہ دار ہے) وکیل اہل چندہ اور مالیات میں نمائندہ عوام قرار دیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ عوام نہ صرف چندہ بلکہ بواسطہ مجلسِ شوریٰ اس کے مالی مصارف کے نگران اور مجوّز بھی ہیں اور اوّل سے آخر تک ادارہ میں انہی کا عمل دخل ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی انقلاب لانے والی یا حکومت چلانے والی جماعتوں کا بنیادی اصول کیا اس سے مختلف ہے؟ ان کے یہاں آج کے جمہوری دور میں انقلاب لانے کا بنیادی اصول رابطہ عوام کے سوا اور کیا ہے؟ اور اس رابطہ کی صورت آخر اس کے سوا کیا باقی ہے کہ عوام کو مرکز سے وابستہ کر کے ان کی قوت سے کام لیا جائے۔ اور انہی کے حصہ رسد سرمایہ سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو اس نے بھی عوام کو ممبر بنا کر رکنیت کی فیس رکھ

دی کانگریس کمیٹی رونما ہوئی تو اس نے بھی عوام کی ۴۰۰ ممبری سے کام چلایا۔ دوسری سیاسی پارٹیاں ابھریں تو انہوں نے بھی عوامی ممبر سازی اور رکنیت کی فیس رکھ کر ہی عوام سے رابطہ قائم کیا جس سے انقلابی کام آگے بڑھا۔

حضرت والا نے آج سے سو برس پہلے جب کہ رابطہ عوام کا سسٹم عام نگاہوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ عوام کا ادارہ قائم کر کے عوام کو فیس رکنیت کے عنوان کی بجائے عوامی چندہ کے نام پر ادارہ سے وابستہ کیا۔ کیا اسی طریق کار کو بعد کے مبصروں نے مدارس کے بجائے انجمنوں اور کمیٹیوں کی صورت سے نہیں اپنایا، فرق یہ رہا کہ سیاسی انجمنوں کا مقصد کوری سیاست تھی۔ اور اس ادارہ کا مقصد سیاست اور دیانت کا مرکب نصب العین تھا۔ سیاسی کمیٹیوں نے سیاسی عنوان سے کام کیا اور اس ادارہ نے اپنی سیاست کو تعلیمی لائنوں سے آگے بڑھایا۔ جس میں آزادیٔ وطن کے ساتھ آزادیٔ مذہب وملت کی روح بھی قائم کر دی۔

بہر حال اس اولین اصول کی روح اس عوامی چندہ کی جدوجہد سے ملک کے عوام اور غرباء سے زیادہ سے زیادہ رابطہ کرنا تھا۔ تا کہ ادھر تو عوام اس ادارہ کو اپنی چیز سمجھیں اور ادھر اس علمی ادارہ سے وابستگی کے راستہ سے ان میں علمی شعور پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب ہر قوم میں اکثریت عوام اور غرباء ہی کی ہوتی ہے اور وہی قوم کی قوت اور ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ہر اجتماعی کام کا مدار اس رائے عامہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اصول مذکور کی رو سے عوام یا رائے عامہ کو پشت پر لے کر درحقیقت آزادیٔ ملک وملت کی ایک بنیادی قسط حاصل کر لی گئی۔ اور یہ اجتماعیت کی لائن کا پہلا قدم تھا جو اس ادارہ نے جنم لیتے ہی اٹھایا۔

سرکاری اِمداد کا بدل...... 2 اسی کے ساتھ دوسرے اُصول میں قوم کے غریب بچوں یعنی طلبہ کی امداد طعام وغیرہ اور اس کی افزائش وتکثیر ضروری قرار دی تا کہ ان کی دلجمعی اور وابستگی کے واسطہ سے قوم اور ملک کی اس ادارہ سے وابستگی روز بروز بڑھتی رہے گویا پہلا اُصول اگر رابطۂ عوام کا رکھنا مقرر کیا جو پچاس برس بعد کے انقلاب اور جمہوری حکمرانیوں کی اساس بننے والا تھا۔ تو دوسرے اُصول میں عوام کو خود بھی ادارہ کی طرف بڑھنے کا موقع دیا۔ تا کہ اس دوطرفہ رابطہ سے اتحاد باہمی کی بنیادیں مضبوط تر ہوتی رہیں۔

گو اس دور کے سرکاری لائنوں کے افراد کی طرف اس عوامی چندہ کی تحصیل ووصول اور غریب طلبہ کی امداد کو بھیک مانگنے اور بھک منگے تیار کرنے سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کے لئے چندہ کے ادارہ کا قیام ایک نئی چیز تھی۔ اور سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ دارالعلوم ہی تھا جو ۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۶۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن حضرت والا اپنے نورِ فراست سے محسوس کر چکے تھے کہ سرکاری ایڈ کے ساتھ قومی روح کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اور اس سرکاری امداد کا بدل بجز قومی چندہ کے دوسرا فاصلہ نہیں اس لئے ان مطاعن کی پرواہ کئے بغیر آپ نے انگریزی سرکار کے علی الرّغم اُدارہ کو اس لائن سے آگے بڑھایا مگر زمانہ کی رفتار نے بہت جلد اس رابطہ عوام کی ضرورت واہمیت سمجھا دی۔ اور بھیک مانگنے اور بھک منگے بنانے کا سسٹم بالآخر ہر قوم پرور کو اختیار کرنا پڑا۔ اس لئے

کہا جا سکتا ہے کہ اس بارہ میں دارالعلوم نے ملک کی قیادت کی اور قومی اداروں کے قیام کی لائن سے حریت طلبی کا یہ اولین اصول عملی طور پر دنیا کے سامنے لا رکھا۔

تالیفِ خواص...... 3 رابطہ عوام کے ساتھ اجتماعی لائنوں میں علاقہ خواص بھی ناگزیر تھا۔ تو حضرت والا نے تیسرا اصول تالیفِ خواص کا رکھا۔ جس کی رو سے اس ادارہ کو شخصیاتی یا انفرادی رکھنے کی بجائے شورائی قرار دیا۔ تاکہ اس کے کام شخصی ہونے کے بجائے جماعتی رنگ سے انجام پائیں، کیونکہ شخصیتوں پر مبنی کام شخصیتوں کے اٹھ جانے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن جماعتی کام افراد کے اٹھتے رہنے کے باوجود بقا پذیر رہتا ہے۔ ساتھ ہی ان مخصوص افراد کے رد و قبول کا معیار بھی کھول دیا کہ شورائی ارکان مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ صداقت و ایثار لئے ہوئے ہوں۔ اجتماعیت کا مذاق رکھتے ہوں۔ بات کی پچ اور سخن پروری کی خو نہ ہو کہ اگر کسی کی شخصی رائے نہ چلے تو اس میں واک آوٹ کا جذبہ اُبھر آئے بلکہ حق پسندی کا جذبہ رکھتے ہوں، کہ اپنی رائے کے اظہار میں بھی حق نظر آئے تو گردن جھکا دیں۔

پس آزادی ضمیر تو ایسی ہو کہ اپنی سچی رائے کے اظہار میں جھجھک محسوس نہ کریں۔ اور حق پسندی یہ ہو کہ دوسرے کی رائے سمجھ میں آ جانے کے بعد مان لینے میں تامل تک نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس آزادی ضمیر کے ساتھ آزادانہ دستوری فرائض ادا کرنے والوں سے آزاد فضا پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی آزاد فضا میں تعلیم بھی ہوگی تو آزاد نظم و نسق بھی ہوگا تو آزاد۔ اور اس سے تربیت پا کر نکلنے والے بھی ہوں گے تو آزاد ضمیر، جو آزاد ہی ماحول پیدا کر دینے کی صلاحیتیں رکھتے ہوں گے۔

پس اس اصول سے حضرت والا نے ذہنی آزادی کی بنیاد ڈال دی جو خارجی آزادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور اس طرح گویا آزادی کی ایک اور قسط حاصل ہوگئی۔ پھر اس تالیفِ خواص کا دائرہ بھی محدود یا تنگ نہیں رکھا بلکہ رائے اور مشورہ کا دروازہ ہر وارد و صادر، ہر ذی عقل اور فہیم آدمی کے لئے کھلا رکھا جو اس قسم کے تعلیمی اداروں اور ان کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہو۔ گویا علاقہ خواص میں رابطہ عوام کو فکری حد تک بھی نہیں چھوڑا گیا، تاکہ ادارہ چند مخصوص اہل الرائے کی آراء میں محدود ہو کر ملک کے عام ذی رائے اور زیرک طبقہ کی فکری اعانتوں سے محروم اور منقطع نہ ہو جائے جو انجام کار کاموں کے نقصان اور جماعتی نظم میں ضعف و اختلال کا سبب ہوتا ہے۔ اور بالآخر نظم میں محدودیت و استبداد پیدا ہو کر جماعتی تعصب اور گروہ بندی کے جراثیم رونما ہو جاتے ہیں جو آزادی کے حق میں سنگ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ پس اس اصول سے راہ آزادی کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا گیا جو اصول آزادی کی ایک اہم قسط ہے۔

اِتحادِ مشرب...... 4 مرکز میں مربیوں کا کارکنوں کا اتحاد مشروب لازمی قرار دیا تاکہ اتحاد خیال سے جماعت کا نظم متحد اور مستحکم رہے ورنہ درصورت اختلاف مشرب تقابل باہمی پھر اس سے خود بینی و خودستائی اور اس سے دوسروں کی توہین و آزار رسانی کے جراثیم ابھر کر جماعتی نظم اور داخلی دلجمعی اور جماؤ کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں، انتظامات کی پارٹی فلینگ شروع ہو جاتی ہے جو انجام کار غلامی کی جڑوں کو زیادہ مستحکم کر دیتی ہے جو ایک آزادی پسند اور

حریت طلب جماعت کے لئے سم قاتل ہے۔اس لئے حضرت والا نے اس غلامی شکن اصول سے آزادی کا ایک اور مانع مرتفع فرما دیا یا جماعتی آزادی کے پروگرام کی ایک اور اہم قسط حاصل کر لی۔ جس سے آزادی کی منزل قریب اور یقینی ہو جاتی ہے۔

ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی اِستعداد...... 5 تجویز نصاب، مقدارِ خواندگی اور اندازِ تعلیم کو اس اصول کی رو سے نہ تو شخصی محض رکھا جس میں وسعت نہ ہو اور نہ عامتہ الناس کے عامیانہ آراء و قیاسیات کے تابع کیا جو عقلی تقاضوں اور مقتضیاتِ وقت سے معرّٰی ہو۔ بلکہ مشورۂ خاص اور انہی اہلِ علم اور اہلِ تجربہ کی رائے پر مبنی رکھا جو مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے آزار نہ ہوں تا کہ تعلیم آزاد بھی رہے اور اس میں عامۂ مسلمین کے حالات اور وقت کے تقاضوں کی رعایت بھی ملحوظ نظر رہے، ظاہر ہے کہ ایسی آزاد مگر مطابق حالات و مقتضیاتِ تعلیم سے دل و دماغ بھی آزاد مگر پابند حدود ہی پیدا ہو سکتے تھے جو اور ایسے ہی معتدل افراد سے ایک ایسے درمیانی قسم کے انقلاب کی توقع باندھی جا سکتی تھی ملک کی ساری قوموں کے لئے قابلِ قبول اور اپنے اپنے دائرہ میں نفع بخش ہو۔ جو نہ بے قید قسم کے انسانوں سے ممکن تھا، نہ غلامی پسند اور محدود الخیال افراد سے متوقع تھا۔

پس اس پانچویں اصول سے عمومی آزادی اور ہمہ گیر انقلاب کی ذہنی استعداد پیدا کر دی گئی جس سے آزادی کی منزل قریب سے قریب تر لائی گئی۔ یہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہے کہ ہر انقلاب پسند ادارہ اپنے مطلوبہ رنگ کے انقلاب کے مطابق ہی کانسٹی ٹیوشن بنا کر افراد تیار کرتا ہے۔ تنگ دل طبقہ تنگ دلانہ لٹریچر دماغوں میں ٹھونستا ہے۔ اور متعصب آمیز کورس سے دل و دماغ کو تنگ نظر بناتا ہے۔ انجام کار جو طبقہ بھی انقلاب میں غالب آجاتا ہے، انقلاب و تعمیر میں تعصب و تنگ دلی کے مظاہرے ہونے لگتے ہیں اور فرقہ پرستی کے۔ اس لئے حضرت والاؒ نے نصاب کو کوری آزادی و بے باکی اور خالص بستگی و غلامی دونوں ذہنیتوں سے الگ رکھ کر درمیان میں رکھا جو دل و دماغ میں ہر طبقہ کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کر سکے کہ اسی سے درمیانی قسم کا انقلاب پیدا ہو سکتا تھا۔

روحانیت و اخلاق کے ذریعہ سے آزادی کی منزل...... 6 عطیات اور چندوں کے سلسلہ میں اُمراء پر نظر اور ان کے وعدوں یا جاگیروں یا کارخانہ ہائے تجارت وغیرہ کے مستقل ذرائع آمدنی پر بھروسہ رکھنے سے اس چھٹے اصول میں کافی طور پر ڈرایا گیا ہے، تا کہ مرعوبیت اور اسیری دل و دماغ کے جراثیم پرورش نہ پا سکیں اور اداروں یا خود غرض سرمایہ داروں کی نفسانی اغراض کی آمیزش سے پاک رہے، جو ذہنی ہی نہیں خارجی آزادی کے حق میں بھی زبردست رکاوٹ ہیں۔

کیا آج کے دور میں سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کے ختم کرنے کے دعوؤں سے فضاء عالم گونج نہیں رہی ہے؟ اور کیا ہر انقلابی پارٹی سرمایہ داروں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش میں لگی ہوئی نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتی ہے کہ مطلوبہ انقلاب میں بھی سرمایہ دار پارٹی اپنے سرمایہ اور عیش پسندانہ وسائل کی حفاظت کی خاطر انقلاب میں حارج

ہوتی ہے۔ حضرت والاؒ نے اسے اس وقت محسوس کیا جب مزدور اور سرمایہ دار کا کوئی رسمی سوال دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر پیدا ہونے والا تھا۔ حضرت والاؒ اپنے نورِ فراست اور اپنے مذہب کے اصول کی روشنی میں دیکھ رہے تھے کہ انقلاب لانا کبھی سرمایہ داروں کا کام نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ جفاکش مزدور قسم ہی کے لوگ اس میدان میں آگے آئے ہیں اور اب بھی وہی آگے آئیں گے، اس لئے آپ نے اپنے غریب اور متوکل طبقہ کو جس کو اس ادارہ میں تیار کرنا چاہتے تھے، سرمایہ دار طبقہ سے بے نیاز بنا کر الگ کر دیا تا کہ ادھر تو یہ غریب طبقہ اس بیماری سے محفوظ اور ادھر وہ روگ زدہ طبقہ بھی کسی حد تک شفا پا جائے، کیونکہ ایک صورت تو اسے بدکا کر اور اس سے رقیبانہ تقابل ڈال کر اسے ختم کرانے کی تھی اور ایک صورت اس سے مستغنی بن کر اسے مفلوج کر دینے کی تھی جس سے وہ خود ہی اپنے روگ کو پہچان کر اسے زائل کرنے کی فکر میں لگ جائے۔

پہلی صورت میں کامیابی موہوم اور فساد یقینی تھا۔ اور دوسری صورت میں کامیابی یقینی اور امن واصلاح کے ساتھ، نیز پہلی صورت میں شور وشر اور ڈھونگ زیادہ ہے اور عمل کم۔ اور دوسری صورت میں اس کے برعکس کام اور کار برآری زیادہ ہے۔ اور دعوؤں کا شور کم۔ نیز پہلی صورت میں سرمایہ داروں کو چونکانا اور مقابلہ کی دعوت دینا ہے۔ اور دوسری صورت میں اسے ایک طرف چھوڑ کر خاموشی سے اس کی راہیں مسدود کر دینا ہے۔ حضرت والاؒ نے اس اصول میں دوسری صورت اختیار فرمائی جو امن وسلامتی کے ساتھ سرمایہ داری کا جنازہ سامنے لے آتی ہے کیونکہ اس میں استغنائی رنگ سے سرمایہ داری کے جذبات کی حقارت دل میں اُتاری گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ استغناء سے سرمایہ داری کو مٹانے والا خود سرمایہ دار بننے کی کبھی آرزو نہیں کر سکتا۔ لیکن سرمایہ کی محبت سے سرمایہ داری کو مٹانے کا خواہش مند درحقیقت سرمایہ کا خواہش مند ہے جو اپنے رقیب کو راستہ سے ہٹا کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے جس سے سرمایہ دار تو مٹ سکتا ہے مگر سرمایہ داری نہیں مٹ سکتی، ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت (جو غیر سرمایہ دار غرباء ہی کی ہوتی ہے) سرمایہ داری سے بے نیاز ہوگئی تو قوم کی اکثریت سے سرمایہ دارانہ جذبات ختم ہوگئے۔ اور غنی کے آگے محتاج خود ہی جھک جاتا ہے۔

اس لئے حضرت والاؒ نے ادارہ کی آمدنی تعمیر اور دوسرے کاموں میں ایک گونہ بے سروسامانی توکل اور اِستغناء کا اصول رکھ کر ادارہ کو غریبانہ اور متوکلانہ انداز میں چلانا چاہا ہے تا کہ کارکنوں میں تو سرمایہ اور سرمایہ کا غرور پیدا نہ ہونے پائے اور جن کو یہ روگ لگا ہوا ہے وہ ادھر جھک جائیں جس سے ان کے غرور میں کمی آ جائے اور اس طرح یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔ اور ان میں رقابتوں کے جوش سے باہمی نزاعات نہ پیدا ہوں جس سے اولاً ذہنی آزادی اور ضمیر کی حریت ختم ہو جائے۔ اور پھر خارجی آزادی کے امکانات بعید سے بعید ہو جائیں۔ پس حضرت والاؒ نے اس اصول کے ذریعہ حصول آزادی کی ایک اور منزل قریب کر دی۔ مگر مادیت کے راستہ سے نہیں بلکہ روحانیت واخلاق کے راستہ سے۔

سرکاری امداد سے اِحتراز کی حکمت...... 7 ادارہ کے لئے گورنمنٹ کی امداد کو مضر بتلا کر اس سے بچتے رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اور اس طرح ادارہ کو سرکار کی مداخلت سے بچا کر تعلیمی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے، جو حقیقی آزادی کی اصلی منزل ہے کیونکہ اقتصادی غلامی ہی بالاخر سیاسی اور انتظامی غلامی پر منتج ہوتی ہے۔ اس لئے اس ساتویں اصول سے اقتصادی آزادی حاصل کی گئی ہے۔

کیا اسی کو ترک موالات نہیں کہتے؟ جس کو سیاسی پارٹیاں مختلف اندازوں سے استعمال کرتی ہیں ۱۹۲۰ء میں بسلسلہ تحریک خلافت اور پھر بسلسلہ تحریک آزادی وطن کھدر پوشی کو رواج دے کر بدیشی کپڑے کا نکاس بند نہیں کیا گیا۔ جس سے مانچسٹر وغیرہ کے کارخانے کافی متاثر ہوئے۔ نیز دیسی صنعتوں کو رواج دے کر بدیشی کپڑے سامانوں کا عملاً بائیکاٹ نہیں کیا گیا؟ اور کیا آج بھی ملکی اور قومی حکومتیں غیر ملکی سامانوں کی درآمد پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر کے ان کا نکاس نہیں روک رہی ہیں؟ تا کہ خود اپنے ملک کی تجارت وصنعت ترقی پائے اور ملک ہر سامان میں غیر ملکوں کا اقتصادی محتاج وغلام رہنے کے بجائے خود کفیل ہو جائے کہ اس کے بغیر ملک کی اپنی بنیادیں مستحکم نہیں ہوتیں، ٹھیک اسی طرح اس اصول کی رو سے اس اجنبی حکومت کی درآمد بند رکھی گئی جو ملک کی آزادی کی پامال کنندہ تھی تا کہ یہ قومی رنگ کے سرمایہ کا دست نگر بن کر اقتصادی غلامی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ جس سے وہ ہمیشہ سرکاری مداخلتوں کا نشانہ بنا رہا ہے، بہر حال جو مالی عدم تعاون کھدر پوشی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں مضمر تھا وہی اس سرکاری ایڈ سے احتراز اور قومی سرمایہ میں محدود رہنے میں مخفی تھا۔ صرف صورت اور مالی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ اس لئے حضرت والا کی دور بین آنکھ سو سال پہلے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو دوسروں کی آنکھوں نے بہت بعد میں دیکھا اور پھر بھی پورا نہیں دیکھا۔

سرمایہ داری پر ضرب کاری...... 8 اس آٹھویں اُصول میں کارکنان اِدارہ کو غریب منش رہنے اور سرمایہ دار بننے سے روکا گیا ہے۔ جیسا کہ چھٹے اُصول میں سرمایہ داری کے خاتمہ کی تدبیر بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ اس دفع کا حاصل یہ ہے کہ ادارہ کے سلسلہ میں غرباء کے تعاون اور موالات کو اصل رکھا جائے اور انہیں کے انداز پر غریبانہ انداز میں کام چلایا جائے کہ ادارہ کے لئے یہی پائیداری اور پختگی کا سامان ہے۔ گویا اس دفع کا مفاد تعلیمی لائن سے غیر سرمایہ داروں کی ایک مستقل برداری کا قیام ہے مگر غیر رسمی طور پر بلا انداز تقابل ورقابت جو ظاہر ہے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں اقلیت ہی میں رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ان سے بعد اور تنفر کی ہوتی ہے کہ وہ اکثریت کو ضرورت کی حد تک بھی سرمایہ سے محروم کئے رہتے ہیں۔ اس کا ثمرہ یہ نکل سکتا ہے کہ جب اکثریت اپنے کمال قناعت وتوکل سے سرمایہ داروں سے مستغنی ہو جائے تو قدرتاً سرمایہ دار اس کے محتاج ہو جائیں گے اور بشوق ورغبت اپنا سرمایہ ایسے انسانوں اور کاموں پر نثار کرنے کے آرزومند ہو جائیں گے جس سے سرمایہ داروں کا سرمایہ خود بخود باہر آ جائے اور غیر سرمایہ داروں کے حقوق قدرتی طور پر وصول ہوتے رہیں۔ اس طرح یہ دفعہ سرمایہ داری کے سر پر ایک ضرب کاری ہے مگر

موافقت اور مدارات کے پیرایہ میں جس سے ان دو طبقوں میں منافرت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ آزادی کی راہ کی دراڑ بنے۔ اس لئے اس دفعہ سے بھی اقتصادی آزادی کا ایک اہم مورچہ فتح ہو جاتا ہے۔

تنظیم مدارس آزادی کی خشتِ اوّل...... 9 یہ حضرتؒ کے آٹھ حکیمانہ اُصول کی تشریح تھی لیکن غور کیا جائے تو ایک نواں اُصول ان کے عنوان سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ تنظیم مدارس کا اصول ہے کیونکہ عنوان بالا میں دارالعلوم اور دوسرے مدارس چندہ کو ان ہی اصول ہشت گاہ کے نیچے جمع کر کے انہیں ایک دوسرے کا شریک ٹھہرایا گیا ہے جو رابطہ مدارس کی ایک معقول اور موثر صورت ہے اور ظاہر ہے کہ مدارس کا رابطہ مدارس کے فضلاء کا قدرتی رابطہ ہے اس لئے اس اصول میں تنظیم مدارس کے راستہ سے علمی فضلا اور ان کے حلقہ ارادت کی تنظیم کر دی گئی ہے۔ جو انقلاب اور آزادی کے لئے خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

پھر حضرت والاؒ نے صرف نظری ہی طور پر یہ اصول نہیں بتلا دیا بلکہ عملی طور پر ان ہی اصول ہشت گانہ کی روشنی میں بہت سے مدارس خود قائم فرمائے اور بہت سے مدارس اپنے متوسلین کے ذریعہ قائم کرائے۔ گویا ۵۷ء کے بعد آپ کی مستقل سیاست ہی یہ تھی کہ جگہ جگہ آزاد قومی مدارس قائم کئے جائیں اور ان میں آزاد ضمیر نوجوان تیار کئے جائیں۔ اگر لارڈ میکالے یہ دعویٰ لے کر اٹھے کہ: ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔ تو ان مدارس سے عملی طور پر یہ صدا بلند ہو کہ: ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور ہندوستانی ہوں''۔

چنانچہ ایسے ہی نوجوان تیار کرنے کے لئے اگر دیوبند میں دارالعلوم قائم فرمایا۔ تو مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا، سنبھل میں مدرسہ عربیہ الگ قائم کیا امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد قائم فرمایا۔ گلاوٹھی میں مدرسہ قائم فرمایا۔ انبہٹہ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسہ قائم فرمایا۔ غرض جہاں جہاں حضرت والاؒ خود پہنچے وہاں خود اور جہاں ان کے خدام اور متوسلین پہنچے وہاں ان کے واسطے سے بتاکید تمام آزاد مدرسے قائم فرمائے جس سے اطراف میں بکثرت مدارس قائم ہوئے پھر ان مدارس کے نقش قدم پر اور سینکڑوں مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں، جس سے آپ صرف بانی دارالعلوم دیوبند ہی ثابت نہیں ہوتے بلکہ اس نوعیت خاص کے لحاظ سے بانی مدارس ثابت ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان مدارس کو ان ہی اصولِ ہشت گانہ سے وابستہ کر کے جن کی صراحت عنوان بالا میں ہے ان مدارس کی روحانی تنظیم بھی فرمائی جس سے ان کے پروردہ افراد خود ہی منظم ہو گئے اور ایک تنظیمی مذاق لے کر ابھرے۔

جمعیت علماء کا پس منظر...... چنانچہ آزادی کی تحریکات شروع ہوتے ہی یہ مدارس کی بے شمار جماعتیں رسمی طور پر بھی منظم ہو گئیں۔ اور انہوں نے جمعیت العلماء کے نام سے جنگ آزادی میں حصہ لے کر ملک کی جو شاندار سیاسی خدمات انجام دیں اور جو جو بے نظیر قربانیاں پیش کیں تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ جمعیت العلماء کے افراد پر

شخصی حیثیت سے نکتہ چینی ہر وقت ممکن ہے۔ لیکن اس کے اصول و مقاصد اور اس کے تحت مجموعی حیثیت سے اس تنظیم مدارس کی لائن سے میدان میں نہ آتی تو عوام کا اس طرح جوق در جوق آوازہ آزادی کا خیر مقدم کرنا عادۃً مشکل تھا۔

اس ملک کا مزاج ہی مذہبی ہے اور اس کے لئے مذہبی آواز ہی میں جذب و کشش ہے۔ وہ کوری سیاسی آواز پر گوش برآواز نہیں ہوتا۔ اسی لئے علماء کے میدان میں آنے سے پہلے یہاں کے عوام سے میدان خالی تھا۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی صدا بلند ہوتے ہی عوام سے میدان پٹ پڑے اور یہ ظاہر ہے کہ مذہبی صدا مذہبی حلقوں ہی سے اٹھی جو مدارس کی صورت میں اس وقت منظم تھے جب عوام اس قسم کی رسمی تنظیموں کے تصورات سے خالی تھے۔

ملت کا وقار بازیافت کرنے کے اُصول...... یہ غیر رسمی مگر رسمی سے زیادہ پائیدار تنظیم حضرت والاؒ ہی کے ان اصول ہشت گانہ اور طرزِ عمل سے ہوئی جس میں سیاسی مقاصد کے ساتھ دینی اور مذہبی جذبات بنیاد بنے ہوئے تھے اور جوں ہی اس مدارسی تنظیم کو رسمی انداز میں لایا گیا یعنی جمعیت کے پلیٹ فارم جگہ جگہ کھولے گئے وہیں عوام سے سیاسی میدان بھر گئے اور جوش و خروش کے حیرت ناک منظر سامنے آ گئے جس کی شہادت تحریک خلافت اور پھر تحریک آزادی وطن دے سکتی ہے۔ بہرحال حضرت والاؒ نے ۱۸۵۷ء کی شکست پر میدان شاملی میں مسلمانوں کی ہر جہتی آزادی مٹ جانے کے جو مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کا تیر بہدف علاج آزادی کے انہی بنیادی اصولوں اور ان کی عملی تشکیل سے ہو سکتا تھا جو بِناءِ مدارس اور تعلیمی نظام کی لائن سے بروئے کار لائی گئی۔

سوانح مخطوطہ ① عبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف آج ہی اس نظام کے نتائج کا مشاہدہ کرنے والے اس کے قائل اور اس سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس ابتدائی دور کے لوگ بھی حتیٰ کہ مخالفین تک بھی اس وقت جب کہ یہ نظام ایک مخالف ماحول میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اس کے اعتراف پر مجبور تھے کہ ملت کے گئے ہوئے وقار کی بازیابی کے لئے ان اصول سے بہتر تیر بہدف نسخہ دوسرا نہیں ہو سکتا جن کے سامنے دلی کی ویرانی اور اس کے مرکزی حیثیت کے تباہ ہو جانے سے پورے ملک کے حال و مال کی تباہی عیاں تھی، صاحب سوانح مخطوطہ نظام مدرسہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اور جو فوائد معاش و معاد کے مسلمانوں کو اس سے (ان اساسی اصول کے نظام تعلیم سے) حاصل ہوئے اور ہوں گے وہ مثل آفتاب کے روشن ہیں یہاں تک کہ مخالفین بھی مانتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لئے اور غیر قوموں پر غالب ہونے کے لئے (جنہوں نے انہیں مغلوب کیا) اس سے بہتر اور

① سوانح مخطوطہ کے مولف جناب حاجی فضل حق صاحب مرحوم ہیں جو دارالعلوم کے اولین طبقہ میں ممبر کی حیثیت سے مجلس کے رکن رہے پھر ایک زمانہ تک دارالعلوم کے مہتمم بھی رہے۔ ممدوح دیوبند کے باشندہ اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے معتقدین خاص میں سے تھے۔ آپ نے حضرت والا کی سوانح مرتب کی جو زمانہ کی دست برد سے ضائع ہو گئی۔ اس کے کچھ بچے کھچے اور پھٹے ہوئے اوراق پرانے کاغذات میں دستیاب ہوئے جن سے کافی معلومات بہم پہنچیں اور سوانح قاسمی میں ان سے کافی مدد ملی۔ اس مضمون میں جہاں سوانح مخطوطہ کا لفظ آئے اس سے یہی سوانح قاسمی مراد ہوگی۔

مجرب نسخہ کوئی نہیں''۔ گویا اس دور میں بھی جبکہ حکومت حاکمانہ رنگ سے چلتی اور ملتی تھی محض حکیمانہ رنگ سے انقلاب لانے کے ڈھنگوں سے دنیا ناواقف تھی، ان اصولوں کی معنویت اور نتیجہ خیزی کو تسلیم کی جا چکا تھا اور مخالفین تک کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ آج اجتماعی مساعی کے سلسلہ میں نصف صدی کے پیہم تجربات کے بعد ملک جن اصول تک پہنچا ہے اور جن پر چل کر اس نے بدیشی غلامی سے نجات پائی۔ وہ سرموان اصول سے متجاوز نہیں ہیں جو حضرت والاؒ تقریباً ایک صدی پیشتر ۱۸۵۷ء کے بعد اجراء مدرسہ کے وقت اپنے قلم سے لکھ چکے تھے۔ اور عین اس وقت جبکہ ملک اور قوم کے بارسوخ افراد و طبقات اپنی زندگی حکومت متسلطہ کے رحم و کرم پر ڈال دینے اور اس کی حمایت و وفاداری ہی کو سب سے بڑی ترقی اور معراج کمال سمجھے ہوئے تھے اور اس میں سرگرم عمل تھے۔

عوامی قوّت کا پرداز ...... پھر حضرت والاؒ نے ان اُصول پر اس وقت اس ادارہ (دارالعلوم) کی بنیاد رکھی جبکہ ملک کے بارسوخ طبقات، بہت سے معاشرتی اور معاشی اداروں کی بنیاد نہ صرف منشاء حکومت کی تکمیل اس کی پوری پوری وفاداری اور اشتراک عمل کے اصول ہی پر رکھ رہے تھے بلکہ ان بنیادوں میں ان مجاہدو سربکف علماء و مفکرین کے ساتھ تحقیر و تمسخر کا برتاؤ اور عوام کو ان سے نفرت دلانے کا جذبہ بھی پیوست کیا جا رہا تھا۔

گویا ''اینٹی مُلّا ازم'' کا پروانہ بھی ساتھ ہی ساتھ ڈالا جا رہا تھا لیکن حضرت والا کے ان اساسی اصول پر قائم شدہ نظام میں جہاں بدیشی اقتدار کی شکست وریخت کے نتائج مخفی تھے وہیں ان میں اس تحقیر و تمسخر کے اکھاڑ پھینکنے کی قوت بھی مضمر تھی کیونکہ ان اصول کا حاصل رابطۂ حکومت نہ تھا بلکہ رابطۂ عوام کا استحکام تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد متسلط اقتدار کے خلاف مشینی قوت کی بجائے عوامی قوت ہی موثر ثابت ہوسکتی جسے حضرت والاؒ نے پرکھ لیا تھا۔ جس کو اس زمانہ ہی میں مخالفین تک بھی مان چکے تھے اور جب کہ یہ عوامی قوت براہ راست انہیں علماء کے ہاتھ میں تھی اور رہے ہے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ عوامی قوت کی بیداری کے وقت ہر طبقہ ان لوگوں کی طرف نہ جھکتا جو اس عوامی قوت پر قابض اور جائز طریق پر استعمال کرنے کے ڈھنگ سے واقف تھے۔

نتیجہ یہ ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا کہ جن علماء کو نکما اور بیکار یا قوم پر ناحق بار باور کرایا جا رہا تھا جونہی عوامی تحریکات شروع ہوئیں یا عوام کی قوت سے حکومت متسلطہ کے اقتدار کے خلاف عصبیاتی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو وہی ''اینٹی مُلّا ازم'' والے طبقات ملاؤں کی طرف جھکنے پر مجبور نظر آنے لگے۔ اور اسٹیجوں پر وہی تمسخر و نفرت اظہار عقیدت و نیاز میں تبدیل ہونے لگے۔

یہی علماء جو ۱۸۵۷ء کے بعد ان اصول کے زیر سایہ مدارس کی خلوت گاہوں میں برائے چندے خاموش بیٹھ گئے تھے وہ بالآخر اسٹیجوں کی جلوت گاہوں میں اس شان سے اچانک نمایاں ہوئے کہ چاروناچار ان کے کارآمد ہونے کو تسلیم کرلیا گیا اور پھر عوامی تحریکات اکثر و بیشتر انہی کی قوت کے ہاتھوں چلیں اور آگے بڑھیں۔

عدم تشدد کے راستہ سے انقلاب کا ذہنی خاکہ..... ان اصول کے زیر اثر تربیت پانے والے علماء بالآخر

آزادی ملک کا جھنڈا لے کر سب سے پہلے سامنے آئے اور جو کام شاملی کے میدان میں تلواروں سے پورا نہ ہوسکا تھا وہ امن کی زبان وقلم سے پورا ہوگیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس اول دارالعلوم دیو بند نے جو مسجد چھتہ کے عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر تھے حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس خلجان کے ذکر پر کہ ''اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں جیسی مدبر اور قوی قوم کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ان کے پنجے ایسے جم گئے ہیں کہ اب وطن کا استخلاص بظاہر ممکن نظر نہیں آتا''۔ ارشاد فرمایا: ''حاجی صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔ لوگ سوئیں گے انگریزوں کی حکومت میں اور صبح کو جاگیں گے دوسری حکومت میں''۔

یعنی تشدد اور تلوار کے راستہ سے نہیں جو حکومتوں کے لوٹنے کا متعارف اور واحد طریقہ سمجھا جاتا ہے بلکہ امن اور عدم تشدد کے راستہ سے یہ لوٹ پوٹ عمل میں آئے گی جس سے واضح ہے کہ یہ بزرگ ۵۷ء کے بعد ہی سے عدم تشدد کی راہ سے انقلاب کا خاکہ ذہنوں میں لئے ہوئے تھے اور حضرت نانوتویؒ نے اس خاکہ کو ان اصول ہشتگانہ کی دفعات کے تعلیمی رنگ سے بھر دیا۔ جس کو اس وقت کے ماحول میں اپنے سمجھے ہوئے تھے اور بقول صاحب سوانح مخطوطہ مخالف بھی معقول اور موثر تسلیم کر چکے تھے۔

یورپ کے مشاہدات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی قدر و قیمت...... اس مختصر مضمون کی حد تک میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ ملک کی آزادی میں ان علمائے آخرت کا کتنا اور کیا حصہ تھا؟ اسے پوری بالغ نظری کیساتھ مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ناظم جمعیت علماء ہند نے اپنی مشہور تصنیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' میں تاریخی حوالوں سے کھول دیا ہے۔ نیز دوسرے اہل قلم بھی اس موضوع پر کافی تحریری سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ملک کے استخلاص اور آزادی کا یہ نیا نقشہ انہی مجاہدین شاملی نے بنایا اور ۵۷ء کے بعد ان کے پیشرو حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ تھے جن میں یہ جوش امتیازی شان سے ابھرا ہوا تھا اور انہوں نے اپنے اس جوش کو ہوش کی شکل دے کر آئینی رنگ سے ان اصول ہشت گانہ کے اساسی نظام میں بھر دیا تھا۔ جو اس اقامتی تربیت گاہ ''دارالعلوم دیو بند'' کے لئے آپ نے وضع فرمائے۔ دارالعلوم کے ان فضلاء کے ذریعہ جنہوں نے ان اصول کے زیر سایہ تربیت پائی یہ رنگ ملک میں پھیلنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ملک کے ایک بڑے طبقہ کا جو عوام پر اثر رکھتا تھا ذہن ہی یہ بن گیا اور عوامی رابطہ کی وہ عمومیت یا جمہوریت جو ان اصول میں پنہاں تھی ان تربیت یافتوں کے راستہ سے سو برس پہلے کی ہنڈیا کا ابال چھلکا تو چولہے کے گرد و پیش چاروں ہی سمتوں کو تر کر کے رہا۔

مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی فرمایا کرتے تھے جس کو احقر نے خود بلا واسطہ سنا کہ ''میں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول کی قدر و قیمت یورپ جا کر سمجھی، بالخصوص یورپ و ایشیا کے متعدد انقلابات کی بنیادوں کو میں صرف انہی اصول کی روشنی میں پا سکا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں ان اصول کی شرح لکھنے بیٹھ جاؤں تو دو ضخیم جلدیں تیار کر دوں گا''۔

رئیس الاحرار کا غایتِ تأثر...... رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۲۴ء میں جب بسلسلۂ تحریک خلافت دیوبند تشریف لائے اور احقر ہی کے مکان پر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تو حضرت کے ان اصولِ ہشت گانہ کو دیکھ کر جو دار العلوم کا سنگ بنیاد ہیں رو پڑے۔ اور غایت تأثر سے بیساختہ فرمایا کہ ''یہ اصول تو الہامی معلوم ہوتے ہیں ان کا عقل محض سے کیا واسطہ''؟ چنانچہ ان اصول کی دفعات میں نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے قلم سے بھی باوجود ذوق اخفاء کے جگہ جگہ یہ الفاظ نکل نکل گئے ہیں کہ ''یوں معلوم ہوتا ہے'' اور ''یوں نظر آتا ہے'' اور ''ایسا ہو جائے گا'' وغیرہ جو ان اصول کے الہامی ہونے کی گویا خود صاحب اصول کی طرف سے بھی شہادت ہے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو...... بہر حال ان اُصول کی روشنی میں جو کچھ ہوا اس پر ۱۹۴۷ء شاہد ہے۔ اور اس انقلاب ۱۹۴۷ء کے اولین ہیرو قدرتا وہی سمجھے جا سکتے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں بھی اسی اسٹیج پر تھے۔ جس پر آزادی خواہ، طبقے بعد میں آئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے اساسی اصول وعمل کی راہ سے اسی اسٹیج پر رہے۔

بہر حال حضرت نانوتویؒ نے اگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے یہ دار العلوم قائم کیا تھا۔ جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ اس بارہ میں معروف ہے اور رسالہ دار العلوم میں شائع ہو چکا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اس ادارہ اور اس کے اصول تربیت نے یہ تلافی کر دکھائی اور زیادہ نہیں صرف نوے سال کی مدت میں جو ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک فرد کی عمر ہوتی ہے ایک عظیم ترین طاقت کو جو ۱۸۵۷ء میں ایک ملک کے جائز حقدار کو پامال کر چکی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں مسکینانہ، ضعف اور مظلومانہ فروتنی سے نیچا دکھایا۔ صف کی طرح ہندوستان لوٹ گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں لوگ سوئے انگریزوں کی حکومت میں صبح کو جاگے قومی حکومت میں اور اسی طرح ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی گئی۔ گو متسلطہ طاقت نے جاتے جاتے بھی آزادی کے نقشہ کو بگاڑ دینے کے کافی سامان فراہم کر دیئے جن کا بگاڑ کافی نمایاں ہوا۔ اور ابھی تک ہے لیکن جن اصول کی صداقت نے اصل نصب العین کو رونما کیا تھا انہیں اصول کی صداقت اس بگاڑ کے دفعیہ کی بھی کفیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ان اصول پر اسی سابقہ رنگ سے عمل کیا جائے۔

پھر اصول ہی نہیں مدرسہ کے عملی پروگرام کی تشکیل میں بھی حضرت والاؒ نے وہی تلافی والا نصب العین پیش نظر رکھا۔ آپ نے ایک طرف فن سپہ گری کی مشق کا شعبہ طلبہ کے لئے بہ تقاضائے وقت ضروری سمجھا۔ جس سے طلبہ میں جہاد کی قوت قائم رہے۔ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ پائیدار ہوتا رہے۔ اس میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ یہ مدرسہ عربیہ کیا ہوا۔ مدرسہ حربیہ ہو گیا تو حضرت والاؒ نے بقول صاحب سوانح مخطوطہ اس پر مبسوط تقریر فرمائی اور عصری اور شرعی تقاضوں کو جواب میں پیش کیا۔

عدالت شرعیہ کا قیام...... دوسری طرف قومی محکمہ قضا قائم فرمایا تا کہ متعلقین مدرسہ اپنے متعلقین اور حلقہ اثر میں عدل وقسط اور انصاف پسندی قائم رکھنے کے ساتھ ان میں اپنے باہمی جھگڑوں کو خود نمٹانے اور شرعی اصول کو ہر معاملہ

میں حکم بنانے کا سلیقہ اور جذبہ ابھرا رہے چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس تحریری معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے جس میں اہل دیو بند سے آپ نے مختلف معاشرتی امور کے بارہ میں عہد کرایا۔ ایک دفعہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ ''کوئی مقدمہ جس میں فریقین مسلمان ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے۔ اور اس کے حاکم مولانا محمد قاسمؒ صاحب تھے''۔

چنانچہ سینکڑوں مقدمات جو برسہا برس سے کچہریوں کی دفتری طوالتوں میں الجھے پڑے تھے۔ منٹوں میں فیصل ہونے لگے۔ یہ شرعی کچہری چھتہ کی مسجد میں قائم ہوئی۔ معاملات اور مقدمات کی تعداد جب زیادہ ہونے لگی تو فصل خصومات کا یہ کام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صدر مدرس دار العلوم کے سپرد فرمایا گیا۔ اور انہیں کو مستقل قومی قاضی قرار دیا گیا۔ جب اس سلسلہ کا کام بڑھا تو اسی نسبت سے دیو بند کی سرکاری منصفی کی رونق گھٹنی شروع ہوگئی۔ اور یہی مقصد بھی تھا کہ متسلط قوت کا اثر ورسوخ ہر سمت سے کم اور کمزور ہوتا چلا جائے۔

دار العلوم میں صنعت وحرفت کے شعبہ کا مقصد...... اسی کے ساتھ حضرت والاؒ نے دار العلوم میں صنعت وحرفت کا شعبہ بھی قائم فرمایا جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاکہ ادارہ کے فضلا معاشی ضروریات میں خود کفیل بننا سیکھیں۔

بظاہر یہ مقابلہ تھا اس رد کا کہ اس وقت کی تعلیم کا انتہائی نقطہ نظر ملازمت تھا اور وہ بھی سرکاری جس کا مال اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا تھا کہ اسکولی اور کالجی تعلیم سے لوگ سرکاری ملازمت کرنا سیکھیں اور اس ملازمت سے اپنی غلامی کی جڑوں کو مضبوط بنائیں۔ اس کا رد عمل صحیح معنی میں یہی ہوسکتا تھا کہ لوگ اس غلامی امور تعلیم سے ہٹ کر اس تعلیم میں لگیں جو غناء واستغناء کا جوہر پیدا کرے اور جہاں تک معاش کا تعلق ہے سرکاری ملازمتوں سے الگ رہ کر صنعت وحرفت یا قومی ملازمت سے اپنے گزر بسر کا سامان کریں۔

دار العلوم کے ذریعے ''ہندو مسلم'' کا پرداز...... ایک طرف دار العلوم کے چندوں کا دائرہ اتنا وسیع رکھا گیا کہ ان میں غیر مسلم بھی شریک ہوسکیں۔ چنانچہ دار العلوم کی ابتدائی روداد میں بہت سے ہندوؤں کے چندے بھی لکھے ہوئے ہیں۔ حضرت والاؒ کی تجویز پر یہ بھی تحریک کی گئی کہ ملک کے تمام مطابع اور پریس بلا تفریق مذہب وملت اپنی مطبوعات کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم کو عنایت کریں۔

چنانچہ سب سے پہلے اس صدا پر لبیک کہنے والی شخصیت ایک ہندو کی تھی، اور وہ منشی نول کشور مالک مطبع نول کشور لکھنو تھے جنہوں نے اپنے پریس کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ دار العلوم میں بھیجا۔ جس پر دار العلوم کی جانب سے ان کے حق میں شکریہ ودعا کا ہدیہ پیش کرنے کے لئے دار العلوم کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں حضرت نانوتوی قدس سرہ بھی شریک تھے اور شکریہ کی ایک مستقل تجویز پاس کر کے ان کے پاس بھیجی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس ادارہ کو عوامی نہیں بلکہ ایسا ہمہ گیر ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں غیر اقوام کی ہمدردیاں بھی شامل رہیں۔ گویا ہندو مسلم اتفاق کا پرداز بھی ڈال دیا گیا۔

دار العلوم میں بین الاقوامیت کا عنصر...... بلکہ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت والاؒ اس دار العلومی تحریک کو نہ صرف ملک گیر ہی بنانا چاہتے تھے جس میں اس ملک کی ہر قوم کی ہمدردیاں اس ادارہ اور اس کی تحریک کے لئے حاصل ہوں بلکہ اسے عالمگیر بھی دیکھنا چاہتے تھے اور اس علمی حلقہ کا رشتہ بیرونی ممالک کے مسلمانوں اور ان کی حکومتوں سے بھی جوڑنا چاہتے تھے چنانچہ ترکی کی خلافت جو اس وقت پورے عالم اسلامی پر اثر رکھتی تھی سے انتہائی شد و مد سے اپنے تعلقات کو دینی اور علمی حیثیت سے وابستہ فرمایا۔ سلطان عبد الحمید خان والی ترکی کی جنگ روس سے ہوئی تو حضرت والاؒ نے ترکی کے لئے چندہ شروع کیا اور اپنے گھر کا سارا اثاثہ اپنی اہلیہ محترمہ کا تمام جہیز، کپڑا، زیور برتن سب کچھ ترکوں کی حمایت کے لئے قربان کر دیا۔

تنظیم ملت کا نیا خاکہ......اس سے اندازہ کر لیا جائے کہ اس دار العلوم کی تحریک کا مرکب نصب العین صرف تعلیم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے ضمن میں آزادی پسندی، غلامی شکنی، اسلامی اتحاد، وطنی اتحاد، قومی خود مختاری، حق خود ارادیت، معاشی استغناء، وسائل قوت کی فراہمی، رابطہ عوام، تالیف خواص وغیرہ کے ملے جلے جذبات کارفرما تھے۔ اور دار العلوم کی تاسیس ایک خاص مکتب فکر کی تاسیس تھی جیسا کہ حضرت والاؒ کے اصول ہشت گانہ اور جاری کردہ نظام کار سے واضح ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ کے کارکنوں اور پروردوں میں استغناء کی روح پھونکتے ہوئے انہیں حکومت وقت سے بے پرواہ اور قوم کے غریب افراد اور عوام سے زیادہ سے زیادہ مربوط فرمانے کی راہ ڈال رہے تھے ورنہ تکثیر چندہ اور وہ بھی زیادہ تر غرباء سے پھر افزائش طعام طلبہ کی سعی جو قوم کے غریب بچے ہی ہو سکتے تھے اور ادھر حکومت وقت کی امداد سے کلی استغناء بلکہ ممانعت اور امراء اور جاگیرداروں پر تکیہ کر کے ان کے فخرانہ عطیات سے اعراض کا مطلب آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ کہ حکومت وقت کے علی الرغم رابطہ عوام کو مستحکم اور مضبوط کیا جائے تاکہ ملک کے عوام اس مدرسہ کو اپنی چیز سمجھیں اور اس کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر اپنی عوامی طاقت سے انہیں آگے بڑھائیں ورنہ محض درس و تدریس کی حد تک تنظیم ملت کے اس نئے خاکہ کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟

پھر اگر محض مذہبی تعلیم و تعلم ہی نصب العین کی آخری حد تھی تو مدرسہ میں فن سپہ گری کے شعبہ کے قیام کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی تھی؟ جسے حضرت والاؒ نے اہتمام کے ساتھ خود قائم فرمایا۔ نیز محض مذہبی تعلیم ہی پیش نظر ہوتی تو حضرت والاؒ صنعت و حرفت کا شعبہ اس مدرسہ میں قائم نہ فرماتے؟ جو خالص معاشی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ محض ایک مذہبی مکتب تھا تو حضرت والاؒ شرعی محکمہ قضا قائم فرما کر اعضاء مدرسہ کو اس کا جج مقرر نہ فرماتے جو خالص ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اسی طرح صرف مذہبی تعلیم ہی کا خاکہ مدرسے کے کاروبار کی آخری حد ہوتی تو مدرسہ کے چندہ دہندوں میں غیر مذہب کے لوگوں کے عطیات شامل کئے جانے کا کوئی تصور سامنے نہ آنا چاہئے۔ نہ ہندو مسلمانوں کے بلا تخصیص مذہب و ملت چندے قبول کئے جاتے اور نہ ہندو چندہ دہندگان کی دعا و شکریہ سے

ہمت افزائی کی جاتی۔ پھر اگر کاروبار مدرسہ کی انتہائی غرض محض کتابی درس وتدریس تھی تو حضرت والاؒ اس مدرسہ کے سرپرست اور ہمہ اوست ہوتے ہوئے سلطانی چندہ کی بنیاد ڈال کر اور خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان والی ترکی کی مدح میں قصائد لکھ کر خلافت ترکی سے رشتہ ارتباط قائم کرنے کی صورتیں پیدا نہ فرماتے۔ گویا آپ نہ صرف ملک کی اندرونی اقوام ہی سے رشتہ یگانگت قائم فرمانے کے داعی تھے بلکہ بیرون ملک سے بھی رشتہ اتحاد کا سلسلہ پھیلانا چاہتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مدرسہ محض کتب درسی کی تعلیم کا مدرسہ نہ تھا بلکہ حضرت اسے ایک ملی جلی تحریک کے مرکز کی حیثیت سے قائم فرما رہے تھے جن کے نظام کار میں علم وعمل، معاش ومعاد، قوم ووطن اور دین ومذہب کی حمایت ونصرت کے ملے جلے جذبات ایک دم پیش نظر تھے جو حضرت والاؒ کے وسیع اور ہمہ گیر ذہن سے نکل کر اس مدرسہ کی بنیادوں میں پیوست ہوئے اور اس کے اثرات تعلیمی راہوں سے اس ادارہ کے تربیت یافتہ فضلا متوسلین میں حسب استعداد وقابلیت نفوذ پذیر ہوتے رہے۔

قیام دارالعلوم کا بنیادی محرک!...... بہرحال دارالعلوم کے یہ اساسی اصول اور اس کا نظام کار اس ہمہ گیر حکمت عملی اور وسیع نظام کی غمازی کر رہا ہے جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد شاملی کے میدان سے لیکر آئے اور اس کی ناکامی کی تلافی کے لئے بقول حضرت شیخ الہندؒ یہ مدرسہ قائم فرمایا۔ غور کیا جائے تو یہ اس امانت کی ادائیگی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے حضرت شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ میں اور ان سے بواسطہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ، حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ تک منتقل ہوئی اور حاجی صاحبؒ کے لوگوں میں بالآخر پوری قوت کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے قلب ودماغ کا جوہر بن گئی جنہیں حاجی صاحبؒ نے اپنی زبان اور اپنے مقاصد کا ترجمان فرمایا تھا جیسا کہ اس کی تفصیلات سوانح قاسمی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہجرت کر جانے کے بعد ان کے ترجمان خاص ہی سے ان جذبات کے بقا وترویج اور اظہار واعلان کی توقع ہو سکتی تھی اور وہی ایسے ہمہ گیر ادارہ کے اصول ونظم کا تصور باندھ سکتے تھے۔

اصول آزادی کی امین شخصیت...... بہرحال ان اصول ہشت گانہ کے مرکب نصب العین کی یہی وہ اصولی اور عملی خصوصیات ہیں جن کی مادی اور معنوی شکل کا نام دارالعلوم دیوبند ہے اور جس نے بالآخر ۱۸۵۷ء کی پسپائی کی تلافی کر دکھائی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالآخر دنیا اس کے نصب العین پر آ کر رہی اور آزادی ملک وملت کے لئے جو خاموش راہنمائی اس نے کی وہ اشتہاروں، پوسٹروں، رسالوں اور اخباروں اور عمومی پروپگنڈوں کے شور محشر میں نظر نہیں آتی۔

اس لئے اس یوم آزادی کے موقع پر جب کہ دنیا مختلف اندازوں سے اس کی یاد منا رہی ہے اور مختلف انداز کی یادگاریں قائم کرنے کے مشورے دیئے جا رہے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان اصول کے تذکرہ سے یاد منائیں جن پر چل کر دنیا، آزادی کی منزل پر پہنچی اور اس شخصیت کا ذکر خیر کریں جن کا وسیع اور ہمہ گیر ذہن ان دواعی آزادی کا نہ صرف جذبات بلکہ اصول کے درجہ میں بھی امین تھا اور جو ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو ہو

کر ملک کا ذہن آزادی پسند اور حریت طلب بناتے رہے تا آنکہ آزادی سامنے آ کھڑی ہوئی اور آج ہر ایک کو اس کی خوشی منانے کا موقعہ ملا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

محمد طیب غفرلہ

مدیر دارالعلوم دیوبند (۱۵ اگست ۱۹۵۷ء)

اکابر دیو بند اور آزادی ہند

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِ يْرًا ، وَّدَ اعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . اَمَّـا بَعْــــدُ !

شیریں ثمر کے حصول پر تبریک...... بزرگانِ ملت! علمائے کرام اور عزیز طلبائے دار العلوم! یہ آج کا مبارک [1] دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود اس سلطنت کے ایک مغرور اور متکبر نمائندہ گلید سلون نے اپنے ایام زندگی میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقت ور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذوروں کے اڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے۔ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوا بوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی قربانی اور مساعی نے یہ شیریں ثمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

اکابر ملت اور جہاد آزادی...... ناسپاسی ہوگی اگر اس موقعہ پر ہم ان اکابر ملت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنہوں نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب کہ آزادی کے تصور سے بھی اس ملک کے دل و دماغ خالی تھے وہ شاہ ولی اللہ کے جانباز شاگردوں کی جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نوردی کر رہے تھے۔ آخر میں ۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل ہو کر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اسی تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔

۵۷ء میں بانی دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ بقول مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اس تصور کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت امداد اللہ

[1] ہندوستان کی آزادی کے موقع پر ۱۵؍۱۶ اگست ۴۷ء کی درمیانی شب میں نماز تراویح کے بعد علماء وطلباء دار العلوم اور اہل شہر سے خطاب۔

قدس سرہ کی قیادت میں تلوار اٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اتر آئے۔لیکن وقت مقررہ نہیں آ پہنچا تھا اس لئے فتح کا سلسلہ شاملی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا۔ ملک آزاد نہ ہوا۔ لیکن یہ جماعت اپنے تصور سے الگ نہ ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی دنیا وفاداری کے جذبہ سے سرشار تھی۔انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قرآن سے آیات جہاد کو خاوج کر دینے کے مشورے اور منصوبے قائم کئے جارہے تھے۔دیوبند کے لمبے کرتے والے مولویوں کو باغی کا نام رکھ کر مطعون کیا جارہا تھا لیکن یہ جماعت اپنی دھن میں تھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اس دنیا سے گئے تو ان کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے جوان کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے۔اس پوری جماعت کی سرپرستی کے ساتھ تحریک آزادی اس وقت جاری رکھی جب کہ انگریزوں کی مخالفت کا تصور بھی گھروں کے کونوں تک میں نہ تھا۔نہ صرف قلم یا زبان کی حد تک بلکہ عمل کے پردوں میں اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ ایسے ہمہ گیر عمل کے ساتھ جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی متعدد ریاستیں، اسلامی ممالک، متعدد فرماں روا اور انگریزی فوجوں کے کتنے ہی افسر بھی آ گئے اس عمل کا حال ہندوستان سے گزر کر روس کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق ’’شیخ الہند کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثے میں کیا حرارت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا‘‘۔

بہرحال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ ومنصب کے لئے تھا نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ ایک جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے اور حق بحقدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کیا جائے۔

شیخ الحدیث دارالعلوم کی پیشین گوئی......ان بزرگوں کا ہر وقت یہی ذکر تھا اور یہی فکر، اسی کے بارے میں پیشین گوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارے میں عام نظم اور انتظام چھتہ کی مسجد میں یہ سب بزرگ جمع تھے اور انگریزوں کے تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں نے گہرے پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑیں گے؟

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث تھے۔فرمایا ’’حاجی صاحب آپ کس خیال میں ہیں؟ وہ وقت دور نہیں جب کہ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا۔کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالت امن وسکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا اور انقلاب ہو جائے گا۔ رات کو سوئیں گے ان کی عملداری میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں!‘‘۔

لیکن آج دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ پندرہ اگست کی رات لوگ حسب معمول دس گیارہ بجے سوئے تو انگریزوں کی عملداری میں تھے۔اور جب پندرہ اگست کی تاریخ شروع ہوئی تو ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر دوسری

عملداری تھی۔ سوئے ایک عملداری میں اور جاگے دوسری عملداری میں۔

آزادی ہند کی جدوجہد کی ابتداء صرف مسلمانوں نے کی...... میں آج کے جانبازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس سے کسی حالت میں بھی نہیں ہٹ سکتا کہ آج کی آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے اور اس لئے میں ببانگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد صرف مسلمانوں نے شروع کی انہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا کہ "ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا"۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی نے اس فتویٰ کو استعمال کیا اور اس نسخہ شفا کو خاص ترکیب سے پیا اور پلایا۔ شیخ الہندؒ نے اسی نسخہ کو معجون مرکب کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کر دیا کہ ہر کس و ناکس اسے استعمال کر سکے۔ چنانچہ وہ استعمال عام شروع ہو کر عام ہو گیا۔ تحریک خلافت میں بھی نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہر حال استعمال عام شروع ہو کر آزادی کا جذبہ مسلمانوں سے گزر کر ابناء وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہو گئے اور ہندو مسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرہ شیریں آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس پر ہم ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان بزرگان مرحومین کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں، جن کی تخم ریزی اور تردد سے یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات...... ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے اس لئے ہماری مبارکباد کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے۔ ملک کی آزادی کی یہ پہلی قسط ہے۔ اس کی دوسری قسط جون اڑتالیس میں سامنے آنے والی ہے۔ لیکن ان اکابر مرحومین کا مقصد اس سے بھی آگے ہے۔ ہمیں آزادی کی دوسری قسط اور پاک نصب العین کی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے اور اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ابھی کمر کھولنے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہماری مبارک باد کی مستحق ہندوستان و پاکستان دونوں سلطنتیں ہیں۔ "ہم پاکستان کو مسلمان کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن کی حیثیت سے مبارکباد دیتے ہیں"۔

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل...... میں اس تصور کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں مسلمان اب ایک معمولی اقلیت کی صورت میں رہ گئے ہیں اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دو سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا جس کے لئے وہ بے چین تھے۔

ہندوستان کی آزادی کے عالمی اثرات...... وہیں اس فکر کا موقعہ بھی ہے کہ ان کی حیات اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور متدین امیر کا انتخاب کر کے ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہو جائیں اور اسلام کے کلمہ پر ایک ہوں ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں۔ صرف ظاہری طور پر ایک نہ ہوں بلکہ حقیقی طور پر ایک

ہوں۔اسی ایک جملہ میں ان کی حیات اجتماعی کی لمبی چوڑی داستان پنہاں ہے۔ان کے لئے سب سے مقدم یہ چیز ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کر دیئے جائیں طعن وطنز کا سلسلہ ترک کر دیا جائے ایک دوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ رکھیں بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ انہیں متحد ہو جانے کے لئے اخوت ومساوات کی کتنی تدابیر ہوسکتی ہیں جو وہ آج عمل میں لا سکتے ہیں۔

نئے ہندوستان میں وحدت جماعت کی ضرورت......میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب وقت ہے کہ ہم متحد ہوں پہلے سے زیادہ اب امکانات ہیں کہ ہم متحد ہوسکیں۔وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں۔اس انقلاب سے منقلب ہو چکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں۔اس لئے اب بجائے اس کے کہ ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی تخم ریزی کریں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدت جماعت کا سنگ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہو گئے ہیں۔میں آخر میں مکرر مبارک باد پر جو مسلمانوں کے لئے اور پورے ایشیاء کے لئے ہے اس تقریر کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

پس منظر......حضرت مولانا مدنی مدظلہ کی تحریک اور نائب مفتی احمد علی صاحب سعید کی تائید سے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر جلسہ قرار پائے۔قاری حفظ الرحمٰن صاحب کی قرات سے جلسہ کا آغاز ہوا۔حافظ اخلاق احمد صاحب محرر دارالافتاء نے حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کی جانب سے فارسی کا قصیدہ خیر مقدم پڑھ کر سنایا۔محمد حسیب دیوبندی طالب علم نے اردو نعت اور فضل الرحمٰن ابن قاری حفظ الرحمٰن نے عربی قصیدہ سنایا۔

حضرت مولانا مدنی مدظلہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد فرمایا۔

اے تماشا گاہ عالم روئے تو — تو کجا بہر تماشا مے روی

نہایت خوشی کا مقام ہے جس جگہ ہم سب جمع ہیں یہ کوئی معمولی نہیں ہے۔تذکرۃ الرشید میں ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ نے خواب میں دیکھا تھا کہ۔

”میں خانہ کعبہ کے در پر کھڑا ہوں اور میرے پیروں کے نیچے سے نہریں نکل کر تمام عالم میں پھیل رہی ہیں“۔اس خواب کا مصداق دارالعلوم اور اس کی شاخوں کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے خلیفہ اعظم تھے۔شاہ عبدالغنی صاحبؒ تلامیذ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ پر اور خلفاء میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ پر فخر کیا کرتے تھے۔چنانچہ تصوف میں مولانا رفیع الدین صاحبؒ کا بڑا درجہ تھا۔انہوں نے ہی یہ خواب دیکھا تھا کہ علم کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دی گئیں وہ تعجب کرتے تھے کہ میرا علم میں کوئی بڑا درجہ نہیں ہے پھر ایسا کیوں ہوا؟ مگر جب وہ دارالعلوم کے مہتمم بنائے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کے ذریعہ سے علم دنیا میں پھیلا۔

ایک دوسرا خواب انہوں نے ہی یہ دیکھا تھا کہ ”مدرسہ کے چمن میں خانہ کعبہ ہے اور لوگ اس کا طواف کر

رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی معنوی حیثیت اسلام میں وہ شان رکھتی ہے جو عالم میں خانہ کعبہ کے انوار و برکات لئے ہوئے ہیں''۔ ہماری عملی حالت گو بہت گری ہوئی ہے مگر خدا کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے ہم سے اس مرکز کی خدمت لی۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ' کے ان مکاتیب میں جو ابھی چھپے نہیں ہیں میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب جہانگیر نے ان کو قید کر کے دہلی بلایا تو ان کا دیوبند سے گزر ہوا تو فرمایا کہ ''اس جگہ سے علم نبوت کی بو آتی ہے''۔

چنانچہ اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے علم شریعت و علم نبوت کا مظہر قرار دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے جب ہمارے مہتمم صاحب کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعا فرمائیں تو بگڑ کر فرمایا کہ ''کیا خوب! تمہارے مدرسہ کے لئے؟ نہ معلوم ہماری کتنی راتیں اس دعا کی نذر ہوئی ہیں۔ اور اب مدرسہ آپ کا ہو گیا۔ فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا خیال تھا کہ علم شریعت کا کوئی مرکز بنانا چاہئے مگر ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دیوبند کو اس کام کے لئے منتخب کیا ہے''۔

بہر حال یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ہم سب سے یہ خدمت لی۔ دار العلوم کو جو فضیلت ان بزرگوں کے ذریعہ سے حاصل ہے وہ کسی دوسری جگہ کو نصیب نہیں ہے۔ علم کے اللہ نے بڑے بڑے مرکز مقرر فرمائے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عراق، شام، مصر، خراسان، بخارا اور سمرقند وغیرہ۔ پھر دیوبند کے حصہ میں یہ دولت آئی۔ دینی علوم کی ترقی جس قدر آپ کو یہاں ملے گی وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے۔ ﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾ ①

یہاں کے دیہات میں علم کا جو اثر ہے وہ دوسری جگہ کے شہروں تک میں نہیں ہے۔ ہمارے محترم بزرگ حضرت مہتمم صاحب گو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں مگر ان کو خاندانی جو نسبت حاصل ہے اور ان کا جو منصب ہے۔ اس کے اعتبار سے وہ ہمارے سب کے سردار ہیں۔ ہمارے لئے افسوس کا موقع تھا کہ وہ دوسری جگہ پاکستان رہ جاتے۔ اگرچہ جانا عارضی تھا مگر یہ افواہیں سن سن کر اب واپسی نہیں ہوگی ہم کو تکلیف ہوتی تھی مگر۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور

الحمد للہ! ہمارے صدر مہتمم صاحب حضرت نانوتوی کی آنکھوں کے تارے تشریف لے آئے ہیں۔ ہم جس قدر بھی خوشی کا اظہار کریں کم ہے۔ ان کا قیام اگر پاکستان میں ہوتا تو بھی فیض سے خالی نہ ہوتا مگر ہمارے لئے قلق کا باعث ہوتا۔ آپ کے لئے سرچشمہ فیض خانہ کعبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اپنے سفر کے تاثرات سے بھی مستفیض فرمائیں گے تاکہ وہ مستقبل میں ہمارے کام آئیں۔

حضرت مولانا کی تقریر کے بعد مولوی غلام حیدر اور مولوی عبد الاحد صاحبان کی دستار بندی ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے خطبہ مسنونہ کے بعد ذیل کا شعر پڑھ کر اپنے تاثرات بیان فرمائے۔

① پارہ: ۲۷، سورۃ الحدید، الآیۃ: ۲۱.

حدیث پاکستان

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْـــــــدُ !

عظیم الشان نفع...... بزرگانِ محترم!

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　　　نسیم صبح تیری مہربانی

میں حیران ہوں کہ بیان تاثرات کے اس بوجھ کو کس طرح اٹھاؤں مجمع اکابر کا ہے۔اساتذہ کا اجتماع ہے۔ بزرگوں کے اجتماع میں قوت گویائی یارا نہیں دیتی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ارشاد ہے کہ اپنے ان تاثرات کا اظہار کروں جو ہر شخص کچھ نہ کچھ سفر سے لے کر آتا ہے۔

اول تو پاکستان جانے میں جو عظیم الشان نفع حاصل ہوا وہ دعائیں ہیں جو بزرگوں نے فرمائیں۔ اگر میں پاکستان نہ جاتا تو یہ دعائیں حاصل نہ ہوتیں۔ پھر بزرگوں کے حوصلہ افزا کلمات میسر نہ ہوتے۔ حضرت مولانا سید مہدی حسن صاحب نے اپنی نظم میں جس تاثر کا اظہار فرمایا وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ اور حضرت شیخ مدظلہ العالی کے بارے میں تو میں کیا عرض کروں وہ تو ہم سب کے لئے انشاءاللہ وسیلہ نجات ہیں۔ حضرت نے اس ناکارہ کے بارے میں جو کلمات فرمائے ہیں۔ "میری درخواست یہ ہے کہ وہ انہیں یاد رکھیں اور قیامت میں انہی الفاظ میں گواہی دے دیں تاکہ میرے لئے وہاں نجات کا باعث ہوں کہ یہ کلمات ہی میرے لئے دستاویز نجات ہیں"۔

(اس موقع پر وفور جذبات سے حضرت مہتمم صاحب پر رقت وگریہ طاری تھا۔ ممدوح کی اس حالت کا مجمع پر بھی زبردست اثر پڑا اور لوگوں کے بے ساختہ آنسو نکل آئے) چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔

پاکستان جانے کے مقاصد...... میں یہاں سے پاکستان تین مقصد لے کر گیا تھا۔ ایک عزیز اقرباء سے ملاقات تھی، جن کا عرصہ سے تقاضا تھا۔ وہاں کے مدارس سے بھی طلب تھی اور جلسوں میں شرکت کے کے خطوط بھی برابر آ رہے تھے۔ اس مرتبہ کوشش کی کہ ہو آؤں۔ چنانچہ سفر کا یہ مقصد میں نے حکومت کے سامنے بھی ظاہر کر دیا تھا۔

دوسری غرض دارالعلوم کا مفاد تھا۔ دارالعلوم ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں وہاں سفر بھی

کیئے۔اور بساط کے موافق جتنی کوشش ہوسکتی تھی کی' اس کے اثرات اور منافع بھی بحمد اللہ ظاہر ہوئے۔

تیسرے تبلیغ و اصلاح کا سلسلہ جو ہر شخص کا فرض ہے اور قدرتی طور پر میرے دل میں بھی ہے ایک اہم مقصد سفر تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور اصلاح دینی کی سعی کی گئی۔ میں نہ سیاسی آدمی تھا، نہ ہوں۔اس لئے زیادہ تر اجتماعات، اخلاقی مواعظ و پند پر مشتمل ہوتے تھے۔

دنیا کا عمومی دینی انحطاط...... دینی حالت پاکستان و ہندوستان کیا، ساری دنیا کی یکساں ہے۔آج حقیقی طمانیت تمام دنیا سے مفقود ہے۔ دنیا اس وقت ایک بے اوڈھک کرہ کی طرح اضطراب اور حرکت میں ہے۔ ساری دنیا کی یہی کیفیت ہے۔آج جہاں سے بھی خبریں آتی ہیں وہ عام بدامنی، عام طور سے بے چینی، بے سکونی، لڑائیوں اور فسادات کی تو آتی ہیں۔ صلاح و رشد کی اطلاعات کہیں سے نہیں آتیں حجاز سب سے بڑا مرکز دین ہے۔خود وہاں کی حالت بھی دینی اور اخلاقی حیثیت سے بلند پایہ نہیں۔

تیسرے سال جب مجھے وہاں حاضری کا موقع ہوا تو میں نے دیکھا کہ عصر کے بعد ہزاروں آدمی جبکہ طواف بیت اللہ اور ذکر اللہ میں مشغول تھے۔ مکہ کے چند نوجوان جو لباس فاخرہ پہنے ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے معلوم ہوتے تھے۔حرم محترم میں انگریزی اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔جس میں عریاں تصویریں تھیں۔ان تصویروں کی خوبیاں بیان کرنے اور یورپ و لندن کے تمدنی مسائل کی بحث میں مشغول تھے۔گویا وہ ان طواف و ذکر کرنے والوں کو احمق سمجھ رہے تھے۔ اور ان کے نزدیک ان عریاں تصاویر کی دید بیت اللہ کی دید کے مقابلہ میں زیادہ باوقعت تھی۔ مجھے بڑی ضیق ہوئی۔حرم محترم میں بیٹھ کر بیت اللہ کے سامنے قبولیت کے اوقات میں تصاویر پر بحث کرنا بہت ہی ناگوار گزرا۔ میں چپ رہا یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی اور لوگ نماز میں مشغول ہوگئے۔نماز کے بعد دیکھا تو انہوں نے پھر یہ مصور اخبار سنبھالے اور پھر وہی بحث چھیڑی تنگ ہوکر میں نے عرض کیا کہ ''عزیزو! مشرق و مغرب کے لوگ جو آپ کی تقلید کرنے یہاں آتے ہیں جب آپ عمل کا یہ نمونہ پیش کریں گے تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ آپ کو اپنا مقام خود سمجھنا چاہئے۔آنے والے آپ سے اسلام کا نمونہ سمجھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں''۔حاصل یہ ہے کہ اخلاقی حالت آج ہر جگہ یہ ہے تو ہندوستان اور پاکستان تو پھر بعد کی چیز ہے۔ بہر حال ہر ملک کی طرح پاکستان بھی دین کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاج اصلاح ہے۔

اصلاح کی ذمہ داری......اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہے؟ حقیقت میں مسلمانوں پر، مسلم کو خیر الامم کہا گیا ہے جس طرح جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام الانبیاء ہیں۔اسی طرح آپ کی امت بھی امام الامم ہے۔اگر امام کا وضو ٹوٹ جائے تو مقتدیوں کی تو نماز بھی باقی نہیں رہ سکتی۔پھر مسلمانوں میں سب سے زیادہ اصلاح خلق اللہ کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری بھلا دی ہے۔اگر وہ خود خلیق ہوں تب دوسرے با اخلاق بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں سر اٹھانے والے فتنے...... وہاں اس وقت دینی حیثیت سے تین فتنے مسلمانوں کے لئے خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔ایک قادیانی فتنہ۔دوسرا شیعیت کا فتنہ۔اور تیسرا مغربیت کا فتنہ۔

قادیانیوں نے اپنا مرکز کوئٹہ بلوچستان کو بنالیا ہے۔مرزا بشیر الدین نے اعلان کر دیا ہے کہ قادیانی بلوچستان کو سنبھالیں۔چنانچہ انہوں نے کوئٹہ میں اپنا مرکزی دفتر کھول دیا ہے۔جو ایران،مصر اور دوسرے ممالک اسلامیہ کا دہانہ ہے۔انہوں نے ملتان میں ایک عظیم جلسہ کا اعلان کیا ہے جس میں ان کے نزدیک پچاس ہزار قادیانیوں کے جمع ہونے کا امکان ہے۔جلسہ کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا میں پھیل کر قادیانی مسلک کی اشاعت کی جائے۔

انہوں نے اپنے چند افراد مصر وغیرہ بھیج کر انہیں عربی بول چال کا ماہر بنالیا ہے۔اور بطور شو کے ان کی عربی تقریریں پبلک کے سامنے کراتے ہیں۔تبلیغ کا نظم سامنے لاتے ہیں اور اپنی مساعی کی روداد پیش کرتے ہیں۔اس طرح سے اہل حق اس باطل کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ادھر ان عربی دانوں کے ذریعہ ممالک اسلامیہ میں اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسری طرف شیعوں نے ملک میں مختلف انداز سے شیعیت کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے۔جس سے سادہ لوح عوام شیعیت کا شکار ہو رہے ہیں اور اس طرح یہ فتنہ بھی فروغ پا رہا ہے۔

تیسرا فتنہ مغربیت یا آزادی اور بے قیدی کا ہے جس کے راستہ سے بے دینی اور بے حیائی کی تخم ریزی ہو رہی ہے۔اس جماعت کے نزدیک سرے سے مذہب ہی کی اہمیت نہیں۔مغربیت کے اس فتنہ سے الحاد اور بے دینی بڑھ رہی ہے۔گو یہ فتنہ اس وقت پوری دنیا پر مسلط ہے۔تاہم ہمیں اور جگہ سے بحث نہیں۔

فتنوں کا سدِ باب...... ایک زمانہ میں ان فتنوں کا دار العلوم نے سد باب کیا تھا اور آج بھی دار العلوم ہی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے ذیل میں کمیونزم اور کیپٹل ازم وغیرہ کے سیاسی فتنے پھر سر ابھار رہے ہیں۔جن کا سد باب علمائے حق کا کام ہے۔میں نے تو وہاں کے علماء کو توجہ دلائی کہ اگر مسلمانوں کی اخلاقی حالت درست ہو جائے تو دوسری اقوام کی حالت درست ہو جائے گی بلکہ اخلاق درست کر لئے جائیں تو پاکستان و ہندوستان دونوں کے درمیانی معاملات کی حالت بھی درست ہو سکتی ہے۔

ایک حدیث قدسی میں یہ فرمایا گیا ہے ''حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی قوم کی بدعملی پر ناخوش ہوتا ہوں تو دوسری اقوام کے دل میں اس بدعمل قوم کی طرف سے بغض وعداوت بٹھا دیتا ہوں اور وہ جلاد بن کر مجرم قوم پر مسلط ہو جاتی ہیں۔اور قتل و غارت کے ذریعہ اسے سزا دیتی ہیں۔پس اگر تمہیں یہ سزا اور بے کسی اور مغلوبیت ناگوار ہے تو تم کسی قوم کو برا مت کہو۔میرے ساتھ معاملہ درست کرو،میں اقوام کے قلوب میں پھر تمہاری محبت ڈال دوں گا''۔اس لئے میں تو دوسری اقوام کی بدحالی کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد کرتا ہوں۔اگر یہ قوم درست ہو جائے تو سب اقوام درست ہو جائیں۔

اصلاحی کاموں پر تقسیم ہند کے اثرات...... بہر حال جیسے عام دنیا اس وقت اصلاح طلب ہے اسی طرح پاکستان بھی دینی حیثیت سے کافی حد تک محتاج اصلاح ہے۔ جو علمائے حقانی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کی تقسیم سے اصلاحی کاموں میں خصوصیت سے رکاوٹ پیش آ گئی ہے اور اصلاح کے راستے کچھ بند سے ہو گئے ہیں۔ طلباء کا ادھر سے آنا منقطع ہو گیا ہے اور دارالعلوم کا علمی فیضان وہاں پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کی سعی پر حکومت ہند نے طلباء کے لئے راستہ کھول دیا ہے۔

اور اب حکومت پاکستان کے سامنے بھی دارالعلوم کی طرف سے درخواست پیش کی گئی ہے کہ وہ بھی طلبائے علم کے لئے ہندوستان آنے کے راستے کھول دے امید ہے کہ یہ سعی کامیاب ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ نہ صرف وہاں سے طلبہ کی آمد پر ہی سے پابندی ہٹا لینے کی ضرورت ہے بلکہ یہاں سے وہاں مبلغین کی آمد و رفت کو بھی آزاد کر دیا جائے تو یہ دونوں ملکوں کے تعلقات کے لئے خیر سگالی کے وفود سے زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوگا۔ کیونکہ مبلغین ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کریں گے اور اخلاق جس حد تک درست ہوں گے اور کردار جس حد تک کسی ملک کا اونچا ہوگا۔ اسی حد تک دوسرے ممالک اس سے مطمئن ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیں گے۔

بڑی امید افزاء خوبی...... آج کل اخلاقی حالات کے بگڑ جانے سے ہی عموماً بگاڑ آیا ہوا ہے۔ ہاں! مگر جہاں عام دنیا کی حالت ہے وہاں دینی حیثیت سے یہ خرابیاں ہیں وہیں ایک بڑی امید افزاء خوبی بھی ہے جو اور جگہ کم پائی جاتی ہے اور وہ ہے طلب اصلاح اور حسن قبول یعنی وہاں پر ہر بڑے چھوٹے میں اصلاح کی طلب اور خواہش پائی جاتی ہے۔ مگر اصلاح کے لئے ہر قسم کے علماء کی ضرورت ہے۔ ایک خالی الذہن کے لئے خطابات سے سمجھا دینا کافی ہوگا۔ ایک عقلیت پسند کے لئے حکمت و استدلال کی ضرورت ہوگی اور ایک کٹ حجت کے لئے الزامی جوابات اور خود اس کے مسلمات سے اس پر حجت قائم کرنا ضروری ہوگا۔ قرآن نے ان ہی تین مقامات کی طرف اشارہ فرمایا کہ ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾ (1) پس جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی زبان میں انہیں سمجھانا ہوگا۔ اس لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔

اعلان استغناء...... ہاں! پھر اسی کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کو قلبی استغناء کی بھی حاجت ہے۔ اصلاح میں جس قدر بھی رکاوٹ یا تاثیر میں جتنی بھی روک ہوتی ہے وہ مصلح کی طمع سے ہوتی ہے۔ مخاطب پہلے یہ دیکھتا ہے کہ مصلح غرض مند تو نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی غرض مندی کا شبہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اس لئے جہاں قلبی استغناء درکار ہے وہیں اعلان استغناء بھی ضروری ہے تاکہ اصلاح محض لوجہ اللہ ہونے سے قلوب پر اثر انداز ہو، گویا تبلیغ کی تاثیر کے لئے استغناء بالخاصہ ضروری ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے بتلایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام موعظت و اصلاح کے وقت خصوصیت سے اعلان استغناء فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ ﴿ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ

---

(1) پارہ: ۱۵، سورۃ النحل، الآیۃ: ۱۲۵.

اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ ① اگر اس طرف سے طلباء آنے لگیں اور اس طرف سے مبلغین جانے لگیں تو دونوں حکومتوں کے کردار پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے جیسا کہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

دیانت عمل کی تاثیر...... تقریباً آٹھ سال ہوئے کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے جلسہ کی صدارت کے لئے میرا حیدر آباد سندھ جانا ہوا تھا، جلسہ کے بعد وہاں کے ہندوؤں نے ہم لوگوں کو چائے پر مدعو کرنا چاہا جس کو مان لیا گیا۔ عصر کے بعد موٹریں آئیں۔ شہر سے باہر ان کی کوٹھی پر پہنچے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اس لئے طبیعت نماز کے لئے بے چین ہوئی۔ جس کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور کہا کہ غالباً آپ لوگ نماز کی وجہ سے مضطرب ہیں تو مسجد یہاں سے ڈیڑھ میل دور ہے۔ مسجد تک جاتے جاتے نماز کا وقت جاتا رہے گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو نماز ہمارے مکان ہی میں پڑھ لیجئے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ساری زمین ہمارے لئے مسجد ہے۔

اس قرارداد کے بعد کا منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ وہ لوگ پانی وغیرہ لا رہے تھے سفید تولئے لا رہے تھے، چادریں بچھا رہے تھے۔ قبلہ کی سمت بھی انہوں نے تشخیص کر کے بتلائی۔ ہم نے اذان دی اور نماز ادا کی۔ اور وہ سب مرد، بچے، بڑے ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ جب ہم لوگ نماز اور معمولات سے فارغ ہو چکے تو وہ آگے آئے اور کہا کہ ''ہماری قسمت ایسی کہاں تھی کہ ہمارے گھر پر بھگوان کا نام لیا جائے''

مجھے ان کے ان الفاظ کی قدر ہوئی اور میں نے کہا کہ یہ آپ کی نیکی کی بات ہے مگر عام طور سے تو لوگ نماز کے بارے میں اور مسجدوں کے معاملہ میں تعصب کا برتاؤ کرتے ہیں۔ مسجد اور باجہ وغیرہ کا جھگڑا روزانہ ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا' جیسے آدمی ہوتے ہیں ویسا ہی ان کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمارے چڑانے کو نماز پڑھیں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے۔ بہرحال اگر مسلمان دیانت عمل کا مجسمہ بن جائیں تو خود بخود لوگوں کے دل میں کشش پیدا ہو جائے۔ غلط نمونہ پیش کر کے خود ہم نے لوگوں کو دین سے دور کر دیا ہے۔ گویا ہم مبلغ بننے کی بجائے تبلیغ دین کے حق میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا نمونہ عمل دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کے یہی معنی ہیں تو ہمارا اسلام کو سلام ہے۔ بہرحال دارالعلوم اپنی بنیادوں کے لحاظ سے مصلح ہے اور لوگ اس کی اصلاحی مساعی سے اثر لیتے ہیں۔ اس وقت اسے اخلاقی اور دینی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ اصلاحی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

قدر دارالعلوم...... ہم کو دارالعلوم کی قدر یہاں بیٹھ کر محسوس نہیں ہوتی۔ دارالعلوم سے باہر جا کر قدر ہوتی ہے کہ وہ کیا نعمت ہے؟ جب مجھے واپسی کی راہ کچھ مسدود سی نظر آئی تو اس وقت دارالعلوم کی فضا ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے لگی کیونکہ یہ ماحول ہر جگہ میسر نہیں۔

مجھے عید الاضحیٰ کراچی ہی میں پڑھنے کی نوبت آئی اور ظاہر ہے کہ چودہ لاکھ کے شہر میں عید کے اجتماع کا منظر کتنا اعلیٰ ہوتا ہوگا۔ لاکھوں کے مجمع میں ایک جگہ عید پڑھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے تلاش طلباء و علماء کے ماحول کی

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۰۹.

رہی۔ اور میں اس عید کا متلاشی تھا جس میں دارالعلوم جیسا ماحول ہو۔ میں نے مولانا محمد صادق صاحب کے مدرسہ کے مجمع کے ساتھ نماز عید پڑھی کہ وہاں کا ماحول کچھ طلباء اور علماء کا تھا مگر پھر بھی کمال تسکین واطمینان حاصل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں نے مدارات میں کمی نہیں کی۔ قدم قدم پر وسائل راحت تھے۔ پبلک نے مجھے دارالعلوم قائم کرنے کو کہا اور تین لاکھ کا فنڈ بھی پیش کیا۔ لوگ وہاں کے قیام کے لئے مضبوط دلائل بھی بیان کرتے تھے مگر اس کے باوجود قلبی رجحان اور وجدان دارالعلوم کے ماحول کا متلاشی تھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تصرف...... میرے اصرار واپسی کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قلب میں قیام سے توحش کی بنا در حقیقت حضرت شیخ مدنیؒ کا تصرف ہے جو وہاں بیٹھ کر وہ کر رہے ہیں۔ اور اس لئے آپ یہاں سے اکھڑ رہے ہیں۔ بہر حال میرا قلبی رخ کسی بھی وجہ سے ہو یہی تھا کہ میں حاضر ہوں۔ الحمد للہ کہ حاضری ہوگئی۔ اور آپ بزرگوں اور دوستوں کی زیارت کا حق تعالیٰ نے موقع میسر فرما دیا۔ پھر بھی وہاں کے بزرگوں اور دوستوں کی محبانہ مہمان نوازی اور غرباء پروری کے نقوش دل میں نقش رہیں گے۔ باقی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کی حاضری حضرت شیخ کی ظاہری وباطنی توجہ بلکہ تصرف سے ہوئی اور دارالعلوم کی خدمت کا دوبارہ موقع ملا۔

قمیص عثمانی...... میرے محترم بھائی مولانا عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی نبیرۂ حضرت اقدس مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے اس خدمت دارالعلوم کو قمیص عثمانی سے تشبیہ دیتے ہوئے مجھے وہاں لکھا تھا کہ آپ کو اپنے ارادہ واختیار سے اس قمیص عثمانی کو نہ اتارنا چاہئے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ قمیص عثمانی کو اتارا نہیں ہے بلکہ تھوڑے وقفے کے لئے۔ جیسے غسل کے لئے کپڑے اتارے جاتے ہیں اور پھر پہن لئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی میں نے برائے تطہیر کچھ وقفہ کے لئے یہ لباس اتار کر رکھا ہے۔ عنقریب پہن لیا جائے گا۔

جذبات تشکر...... آخر میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ آپ حضرات نے کل سے اب تک جن پر خلوص جذبات محبت کو ظاہر فرمایا اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں اور اس کو اپنے لئے وسیلہ نجات تصور کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کی توفیق مزید نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

امارت شرعیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

روزِ مسرت...... بزرگانِ محترم! میرے لئے خصوصیت سے آج بہت ہی مسرت وخوشی کا دن ہے کہ اس مقدس مجمع میں کہ جس میں اس نواح کے امیر شریعت اور دوسرے بزرگان تشریف فرما ہیں۔ مجھے ان کی معیت کا بھی شرف حاصل ہوا ہے۔ اوران کی برکات سے مستفیض ہونے کا بھی موقع ملا اور دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی رعیت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اس لئے کہ امیر شریعت کے سامنے تو سب رعایا ہی ہوتی ہے وہ باہر کے ہوں یا اندر کے ہوں۔

بہر حال ایک رعایا کی حیثیت سے اپنے امیر کی خدمت میں حاضر ہونا ایک مستقل سعادت اور برکت ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس امارت کے سلسلہ میں چند طالب علمانہ باتیں آپ کی خدمت میں گزارش کروں زیادہ دیر تک تو عرض نہیں کرسکوں گا اس لئے کہ کچھ تو علیل ہوں اور باعتبار علم کے قلیل ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ صبح سے دماغی کاوش کا بار بھی اوپر پڑا ہوا ہے جس وجہ سے تعب اور تکان بھی پیدا ہوگیا۔

معالجوں کی طرف سے بھی مجھے ہدایت ہے کہ عشاء کے بعد نہ کسی جلسے میں تقریر کروں۔ اور نہ شرکت کروں لیکن بہر حال بزرگوں کا حکم ڈاکٹروں کے حکم سے زیادہ اونچا ہے کیونکہ ڈاکٹر معالج جسمانی ہیں اور یہ بزرگان دین معالج روحانی ہیں اور روح کو جسم پر قدرتی طور پر فضیلت حاصل ہے اس لئے معالجین روح کا حکم زیادہ واجب الاطاعت ہے بہ نسبت معالجین جسم کے۔ اس لئے تعمیل حکم کے طور پر بھی کچھ عرض کرنا ضروری تھا۔ مگر میں زیادہ

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

وقت نہیں لے سکوں گا صرف تھوڑی دیر چند طالب علمانہ باتیں مختصر طور پر گزارش کروں گا۔

اسلام کی بنیاد...... اسلام وسیع ترین اور عالمگیر دین ہے اور ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے۔ اور اس کی عمارت پانچ شعبوں پر قائم ہے۔ گویا اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں کہ جس پر اسلام کی تعمیر کھڑی ہے۔

1 ...... اعتقادات 2 ...... عبادات 3 ...... اخلاقیات 4 ...... معاملات ...... 5 اجتماعیات

عقائد...... پہلا شعبہ اعتقادات کا ہے کہ آدمی کے عقائد درست ہونے چاہئیں اور عقیدے کی تین بنیادیں ہیں۔

1 مبداء 2 معاد 3 نبوت مبداء کے معنی یہ ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں آئے ہیں۔ ہماری اصل کیا ہے۔ ہم کس طرح دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ معاد کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ عمر گزار کر جائیں گے کہاں؟ اور نبوت کا حاصل یہ ہے کہ اس آمد و شد کے درمیان ہم زندگی کیسے گزاریں۔ یہ تین بنیادیں ہوئیں عقائد کی۔ مبداء ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے کہ جس سے ہمیں ہستی ملی ہے اور وجود ملا ہے۔ اور وہ ہمارے وجود کی اصل ہے اور معاد بھی وہی ہے کہ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تو مبداء بھی وہی ہے۔ اور معاد بھی وہی ہے۔ اور ہدایت کرنے والا بھی وہی ہے۔ کہ ہم زندگی کیسے گزاریں۔ تو سب سے پہلی چیز عقائد ہے کہ جس سے قلب انسانی صحیح ہو جائے۔ کیونکہ تمام اعمال عقائد ہی کے تابع ہیں۔ عقیدہ اگر غلط ہے تو عمل خود بخود غلط ہو جائے گا خواہ آدمی اچھی نیت ہی سے کرے۔ اگر عقیدہ درست ہے تو سارے اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ جب اعمال صحیح ہوں گے تو احوال بھی صحیح ہوں گے۔ اور جب احوال صحیح ہوں گے تو انجام بھی صحیح ہو جائے گا۔ تو ابتداء سے انتہاء تک انسان عقائد کی صحت کی بناء پر صحیح ہوگا۔ اس لئے سب سے بڑی بنیادی چیز اسلام میں عقائد کا درجہ ہے جو قلب کے اندر پیوست کیا جاتا ہے۔

عبادات...... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے کہ ان عقائد کے تحت اللہ تعالیٰ کو کس طرح سے یاد کیا جائے، عبادت کس طرح سے کی جائے۔ عبادت کے معنی ہیں غایت تذلل یعنی معبود کے سامنے ایسے ذلت اختیار کر لینا جس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عزت لامحدود ہے۔ کوئی عزت کا درجہ نہیں جو اس کی ذات میں موجود نہ ہو۔ اس کے یہاں عزت کامل ہے اس لئے اس کے یہاں ذلت کامل یعنی ایسی ذلت پیش کرنی چاہئے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے کہ آدمی اس کے سامنے ذلیل نہ ہو جائے۔

تو عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اس عزیز مطلق کے سامنے ذلیل مطلق بن جائے۔ اس کی عزت کسی حد تک رکی ہوئی نہیں۔ ہماری ذلت کسی حد پر رکی ہوئی نہ ہو اور یہ غایت تذلل اور انتہائی ذلت اللہ کے سامنے اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آدمی میں انتہائی محتاجگی ہو کیونکہ غنی کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا:

آنکہ شیراں راکند روباہ مزاج ——— احتیاج است و احتیاج است و احتیاج

جو شیروں کو بھی لومڑی بنا دے وہ حاجت مندی ہے۔ غنا کے ساتھ کوئی کسی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ حق

تعالیٰ شانہٗ غنی مطلق ہیں، رفیع المرتبت ہیں، انسان ان کے سامنے ذلیل مطلق ہے اس کا کام ان کے سامنے ہر وقت جھکنا ہے کہ دل سے بھی جھکے، روح سے بھی جھکے، بدن سے بھی جھکے، قول سے بھی جھکے، فعل سے بھی جھکے ہر اعتبار سے اپنی ذلت و پستی کا اظہار کر دے۔ یہ ہے عبادت۔ عبادت کے معنی فقط نماز روزہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ قانون اسلام کے تحت ذلت کے ساتھ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہ اگر کہیں کہ گھر میں فلاں کام کرو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اسی طرح کریں۔ اگر وہ فرمائیں کہ مسجد میں جاؤ تو ہمارا فرض ہے کہ مسجد میں جائیں اگر وہ کہیں کہ تخت سلطان پر امیر شریعت بن کر بیٹھ جاؤ۔ ہمارا فرض ہے کہ امیر بن کر بیٹھ جائیں اگر وہ کہیں کہ غلام بن جاؤ، فلاں کے تو ہم غلام بننے کو تیار ہوں۔ تو اظہار ذلت کے یہ معنی ہیں کہ عمل سے قول سے، فعل سے، حال سے، چال سے ہر اعتبار سے آدمی اپنی پستی، اپنی احتیاج اور اپنی حاجت مندی کا اظہار کر دے۔ اسی کا نام عبادت ہے۔

اخلاقیات...... تیسرا شعبہ اخلاقیات کا ہے۔ عبادات اور عقیدہ درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ قلب کی حالت درست نہ ہو اور قلب محل اخلاقیات ہے۔ لہٰذا جب تک اخلاق انسانی صحیح نہ ہوں گے یعنی جب تک صبر نہ پیدا ہو، حیا نہ پیدا ہو، شکر نہ پیدا ہو۔ سخاوت نہ پیدا ہو، شجاعت نہ پیدا ہو، توکل علی اللہ نہ پیدا ہو۔ انابت الی اللہ نہ پیدا ہو۔ یہ ملکات جب تک ذہن میں نہ جمیں گے عقیدہ درست نہ ہوگا۔ عقیدہ درست نہ ہوگا تو عمل درست نہ ہوگا۔ اور عبادت درست نہ ہوگی۔ تو مدار آ کر ٹھہر جاتا ہے اخلاق پر۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاق کا ہے۔ لہٰذا اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اخلاق کو بلندی پر پہنچایا جائے۔ اور انسان کو جبلی طور پر جو بد اخلاقیوں کے روگ لگے ہوئے ہیں یہ دور کر کے پاکیزہ اخلاق سے بدلا جائے۔ جبلی طور پر انسان میں حرص بھی ہے۔ بخل بھی ہے۔ حسد بھی ہے۔ کبر و رعونت بھی ہے۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کو مخلوق کے آگے ذلیل کرتی ہیں۔ ان کو نکال کر کبر کی بجائے تواضع پیدا کی جائے۔ بخل کی بجائے سخاوت پیدا کی جائے۔ خود غرضی کی بجائے ایثار پیدا کیا جائے ہوس رانی کی بجائے قناعت کا جذبہ پیدا کیا جائے جب یہ اخلاق درست ہوں گے تو عقائد درست ہوں گے پھر اعمال درست ہوں گے اور جب اعمال درست ہوں گے تو انجام درست ہوگا۔ پھر زندگی بھی صحیح ہو جائے گی اور موت بھی صحیح ہو جائے گی۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاقیات کا ہے۔

معاملات...... چوتھا شعبہ معاملات کا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کس طرح کا برتاؤ کریں معاملات میں نزاع ہو، جھگڑا ہو، اس کا سلجھاؤ کس طرح سے کریں۔ ہم ایک دوسرے سے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے کریں، لین دین کس طرح سے ہو، قرض ادھار کے طریقے کیا ہوں گے، امانت رکھنے کے طریقے کیا ہیں اور ادائیگی کے طریقے کیا ہیں، اجارہ کے احکام کیا ہیں، اور زمین کے احکامات کیا ہیں تو معاملات کا شعبہ بھی اہم شعبہ ہے جس میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے، اگر دیانت نہ ہو، امانت نہ ہو۔ لازمی طور پر دنیا میں فساد پیدا ہوگا اور جب فساد پیدا ہوگا تو بدامنی پیدا ہوگی، جب بدامنی پیدا ہوگی تو نہ جان کی خیر رہے گی نہ

مال کی خیر رہے گی۔ ہر شخص غیر مطمئن رہے گا۔ پریشان رہے گا۔ اضطراب اور بے چینی قلب کا جوہر بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے معاملات کی صحت اور خوبی یہ بھی اسلام کا اہم ترین شعبہ ہے۔

اجتماعیات...... پانچویں چیز اپنی قومیت کو سنبھالنا ہے، یعنی اجتماعی حالت کو درست کرنا ہے قوم میں اجتماعی طور پر ایک تنظیم ہو، قوم ایک نظم کے تحت زندگی گزارے، بدامنی نہ ہو کہ ایک کا رخ ادھر کو ہو اور ایک کا رخ ادھر کو ہو، ایک مشرق کو جارہا ہے اور ایک مغرب کو جارہا ہے۔ یا ایک ادھر سے آرہا اور ایک ادھر سے دونوں ٹکرائیں آپس میں اور جھگڑیں اور خونم خون ہوں، بلکہ ایک نظم کے اندر پوری قوم جڑی ہوئی ہو۔ ایک نظام کے تحت چل رہی ہو۔ ہر ہر چیز اپنے محل کے اوپر قائم ہو۔

یہ پانچ شعبے ہو گئے ہیں۔ اعتقادات، عبادات، اخلاقیات، معاملات اور اجتماعیات۔ ان پانچ شعبوں کو علماء کے ایک ایک طبقہ نے سنبھالا ہے اور لاکھوں علماء ایک ایک شعبے کو سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سنبھالا اور اپنا فرض منصبی پورا کیا۔

متکلمین اسلام کی خدمات...... اعتقادات کو سنبھالنے اور ان کو ثابت کرنے کے لئے حکماء اسلام کا ایک طبقہ کھڑا ہوا جنہیں متکلمین کہتے ہیں، انہوں نے عقلی اور نقلی انداز سے عقائد کو حق ثابت کیا، استدلالات سے عقائد کا فطری ہونا ثابت کیا سب عقیدے فطرت کے مطابق ہیں، کوئی عقیدہ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اسلام میں اس کو زبردستی ٹھونس دیا گیا ہو بلکہ فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ یہ ہی عقیدہ ہونا چاہئے۔

فطرتیں مطمئن ہیں کہ یہی عقیدہ درست ہے۔ ان حکماء اسلام نے حسی، عقلی، نقلی، فطری۔ ہر طریقے سے ثابت کر دکھایا، ایک ایک عقیدے کے لئے ہزارہا دلائل قائم کئے اور اس سلسلے میں بڑی بڑی، ضخیم ضخیم، عظیم عظیم کتابیں لکھی گئیں اور حجت و برہان سے عقائد مضبوط ہو گئے۔ اس لئے کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے نہ مسلمانوں کے سامنے اور ان کے عقائد کے سامنے، اللہ جزائے خیر دے متکلمین حکماء اسلام کو کہ انہوں نے اس سلسلہ میں خدمت کی اور اس دائرہ اعتقادات کو سنبھالا اور ثابت کر دکھایا کہ حق یہ ہی ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

ائمۂ اجتہاد کی خدمات...... دوسرا شعبہ عبادات کا ہے اس کو سنبھالا ہے فقہائے اسلام نے اور ائمہ مجتہدین نے اور پھر ان کے نیچے دوسرے ائمہ کھڑے ہوئے اور فقہ کے بڑے بڑے اکابر نے اس کو مدون کیا اور مرتب کیا۔ باب وار فصل وار مسائل مقرر کئے، اپنی ترتیب کے ساتھ مسائل کو ترتیب دیا، ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئیں مستقل ایک فن بن گیا جس کے اندر ہزارہا فروع داخل ہوئیں، ائمہ اجتہاد نے اپنے تفقہ کے اصول سے قرآن و حدیث سے مسائل کا استخراج کیا، خود مسائل کو نکال کر پیش کیا اگر کہیں اصول فقہ میں اختلاف ہوا تو فروعی مسائل میں بھی اختلاف ہوا مگر سب ائمہ ہیں دین حق پر ہیں اور حق ان میں دائر و سائر ہے۔

اگر امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلافات ہیں تو وہ حق و باطل

کے نہیں کہ ایک سمت حق ہو اور ایک سمت باطل ہو، ایسا ہر گز نہیں بلکہ وہ خطاء اور صواب کے اختلافات ہیں کہ ایک طرف صواب ہے اور ایک طرف خطاء، لیکن ساتھ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ یہ صواب ہے مگر احتمال ہے کہ خطا بھی ہو اور یہ خطا ہے مگر احتمال ہے کہ صواب بھی ہو۔ اسی لئے حق دائر و سائر ہے تمام ائمہ کے اندر اور تمام کے تمام نجوم ہدایت ہیں جس کا دامن آپ تھام لیں گے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی، اگر کوئی شافعی المسلک ہے تو وہ بھی نجات یافتہ ہے۔ اگر کوئی حنفی ہے تو وہ بھی نجات کے مراتب طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مالکی یا حنبلی ہے تو وہ بھی نجات کے راستے پر جا رہا ہے اور سب اللہ و رسول کی طرف دوڑ رہے ہیں، اس لئے کہ بنیاد سب کی ایک ہے وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ البتہ استخراج مسائل میں اصول الگ الگ ہو گئے ہیں۔

اختلافِ مشرب...... اور یہ خود شریعت کی عین حکمت ہے اس لئے کہ ائمہ کے اختلاف سے امت کے اندر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اتنے راستے نکل آئے ہیں کہ جو جس ذوق کا ہے اسی راستے پر چل کر حق کو پا سکتا ہے، اگر ایک عظیم دریا ہو اور بہت بڑا لمبا چوڑا اتھاہ سمندر ہو لیکن پانی پینے کا گھاٹ ایک ہی ہو تو لوگ ہزاروں میل سے سفر کر کے آئیں گے جب ہی پانی مل سکتا ہے ورنہ وہ پانی سے محروم رہیں گے لیکن دریا اگر ایسا ہے کہ ہزاروں مشرب اور گھاٹ موجود ہیں جس سمت سے آئے وہی پانی، وہی مزہ، وہی ذائقہ ہے۔ صرف سمت بدلی ہوئی ہے۔ ایک مشرق کی طرف ہے ایک مغرب کی طرف ہے تو کچھ آسانی ہوگی کہ دریا بڑا ہے اور مشرب اور گھاٹ بہت ہیں۔ ہر طرف سے پانی مل سکتا ہے تو اسلام ایک اتھاہ سمندر ہے اس کے مشارب بہت ہیں۔ ایک مشرب حنفی ہے اور ایک مشرب مالکی ہے۔ ایک مشرب حنبلی ہے اور ایک مشرب شافعی ہے۔ اور یہ چار ائمہ وہ ہیں کہ حسن تدبیر کہئے یا تقدیر خداوندی کہئے کہ یہ چار مذہب دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔ ورنہ ائمہ اجتہاد سینکڑوں پیدا ہوئے امام بخاریؒ خود مجتہد ہیں۔ عبداللہ بن مبارکؒ خود مجتہد ہیں۔ حماد بن سلمہؒ خود مجتہد ہیں۔ سفیان ثوریؒ مجتہد ہیں۔ سفیان بن عیینہؒ مجتہد ہیں۔ ہر ایک کی فقہ الگ الگ ہے۔ لیکن یہ خدا کی طرف سے بات ہے کہ بقیہ فقہیں مندرس ہو گئیں اور باقی نہ رہے اور یہ چار فقہیں دنیا کے اندر رائج ہو گئیں۔

فقہائے اسلام اور ان کا تادب...... امام ابو حنیفہؒ کوفہ میں پیدا ہوئے خراسان کی طرف ان کا فقہ چلا تو پورا خراسان حنفی پورا افغانستان حنفی، ہندوستان کا اکثر حصہ حنفی، پورا ترکستان حنفی، جہاں جہاں ان کا فقہ پھیلا وہاں وہاں حنفی ہو گئے۔ چونکہ اللہ و رسول کی محبت انتہا پر تھی اسی لئے ادب بھی بے حد تھا۔ چنانچہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حج کو تشریف لے گئے، مدینہ منورہ روضہ اقدس پر بھی حاضری دی تو سات دن کے بعد واپسی کا رادہ کیا مگر تمام اہل مدینہ سر ہو گئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ جب سارے مصر ہو گئے تو ٹھہر گئے، دس دن ہو گئے تو پھر اجازت چاہی۔ مگر اہل مدینہ نے پھر گھیرا ڈال لیا کہ ہم ابھی اجازت نہیں دیں گے، گیارہویں دن آپ نے فرمایا کہ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ اس پر اہل مدینہ نے معلوم کیا کہ ناطاقتی کی کیا بات ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ

جب سے مدینہ میں آئے ہیں۔استنجا نہیں فرمایا ہے۔نہ پیشاب نہ پاخانہ کہ مناسب نہیں۔مدینہ کی ارضِ مقدس کو نجاست سے آلودہ کرنا اس لئے اب میرے اندر طاقت نہیں تو پھر اہل مدینہ نے خود باعزت واحترام رخصت کیا۔

یہ تھا ائمہ کا ادب واحترام کہ جتنی محبت غالب تھی ان حضرات میں اتنا ہی ادب واحترام تھا۔

اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ......آپ کی پیدائش ہوئی مصر میں مقام غزا میں، ابتدائی زمانہ مصر میں گزرا اور عمر کا اکثر حصہ حجاز میں گزرا اور عمر کا آخری حصہ بھی مصر میں گزرا۔مصر تقریباً سب کا سب شافعی المسلک ہے۔حجاز میں بھی تقریباً سب فقہ شافعی پر چل رہے ہیں۔محبت وادب میں ان کا بھی وہی حال تھا۔جو دیگر ائمہ کا ہے۔خوف و خشیت غالب اور تقویٰ اونچے درجے کا۔

اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ......امام مالک امام دارالہجرہ کے لقب سے ملقب ہیں۔مدینہ سے ان کو شغف تھا اور مدینہ شہر میں کبھی جوتے پہن کر نہ چلے،اس لئے کہ معلوم نہیں کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو اور وہاں میرا جوتا گزرے اور مدینہ منورہ میں کبھی پاخانہ پیشاب بھی نہیں کیا بلکہ اس کے لئے مدینہ منورہ سے کئی میل دور نکل جاتے تھے۔یہ ادب تھا اور تمام ائمہ میں اسی طرح سے ادب کی انتہا تھی۔امام مالکؒ نے مدینہ منورہ کو ہی اپنا وطن قرار دیا اور وہیں ہجرت فرمائی۔ان کی تمنا یہ تھی کہ مجھے مدینہ کی زمین قبول کرلے اور میں وہیں دفن ہوجاؤں۔نفلی حج بھی نہیں کرتے تھے اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں باہر میری وفات نہ ہوجائے اور میں مدینہ کی زمین سے الگ نہ ہوجاؤں۔

امام مالک نے ایک روز خواب دیکھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار مبارک قائم ہے اور امام مالک حاضر ہیں عرض کیا یارسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کرلے اور مجھے معلوم ہوجائے کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں۔سال ہے یا دو سال ہیں تاکہ مجھے اطمینان ہوجائے اور میں عمرہ کرآؤں اور حج کرآؤں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے ہاتھ اٹھایا کہ پانچویں انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ اب امام مالک حیران ہیں کہ پانچ انگلیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائی ہیں تو آیا یہ مطلب ہے کہ پانچ دن باقی ہیں میری عمر کے۔یا پانچ مہینے یا پانچ برس ہیں۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔امام مالک کے ہم عصر امام محمد بن سیرین ہیں جو تعبیر خواب کے امام ہیں اور خواب کی تعبیر پر انہوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔جلیل القدر امام ہیں اور ایسی تعبیر دیتے تھے کہ ہاتھ کے ہاتھ تعبیر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی۔ان کو یہ مناسب تعبیر سے تھی۔اس قسم کے ان کے بہت سے واقعات ہیں۔تو امام مالک نے ایک شخص سے کہا کہ تم جاکر ابن سیرین سے میرا خواب بیان کرو مگر میرا نام مت لینا۔یہ کہنا کہ مدینہ میں رہنے والے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا ہے۔اس کی تعبیر کیا ہے۔

چنانچہ وہ شخص حاضر ہوا اور اس نے ابن سیرین سے کہا کہ مدینے کے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا دیا۔اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ دن مراد ہیں یا پانچ مہینے یا پانچ برس مراد ہیں؟ ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب تو

بہت بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ جاہل کا کام نہیں کہ اس قسم کا خواب دیکھے اور نہ جاہل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب دے سکتے ہیں۔ یہ جواب تو بڑے عالم کو ہی دے سکتے ہیں۔ اور مدینہ میں اس وقت امام مالک سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ تو کہیں یہ خواب امام مالک نے تو نہیں دیکھا؟ اب وہ شخص خاموش کیونکہ اسے تو روک دیا گیا تھا کہ میرا نام مت لینا، اس نے کہا کہ اچھا مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سے اجازت لے آؤں۔ فرمایا ہاں اجازت لے کر آداؤ۔ پھر ہم خواب کی تعبیر بتلائیں گے۔ وہ گیا اور جا کر عرض کیا کہ حضرات! وہ تو پہچان گئے کہ یہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں اور نام بھی لے دیا، مگر یہ کہا کہ پوچھ کر آجاؤ پھر تعبیر بتاؤں گا۔ فرمایا اچھا جاؤ میرا نام لے دینا کہ مالک بن انس نے یہ خواب دیکھا ہے۔

اس شخص نے جا کر عرض کیا کہ حضرت! امام مالک نے ہی یہ خواب دیکھا ہے ابن سیرین نے فرمایا کہ ہاں امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ یہ خواب دیکھے فرمایا کہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیاں اٹھائیں اس سے نہ پانچ دن مراد ہیں نہ پانچ مہینے نہ پانچ برس مراد ہیں بلکہ اشارہ ہے کہ اس طرف کہ ﴿هِيَ خَمْسٌ لَايَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ① یعنی پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ﴿وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ② کسی کو پتہ نہیں کہ میرا انتقال کس زمین پر ہوگا اور میں کہاں دفن ہوں گا اور کیا وقت ہے میرے انتقال کا۔ قرآن کریم کے اندر فرمایا گیا کہ اصول غیب کے پانچ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا فرمایا گیا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ③ اس کے نظام کو صرف اللہ جانتا ہے قیامت کب آئے گی۔ کسی کو پتہ نہیں حالانکہ قیامت کا عقیدہ قطعی ہے، قرآن سے ثابت ہے ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر وقت کا پتہ کسی کو نہیں حتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پتہ نہیں۔ چنانچہ جبرئیل امین نے آپؐ سے پوچھا مَتَى السَّاعَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: ''مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ'' ④ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ مجھے علم نہیں ہے۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ قیامت آئے گی مگر یہ مجھے معلوم نہیں کہ کب آئے گی۔ یہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تو امام ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب امام مالک ہی دیکھ سکتے تھے، خواب بھی علمی ہے جواب بھی علمی ہے اور حدیث کی طرف اشارہ ہے، امام مالک ہی اس کے مخاطب بن سکتے ہیں۔ ابن سیرین نے اس آدمی سے فرمایا کہ امام مالک سے کہہ دینا کہ حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ موت کہاں آئے گی کس زمین میں آئے گی۔ اس کا علم ان پانچ چیزوں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔ ③ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۳۴۔
④ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ ج: ۱، ص: ۸۷، رقم: ۴۸۔

امام مالک یہ جواب سن کر مطمئن ہو گئے اور پھر گھر سے نہیں نکلے یہاں تک کہ وفات ہو گئی اور مدینہ کی زمین نے قبول کیا اور جنت البقیع میں مزار ہے جو ہر مسلمان کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔ تو بہر حال امام مالک امام دار الہجرہ ہیں اور ان کا زیادہ تر فقہ مغربی ممالک میں پھیلا ہوا ہے جو عرب کے مغربی حصے ہیں ان میں زیادہ تر مالکی ہی آباد ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ...... امام احمد بن حنبلؒ کا قیام نجد میں رہا ہے۔ اسی لئے نجد اور یمن کے لوگ بکثرت حنبلی ہیں اور فقہ حنبلی پر عمل پیرا ہیں۔

احسانِ عظیم...... تمام ائمہ برحق ہیں جس کا دامن تھام لو گے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی یہ سب حضرات حقانی ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے اصولِ فقہ اور اپنے اجتہاد سے کتاب وسنت سے مسائل اخذ کئے اور مسائل نکال کر دین کو باغ و بہار بنا دیا اور ایک لاء اور ایک قانون کی صورت میں فقہ کو مرتب کیا۔ جن کے ابواب الگ الگ ہیں۔ باب الافاضات، باب المعاملات، باب المساقات، باب المزارعة، باب الاراضی وغیرہ۔ سارے مسائل ان ابواب کے نیچے جمع ہیں۔ ساری چیزیں استخراج کر کے جمع کر دی ہیں۔ ان کا بھی امت پر احسان عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کے مقابر کو نور سے منور فرما دے اگر یہ استخراج نہ کرتے تو اتنی جزئیات ہمارے پاس فقہ میں موجود نہ ہوتیں۔ بڑی دقت اور دشواری پیش آتی۔

عُرفاءِ اسلام کی خدمات...... عرفاء اسلام جن کا دوسرا نام صوفیاء کرام ہے۔ ان حضرات نے اخلاقیات کو سنبھالا ہے اس طرح پر کہ بال کی کھال نکال کر انسانوں کے سامنے پیش کر دی۔ روح کی حکمت بیان کی اور بتایا کہ نفس میں اتنی مکاریاں ہیں ان کا توڑ یہ ہے۔ کہ اگر نفس میں یہ کید پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے اور نفس میں یہ خواہش پیدا ہو تو اس کا دفعیہ یہ ہے۔ اور کوئی رغبت اور تمنا پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے۔ یہ ان حضرات صوفیاء ہی کا طفیل ہے کہ حکمت قلب کی انہوں نے تعلیم دی اور انہوں نے دلوں کو منور کیا اخلاق سے اور ان ہی اخلاق کے ذریعہ تزکیہ نفس کیا اور انسان کو انسان بنایا۔ **فَجَزَا هُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَآءِ**

اُمراءِ اسلام کی خدمات...... اُمراء اسلام انہوں نے شعبہ معاملات کو سنبھالا۔ لین دین اور جھگڑوں کے فیصلوں پر امراء اسلام مقرر ہوئے، دنیا بھر کے جھگڑے نمٹائے۔ لوگوں کے مقدمات فیصل کئے، فوجداری کے الگ دیوانی کے الگ ہر ہر دائرے کے مقدمات سنبھالے اور مستقل کتابیں لکھیں گئیں، حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب ہے ''السیاسۃ الشرعیۃ'' اور اسی طرح بہت سے ائمہ علوم نے کتابیں لکھیں کسی نے سیاست کے اصول واضح کئے ہیں، فصل خصومات اور مقدمات کا فیصلہ کرتے کے لئے اس لئے ان امرا نے بہت اونچا کام کیا ہے کہ اس شعبہ کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ **فَجَزَا هُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَآءِ**

خُلفاءِ اسلام کی خدمات...... اس پانچویں شعبہ کو سنبھالا ہے خلفاء اسلام نے جیسے صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ وغیرہ یہ حضرات درحقیقت ذمہ دار تھے ملک کے نظام کے تنظیم ملت اور تنظیم امت کے ان حضرات نے پوری امت

کو اور مغرب و مشرق کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا کہ نہ آپس میں لڑیں نہ جھگڑیں نہ تعصبات برتیں نہ آپس میں گالم گلوچ کریں نہ سب وشتم کریں۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو محبت سے پیش کر دیں، دوسرا محبت سے جواب دے۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے معذور سمجھے اور یہ خیال کرے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ دوسرا حق پر ہو۔ یہ کہنا کہ میں ہی حق پر ہوں، دوسرا غلطی پر ہے۔ رائے دہی کے معاملہ میں بالکل غلط چیز ہے۔

خلفاء کیلئے طریق عمل...... سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے اپنے ایک خلیفہ کو خلافت عنایت فرمائی اس زمانے کے دستور کے مطابق پگڑی باندھی اور کچھ وصیتیں کیں اور کہہ دیا کہ تم میری طرف سے نائب اور خلیفہ ہو جا کر لوگوں کی تربیت کرو، اصلاح کروان خلیفہ نے رخصت کے وقت عرض کیا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرمایئے تا کہ میں اس نصیحت پر کاربند رہوں۔ حضرت نے دو باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ: نہ تو نبوت کا دعویٰ کرنا اور نہ خدائی کا دعویٰ کرنا۔

خلیفہ یہ سن کر حیران و پریشان ہوئے کہ حضرت آپ کا خادم غلام برسوں آپ کی صحبت میں رہا کیا مجھ سے یہ ممکن ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا غلام ہو وہ کب نبوت کا دعویٰ کرے گا؟ تو حضرت نے یہ کیسی نصیحت فرمائی۔ نصیحت فرماتے کہ بھائی عبادت میں ثابت قدم رہنا اخلاق کی حفاظت کرنا مخلوق کی اصلاح کرنا اور یہ کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا یہ تو ہم لوگوں سے ممکن ہی نہیں اس نصیحت سے کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی فرمایا کہ اس کے معنی سمجھ لو پھر بات سمجھ میں آجائے گی۔

فرمایا: کہ خدا کی ذات وہ ہے کہ جو کہہ دے وہ اٹل ہو۔ اگر وہ چاہے کہ زمین بنے تو زمین بن کر رہے۔ ناممکن ہے کہ نہ بنے۔ ارادہ خداوندی پر مراد کا مرتب ہونا قطعی اور لازمی ہے یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ ارادہ فرمائیں اور وہ پورا نہ ہو وہ تو قادر مطلق ہیں۔ ﴿اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ﴾ ① اگر وہ ارادہ کرے کہ جہان بنے تو اسے محنت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسباب فراہم کریں، وہ اسباب کے محتاج نہیں۔ اسباب کے تو وہ خالق ہیں وہاں تو منشاء ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے تو اللہ کی ذات وہ ہے کہ جو وہ ارادہ کرے اور کہہ دے وہ اٹل ہو ٹلنے والی چیز نہ ہو۔

اور دعویٰ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ جو فرما دے وہ حق ہو۔ یوں ممکن ہی نہیں کہ نبی کی زبان سے کوئی ناحق چیز نکلے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے وہ حق ہوگا اور جو کر کے دکھائیں گے وہ بھی حق ہوگا۔ ناحق کا وجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ نبی جو کہے گا وہ حق ہوگا اور اس کے خلاف باطل ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کبھی خلاف حق نہیں ہو سکتی ہے، اگر تم نے جا کر یہ کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اور میری رائے اتنی حق ہے کہ دوسرا سامنے نہیں آ سکتا۔ تو یہ در پردہ نبوت کا دعویٰ ہوگا۔ میں تم کو اسی کی

① پارہ: ۲۳، سورۃ یٰسٓ، الآیۃ: ۸۲.

نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ نہ کرنا۔ نبوت کا دعویٰ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم یوں کہو کہ میں نبی ہوں بلکہ اپنے اندر خاص وہ شان پیدا کر کے جو نبی کے اندر ہوتی ہے یوں کہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اس کیخلاف سب باطل ہے۔ اس چیز کا مدعی بننا در پردہ نبوت کا دعویٰ ہے اور جو یوں کہے کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مخلوق کٹ جائے، خون بہہ جائے مگر یہ ہو۔ یہ در پردہ خدائی کا دعویٰ کرنا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے ارادے کو یوں مت سمجھنا کہ یہ اٹل ہے اور ہونا ہی چاہئے اور اس کیخلاف ممکن نہیں حالانکہ ہر چیز میں تمہارا خلاف ممکن ہے، یہ تو ہوا دعویٰ خدائی کا حاصل۔ اور دعویٰ نبوت کا حاصل یہ کہ جو تمہاری زبان سے نکل جائے اس پر جمے رہو گویا کہ اس کیخلاف باطل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے وہ خدا کا مقام ہے اور یہ نبی کا مقام ہے۔

تو حضرت شیخ نے بڑے بلیغ پیرائے میں نصیحت فرمائی۔ ظاہر میں تو بڑی وحشت ناک نصیحت تھی کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا، نبوت کا دعویٰ مت کرنا، مگر جب معنی بیان کئے خدائی اور نبوت کے تو سمجھ میں آ گیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی در پردہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ جو جمود کرتے ہیں کہ وہی صحیح ہے جو ہم کہہ رہے ہیں۔ وہ در پردہ نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ورنہ ان پر کوئی وحی یا الہام آ رہا ہے کہ وہی حق کہہ رہے ہیں دوسرا حق کہہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ مسئلہ جو قرآن وحدیث سے ثابت شدہ ہے اس کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہی حق ہے اس کیخلاف ہرگز نہیں۔ ہاں اپنی رائے اور فکر کے بارے میں یہ کہیں کہ یہ ہی حق ہے یہ نہیں ہونا چاہئے۔

ان جھگڑوں کا فیصلہ جب ہی ہو سکتا ہے جب امت کا نظام بنا ہوا ہو پھر اس قسم کے مدعی مغلوب ہو جائیں گے اور واقعی جو حقانی لوگ ہیں وہ غالب آ جائیں گے۔ یہ کام ہے نظام و تنظیم کا جب تک تنظیم نہ ہو، نظام نہ ہو اس وقت تک معاملہ نہیں سلجھ سکتا ہے۔ اس خدمت کو انجام دیا ہے خلفاء اسلام نے یہ ہی درحقیقت ملک کے نظام اور تنظیم ملت کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی حضرات نے امت کو جوڑا ہے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔

محافظین شئون نبوت کی تعظیم ضروری ہے...... خلفاء اسلام نے تنظیم ملت کی ذمہ داری قبول کی۔ امراء اسلام نے جھگڑوں اور فیصلوں کو نمٹایا عرفاء اسلام نے اخلاق درست کئے فقہاء اسلام نے عبادات کو صحیح کیا اور حکماء اسلام نے عقائد کو درست کیا۔ یہ پانچ طبقے اکابر اہل اللہ کے ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے جنہوں نے ان پانچ شعبوں کو مضبوط کیا اور مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور امت کے سامنے پیش کیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ ایک مقدمہ ہوا تفصیل اس میں بہت ہے مگر میں زیادہ تفصیل نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے ایک لفظ کہا تھا کہ طالب علمانہ انداز میں کہوں گا یہ تو محض طالب علمانہ انداز ہے جو درس و تدریس میں طالب علموں کے سامنے کہا جا سکتا ہے اگرچہ آپ عرفی طور پر طالب علم نہیں ہیں مگر حقیقتاً تو طالب علم ہیں ورنہ جلسوں میں کیوں آتے؟ علم کی طلب ہی تو آپ کو لے کر آئی ہے۔ آپ بھی طالب علم ہیں اور میں بھی ایک طالب علم ہوں۔ اور آپ سے کم رتبہ ہوں درس و تدریس نہ سہی مگر کچھ تو سمجھ جائیں گے۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اتنی بات تو آپ سمجھ گئے ہوں گے جو میں نے کہی ہے کہ پانچ شعبے ہیں اور ان پانچوں شعبوں کو پانچ طبقات نے اٹھایا ہے اور وہ طبقے سب کے نزدیک معظم و مکرم ہیں اس لئے امراء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ اسی طرف عرفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ اور خلفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں۔ تو آدمی اپنی کس آنکھ کو پھوڑ لے؟ سب کو یکساں طور پر ہم کو اپنے سر پر رکھنا پڑے گا اسی بنا پر سب ہمارے نزدیک معظم و مکرم ہیں سب کے آگے گردن جھکانا ہمارا کام ہے۔

اگر کوئی شخص محدث کے آگے گردن جھکا دے۔ اور فقیہ کیخلاف کرے۔ وہ درحقیقت امتی ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا ہے، امت کا صحیح فرد وہ ہے کہ حکماء فقہاء صوفیاء عرفاء امرا خلفاء سب کو واجب التعظیم سمجھ کر سب کے آگے گردن جھکا دے۔ اس لئے کہ یہ پانچوں طبقے وہ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک شان کو سنبھالا ہے آپ کی ایک شان عقیدے کی ہے۔ ایک شان عبادت کی ہے ایک شان اخلاق کی ہے ایک شان معاملات کی ہے ایک شان خلافت و تنظیم ملت کی ہے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ شانیں ہیں، انہیں ٹکرانے کا یہ مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانوں میں تعارض پیدا کر رہے ہیں جو لوگ ان میں باہم ٹکر دے رہے ہیں یہ سوائے جہل کے اور کیا ہوسکتا ہے؟ شؤن نبوت میں ٹکراؤ پیدا کرنا علم والے کا کام نہیں ہے اور نہ علم والے کا کام یہ ہے کہ طبقات امت میں ٹکراؤ پیدا کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے گردن جھکا دے اور ہر ایک تعظیم و تکریم ضروری سمجھے۔

نظم مسائل...... ایک دوسری بات اور سمجھ لیجئے وہ طالب علمانہ ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر طبقے نے کتاب و سنت سے نظم قائم کیا ہے یعنی اسلامی مسائل بے تکے نہیں ہیں ہر مسئلہ ایک لڑی کے اندر پرویا ہوا ہے اور مسائل کا ایک نظام ہے۔ اور پورے مسائل منظّم ہو کر ایسے ہیں جیسے موتیوں کا ایک ہار ہوتا ہے اگر ایک موتی بیچ سے نکال دو تو ہار ناقص ہو جائے گا اور چونکہ ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے لہٰذا ہر شعبہ نہایت منظّم ہے۔

تنظیم بلا امام ممکن نہیں...... آپ جانتے ہیں کہ نظم و تنظیم بغیر امام کے نہیں ہوتی مثلاً اگر تسبیح میں ایک ہزار دانے ہیں مگر امام نہ ہو جسے القند کہتے ہیں۔ وہ ایک لمبا دانہ ہوتا ہے تسبیح کے درمیان وہ اگر بیچ میں نہ ہو تو وہ تسبیح نہ ہوگی بلکہ مالا کہلائے گی۔ اگر تسبیح ہی بنانی ہے تو ایک گرہ بیچ میں ضرور ہونی چاہئے جسے آپ امام کہیں اسی سے سارے دانے جڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ گرہ آپ اگر کھول دیں تو سارے دانے بکھر جائیں گے۔ جھاڑو میں ہزاروں سینکیں ہوتی ہیں ایک سینک کو آپ چٹکی سے مسل دیں تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن اگر بندھن باندھ کر جھاڑو بنائیں تو گھر کا کوڑا کباڑ آدھ گھنٹے میں صاف کر دیں گی۔ ایک سینک یہ کام نہیں کرسکتی ہے ساری سینکیں مل کر پھینکیں گی۔ اور ملنے کی شرط یہ ہے کہ ان میں بندھن بندھے وہی بندھن ان کا امام ہے اگر ان میں بندھن نہ ہو تو وہ منتشر ہو جائیں گی۔ بکھر جائیں گی کوڑا کباڑ تو کیا صاف کرتیں وہ خود کباڑ بن جائیں گی۔ لیکن اگر بندھن باندھ دیا اور ایک ڈورے کے تابع کر دیا ان کو تو سارے گھر

کا کوڑا صاف ہو جائے اور جھاڑو ایک جگہ رکھی ہوئی موزوں نظر آئے گی۔ گویا کہ صاف کرنے کا آلہ موجود ہے۔ جو بڑے سلیقہ سے رکھا ہوا ہے۔ بغیر امام و بندھن کے نظام قائم نہیں ہو سکتا ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے ہر چیز میں اس نے نظم قائم کیا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھوں اور جماعت کے اندر بھی پھر ترتیب قائم کی ہے کہ امام کیا کرے گا اور تم کیا کرو گے۔ امام کیا پڑھے گا اور تم کیا پڑھے گے اس میں تمہیں آزادی نہیں بلکہ ایک نظم کے تحت نماز پوری کرنی ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے: اِذَا قَالَ الْاِمَامُ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِیْنَ. یہ حدیث کا آخری ٹکڑا ہے مطلب یہ ہے جب امام اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے سب اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہؤ جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، وہ سجدے کرے تم بھی سجدہ کرو، وہ قیام کرے تم سب قیام کرو اور جب امام وَ لَا الضَّآلِّیْنَ کہے تم آمِیْن کہو اور جب وہ سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔

تو تم کلیۃً امام کے تابع ہو ہر نقل و حرکت میں اگر تابع نہ ہوئے اور اطاعت نہ کی تو آپ جماعت سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے امام سے پہلے سلام پھیر دیا تو بس گئی آپ کی نماز اس لئے کہ آپ امام سے منحرف ہو گئے۔ جماعت کی نماز بن نہیں سکتی جب تک آپ اطاعتِ کامل نہ کریں۔ لیکن اِنفرادی طور پر بھی اللہ نے اجازت دی ہے کہ پڑھ لیا کرو جتنی چاہے پڑھو لیکن جماعت سنتِ موکدہ ہے اور بعض ائمہ کے یہاں واجب قرار دی گئی ہے اور بعض کے یہاں فرض ہے کہ اگر نماز با جماعت ترک کر دی تو وہ اس کا مستحق کہ اس کو قتل کر دو یا جیل میں ڈال دو۔ امام ابو حنیفہؒ کے یہاں یہ سہولت ہے کہ وہ جماعت کو سنت موکدہ کہتے ہیں جو قریب واجب کے ہوتی ہے تو جماعت بن نہیں سکتی جب تک امام نہ ہو اور امام، امام نہیں ہو سکتا جب تک کہ سب مطیع نہ ہوں امام بنا دیا اور مقتدی کھڑے ہو گئے، لیکن کوئی تکبیر کہتا ہے تو کوئی تکبیر کے بجائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتا ہے۔ کسی نے سجدہ کیا تو کسی نے رکوع کیا۔ کسی نے مغرب کی طرف منہ کیا تو کسی نے مشرق کی طرف منہ کیا تو امام ہوا نہ ہوا برابر ہے۔ امام جب ہی بنتا ہے جب سب مطیع ہوں۔

سمع و طاعت...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَلَوْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبْشِیٌّ مُجَدَّعُ الْاَطْرَافِ" (1) "سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر امیر مقرر کر دیا جائے کسی ایسے حبشی غلام کو جس کے ہاتھ پیر بھی کٹے ہوئے ہوں"۔ کوئی صورت وجاہت کی نہ ہو اور قوم مل کر اسے امیر بنا دے تو مامورین پر سمع و طاعت فرض ہے اس کے خلاف مت کرو امت کا نظم جب ہی باقی رہ سکتا ہے، نماز فرض کی تو اس میں جماعت کا حکم دیا اور جماعت کے لئے امام بنانے کی لازمی طور پر ضرورت پڑے گی۔

فرائض امیر...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما ہیں اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے چند صحابہ کو ساتھ لے کر سفر کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھائی کسی کو امیر مقرر کر لو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے

---

(1) السنن للترمذی، ابواب الجھاد والسیر، باب ماجاء فی طاعۃ الامام، ج: ٦، ص: ٢٩٨، رقم: ١٦٢٨۔

زیادہ افضل ہم میں کون ہے؟ کہ جس امیر بنادیں آپ افضل الصحابہؓ ہیں فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کوئی اور بن جائے۔ عرض کیا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر کار سب نے مل کر حضرت صدیق اکبرؓ کو ہی امیر بنادیا۔

حضرتؐ نے فرمایا کہ جب میں امیر بن گیا تو اطاعت کرو گے۔ عرض کیا کہ لازمی طور پر کریں گے عہد و پیمان لیا کہ منحرف تو نہیں ہو گے؟ عرض کیا کہ قطعاً نہیں۔ جب منزل پر پہنچے تو سب کے بستر کھول کر بچھانے شروع کئے لوگوں نے کہا حضرت ہم بچھائیں گے فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو امیر کی اطاعت واجب ہے کسی کو بسترہ نہیں بچھانے دیا کبھی جگہ صاف کر رہے ہیں کبھی کپڑا بچھا رہے ہیں جہاں کوئی آیا کہ حضرت میں کروں گا یہ کام فرماتے کہ میں امیر ہوں امیر واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

لوگ عاجز آ گئے کھانا پکانے کا وقت آتا۔ تو جنگل سے لکڑیاں لا رہے ہیں کبھی بازار میں گوشت خریدنے جا رہے ہیں لوگوں نے عرض کیا حضرت! ہم یہ کام کریں گے۔ فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو لوگ عاجز آ گئے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ہمارے امام مقتداء بڑے اور ساری خدمات انجام دے رہے ہیں ہمارے جوتے بھی سیدھے کر رہے ہیں بستر بھی بچھا رہے ہیں کھانا بھی پکا رہے ہیں اور کوئی بول بھی نہیں سکتا اور جہاں کوئی بولا تو انہوں نے کہا کہ میں امیر ہوں واجب الاطاعت ہوں اس لئے لوگ عاجز آ گئے۔

عجیب لطیفہ...... اس سفر میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا۔ وہ بھی سنا دوں۔ گو مضمون سے متعلق نہیں مگر اس واقعہ کا جز ہے کہ ایک روز حضرت صدیق اکبرؓ نے کھانا وغیرہ پکا دیا مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی کام سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک صحابیؓ کو بھوک بے تحاشہ لگی۔ انہوں نے کھانے کے نگران سے کہا کہ بھائی کم از کم مجھے ایک روٹی دے دو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔ نگران نے کہا جب تک امیر نہیں آئیں گے اور ان کی اجازت نہیں ہوگی تو میں کھانا نہیں دوں گا۔ انہوں نے بہت منت سماجت کی کہ بھائی مجھے ضعف طاری ہو رہا ہے۔ بھوک ستا رہی ہے۔ ایک آدھ روٹی دے دو! کچھ سہارا ہوگا۔ انہوں نے پھر انکار کیا اور ان کو روٹی نہیں دی۔

تو صحابہؓ جیسے مقدس ہیں ویسے ہی اندر خوش طبعی بھی ہے۔ فرمایا کہ اچھا میں تجھے سمجھوں گا نہ دے تو روٹی۔ اسی حال میں بھوکے بیٹھے رہے، کچھ دیر کے بعد وہ جنگل کی طرف اٹھ کر چلے، اچانک دیکھا کہ ایک دیہاتی اونٹ پر بیٹھا ہوا آ رہا ہے۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ لباس سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی گاؤں کا بڑا آدمی ہے اور اچھی خاصی عمدہ اونٹنی پر سوار ہو کر آ رہا ہے۔ ان صحابیؓ نے کہا کہ چودھری صاحب کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا مجھے ایک غلام خریدنا ہے کھیتی باڑی کے کام کے لئے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس غلام موجود ہے اور پانچ سو درہم میں بیچ سکتا ہوں۔ چودھری صاحب نے کہا کہ پانچ سو درہم کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر غلام اچھا ہے انہوں نے کہا کہ بہت سمجھ دار ہے معاملہ طے ہو گیا اور پانچ سو درہم لے کر اشارہ ان کی طرف کیا جنہوں نے روٹی نہیں دی تھی کہ وہ بیٹھا ہوا ہے اس کو جا کر پکڑ لو اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے دماغ میں تھوڑی سی سنک ہے جب کوئی پکڑنے جاتا ہے تو کہتا ہے

کہ میں غلام کب ہوں؟ میں تو آزاد ہوں۔اس کا خیال نہ کیجئو انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا۔بعضوں کے دماغ میں ہوا ہی کرتی ہے۔ایسے میں انہوں نے کہا کہ چلائے گا بھی کہ میں غلام کب ہوں؟۔ میں تو حر ہوں۔آزاد ہوں اس کا بھی خیال نہ کیجیو یہ اس کی عادت ہے۔انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔

چودھری صاحب نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا چل میرے ساتھ! اس نے کہا کہ: کہاں چلوں؟ چودھری صاحب نے کہا کہ: میرے گھر، اس نے کہا کہ: کیوں؟ کہنے لگے: میں نے تجھے خریدا ہے۔اس نے کہا کہ: واللہ میں غلام نہیں ہوں، میں تو آزاد ہوں، اس نے کہا: مجھے معلوم ہے کہ تیری عادت یہی ہے۔اب یہ چلا رہا ہے کہ میں آزاد ہوں۔حر ہوں۔مگر چودھری صاحب نے ایک نہ سنی۔چودھری صاحب چونکہ طاقت ور تھے، زبردستی اٹھا کر اونٹ پر سوار کیا اور لے جانا شروع کیا اور اس نے ہائے وائے شروع کی کہ مجھے غلام بنا دیا، میں تو آزاد ہوں۔اس نے کہا کہ میں تیری ساری داستان سن چکا ہوں۔تیری عادت ہی یہ ہے۔

ادھر سے صدیق اکبرؓ چلے آ رہے تھے دیکھ کر یہ چلائے کہ امیر المومنین میرا تو ناطقہ بند کر دیا ہے اور مجھے غلام بنا دیا ہے اور یہ چودھری مجھے لئے جا رہا ہے۔صدیق اکبرؓ کا سبھی لوگ احترام کرتے تھے۔چودھری اتر ا سواری سے اور سلام عرض کیا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی یہ تو میرا ساتھی ہے اسے تو کہاں لئے جا رہا ہے۔کہنے لگا حضرت جی میں نے تو اسے پانچ سو درہم میں خریدا ہے۔فرمایا کہ یہ غلام نہیں، یہ آزاد ہے یہ کس نے بیچا ہے۔اشارہ کیا کہ فلاں صاحب نے بیچا ہے۔میں نے رقم بھی ان کو ہی دی ہے۔انہوں نے کہا کہ غلام موجود ہے لے جاؤ، حضرت صدیق اکبرؓ سمجھ گئے کہ کسی نے مذاق کیا ہے ان کے ساتھ جب واپس آئے تو جنہیں روٹی نہیں ملی تھی انہوں نے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اب کہو کیا حال ہے۔تو نے مجھے روٹی سے عاجز کر رکھا۔اب بتا۔صدیق اکبرؓ جب پہنچے تو فرمایا: کیا واقعہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی میں نے اس کی بہت منت کی کہ بھائی آدھی ہی روٹی دے دو، کچھ سہارا ہو جائے گا۔اس نے کہا: جب تک امیر نہیں آئیں گے میں نہیں دوں گا، تو میں نے بھی ایک مذاق کیا کہ اس کو پانچ سو درہم میں بیچ دیا۔تو حضرت صدیق اکبرؓ بہت ہنسے وہ پانچ سو درہم واپس کئے گئے، جب اس کی گلوخلاصی ہوئی۔یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سنایا گیا تو آپ مسکرائے اور منہ پر رومال رکھ لیا جب بھی اس واقعہ کا ذکر آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے اور منہ پر رومال رکھ لیتے۔گویا یہ عجیب لطیفہ بن گیا۔

نظم اجتماعیت...... یہ واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ نماز کے اندر بھی جماعت رکھی ہے اور اس جماعت کا ایک امام مقرر کیا ہے اور وہ بھی مطاع جس کی اطاعت کی جائے سفر پیش آئے تو اس میں ایک امام بنا لیا جائے تا کہ سفر منظم ہو گھر میں اگر ہو تو ایک کو بڑا سمجھ لو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو گھر میں نظام پیدا ہوگا۔حج رکھا تو اس میں امام الحج مقرر کیا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔زکوٰۃ رکھی تو بیت المال میں ایک کو امام مقرر کیا کہ وہ ہر چیز کی زکوٰۃ وصول کیا کرے تو ہر چیز میں ایک جماعتی اور

اجتماعی نظم قائم کیا اور اس کا ایک ایک امیر مقرر کیا اور اس کی سمع وطاعت واجب قرار دی کہ اس کی اطاعت کرو۔

اس طرح ہر فن کا ایک امام مقرر ہے عقیدہ میں مرکز حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے اس میں امام مقرر کئے گئے۔ چنانچہ عقائد میں دو بڑے بڑے امام ہیں۔ ایک امام ابومنصور ماتریدی ہیں اور ایک امام ابوالحسن اشعری ہیں یہ دو امام ایسے سمجھے جاتے ہیں کہ جن کی رائے فن عقائد میں فن کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اشعری ہیں اور بعض لوگ اپنی نسبت دوسرے امام کی طرف کر کے اپنے آپ کو ماتریدی کہتے ہیں ان میں آپس میں کچھ تھوڑے بہت اختلافات بھی ہیں مگر وہ اختلافات لفظی کے قریب قریب ہیں۔ عقائد سب کے ایک ہی ہیں' جب اس فن کا کوئی بڑا مسئلہ پیش آوے تو رجوع کرو اس کی طرف کہ امام ابوالحسن نے یہ کہا ہے۔ فقہ کا مسئلہ ہو تو اس میں ایک امام مقرر کرو امام شافعیؒ ہوں، امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ ہوں جب کوئی مسئلہ اختلافیہ آئے تو کسی ایک کی اطاعت کرلو تاکہ تمہارے اندر نزاع نہ پیدا ہو۔

مبنی بر حجت اختلاف مذموم نہیں...... اس لئے کہ مسئلہ میں نزاع نہیں۔ مسئلہ میں اگر اختلاف ہو تو اختلاف حجت کا ہوتا ہے اور نزاع وجدال جو ہوتا ہے وہ نفسانی جذبے کے تحت ہوتا ہے اور وہ برا ہوتا ہے اور حجت سے جو اختلاف ہوتا ہے وہ برا نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ ہر اختلاف برا نہیں ہے۔ مثلاً چور اور ڈاکو اتفاق کرلیں تو یہ اتفاق اچھا نہیں ہے۔ برائی میں اگر لوگ متحد ہو جائیں تو وہ اتحاد بھی برا ہوگا اور اگر بھلائی کے اوپر لوگ جمع ہو جائیں تو وہ اتحاد اچھا ہوگا۔

اب اختلاف کو لے لو اگر اختلاف حجت سے ہو اور اللہ ورسول کا حوالہ دیانت سے ہو تو وہ ایک پہلو ہوگا دین کا۔ وہ اختلاف ہوگا مگر جھگڑا نہ ہوگا۔ کیونکہ حجت اس میں موجود ہے۔ یہ جھگڑے اصل میں ہم اپنے جذبات سے کرتے ہیں اور مسئلوں کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑنا نہیں ہے اگر مسئلوں کی خاصیت لڑنا ہوتا تو پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی کہ کوئی رفع یدین کررہا ہے کوئی نہیں کررہا ہے۔ کوئی امین بالجہر کررہا ہے کوئی امین بالسر کررہا ہے۔ کوئی فاتحہ کو امام کے پیچھے واجب قرار دیتا ہے اور کوئی ناجائز قرار دے رہا ہے تو سب سے پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی اگر مسئلہ کی خاصیت لڑنا ہوتا۔ مگر سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کررہے ہیں اور ایک دوسرے کی عظمت بھی قلب میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اس کے بعد ائمہ مجتہدین میں ڈنڈا چلتا جن میں اختلاف ہے۔ خوب لڑائی ہوتی مگر سارے ائمہ باہم متحد ہیں اس لئے کہ وہ اختلافات فروعی ہیں اور بنیادیں سب کی ایک ہیں۔ اس لئے قلوب میں سب ایک دوسرے کی عظمت لئے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ بغداد میں امام ابوحنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو فاتحہ پڑھی اور ایصال ثواب کیا۔ وہیں مسجد تھی جب نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھی اور اپنا مسلک ترک کر کے امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھی اور امام شافعیؒ کا مسلک جو کہ مستحب کے درجہ میں تھا یعنی رفع یدین نہیں کیا اور آمین زور سے نہیں کہی۔ پوچھنے پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ''مجھے صاحب مزار سے حیاء آتی ہے کہ ان کے قریب ہو کر ان کے مسلک کے خلاف عمل کروں۔ جس جس مسئلہ میں گنجائش تھی اس میں فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھی اور جہاں جہاں جائز و ناجائز کا

اختلاف تھا اس میں وہ معذور تھے‘‘۔ چونکہ ان کی عظمت قلب میں موجود تھی اس لئے ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ مسئلہ کہ خاصیت لڑائی نہیں بلکہ اپنے نفسانی جذبات سے لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔

آمین بالشر...... ہمارے بچپن کا زمانہ تھا ہمارے ہاں سہارنپور میں مارچ نام کا ایک کلکٹر تھا۔ تھائی لینڈ کا رہنے والا نسلاً یورپین تھا۔ مگر مذاق وذوق اس کا ایشیائیت کا تھا کیونکہ اس کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ اس کے زمانے میں ایک جھگڑا پیش آیا کہ ایک حنفی کہیں اہل حدیث کی مسجد میں چلا گیا۔ انہوں نے زور سے آمین کہی۔ اس نے آہستہ سے کہی۔ وہاں سب جہلا جمع تھے انہوں نے اس کی مار پٹائی کی کہ اس نے زور سے آمین نہیں کہی۔ پٹتے پٹتے وہ چلایا کہ حنفیو! دوڑو، دوڑو، تمام حنفی جمع ہو گئے انہوں نے اہل حدیث پر حملہ کر دیا۔ اب اہل حدیث چلائے کہ اے اہلحدیث دوڑو! ادھر سے اہل حدیث آ گئے۔ غرض لاٹھی چلی کتنوں کے ہی سر پھٹے۔ بلوہ عام ہو گیا فریقین سے رپورٹ درج کرائی۔

مارچ کا زمانہ تھا اس کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین کے وکلاء نے بحث کی آمین کے مسئلہ میں۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آئی اس نے کہا کہ بھائی کیا آمین کسی جائیداد کا نام ہے؟ یا کوئی جاگیر ہے؟ یا کوئی بلڈنگ ہے؟ آخر تم کس چیز پر لڑ رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ صاحب! مسئلہ ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلے پر کیوں لڑتے ہو؟ لڑائی عورت پر ہوتی ہے دولت پر ہوتی ہے۔ جائیداد پر ہوتی ہے۔ مسئلہ پر کیوں لڑتے ہو۔ آخر یہ لڑائی کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے کہ صاحب ایک حدیث میں آیا ہے کہ آمین زور سے کہو اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ آہستہ سے پڑھو۔ اس نے کہا بھائی، جسے زور سے پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ زور سے پڑھے اور جسے آہستہ پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ آہستہ سے پڑھے۔ آپس میں لڑتے کیوں ہو۔ اپنی اپنی حجت پر عمل کرو۔ اس کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ آمین پر لڑائی کیسے ہو سکتی ہے۔ بات بھی ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے کی تھی۔ اس نے تحقیق کر کے فیصلہ لکھا اور فیصلہ بڑا دانشمندانہ لکھا۔ اس نے لکھا کہ میں روداد مسلہ کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ: ’’مسلمانوں کے یہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ **1** آمین بالجھر یعنی زور سے امین پڑھنا۔ **2** آمین بالسر یعنی آمین آہستہ سے پڑھنا **3** امین بالشر یعنی جھگڑا اٹھانے کے لئے آمین پڑھنا۔ یہ جتنا جھگڑا ہے نہ آمین بالجھر کا ہے اور نہ آمین بالسر کا کیونکہ دونوں کے بارے میں پیغمبرؐ سے حدیث وارد ہے اور یہ جھگڑے کی چیز نہیں۔ یہ سارا جھگڑا آمین بالشر کا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں فریق مفسد ہیں۔ میں دونوں کو سزا کرتا ہوں‘‘۔

مسائل کی آڑ میں اندرونی بخار نکالنا...... مطلب یہ کہ ہم لوگ آپس میں نفسانی جذبے کے تحت لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑائی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب وسنت کی حجت ہے اس پر عمل کریں۔ لڑائی کے کیا معنی اور نفرت کے کیا معنی؟ آپس میں مل کر رہو اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو جبر تھوڑا ہی ہے۔ ان کے پاس بھی حجت ہے وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔ یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ وہ فاسق ہے۔ کافر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ لہٰذا میری بات مانو۔ دوسرا باطل محض ہے۔ اس لئے وہ حق پر نہیں۔ یہ کہنا غلط بات۔ یہ

مسائل صرف آڑ ہیں ورنہ حقیقی لڑائی تو نفسانی جذبات کی وجہ سے پیش آتی ہے۔لڑلڑ کر مسلمانوں نے حکومتیں برباد کیں۔اپنی جائیدادیں تباہ کر دیں۔اپنی بلڈنگیں برباد کر دیں، جب یہ دنیا چلی گئی تو رہ گیا دین اور لڑنا ضروری تھا۔ اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔کہا کہ اب دین کو آڑ بناؤ۔اب جائیدادیں نہیں تو مسئلوں پر لڑو۔فروعات پر لڑو۔یہ صرف نفسانی جھگڑے ہیں۔اگر حجت ہاتھ میں ہے تو اس میں جھگڑا ہی نہیں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اس لئے زور سے آمین کہتا ہوں۔امام ابوحنیفہؒ کہیں گے کہ آپ معذور ہیں کیونکہ آپ کے پاس حجت ہے۔میرے پاس حدیث ہے۔میں آہستہ سے آمین کہتا ہوں چونکہ میرے پاس حجت ہے امام شافعیؒ کہیں گے آپ بھی معذور ہیں چونکہ آپکے پاس بھی حجت ہے۔آپ بھی حق پر عمل کرر ہے ہیں۔میں بھی حق پر عمل کرر ہا ہوں۔معاملہ ختم ہوا نہ دوستی گئی، نہ نفرت پیدا ہوئی۔نہ جھگڑا پیدا ہوا اس لئے کہ حجت ہے۔جہاں اختلاف بلا حجت ہوتا ہے۔تعصب سے،عناد سے، پارٹی بندی سے وہاں اصل میں لڑائیاں نفسانی جذبے کے تحت ہوتی ہیں۔وہ مسئلے کی لڑائی نہیں ہوتی۔وہ تو مسئلہ کو آڑ بنا کر اپنا اندرونی بخار نکالنا مقصود ہوتا ہے۔

توحید مقصد...... میں عرض کرر ہا تھا کہ فقہ کے مسئلے میں بہر حال کسی کو امام بنانا پڑے گا، جہاں اختلافی مسئلہ آوے کسی امام کی طرف رجوع کرے اور یہ فطری چیز ہے۔مثلاً آپ علاج کرائیں اور چار طبیبوں کی چار رائیں ہو جائیں۔ایک کہے کہ میں گرم دوائیں دوں گا۔ایک کہے کہ میں ٹھنڈی دوائیں دوں گا۔ایک کہے میں خشک دوائیں دوں گا۔ایک کہے کہ میں تر دوائیں دوں گا۔کیا کبھی آپ نے یہ کیا ہے کہ چونکہ طبیب آپس میں لڑر ہے ہیں۔لہٰذا مجھے انتقال کر کے قبر میں چلا جانا چاہئے۔میں علاج نہیں کراؤں گا۔چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ان اطباء میں سے آپ انتخاب کرتے ہیں کہ کسی ایک کی طرف رجوع کریں خواہ انتخاب کی کوئی بھی وجہ ہو۔خواہ یہ وجہ ہو کہ یہ جامعہ طبیہ کا پڑھا ہوا ہے جو بہت بڑا طبی ادارہ ہے۔لہٰذا یہ طبیب حاذق ہوگا۔اس لئے اس کا علاج کراؤں گا۔

یا اس وجہ سے کہ اس کے مطب سے شفاء پانے والے بہت ملتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخے تیر بہدف ہیں لہٰذا اس کا علاج کراؤں گا یا یہ وجہ ہو کہ یہ طبیب خاندانی طور پر طبیب ہے اس کے یہاں جدی طب چلی آرہی ہے۔لہٰذا طب سے جو مناسبت اسے ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے۔اس بنا پر میں اس کا علاج کراؤں گا کہ کوئی بھی وجہ ہو مگر آپ انتخاب کریں گے۔اس لئے کہ جان عزیز ہے محض اس بناء پر کہ اطباء میں اختلاف رائے ہے۔ آپ موت کو ترجیح نہیں دیتے زندگی پر۔کہتے ہیں کہ زندگی رہنی چاہئے اور علاج ہونا چاہئے۔تو ان اطباء میں سے کسی کو بھی منتخب کرلو۔

اگر علماء میں اختلاف رائے ہو اور آپ یہ کہیں کہ علماء تو لڑر ہے ہیں لہٰذا ہم دین اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابدی موت کو ترجیح دیتے ہیں اور موت کو قبول کرتے ہیں۔یہ آج تک کسی نے کیا ہے؟ انتخاب کرنا پڑے گا۔جس کی طرف آپ جائیں یہ دیکھیں کہ اس کا علم مستند ہے۔اس کے مشائخ سند صحیح کے ساتھ نبی کریمؐ تک پہنچے ہوئے

ہیں۔اور جو احکام یہ بیان کرتے ہیں ان کی سند کا سلسلہ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہے۔لہٰذا ہم ان کے مسائل پر عمل کریں گے۔دوسروں کے مسئلے پر عمل نہیں کریں گے۔کوئی بھی وجہ ہو مگر انتخاب کرنا پڑے گا۔

اطباء میں اختلاف رائے ہو تو ان میں سے انتخاب کرتے ہیں اگر علماء میں اختلاف ہو تو دین سے بدظن ہو جاتے ہیں کہ صاحب! کس کی مانیں؟ مولوی تو آپس میں لڑ رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جان زیادہ عزیز ہے ایمان زیادہ عزیز نہیں ہے۔وہاں چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ڈاکٹروں میں کتنے ہی شدید اختلافات ہوں کسی کا انتخاب ضرور کریں گے۔یہاں اگر ایمان عزیز ہوتا تو کتنا ہی اختلاف ہوتا علماء میں کسی نہ کسی کا انتخاب ضرور کرتے اور اس کی پیروی کرتے چونکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا کہ جان تو عزیز ہے مگر ایمان عزیز نہیں ہے۔

بہر حال اپنا امام ضرور بنانا پڑے گا اور اشخاص میں سے انتخاب ضرور کرنا پڑے گا اور ایک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔طب کے اندر ہو تو رجوع کرنا پڑے گا کسی طبیب کی طرف۔ایک دم چار کا علاج جاری کریں تو آپ کا مزاج فاسد ہو کر رہ جائے گا اور جلد ہی آپ قبر میں تشریف لے جائیں گے۔اس لئے کہ ایک طبیب صبح کو ٹھنڈی دوا دے گا تو دوسرا شام کو گرم دوا دے گا، تیسرا تر دوا دے گا، چوتھا خشک دوا سے علاج کرے گا تو مریض تختہ مشق بن جائے گا اور وہ قبر میں جانے کی تیاری شروع کر دے گا۔اس لئے ایک ہی کا علاج کریں۔

توحید مطلب......طریقت میں آپ نے بیعت کی تو وہاں بھی توحید مطلب ہے کہ جس شیخ کے ہاتھ پر بیعت کریں یہ سمجھیں کہ میری دنیا و آخرت کی خوبی اسی شیخ میں ہے دوسرے کی طرف رجوع مت کرو۔ہاں عظمت سب کی کرو۔احترام سب کا کرو مگر قلب کا علاج ایک ہی سے کراؤ۔صوفیاء کی اصطلاح میں اس کا نام توحید مطلب ہے۔یہ ہے کہ وحدت ہونی چاہئے اس شخص کے لئے جس کو آپ نے شیخ بنالیا ہے۔شیخ دو یا تین نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی ہو گا اور ایک ہی کے طریق پر چلنا پڑے گا۔

ہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شیخ واقعی اہل سنت میں سے نہیں ہے بلکہ مبتدع ہے تو ترک کر سکتے ہیں۔اس کے بعد پھر حضرات صوفیاء لکھتے ہیں کہ ترک کر کے دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرو مگر اس پہلے کی شان میں بے ادبی مت کرو، چاہے وہ اپنی ذات میں کیسا ہی ہو، گستاخی مت کرو۔ادب سے پیش آؤ۔تو طریقت کے اندر توحید مطلب ہے اور طب کے اندر توحید مطب ہے۔تو آخر علم کے اندر توحید مقصد کیوں نہیں ہونا چاہئے اور کسی ایک امام کو کیوں مقرر نہیں کرتے کہ آپ اس کے فقہ پر عمل کریں۔اگر ایسا نہیں کریں گے تو آپ ڈانواں ڈول رہیں گے، کبھی ادھر، کبھی ادھر اور یہ نفس کی اتباع ہو گی کسی امام کا اتباع بالکل نہ ہو گا اور شریعت میں نفس کا اتباع مطلوب نہیں۔

تو شریعت نے ہر معاملے میں نظم قائم کیا، عقائد میں الگ نظم ہے۔اور فقہ کے مسائل میں الگ نظم ہے۔مقصد یہ کہ امت جڑ جائے۔چاہے اختلاف رائے بھی ہو مگر باہم متفق و متحد ہو جائیں۔اسی طرح سے جب آپ حضرات صوفیاء کے پاس جائیں گے اور اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں گے تو ان کے بھی مختلف طرق پائیں گے۔

چشتیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ سہروردیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ قادریہ کے وظائف اور ہیں مگر ہیں سب حضرات اہل اللہ اور سب حضرات اہل حق ہیں۔ لیکن چاروں میں آپ ایک دم بیعت کر کے چاروں سے علاج کرائیں تو دین فاسد ہو کر رہ جائے گا اس لئے کہ متضاد چیزوں پر عمل کیسے کریں۔ لہٰذا ایک ہی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ہاں عظمت واحترام سب کا کرنا پڑے گا اور خادم سب کا بننا پڑے گا مگر علاج ایک سے کرائیں۔ تو تصوف کے اندر بھی توحید مطلب ہے جیسے طب کے اندر توحید مطب ہے۔ اور فقہ کے اندر توحید مقصد ہے۔

امیر معاملات...... اسی طرح سے جب معاملات پیش آئیں تو کسی نہ کسی کو امیر تو بنانا پڑے گا مثلاً کوئی جھگڑا ہو، اب راستہ چلتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی کیسے فیصلہ کروں، ایک نے کہا کہ یوں کرو، دوسرے نے کہا کہ یوں کرو، تیسرے نے کہا کہ یوں کرو۔ اگر تینوں کی رائے پر عمل کیا تو وہ جھگڑا تو یوں ہی رہ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ گھر بھی فاسد ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایک متدین شخص کو اپنا امیر بنالیا کہ بھائی! ہم تم سے فیصلہ چاہتے ہیں جو تم فیصلہ کرو گے ہمیں منظور ہے۔ اگر صحیح کرو گے۔ تب بھی عمل کریں گے۔ اور اگر کوئی فکری غلطی بھی واقع ہوگئی تب بھی عمل کریں گے۔ مگر کرائیں گے فیصلہ آپ سے ہی۔ تو ایک قسم کا اطمینان وسکون ہو جائے گا۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جائے گی۔ قاضی جب حکم کر دے کہ یہ ہے مسئلہ تو وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی نافذ ہو جاتا ہے یعنی اس کے خلاف پھر کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر بعد میں یہ بھی ثابت ہو کہ رائے کی غلطی تھی تو یہ بات نہیں کہ فیصلہ ٹوٹے گا، ایسا نہیں بلکہ جو فیصلہ ہو چکا وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ چونکہ وہ فیصلہ من جانب اللہ ہے اور اس کے بغیر سکون واطمینان قلبی اور یکسوئی نہیں ہو سکتی اس بنا پر قاضی کی قضا ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے اور اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے تو امراء اسلام اس لئے مقرر کئے گئے تا کہ وہ جھگڑوں کے فیصلے کر سکیں۔

حق امارت...... اگر خلیفۃ المسلمین اور بادشاہ اسلام موجود ہے تو اصل امیر وہ ہے پھر جن کو وہ امیر مقرر کریں وہ امیر بن جائیں گے۔ اگر اسلام کی حکومت نہیں ہے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب مل کر اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اگر سارے ملک کے مسلمان ایک امیر پر جمع نہ ہوں تو خطوں کے امیر بنا لئے جائیں۔ ہر صوبہ کا الگ امیر ہو اور تمام مامورین پر اپنے اپنے امام کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ ﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ① یہاں پر تین اطاعتیں واجب اور فرض قرار دیں۔ اللہ کی اطاعت، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، اولی الامر یعنی امیر کی اطاعت۔

اطاعت ذاتی اور وصفی...... قرآن تو قرآن ہی ہے وہ تو سرچشمہ ہے بلاغت وفصاحت کا اور معجزہ ہے اس نے جہاں اللہ کی اطاعت فرض کی وہاں تو اللہ کا نام ذکر کیا کہ اطیعوا اللہ یعنی اللہ کی اطاعت کرو۔ اسکے معنی یہ ہیں اللہ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں کسی وصف کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت نہیں ہے کہ جب اللہ کا نام آئے تو گردن جھک جاتی

① پارہ: ۵، سورۃ النساء، الآیۃ: ۵۹.

چاہئے اطیعواللہ علم ذات کا ہے۔ اس لئے کہ وہ بالذات واجب الاطاعت ہیں۔ ہم اور آپ کسی وصف سے واجب الاطاعت بنتے ہیں۔ آپ میں اگر علم آ گیا تو علم کی وجہ سے آپ کی اطاعت ہوگی۔ ورنہ آپ کی اطاعت نہ ہوگی۔ مثلاً کوئی جاہل ہے اس کی کوئی بھی اطاعت نہیں کرتا ہاں علم کا وصف اگر آ جائے تو اطاعت کرنے لگیں گے۔

اگر کوئی باپ ہے تو باپ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت شروع ہو جاتی ہے۔ کوئی استاذ ہے تو استاذ ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت ہوگی کوئی شیخ ہے۔ تو شیخ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی تو انسان بذاتہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ بالاوصاف واجب الاطاعت ہے۔ جب کوئی وصف کمال پیدا ہوگا اس کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی۔

لیکن حق تعالیٰ شانہٗ بذاتہ واجب الاطاعت ہیں۔ صفات تو ذات کے تابع ہوا کرتی ہیں کیوں کہ وہ ذات کا پرتو ہیں۔ دراصل سرچشمہ کمالات کا ذات ہے اور صفات اس لئے مقبول ہوئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں مگر اصل ان سب کی ذات ہی ہے اور جب آگے کی اطاعت بتلائی گئی تو یوں نہیں فرمایا گیا کہ۔ اَطِیْعُوْا عِیْسٰی یا اَطِیْعُوْا مُوْسٰی یا اَطِیْعُوْا مُحَمَّدًا. بلکہ فرمایا اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ یعنی رسول وصف رسالت کی وجہ سے واجبُ اُلاطاعت ہیں۔ اسی وجہ سے اگر وہ کوئی ذاتی مشورہ دیں تو واجبُ اُلاطاعت نہیں ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی محبت کی وجہ سے اس کی منشاء کی بھی اطاعت کریں۔ لیکن قانون شریعت یہ ہے کہ اگر رسول کوئی ذاتی رائے دیں تو واجبُ اُلاطاعت نہیں البتہ جب یہ فرمائیں کہ میں حکم خداوندی پہنچارہا ہوں تو وہ واجبُ اُلاطاعت ہے جب رسالت پہنچائیں گے تو اطاعت کرنا فرض ہے اور جب یوں فرمائیں کہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو آپ مختار ہیں۔ اور معذرت بھی کر سکتے ہیں، ادباً چاہے آپ عمل کرلیں مگر آپ کے ذمے واجب نہیں ہے۔

جیسے کہ حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہوا۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں اور ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ سے کر دیا تھا۔ حضرت بریرہؓ حسین وجمیل اور بہت خوبصورت تھیں اور حضرت مغیثؓ کالے کلوٹے اور بدصورت تھے۔ اس لئے آپس میں بنتی نہ تھی۔ رات دن آپس میں کھٹ پٹ رہتی تھی اور رات دن لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرماتے تھے مگر بہرحال قصہ چل رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کر دیا اب وہ باندی نہیں رہیں اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ منکوحہ باندی جب آزاد ہوتی ہے تو نکاح اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ چاہے تو باقی رکھے چاہے تو فسخ کر دے۔ اب جب کہ آزاد ہوگئیں تو انہوں نے ارادہ کرلیا کہ میں نکاح کو باقی نہیں رکھوں گی بلکہ فسخ کر دوں گی کیونکہ حضرت مغیثؓ سے ان کی موافقت نہیں ہوتی۔ پکا ارادہ کرلیا کہ اب میں ان کے نکاح میں نہیں رہوں گی۔

اور حضرت مغیثؓ ان پر سو جان سے عاشق تھے جب انہیں معلوم ہوا تو پریشان ہوگئے۔ کبھی صدیق اکبرؓ سے سفارش کراتے ہیں کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے پاس جاتے ہیں کہ آپ ان کو سمجھا دیں کہ وہ نکاح باقی رکھیں۔

انہوں نے سب کو جواب دے دیا کہ نہیں میں نکاح باقی نہیں رکھتی۔ آخر میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ! آپ نے ہی یہ نکاح باندھا تھا۔ اب بریرہؓ اس نکاح کو توڑ رہی ہیں۔ آپ ان سے فرمادیں کہ اس نکاح کو باقی رکھو۔ اور حضرت مغیثؓ بے حد پریشان حال ہیں۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ وقت دیکھنے کے قابل تھا کہ حضرت مغیثؓ مدینے کی گلیوں میں روتے ہوئے پھر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ داڑھی پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں کہ ہائے بریرہؓ جدا ہوگئیں۔ اس درجہ عشق تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ آپ فرمادیں نکاح باقی رکھنے کو۔ حضورؐ تشریف لے گئے اور فرمایا: بریرۃ نکاح مت توڑو مغیث سے۔ میں نے ہی وہ نکاح قائم کیا تھا تم اب بھی قائم رکھو۔ وہ بھی بڑی ذہین تھیں۔ انہوں نے کہا: ''یارسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپ کا ذاتی مشورہ؟ آپ نے فرمایا: کہ نہیں حکم شرعی نہیں شرعاً تو تم آزاد ہو۔ نکاح رکھو چاہے توڑ دو۔ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے''۔ ①

بریرہؓ نے کہا پھر تو میں نہیں مانتی۔ آخر کار نہیں مانا اور نکاح توڑ دیا تو معلوم ہوا کہ اگر نبی اپنی ذات سے کوئی مشورہ دیں تو وہ قانون واجب الاطاعت نہیں ہوتا، اگر رسالت پیش کریں کہ یہ حکم خداوندی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انبیاء بھی ذاتی طور پر واجبُ الاُ طاعت نہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے اور میں ذاتی بات کہوں اور اس پر ضد کروں کہ نہیں اس کو ماننا ضروری ہے۔ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ صرف ایک رائے ہے آپ کی، میری بھی ایک رائے ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جو حق ہو اس پر عمل کریں۔ تو اللہ نے جہاں اپنی اطاعت کا حکم دیا وہاں اپنا نام لیا ہے اور فرمایا اَطِیْعُوا اللّٰہَ کہ اللہ کی ذات واجبُ الاُطاعت ہے۔ آگے رسول کا نام نہیں لیا بلکہ ﴿وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾۔ ② فرمایا یعنی وصفِ رسالت کا تذکرہ کیا کہ اسی وصفِ رسالت کی وجہ سے وہ واجبُ الاُطاعت ہیں کہ جب رسالت خداوندی پیش کریں تو گردن تسلیم خم کردو۔

اطاعتِ امیر کا معیار...... ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ یہاں اَطِیْعُوْا﴾ ③ کا لفظ بھی خصوصیت سے ذکر نہیں کیا جیسا کہ ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾۔ ④ میں ذکر کیا تھا یہ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ پچھلے اَطِیْعُوْا کے نیچے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اُولِی الْاَمْرِ ہوگا وہ تابع ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چونکہ آپ کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس لئے واجبُ الاُطاعت ہے۔ مستقلاً اس کی اطاعت نہیں۔ اللہ کے رسول کا فرمان نافذ کرے گا تو واجبُ الاُطاعت ہوگی ورنہ محض ذاتی مشورہ ہوگا کوئی واجبُ الاُ طاعت نہیں اور اولی الامر کا لفظ آخر میں ہے۔ اس کے بعد کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اس بناء پر تین اطاعتیں ہوگئیں۔ اللہ کی اطاعت۔ رسولؐ کی اطاعت۔ اولی الامر کی اطاعت۔ ہاں اگر اولی الامر کوئی غلط حکم دے۔ تو اس کی اصلاح کی جائے۔ اس لئے ذاتی حکم

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الطلاق، باب شفاعة النبی ﷺ زوج بریرة، ج:۱۶، ص:۳۳۲، رقم:۴۸۷۵.

② پارہ:۵، سورة النساء، الآیة:۵۹ ③ پارہ:۵، سورة النساء، الآیة:۵۹. ④ پارہ:۵، سورة النساء، الآیة:۵۹.

واجبُ الاُ طاعت نہیں۔ جب وہ یوں کہے کہ قرآن شریف میں یوں آیا ہے تو پھر وہ واجبُ الاُطاعت ہے چاہے وہ استنباط ہی سے کہتا ہو۔ نص صریح نہ ہو کیونکہ وہ قرآن ہی سے کہہ رہا ہے۔ وہ قرآن ہی کا مصداق ہے۔ اس لئے اس سے گردن پھیرنا جائز نہیں ہے۔

صلاحیت کی بنیاد پر چیف جسٹس کی تقرری...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ، جب امیر المومنین تھے تو دربار خلافت میں ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس نے عرض کیا کہ امیر المومنین! میرے خاوند کی آپ کیا بات پوچھتے ہیں۔ صَآئِمُ الدَّهْرِ ہے۔ قَآئِمُ الَّيْلِ ہے۔ تمام راتیں عبادتیں کرتا ہے اور تمام دن روزے رکھتا ہے۔

فرمایا کہ ماشاءاللہ اللہ مبارک کرے بڑا اچھا خاوند ہے کہ عبادت گزار ہے، راتوں کو تہجد پڑھتا ہے۔ دنوں کو روزے رکھتا ہے مبارک ہو۔ وہ بچاری چپکی ہو کر چلی گئی۔ دربار میں ایک صحابیؓ موجود تھے جن کا نام اکثمؓ تھا وہ اٹھے اور انہوں نے کہا کہ امیر المومنین! آپ سمجھے بھی! یہ کیا کہہ کر گئی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خاوند کی تعریف کر کے گئی ہے اور کیا کہتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضرت! اسے کیا مصیبت آئی تھی کہ وہ دربار خلافت میں آ کر خاوند کی تعریف کرے کہ نمازیں اتنی پڑھتا ہے۔ روزے اتنے رکھتا ہے۔

کہنے لگے پھر کیا کہ کر گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا: خاوند کی تعریف کرنے نہیں آئی تھی بلکہ استغاثہ اور دعویٰ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دعویٰ کیا کر کے گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا کہ دعویٰ یہ کیا ہے کہ ساری رات تو رہتا ہے عبادت میں اور سارے دن رہتا ہے روزے میں یہ اللہ میاں کے کام کا تو ہے میرے کام کا نہیں ہے۔ یہ ہے اس کا منشاء وہ استغاثہ دائر کر کے گئی ہے۔ حضرت عمرؓ چپ ہو گئے اور فرمایا کہ مجھ جیسے کو امیر بنا دیا ہے معاملہ سمجھنے کی بھی طاقت نہیں۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ امیر بنایا جاتا۔ پھر فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی سمجھ دی ہے تو تو ہی فیصلہ کر اس مقدمے کا جب اس نے استغاثہ دائر کیا ہے اور خاوند کی شکایت کی ہے تو کیا حکم شرعی ہونا چاہئے؟

انہوں نے فوراً ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ کیا کہ "امیر المومنین! اس کے خاوند کو حکم دیا جائے کہ چار دن میں سے ایک دن ضرور افطار کیا کرے اور خوب کھانا کھایا کرے اور چار راتوں میں سے ایک رات بالکل نہ جاگے۔ بیوی کے پاس سویا کرے۔ تین راتوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب تہجد پڑھے اور تین دنوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب روزہ رکھے۔ تو ہر چار دن میں سے ایک دن اور ہر چار راتوں میں سے ایک رات خالی چھوڑے"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اکثمؓ! یہ حکم تم نے کہاں سے نکالا ہے۔ انہوں نے کہا قرآن سے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن میں کہاں موجود ہے؟ کہ اگر کسی بیوی کا خاوند رات دن عبادت کرے تو وہ چار رات دن میں سے ایک رات دن بیوی کے پاس گزارے۔ عرض کیا قرآن میں حکم ہے۔ ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اگر

---

① پارہ: ۴، سورۃ النساء، الآیۃ: ۳۔

چار بیویاں ہوں تو چار راتیں انکے گھر جائیں گے۔ اگر چار میں سے ایک بیوی ہو تو تین راتیں خدا کی اور ایک رات بیوی کی۔ فرمایا: سبحان اللہ کتنا اچھا فیصلہ ہے۔ مجھ جیسے کو امیر بنا دیا جس نے قرآن سے اتنا فیصلہ نہیں کیا۔ اس دن حضرت عمرؓ نے ان کو چیف جسٹس یعنی قاضی القضاۃ بنا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری سمجھ کو تیز کیا ہے۔ اس لئے تم ہی فیصلے کرو آج سے مسلمانوں کے مقدموں کے۔ ایک چاول سے پوری دیگ پرکھی جاتی ہے جب ایک فیصلہ کیا کہ جو کہ معمولی مسئلہ تھا قرآن سے پیش کیا۔ فرمایا کہ تیری سمجھ اس قابل ہے کہ آج سے تو مسلمانوں کے فیصلے کرے۔ اس بناء پر ان کو قاضی القضاۃ بنا دیا۔

انحرافِ اطاعت موجب تفریق ہے...... بہر حال اطاعتیں تین ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، رسولؐ کی اطاعت اور رسولؐ کے جو نمائندے اور نائب ہیں ان کی اطاعت جب کہ وہ رسول کی رسالت کو جاری کریں اور ان کے علم پر اعتماد ہو تو وہ واجبُ الطاعت بن جاتے ہیں۔ پھر ان سے اور ان کی اطاعت سے انحراف کرنا قوم کے اندر تفریق ڈالنا ہے اس لئے مامورین کے ذمہ ہے کہ ہر صورت میں جب کہ وہ حکم شرعی بیان کریں تو ان کی اطاعت کریں۔ لہٰذا جب ہم نے اپنا امیر شریعت بنا لیا ہے اور بحمد اللہ ان میں امیر شریعت کے اوصاف بھی موجود ہیں جو اوصاف کہ واقعی طور پر ایک امیر کے اندر ہونے چاہئیں۔ خدا نے ان کو اہل بنایا ہے۔ جب آپ کو ایک اہل ملا تو آپ کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ اب ایسے اشخاص تو آنے سے رہے جو کبھی بھی غلطی نہ کریں۔ ہمیں اپنے ہی میں سے ہر ایک کو بنانا پڑے گا اور اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ہاں اتنا دیکھ لو کہ وہ بشر عمدہ ہو جس کی تمام زندگی تقویٰ و طہارت سے گزری ہو۔ جس کی زندگی میں صلاح اور رشد پایا جاتا ہو وہ بے شک اس قابل ہے کہ وہ ہمارا مطاع بن جائے اور غلطی سے تو کوئی بشر خالی نہیں ہر ایک انسان غلطی بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود واجب الاطاعت ہے تو بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک امیر بنا دیا آپ کے لئے جو اہل ہے امامت کا۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر ان سے کوئی اور افضل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ امیر سب سے افضل ہو۔ اگر دوسرا کوئی افضل بھی ہو تو اطاعت اسے بھی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ قوم نے مل کر ان کو امیر مقرر کر دیا ہے۔

امارت کی بنیادی شرط...... اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب! میں ان سے زیادہ کامل ہوں۔ اس لئے امیر میں بنوں گا۔ تو مدعی کو امیر بنانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ خود شریعت میں مسئلہ موجود ہے ''لَانُوَلِّیْ اَمْرَنَا ھٰذَا مَنْ طَلَبَہٗ''① جو خود عہدے کی طلب کرے اسے کبھی عہدہ نہیں دیں گے۔

جو شخص عہدے سے بچے اور الگ رہے وہ اس قابل ہے کہ عہدہ اس کے ذمے ڈالا جائے۔ اس واسطے کہ جب مسلمانوں نے عہدہ ڈال دیا اس کے ذمے اور امیر بنا دیا اور امیر نے پھر ایک قاضی مقرر کر دیا تو قوم کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات سامنے آئے کہ صریح قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ

① الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب النھی عن طلب الامارۃ والحرص علیھا، ص: ۱۳۳۳.

دیا اور تخریب کر دی تو بھائی اس وقت غور کرنا! کہ ایسے کو امیر کیوں بنایا، لیکن قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کر رہا ہے۔ تو اس بیچارے سے کیوں انحراف کریں؟

اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری...... امارت شرعیہ کا قیام ضروری ہے اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اپنے معاملات مین ان کی طرف رجوع کریں اور سمع وطاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔ وہ یہ کہ جب پوری قوم منظم ہوگی اور ایک کے تابع ہوگی تو اغیار پر اثر پڑے گا کہ یہ ہے متحد ومنظم قوم۔ جب عید کی نماز ہوتی ہے اور ایک امام کے پیچھے پچاس پچاس ہزار آدمی ہوتے ہیں تو بہت سے غیر مسلموں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ یہ نظام کسی قوم کو نصیب نہیں ہے جو اس قوم کو دیا گیا ہے کہ ایک کے اشارے پر لاکھوں آدمی جھک رہے ہیں۔ حرم محترم میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک امام کے پیچھے تیس لاکھ آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک امام زکوٰۃ کے پیچھے سارے اپنی زکاتیں پیش کر رہے ہیں۔ تو اسلام نے ہر ہر جزئی میں ایک نظم قائم کیا ہے اور نظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک جماعت نہ ہو اور جماعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ امام نہ ہو اور امیر نہ ہو اور امیر ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ سمع وطاعت نہ ہو۔ تو سمع وطاعت ہم سب کا فرض ہے ہمیں اور آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی توفیق دی کہ ہم نے اپنا ایک امیر مقرر کیا اور امیر بحمد للہ ایسا کہ قابل اعتراض نہیں ہے۔

انتخاب امیر کے لئے مجموعی زندگی کو پیش نظر رکھا جائے...... دنیا میں کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اعتراض سے بچی ہوئی ہو۔ اعتراض سے کوئی خالی نہیں۔ اعتراض جس پر چاہو کر دو۔ حتیٰ کہ اعتراض کرنے والوں نے اللہ ورسول پر بھی اعتراض کر دیئے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

قَــدْقِيْـلَ اِنَّ الـلّٰــهَ ذُوْ وَلَـدٍ	وَقِيْـلَ اِنَّ الـرَّسُوْلَ قَدْ كَهَنَ
مَــانَـجَـا الـلّٰـهُ وَالرَّسُوْلُ مِنْ	لِّسَــانِ الْــوَرٰى فَـكَيْفَ اَنَـا

کہنے والے نے کہا کہ اللہ صاحب اولاد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بیٹے ہیں اور باپ ہیں۔ اور حضرت مریم بیوی ہیں۔ رسول کے بارے میں کسی نے کہا کہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ساحر ہیں، کسی نے کہا کہ مجنون ہیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ جب اعتراض کرنے والوں نے اللہ ورسول کو بھی نہیں چھوڑا تو میں کون ہو۔ میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔ دنیا میں کون ہے ایسا جس پر اعتراض نہ ہوا ہو۔ بھائی تھوڑا بہت تو اعتراض سب پر ہوتا ہے۔ مجموعی زندگی کو دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی زندگی سچائی سے گزر رہی ہے یا مکر وفریب سے۔ صلاح وتقویٰ پر گزر رہی ہے یا جہالت پر اس لئے اگر تھوڑی بہت غلطی بھی ہو جائے تو وہ قابل عفو ہے۔ ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ① جن کی نیکیاں غالب ہیں وہ اللہ کے یہاں بھی نجات پا جائیں گے۔ معصوم تو انبیاء علیہم

① پارہ :۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ:۸۔

الصلوٰۃ والسلام کی ذوات گرامی ہیں۔

لیکن انبیاء کے بعد اولیاء محفوظ ہیں۔ پھر اولیاء کے بعد جتنے ہم اور آپ ہیں نہ محفوظ ہیں نہ معصوم ہیں۔ کبھی نہ کبھی کوئی غلطی ہو ہی جائے گی مجموعی زندگی کو دیکھ کر حکم لگے گا۔ ایک ایک غلطی نہیں پکڑی جائے گی۔ یہ بدنیتی ہوگی کہ ساری زندگی کی اچھائیوں میں سے ایک برائی پر نظر پڑی تو اس کو آپ نے اچھال دیا یہ تو عناد کی بات ہے۔ یہ کوئی آدمیت نہیں ہے۔ یہ ہے خِلّتُ مَا کِرہ نبی کریمؐ نے اس سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا کہ ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ خَلِیْلٍ مَّاکِرٍ عَیْنَاهُ تَرَیَانِیْ وَقَلْبُهٗ یَرْعَانِیْ اِنْ رَّاٰی حَسَنَةً دَفَنَهَا وَاِنْ رَّاٰی سَیِّئَةً اَفْشَاهَا.'' ② ''اے اللہ! میں ایسے مکار دوست سے تیری پناہ لیتا ہوں جس کی آنکھیں مجھے دیکھیں اور اس کا دل میری ٹوہ میں لگا رہے اگر نیکی دیکھے تو اسے چھپالے اور اگر برائی دیکھے تو اس کو پھیلاتا پھرے''۔

ایسا دوست پسندیدہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی برائی آپ کے سامنے ہو تو اس کی اچھائیوں کو بھی دیکھنا چاہئے اور ان اچھائیوں کی وجہ سے اس کی برائی نظر انداز کر دینی چاہئے۔ یہی قرآن کا فیصلہ بھی ہے۔ ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ ① کہ نیکیاں تمام برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ جب ختم ہوگئی پھر برائی رہ ہی کہاں گئی جس کو اچھالا جائے۔ لیکن کہنے والے اور اعتراض کرنے والے تو ہر وقت اور ہر زمانہ میں رہتے ہیں۔ کام کرنے والے اگر اس کی پرواہ کریں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ قیامت میں جب باری تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی تو اعتراض کرنے والے بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والے بھی کھڑے ہوں گے۔ مگر کامیاب و سرخرو کام کرنے والے ہوں گے، تو شکریہ ادا کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے ہمیں اپنا امیر بنانے کی توفیق دی اور آگے ہم اس کی توفیق بھی بارگاہ صمدی سے چاہتے ہیں کہ ہم اپنے امیر کی سمع و طاعت کریں اور ہم کو راہ راست پر چلائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ ہمیں اسلام پر قائم و دائم رکھے، ایمان پر خاتمہ فرمائے۔

آمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

---

① کنز العمال، ج: ۱، ص: ۴۷۹، رقم: ۳۲۶۶. ابن النجار عن سعید المقبری مرسلاً.

② پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۱۱۴.

اَلواعظ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ، وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ، فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْفَازَ، وَمَاالْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے...... بزرگانِ محترم! آج بعض ضروری کام کی وجہ سے وعظ کرنے کا ارادہ نہیں تھا مگر چونکہ موذن صاحب نے اعلان کر دیا اس لئے موذن صاحب کے اور دوسرے حضرات کے اس جذبہ اور شوق کے پیش نظر کہ آپ لوگوں کو وعظ سننے کا شوق ہے اور اس خیال سے آپ لوگ جمع ہو گئے ہیں کہ خدا کی، دین کی اور شریعت کی کوئی بات کان میں پڑ جائے۔ آج میں آپ لوگوں کو ایسی بات بتلا دوں کہ کوئی واعظ ہو یا نہ ہو۔ مقرر ہو یا نہ ہو آپ لوگ وقت صرف کر کے کہیں جمع ہوں یا نہ ہوں جس حال میں بھی ہوں خود وعظ کہہ لیں اور خود سن لیں۔ خدا اور رسول کی بات کہہ اور سن کر اس پر عمل کر لیں کہ مقصود عمل ہے۔ فائدہ نہ صرف کہنے سے ہوتا ہے اور نہ سننے سے ہوتا ہے فائدہ صرف عمل سے ہوتا ہے۔ فرمایا۔

عقل فکر ونظر کا واعظ...... انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اس کی عقل ہے۔ اگر انسان عقل وتدبر اور تفکر سے کام لے، انقلاباتِ زمانہ اور لیل ونہار کی گردش پر غور کرے اور سوچے تو اس سے اس جہان کے خالق اور اس کی مخلوقات، عجیب وغریب کرشمہ سازیوں اور بوقلموں ایجادات کی طرف رہنمائی ہوگی۔ علوم وحقائق کا انکشاف ہوگا۔ رشد وہدایت کی راہ کھلے گی۔ حیات، زندگی اور دنیا کی ناپائیداری اور ناثباتی کا پتہ چلے گا۔ موت اور بعد الموت پیش آنے والے واقعات کا علم الیقین حاصل ہوگا۔ خدا اور آخرت کی طرف طبیعت رجوع کرے گی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ ② آفاق اور انفس میں خدائے برتر وبزرگ کی ہزار

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۸۵۔ ② پارہ: ۲۵، سورۃ فصلت، الآیۃ: ۵۳۔

ہا نشانیاں اور علامات موجود ہیں اگر چشم بصیرت سے کام لیا جائے دھیان دیا جائے۔ قلب کو متوجہ کیا جائے۔ عالم کی ایک ایک جزئی سے خدا کی قدرت، اس کی حکمت اور بالغ النظری نمایاں ہوگی۔ مگر شرط دھیان اور توجہ ہے، جب تک دھیان اور توجہ سے دیکھا نہ جائے اور غور نہ کیا جائے، اس وقت تک نہ کوئی حکمت ظاہر ہوگی اور نہ کسی مصلحت و دانائی کا پتہ چلے گا۔ دن رات کا مشاہدہ ہے۔ بازار میں، مدرسہ میں، گھر میں، جب تک آپ دھیان نہ دیں کسی کام یا چیز کو خیال اور توجہ سے نہ کریں اور نہ دیکھیں۔ اس وقت تک آپ کو اسکا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ حالانکہ وہ واقعات آپ کی نظروں کے سامنے گزر رہے ہیں۔ آپ کے کان آپ کی آنکھیں اسے سن اور دیکھ رہی ہیں۔ لیکن پوچھنے پر آپ انہیں بتلا نہیں سکتے، اس واسطے کہ آپ نے اسے دھیان اور توجہ سے نہیں دیکھا۔ قلب کو متوجہ نہیں کیا۔ تو اصل قلب ہے۔ قلب اگر متوجہ نہ ہو تو نہ کوئی دکھائی دے اور نہ کان کچھ سن سکے۔

یہ آنکھ اور کان قلب کی عینک اور چشمہ ہیں۔ انسان اگر صرف اپنے نفس، اس کے عدم، پھر وجود اور پھر عدم پر غور کرے اور دیکھے کہ دن اور رات میں، صبح اور شام میں اس خاک کے پتلے پر کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اور کن کن حالات سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی پیدا ہوتا ہے کوئی مرتا ہے۔ کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی صحت مند ہے کوئی بیمار و مریض، کسی کی زندگی عیش و عشرت سے گزر رہی ہے اور کسی کی تنگی اور عسرت سے۔ بہر حال اگر انسان آفاق و انفس اور اس مادی عالم پر نظر ڈالے، اس کے حوادث و واقعات کو امعان کی نظر سے دیکھے۔ عقل و بصیرت، تدبر اور تفکر سے کام لے۔ تو یہ چیز اس کے لئے بڑے سے بڑے واعظ اور مقرر کا کام دے گی۔ اور انسان ہر وقت وعظ کہہ سکتا ہے اور اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ اس عالم کون و فساد، اس کے حوادث، واقعات، انقلابات اور صبح و شام کے تغیرات پر نظر ڈالو، غور کرو، دھیان اور توجہ سے سوچو۔ یہ انقلابات تمہیں خالق کا، صانع کا، اور مالک کا پتہ دیں گے، خالق کے اقرار کے بعد اس کی قدرت، حکمت، علم اور ملوکیت کا نشان ملے گا۔ اس کے بعد اس سے محبت عقیدت اور تعلق پیدا ہوگا۔ پھر اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور عبادت کی طرف میلان پیدا ہوگا۔ آخرت، دین اور خدا اور رسول کی طرف طبیعت رجوع کرے گی اور یہی حاصل ہے وعظ کا، نصیحت کا اور تقریر کا۔ غرض عقل اس عالم میں غور و فکر انسان کے لئے سب سے بڑا واعظ اور مفت کا واعظ ہے۔

موت ایک خاموش واعظ...... دوسرا بڑا واعظ موت ہے۔ اگر انسان موت پر اس کے احوال پر اور یہ کہ موت کے بعد کیا پیش آنے والا ہے؟ اور یہ کہ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ کیا رہا؟ اور موت کے بعد خدا ہم سے کیا معاملہ کرے گا؟ ان احوال پر غور کرنا خود دین اور منشاء شریعت ہے۔ موت کی یاد سے خدا یاد آتا ہے، آخرت کی یاد آتی ہے، دنیاوی لذات سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی حاصل ہے وعظ کا اور نصیحت کا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا۔ انسان کے لئے بڑا واعظ موت ہے۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہے اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ لذتوں کو مٹانے والی (موت) کا ذکر زیادہ کیا کرو۔ موت سے غافل نہ ہو۔ موت کا دھیان ہر وقت

رکھا کرو۔ اس سے دنیا میں اس کی لذات اور آرائشوں میں انہاک کم رہے گا۔ آخرت کی توجہ ہوگی۔ عبادت اور اطاعت میں جی لگے گا اور یہی اصل ہے وعظ کا۔ غفلت بہت بری چیز ہے۔ غفلت سے انسان خسارہ اور نقصان میں رہتا ہے، دنیاوی معاملات میں رات دن کا مشاہدہ ہے، بارش کے وقت اگر کاشتکار آرام میں رہے۔ ٹھنڈی ہوا اور سہانے وقت کے عیش میں پڑا رہے، نہ کھیت پر جاوے اور نہ بیج ڈالے نہ نولائی کرے اور نہ کھیت کی دیکھ بھال کرے تو ظاہر ہے کہ جب دوسرے کاشت کار اپنی لہلہاتی ہوئی کھیتی دیکھ کر خوش ہوں گے اسے کاٹیں گے۔ غلہ اور اناج گھر لائیں گے تو یہ غافل کاشت کار کف افسوس ملے گا اور شرمندہ ہوگا لیکن اس نے وقت کھو دیا وقت کو ضائع کر دیا۔ غفلت اور لاپرواہی برتی۔ افسوس اور پچھتانا اب کچھ کام نہیں دے گا۔ بعینہ یہی حال آخرت کا ہے۔ حدیث میں ہے ''اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ'' ① ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔

دنیا میں اگر انسان توجہ سے دھیان سے کام کرتا رہے۔ غفلت نہ برتے، وقت کو ضائع نہ کرے، قلب میں ایمان کا بیج ڈالے، اعمال سے اس کی آبپاشی کرے، خیر خیرات اور صدقات سے اس کی دیکھ بھال اور نولائی کرتا رہے، موت کو یاد رکھے، اعمال کا محاسبہ اور نفس کا مراقبہ کرتا رہے تو آخرت میں سرخرو ہوگا۔ کامیاب ہوگا اور فائز المرام ہوگا ورنہ نقصان میں رہے گا۔ حدیث میں فرمایا گیا ''اَلنَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوْا فَانْتَبَهُوْا'' ② لوگ سو رہے ہیں۔ غفلت میں ہیں۔ جب مریں گے حساب و کتاب دیں گے۔ سوال و جواب ہوگا۔ اس وقت چونکیں گے، غفلت سے بیدار ہوں گے لیکن دوراندیش اور عاقبت میں وہ انسان ہے جو سوال و جواب، حساب و کتاب اور محاسبہ سے پہلے ہی اپنا حساب پاک وصاف رکھے نفس کا مراقبہ کرتا رہے۔

روزمرہ کے واعظ..... فرمایا گیا: ''مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا'' ③ مرنے سے پہلے اپنے کو مرا ہوا سمجھو۔ محاسبہ سے پہلے اپنے اعمال اور احوال کا حساب کرلو، پاک وصاف ہوکر جاؤ۔ خدا کے دربار میں سرخرو پاک وصاف ہوکر حاضر ہو۔ غرض موت بھی انسان کے لئے بہت بڑا واعظ ہے۔ موت سے پہلے مرض، بیماری، بڑھاپا، مصائب اور تکالیف بھی کم از کم مسلمان کے لئے واعظ اور مذکر کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کو غور وخوض، دھیان اور توجہ کی ضرورت ہے۔ غفلت اور سستی چھوڑو۔ ہمت اور عزم واستقلال سے کام لو۔ تم تھوڑا کرو۔ خدا زیادہ توجہ کرے گا۔ تم خدا کی طرف ایک قدم بڑھو گے تو خدا دو قدم بڑھے گا۔ ''مَنْ اَتٰی اِلَیَّ شِبْرًا اَتَیْتُهٗ

---

① المقاصد الحسنة، قال السخاوی لم أقف علیه مع ایراده الغزالی له فی الاحیاء، حرف الدال ، ج: ۱، ص: ۱۱۸ .

② یہ حضرت علیؓ کا قول ہے۔ دیکھئے: کشف الخفاء ۲/ ۳۱۲ .

③ حدیث کے پہلے حصے ''موتوا قبل ان تموتوا'' کے بارے میں علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: قال الحافظ ابن حجر هو غیر ثابت وقال القاری: هو من کلام الصوفیة، دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۲ ص: ۲۹۱ جبکہ دوسرا حصہ ''حاسبوا قبل ان تحاسبو'' حضرت عمرؓ کا قول ہے، دیکھئے: مصنف ابن ابی شیبه، کلام عمر بن الخطابؓ ج: ۸ ص: ۱۴۹ .

ذِرَاعًا وَمَنْ اَتٰی اِلَیَّ ذِرَاعًا اَتَیْتُهٗ بَاعًا وَمَنْ اَتٰی اِلَیَّ مَشْیًا اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً"۔ ① "جو میری طرف ایک بالشت آوے میں اس کی طرف ایک ہاتھ آتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ آوے میں اس کی طرف ایک قدم یا ایک گز آتا ہوں اور جو میری طرف متوسط رفتار سے چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"۔ (الحدیث) کیا ٹھکانا ہے اس کی رحیمی اور کریمی کا۔ البتہ اس کی رحمت اور کرم لینے کو لینے کی اہلیت کے ساتھ ساتھ سعی اور کوشش کو بھی دخل ہے۔ تمہاری ادنیٰ توجہ سے خدا کی زیادہ توجہ ہوگی اور تم انشاء اللہ کامیاب اور فائز المرام ہو کر دنیا سے جاؤ گے۔

نصیحت اور دعا پر تقریر ختم فرمائی۔

① الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ویحذرکم اللہ نفسه ج: ۲۰۲ ص: ۴۰۹۔

اظہار تعزیت

”اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ ! فَأَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ﴾① (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ)

موت کا جام......

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی ۔۔۔ کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

بزرگانِ محترم! دنیا میں موت و حیات کا سلسلہ ابتدائے آفرینش عالم سے جاری ہے، ولادتیں بھی ہو رہی ہیں اور موتیں بھی آ رہی ہیں، ولادت کے بعد موت سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔ عالم میں ہر کلیہ میں کچھ نہ کچھ مستثنیات نکلتے ہیں۔ مگر جس کلیہ سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں وہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ...... کا کلیہ ہے، جب انبیاء اور اولیاء اور دنیا کے بڑوں میں امراء و سلاطین مستثنیٰ نہیں رہے تو کون ہے کہ موت کے پنجے سے اسے بچا ہوا باور کر لیا جائے۔ پس جو بھی پیدا ہوتا ہے اس کی آخری منزل موت ہی ہے۔

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید ۔۔۔ ز جام دہر مئے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

یعنی جو بھی پیدا ہوا ہے اسے بہر حال موت کا جام نوش کرنا ہے۔

فَإِنَّ الْمَوْتَ غَايَةُ كُلِّ حَيٍّ ”موت ہی ہر زندہ کی آخری منزل ہے“۔ اسی لئے ولادتوں کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی دنیا میں قائم ہے اور رہے گا۔

کسی کا کندہ نگینہ پر نام ہوتا ہے ۔۔۔ کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے

عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر ۔۔۔ کسی کا کوچ، کسی کا مقام ہوتا ہے

فرقِ مراتب...... لیکن ولادت و موت سب کی یکساں نہیں ہوتی بلکہ جیسے پیدا ہونے اور مرنے والے مختلف

---

① پاره : ۲۱ ،سورة العنكبوت،الآية:۵۷.

مراتب کے لوگ ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی ولادتوں اور موتوں میں تفاوت اور فرق مراتب ہوتا ہے کسی کی پیدائش صرف ماں باپ کے لئے خوش کن ہوتی ہے۔ کسی کی خاندان بھر کے لئے باعث مسرت ہوتی ہے۔ کسی کی ولادت پر پورا شہر خوشی کرتا ہے اور کسی کی پیدائش پر ملک بھر اور دنیا میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ ایسے ہی موت بھی برابر نہیں۔ کسی کے مرنے پر کوئی بھی رونے والا اور میراث بانٹنے والا نہیں ہوتا۔ جیسے حدیث شریف میں ارشاد ہے قَلَّتْ بَوَاكِيْهِ وَقَلَّتْ تُرَاثُهُ۔ ''نہ اس کے رونے والے نہ میراث لینے والے''۔

کسی کی موت پر صرف اس کے ماں باپ یا قریبی عزیز غم کر لیتے ہیں۔ کسی کی موت صرف خاندان کے لئے غم ساتھ لاتی ہے، کسی کی موت سے شہر کا شہر سوگوار ہو جاتا ہے اور کسی کی موت پر شہر ہی نہیں ضلع اور صوبہ روتا ہے۔ خان بہادر مرحوم انہیں لوگوں میں سے تھے کہ جن کی ولادت بھی صرف ایک گھر کی خوشی نہ تھی بلکہ کئی خاندانوں اور ایک پورے علاقہ کی خوشی تھی۔

احسانات کا غم......اور آج جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا غم بھی صرف ان کے گھر کا غم نہیں بلکہ خاندانوں پورے شہر والوں پورے ضلع والوں بلکہ بعض حیثیات سے پورے صوبے کا غم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی کسی کی ذات کو نہیں روتا، بلکہ اس کے اوصاف کو، اس کے احسانات کو اور اس کی خوبیوں کو روتا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کہ اچھے اوصاف کا انسان مرنے کے وقت ہنستا ہوا اور خوش ہوتا ہوا اپنے اللہ سے ملتا ہے اس وقت دنیا روتی ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

یاد داری کہ وقت زادن تو	ہمہ خنداں شوند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقت مردن تو	ہمہ گریاں شوند تو خنداں

تجھے یاد بھی ہے کہ تیری پیدائش کے وقت تو تو رو رہا تھا اور سب خوشی سے ہنس رہے تھے۔ بس زندگی ایسے گزار کہ مرنے کے وقت تو تو خوشی سے ہنستا ہوا ہو اور سب روتے ہوئے ہوں۔'' تو یہ واقعہ ہے کہ خان بہادر مرحوم اسی شعر کے مصداق تھے کہ وہ تو انشاء اللہ اپنے نیک کردار کے سبب ہنستے ہوئے اپنے مالک سے جا ملے اور دنیا اج ان کے ماتم میں رو رہی ہے تو یہ رونا ان کی ذات کا نہیں بلکہ ان کے اوصاف اور خوبیوں کا ہے جو آج ہم سے چھن گئی ہیں۔

سلامتی فطرت......خان بہادر مرحوم کی جوانی اور پیری میرے سامنے گزری ہے۔ میرا لڑکپن تھا اور وہ جوان تھے ان کی زندگی کا ایک عجیب اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور وہ لڑکپن میں بلا مربی کے رہ گئے تھے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ ایک نونہال جو خاندانوں کی آنکھ کا تارا ہو اور دولت سے گھر بھرپور ہو تمام وسائل زندگی اور مال و جاہ خاندانی طور پر ورثہ میں ملا ہو اور اوپر سے کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہ ہو تو ایسی حالت میں مال و دولت کی فراوانی کی جو بری لت بھی پڑ جائے وہ حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ ہزاروں رئیس زادے اس طرح بگڑتے دیکھے گئے کہ سر پر بڑا اور مربی نہ رہا اور خاندانی دولت بلا محنت ہاتھ لگ گئی تو

بدکاریوں اور برائیوں میں مبتلا ہو کر دولت بھی برباد کر دی، جائیداد بھی ضائع کر دی اور خاندانی وجاہت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن یہ خان بہادر کی ہستی تھی کہ گھر کی ریاست ہاتھ میں ہے سر پر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں لیکن اپنی سلامتی فطرت سے وہ کسی بری لت کے شکار نہیں ہوئے، کسی عیاشی کسی تعیش، کسی فضول خرچی، کسی نمود و نمائش کے چکر میں نہیں پھنسے ان کی جائیداد نہ صرف یہ کہ محفوظ ہی رہی، بلکہ باغ و راغ کا اس میں بھی اضافہ ہوا۔

یہ بلاشبہ ان کے قلب کی سلامتی اور فطرت کی خوبی تھی کہ وہ خود بخود اسی راہ پر چلے جس پر نیک دل رئیس کو چلنا چاہئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خدا نے انہیں دولت کے ساتھ عزت کے خزانے بھی بخشے، وہ آنریری مجسٹریٹ بھی ہوئے، چیئرمین بھی ہوئے اور برسہا برس رہے۔ صوبائی کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ اونچی سوسائٹی میں ان کا مقام بھی بنا اور شہر یا ضلع ہی کے نہیں صوبہ کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ صوبہ بھر کے بڑوں میں شمار ہوئے، دوسرے لفظوں میں انہوں نے پوری صوبائی ملت کا اعتماد حاصل کر لیا جو ہر ایک کو میسر نہیں آتا۔

ضمیر کی سچائی...... ساتھ ہی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ وہ جس حالت میں قوم کے معتمد علیہ تھے اسی حالت میں گورنمنٹ کے بھی معتمد علیہ تھے۔ اعتماد کا آخری ڈپلومہ سرکاری خطاب ہے۔ سو وہ بھی گورنمنٹ کی جانب سے انہیں عطاء ہوا اور پھر عجیب تر یہ ہے کہ قوم اور گورنمنٹ کا ان پر اعتماد بیک وقت اس وقت بھی بدستور قائم رہا جب کہ قوم اور حکومت میں کشمکش اور مقابلہ ٹھن گیا اور جو لوگ قوم میں معتمد تھے ان کا اینٹی گورنمنٹ ہونا لازمی تھا اور جو گورنمنٹ کے معتمد علیہ ہوتے تھے ان کا اینٹی قوم ہونا ضروری تھا لیکن خان بہادر کے قلب کی یہ جامعیت اور صفائی حیرتناک ہے کہ وہ اس کشمکش کے دوران میں بھی بدستور قوم اور گورنمنٹ دونوں ہی کے معتمد علیہ رہے۔ کس طرح رہے؟ بعض لوگ دورخا اعتماد نفاق سے حاصل کرتے ہیں کہ جدھر جاتے ہیں ادھر ہی کی کہہ کر آتے ہیں۔ لیکن یہ اعتماد وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ اس نتیجہ میں انسان دونوں جانب سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ خان بہادر نے ان دونوں متضاد جانبوں کا اعتماد اپنے ضمیر کی سچائی سے حاصل کیا۔ وہ گورنمنٹ اور قوم کے سامنے سچائی سے وہی بات کہتے تھے جو ان کے ضمیر کی آواز ہوتی تھی۔ بے غرض کہتے تھے، وہ کسی لالچ یا طمع سے کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں آئے۔ وہ گورنمنٹ پر تو قوم کے اثرات کا دباؤ ڈال کر گورنمنٹ کو قوم کی بھلائی کے لئے ہموار کرتے تھے اور قوم کو سچائی کے ساتھ اس کی موافقت و مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنے ضمیر کی بات پہنچا دیتے تھے جس میں ان کے نزدیک قوم کی بھلائی و بہبودی ہوتی تھی، ان کی یہ سب باتیں اس قدر سلجھی ہوئی اور بااصول ہوتی تھیں کہ انہیں مانے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا تھا، اس لئے قوم اور حکومت دونوں ان پر اعتماد کرنے میں مجبور تھے۔ بہرحال انکے پیچھے جاہ و مال کی کوئی بری لت نہ تھی، جس سے ان کی دنیوی جاہ و عزت بڑھی، دولت نے ترقی کی اور اونچی سوسائٹی نے انہیں قبول کیا اور دنیاوی حیثیت سے وہ کبھی کسی تنزل سے دوچار نہیں ہوئے۔

دینی مقبولیت...... ہاں! جوانی میں اگر ان کے پیچھے کوئی دولت لگی تو وہ بزرگان دین کی طرف رجوع ان کی

مجلسوں میں بیٹھنا ان کی عادت بنی۔ یہ بھی ان کے ضمیر کی خوبی اور دل کی ہدایت کی بات تھی کہ لت بھی لگی تو وہ جو دنیا و آخرت میں مقبولیت کا ذریعہ بنے اور ان کی عزت کو پار چاند لگا دیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ہر دوسرے تیسرے روز حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس نشینی۔ میرے والد صاحب قبلہ کی مجلس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنا ان کی زندگی کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اکثر و بیشتر والد مرحوم کے ساتھ ان کے گھر پر آنا مجالس میں بیٹھ کر کچھ حاصل کرنا ان کا امتیاز بن گیا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ نیکوں میں بیٹھ کر آدمی نیک اور بدوں میں بیٹھ کر بد ہوتا ہے۔ خان بہادر جیسے سلیم الطبع انسان کو دل کی سلامتی کے ساتھ جب مجلسیں بھی اہل خیر کی ملیں تو ان کی طبعی نیکی اور زیادہ دوبالا ہوگئی۔ ماہ رمضان میں مجھے یاد ہے کہ کئی کئی بار میرا قرآن شریف سننے مسجد دارالعلوم میں آتے اور تراویح کے بعد ان بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر طویل صحبت حاصل کرتے تھے جس سے دنیوی مقبولیت کے ساتھ انہیں دینی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

اعتماد اکابر...... اور وہ جس طرح گورنمنٹ اور قوم میں معتمد علیہ تھے اسی طرح دینی طبقہ اور جماعت علماء میں بھی معتمد علیہ بن گئے، ان کی زندگی کا عنوان ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ جس طبقہ میں بھی پہنچ جاتے تھے اس کا اعتماد لے کر واپس ہوتے تھے۔ جو ان کی طبیعت کے بے لوث اور صاف ہونے کی دلیل ہے۔ گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ خطاب یافتہ ہوئے۔ قوم کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ کونسل کے نمائندہ (ممبر) منتخب ہوئے، شہر کا اعتماد حاصل کر کے اگر وہ دیوبند کے چیئر مین ہوئے تو علماء کا اعتماد حاصل کر کے وہ دارالعلوم دیوبند کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۳۵۳ء سے ۱۳۷۴ء تک اکیس برس انہوں نے رکنیت کی یہ خدمات اس خوبی اور دیانتداری سے انجام دیں کہ ان کے دوست اور مخالف سب ان سے خوش رہے، جس کی بڑی وجہ وہی تھی کہ وہ ہر اقدام اپنے ضمیر کی سچائی سے کرتے تھے۔ کسی رو رعایت سے ان کے یہاں کام کی انجام دہی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ان کے بڑے اور چھوٹے سب ان کے مداح تھے۔ کوئی بھی ان سے نالاں اور گریاں بریاں نہ تھا کیوں کہ نہ وہ خود غرضی سے کام کرتے تھے نہ انتقامی جذبات سے کام لیتے تھے، بلکہ اصول پسندی سے ان کی رائے اور عمل کا کام انجام پاتا تھا۔ اس دینی سلسلہ کی رکنیت اور علماء کی صحبت و معیت کا انجام دنیوی بہبود و فلاح کے ساتھ اخروی کامیابی کی صورت میں نمایاں ہوا، نماز، روزہ کی پابندی، زکوٰۃ کا حساب کتاب، حج کی توفیق، مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی امداد کے کام ان سے بے تکلف سرزد ہوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے غرباء کی امداد گھر بیٹھ کر کرتے تھے۔ دو مرتبہ ان کے عطیات کا امین میں خود بنا اور ان کے منشاء کے مطابق ان کی رقم مدینہ منورہ میں تقسیم کی گئی۔ پس مرحوم ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جنہیں دنیا کے ساتھ دین اور جائز عیش کے ساتھ طاعات و عبادت کی توفیق بھی بخشی گئی۔

انفرادی اعتماد...... آج اگر یہ شہر اور ضلع خان بہادر کو رو رہا تھا تو وہ ان کی ذات کو نہیں بلکہ ان کے اوصاف کو رو رہا ہے جن کی بدولت وہ ہر طبقہ میں مقبول، ہر طبقہ کے معتمد علیہ تھے اس پر مزید خوبی ان کی بے تکلفی تھی بڑے ہی نہیں

چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسے اخلاق سے پیش آتے تھے کہ چھوٹا انہیں بڑا سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیونکہ وہ خود اپنی نگاہ میں اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ برادری میں برابر کے بھائی کی طرح، بزرگوں میں نیک سرشت خوردوں کی طرح اور خوردوں میں مشفق بزرگوں کی طرح پیش آتے تھے جس سے انفرادی اعتماد بھی ان کا افراد میں قائم تھا۔

بہر حال یہی وہ اوصاف اور خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے شہر اور ضلع سوگوار ہے اور غم میں گریاں ہے۔ چنانچہ آج کی مجلس میں بھی وہی مجلس غم اور تعزیت کی مجلس ہے جو شہر کی طرف سے منعقد ہوئی ہے۔ اس مجلس کا موضوع یہی ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے غم کو جو چھپایا نہیں جا سکتا اور دل میں اس کی سمائی مشکل نظر آ رہی ہے کھول دیں۔ اور آنکھیں اگر روتے روتے تھک گئی ہیں تو دل کو ہی گریہ و بکا سے ہلکا کر لیں۔

لیکن میں اپنے بزرگوں کی خدمت میں ادب سے عرض کروں گا کہ رونا اور غم کرنا نہ کوئی فائدہ مند بات ہے نہ اس سے دنیا و آخرت کا کوئی نفع متعلق ہے اگر رونے اور غم کرنے سے جانے والا واپس ہو جایا کرتا تو سو برس تک بھی رونا بند نہ کیا کرتے۔ بقول عرفی کے ؎

عرفی گر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

''اے عرفی اگر رونے سے مرنے والا مل جایا کرتا تو سو سال بھی ہم رونے سے نہ تھکتے اور روتے رہتے''۔

رسمی نوحہ و بکاء...... لیکن رونا اور غم کرنا کسی کو واپس نہیں لا سکتا اسی لئے شریعت کے نزدیک غم لے کر بیٹھنا اور بہ تکلف اسے نمایاں کرنا جاہلیت کی رسم قرار دیا گیا ہے زمانہ جاہلیت کا دستور تھا کہ بڑے لوگ مرتے وقت وصیت کر جایا کرتے تھے کہ ہمیں برس دن رویا جائے تا کہ دنیا پر واضح ہو کہ کوئی بڑا شخص دنیا سے اٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ برس دو برس کون ہے کہ دل سے روئے کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں رونے والیاں کرایہ پر رکھی جاتی تھیں اور انہیں اجرت دے دے کر رلایا جاتا تھا، جب کوئی تعزیت اور پرسہ کے لئے آتا تو وہ جلدی سے حلقہ باندھ کر بیٹھتیں اور آوازیں ملا کر نوحہ و بکاء کرنا شروع کر دیتیں۔ موثر اشعار اور غم افزا کلمات سے دلوں کو پگھلاتیں اور لوگ آنسو پونچھ کر یہ کہتے ہوئے چلے جاتے کہ حقیقتاً ایک بڑا آدمی دنیا سے اٹھ گیا جس کا یہ سوگ کیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس رسمی رونے میں نہ رونے والیوں کا دل شریک ہوتا نہ رونا دیکھنے والوں کا۔ دونوں سازی سے روتے تھے برادری یا شہر کو دکھلانے کے لئے یہ حرکت کرتے تھے۔

میت کی راحت رسانی...... اس لئے ہماری مجلس اور ہماری انفرادی نشست کا موضوع غم و ماتم نہ ہونا چاہئے کہ یہ رسم جاہلیت ہے۔ بلکہ موضوع یہ ہونا چاہئے کہ ہم سے تو میت کو نفع پہنچے اور میت سے ہمیں نفع پہنچے۔ شریعت نے ہم سے میت کو نفع پہنچنے کی صورت تو ایصال ثواب بتلائی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ ''قبر کے اندھیرے گھرانے میں میت اپنے گھر والوں سے آس باندھتا ہے کہ شاید مجھے کوئی یاد کرے اور شاید مجھے کوئی ثواب پہنچا دے''۔ حدیث شریف میں ہے کہ ''قبر میں میت کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی بچہ دریا میں منجدھار

کے ہچکولے کھا رہا ہو اور اسے تنکا بھی ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے بھی اپنا سہارا سمجھتا ہے، ٹھیک اسی طرح میت قبر میں راحت ونجات کی خاطر اپنے وارثوں اور دوستوں سے آس لگائے رہتا ہے کہ کاش مجھے کوئی یاد کرے اور ثواب پہنچائے جو میرے لئے تنکے کا سہارا ہو جائے''۔ سو خان بہادر کی خیر خواہی یا ان کے حقوق کی ادائیگی جو ہم سب کے ذمہ ہے یہ نہیں ہے کہ اس نیک ہستی کے غم میں ہم چار آنسو بہا لیں اور رومال سے آنکھوں کو پونچھ کر اپنے گھر روانہ ہو جائیں بلکہ یہ ہے کہ ان کی راحت رسانی کا سامان بہم پہنچائیں اور وہ ایصال ثواب ہے۔

ایصال ثواب کی آسانی...... کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر ہر شخص روزانہ یا دوسرے تیسرے، روز قل ھو اللہ شریف تین بار پڑھ کر مرحوم کو ثواب اور دعا میں یاد کر لیا کرے۔ قل ھو اللہ کو تین دفعہ پڑھنے کا ثواب حدیث شریف میں ہے کہ ''ایک پورے قرآن کے ثواب کے برابر ہے''۔

اللہ نے کس قدر آسانی فرما دی کہ دو منٹ میں تین دفعہ قل ھو اللہ پڑھو اور ثواب حاصل کرو جو دس بارہ گھنٹے کی محنت سے پورا قرآن شریف پڑھ کر حاصل ہوتا ہے اس لئے چند آنسو بہا لینا یا چند کلمات تعزیت زبان سے ادا کر دینا مرحوم کی خیر خواہی نہیں بلکہ ایصال ثواب کرنا حقیقی خیر خواہی ہے خواہ جان سے جیسے تلاوت نماز اور دوسری عبادات کا ثواب پہنچانا یا مال سے جیسے غرباء ومساکین کو بہ نیت ایصال ثواب کھانا یا کپڑا پہنچانا وغیرہ۔

محاسن مرحوم...... پس ہماری مجلس یا انفرادی نشست کا ایک موضوع تو بحکم شریعت یہ ہونا چاہئے کہ ہم میت کو نفع پہنچائیں اور دوسرا موضوع یہ ہے کہ میت سے ہم خود نفع حاصل کریں اس کی صورت شریعت نے یہ بتلائی ہے کہ **اُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ** ① ''اپنی میت کی خوبیاں بیان کیا کرو''۔ تا کہ ان خوبیوں کے تذکرہ سے ایک طرف تو میت کی طرف سے قلوب میں محبت پیدا ہو اور محبت کے داعیہ سے لوگ اسے ثواب ودعا سے یاد رکھیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی خوبیوں کے تذکرہ سے خود ہم میں ان خوبیوں کے حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور ہم بھی اس کے نقش قدم پر چل کر وہی مقام حاصل کریں جو مرنے والے نے حاصل کیا تھا۔ پس! ایصال ثواب سے میت کو ہم سے کچھ ملتا ہے اور میت کے عمدہ تذکرہ سے ہمیں میت سے کچھ ملتا ہے۔ اس لئے ہماری اس مجلس کا موضوع رونا اور اظہار غم کرنا نہیں ہونا چاہئے بلکہ خان بہادر مرحوم کو نفع پہنچانا اور ان سے خود نفع حاصل کرنا ہونا چاہئے۔

مرحوم کی یادگار...... خان بہادر مرحوم کی عمدہ ترین یادگار ''یہ ہائی اسکول ہے جو تنہا انکی کوششوں سے قائم ہوا۔ اور اس وقت قائم ہوا جب کہ سب اس کے قیام سے مایوس تھے لیکن ان کی ہمت مردانہ تھی کہ مایوسیوں کے ہجوم میں پامردی کے ساتھ وہ کھڑے ہوئے اور اسکول قائم کر کے چھوڑا، جس کا نفع آج قصبہ کے ہندو، مسلمان دونوں کو پہنچ رہا ہے۔ درمیانی مدت میں ایسا وقت بھی آیا کہ اسکول باقی رہنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، مرحوم نے مجھ سے بھی اس کا تذکرہ فرمایا اور یہ کہ لوگوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کیا جائے۔ میں نے بھی ان کے بزرگانہ ارشاد کی

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الادب، باب فی النھی عن سب الموتیٰ ج:۱۳ ص: ۵۱.

تعمیل میں اسکی جدوجہد کی اور اس میں کامیابی ہوئی جس پر ہمیشہ ممدوح مسرت کا اظہار فرماتے تھے لیکن حقیقتاً یہ کام صرف ان کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا کہ اسکول کو مایوسیوں کے ہجوم میں بھی چلاتے رہے۔ حتی کہ انہیں کتنے ہی ماہ تنخواہ میں اپنی ذات سے ہزاروں روپیہ خرچ کرنا پڑا۔ مگر اس کار خیر سے نہ ہٹے۔ علم کی بقاء کا راستہ پیدا کرنا خواہ وہ کسی بھی چیز کا علم ہو امر خیر ہے۔ جبکہ حسن نیت سے ہو اور صدقہ جاریہ ہے کیوں کہ عمل تو عامل کے ساتھ رخصت ہو جاتا ہے لیکن علم عالم کے ساتھ یا علم کا انتظام کرنے والے کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے۔ یہ مادی دولت نہیں ہے کہ اسے جتنا خرچ کرو گھٹتی ہے بلکہ روحانی دولت ہے کہ جتنا خرچ کرو بڑھتی ہے۔

اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ ان کے اور محاسن کے ساتھ ان کے اس صدقہ جاریہ کو باقی رکھنے کی امکانی سعی کرتے رہیں، جس سے مرحوم کی روح خوش رہے گی اور اجر دائمی سے متمتع ہوتی رہے گی۔ بہر حال رونے اور غم والم کے اظہار کے بجائے ہمارا کام ایصال ثواب اور ذکر محاسن ہونا چاہئے کہ یہی ان کے دلوں میں ہمہ وقت زندہ رہنے کی سبیل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خان بہادر مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقامات عطا فرمائے اور جس طرح انہیں دنیا میں اس نے قبول فرمایا تھا اس طرح آخرت میں انہیں قبول فرمائے اور ان کے پسماندگان اور تمام وارثوں اور عزیزوں کو ان کے نقش قدم پر چلائے اور صبر و تسلی عطاء فرمائے۔ ہم سب ان کے دکھ درد کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جامع مذہب

''اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ !فَأَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ ① صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ.

جامع مذہب...... آیت کے ذیل میں دین اسلام کو جامع بتلایا۔ یہود ونصاریٰ کی مختلف جزئیات کو پیش کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا کہ دین اسلام پچھلے تمام آسمانی دینوں اور ملتوں کا جامع بنایا گیا ہے، اس دین میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی سختی موجود ہے وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نرمی اور درگزر بھی موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہیں اگر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم بھی ایک تھپڑ مارو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہارے گال پر اگر کوئی ایک طمانچہ لگائے تو تم دوسرا گال بھی پیش کردو۔

دین اسلام میں نہ وہ سختی ہے اور نہ یہ نرمی ہے، بین بین کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا۔ ہے: ﴿جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ ② ''برائی کا بدلہ برائی لیکن اتنا ہی''۔ اس کی وضاحت دوسری آیت میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہاری کوئی ایک آنکھ پھوڑے تو تم بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ دو تمہاری ناک پر اگر کوئی گھونسہ مارے تو تم بھی اس کی ناک پر ایک گھونسہ ماردو تمہارے کوئی اگر دانت توڑ دے تو تم بھی اس کا ایک دانت توڑ دو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاف کردیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے گویا بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے اور معاف کردینے کی بھی اجازت ہے۔ اس طرح اس دین میں شریعتِ موسوی بھی آگئی ہے اور شریعتِ عیسوی بھی آگئی۔ متعدد واقعات اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے اس جز کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے مختلف ادیان اور مختلف شریعتیں جاری تھیں اور آپس میں اختلاف اور عداوتوں کی خلیج روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اسلام نے آکر اختلاف اور عداوتوں کی خلیج کو پاٹا، اتفاق واتحاد پیدا کیا اور تمام اقوام عالم کو

① پارہ: ۶، سورۃ المائدہ، الآیۃ: ۳. ② پارہ: ۲۵، سورۃ الشوریٰ، الآیۃ: ۴۰.

ایک دین پر جمع کر دیا۔

طبقاتی اِجتماعیّت...... اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ہندوستان کے تمام مذہبی طبقات بلکہ اُمراء کو، صوفیاء کو، سلاطین کو، وزراء کو، غرض ملک میں پھیلے ہوئے تمام منتشر طبقات کو جمع کرنے کی کوشش کی، خطوط روانہ فرمائے پیغامات روانہ کئے اور ملت کے تمام طبقات کو ایک نقطہ پر جمع فرمایا۔

دارالعلوم کی شانِ اجتماعیّت...... یہ دارالعلوم دیوبند بھی اپنے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز پر قائم کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند سے پہلے ہندوستان میں اہلِ علم کے مختلف طبقے تھے۔ کوئی متکلم اور کوئی منطقی تھا۔ اور کوئی اہل حدیث تھا۔ کوئی اہل قرآن تھا۔ کوئی فلسفی تھا۔ مگر دارالعلوم کے اکابر، اس کے بانیوں نے ایک ایسا نصاب جاری فرمایا جس سے ملک کے تمام طبقوں میں وحدت اور یکسانیت پیدا ر ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند نے سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں محدثین پیدا کئے، ہزاروں مفسرین قرآن اور متکلم پیدا کئے جنھوں نے دین اسلام کی حقانیت، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کی۔ دارالعلوم کا فاضل بیک وقت محدث بھی ہے مفسر بھی ہے، متکلم بھی ہے، مبلغ اور صوفی بھی ہے، حق تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسی جامعیت اور مرکزیت عطا فرمائی ہے کہ اس کے فضلاء دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی خدمت کرر ہے ہیں یہ وہی جامعیت اور مرکزیت ہے جس پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ملک کے تمام طبقات کو جمع فرمایا۔

وفاق المدارس...... دارالعلوم دیوبند نے اجلاس صد سالہ کے موقع پر متعدد اہم و مفید اور کار آمد تجاویز منظور کرائیں۔ ان تجاویز میں سے ایک اہم تجویز وفاق المدارس کی بھی ہے اس تجویز کا مقصد بھی ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے، اگر ہندوستان کے تمام مدارس ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند پہلے سے بنا بنایا مرکز موجود ہے تو اس میں نفع دونوں کا ہے۔ مدارس اور مکاتب کا بھی اور دارالعلوم دیوبند کا بھی، ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کی خدمات سے دارالعلوم باخبر رہے گا۔ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ حضرات کی شہرت اور ان کی خدمات سامنے آئیں گی۔ مدارس اپنے مرکز دارالعلوم دیوبند کی خدمات، حالات اور کارگزاریوں سے واقف ہوں گے۔ تو یہ وفاق مدارس کی تجویز ایسی تجویز ہے۔ جس کے روبہ عمل آ جانے کے بعد فضلاء کی تنظیم بھی قائم ہو جائے گی۔ تنظیم فضلاء نہ تنہا کوئی مقصد ہے نہ اس پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اصل وفاق المدارس اور تنظیم مدارس ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب منظم ہو کر اپنے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے تو فضلاء کی تنظیم خود بخود قائم ہو جائے گی کیوں کہ ان مدارس اور مکاتب کے چلانے والے اس کے اساتذہ اور ذمہ دار اکثر و بیشتر فضلاء دارالعلوم ہی ہیں۔

افاداتِ علم وحکمت

مختلف علمی سوالات کے جوابات کے سلسلے میں
حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کا اظہارِ خیال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا

حسن نیت سے حرام حلال نہیں بنتا...... ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر قوم نے اپنے قومی مفاد کے خیال سے کچھ فنڈ جمع کیا، مثلاً لاکھ دولاکھ روپیہ اور پھر یہ سمجھ میں آیا کہ اس رقم کو بطورِ قرض تاجروں کو دیں اور چونکہ تاجر بہر صورت بینک سے سودی قرض لیتا ہے تو کیوں نہ ہم اس رقم کا سود وصول کریں تا کہ فنڈ قائم رہے اور ترقی کرتا رہے اور قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے تو قوم کی یہ ہمدردی اسلامی شریعت کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ سود کا مسئلہ تو واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اجتہادی یا فروعاتی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے: ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (1) ''اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا'' (القرآن) سود کسی بھی نوعیت سے ہو وہ حرام ہی رہے گا اور قومی ہمدردی اگر حرام طریق سے ہو تو وہ مستقل وبال جان بنے گی دنیا میں بھی آخرت بھی میں، کسی عمل کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں جب تک کہ وہ عمل شریعت کے مطابق نہ ہو۔ اچھی نیت سے اگر کوئی گناہ کرے تو وہ نیکی نہیں بن جائے گا اور نہ ہی اس نیت کا کوئی اعتبار ہوگا۔

جب دو چیزیں تھیں بیع اور سود۔ ایک کو حلال قرار دیا اور ایک کو حرام۔ تو بجائے اس کے کہ اس پر سود لیں اور صریح حرام کے مرتکب ہوں، خود بھی گناہ میں مبتلا ہوں اور قوم کو بھی گناہ میں مبتلا کریں۔ اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگا دیں، خواہ ایک شخص وکیل بن جائے۔ سب کی طرف سے نفع ونقصان کا شریک رہے اور اس منافع سے وہ قوم کی خدمت کرے کہ وہ سرمایہ بھی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ محض سرمایہ کو رکھنے کے لئے ایک حرام شکل اختیار کی جائے کہ وہ راس المال کو بھی حرام اور ناجائز کر دے تو اس سے قوم کو فائدہ نہیں بلکہ ضرر پہنچے گا، یہی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کھلے طور پر کیسے خلاف ورزی کریں گے محض اس نیت سے کہ قومی ہمدردی ہو۔ آج یورپ والے جو سود لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ان میں بھی تو قومی ہمدردی کا

(1) پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۷۵.

جذبہ ہے کہ قوم کو فائدہ پہنچے، لیکن وہ تو شریعت کے مکلّف ہی نہیں مگر جولوگ شریعت کے مکلّف ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سود لینے دینے میں ضرر بھی ہے۔ پھر جانتے بوجھتے کسی کام کو کرنا اور اس پر اعتماد بھی کر لینا صرف یہ سمجھ کر کہ ہماری تو نیت نیک ہے نہایت ہی غلط اور غیر مناسب بات ہے اور قوم کے ساتھ ہمدردی کی بجائے در پردہ دشمنی ہے، دنیاوی بھی اور اخروی بھی۔

عملِ مشروع میں ہی حسن نیت کا اعتبار ہے...... لہٰذا کسی کام کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں۔ اب نیک نیتی سے کوئی یوں سمجھ لے کہ نماز تو اچھی چیز ہے اس کی چھ رکعت ہی پڑھ لوں نفع ہی نفع ہوگا، تو چار بھی نہ ہوں گی وہ بھی منہ پر ماردی جائیں گی۔ تو جہاں اسلام میں نیت کی خوبی ضروری ہے۔ حسن عمل یا عمل صالح اسی کا نام ہے کہ جس میں اخلاص اور حسن نیت بھی ہو اور ساتھ میں عمل کی صورت بھی وہی جو شریعت سے ثابت ہو۔

اسی لئے سورہ ملک میں فرمایا گیا ہے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ① برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی اور کائناتوں کا بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی ذات ہے کہ جس نے موت اور حیات پیدا کی۔ (القرآن) کسی کو وجود دیا کسی سے وجود چھینا، کسی کو زندہ کیا کسی کو مردہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں ہے وجود اور عدم کی باگ دوڑ۔ عالم میں یہ تغیرات، موت، حیات، نعمت، سلب نعمت کیوں رکھے؟ وجہ بیان فرمائی: ﴿لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ② تاکہ اللہ تمہیں جانچے کہ تم اچھا عمل کرتے ہو یا برا۔ جب تم اس کے ملک میں ہو، اس کے اقتدار کے نیچے ہو، اس کی قدرت کے تحت ہو تو تم اس کے حکم کی اتباع کرو گے یا نہیں اسی کو جانچنے کے لئے عالم میں یہ تغیرات رکھے ہیں تاکہ تمہارے ایمان کی جانچ ہو اور دیکھیں کہ تم میں اَحْسَنُ عَمَلًا ہے۔

عمل صالح کی دو بنیادیں...... اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے کی ہے کہ "اَیُّ اَخْلَصُهٗ وَاَثْبَتُهٗ" ③ حسن عمل اور علم صالح وہ ہے کہ خالص ہو، رضاء خداوندی کے لئے اخلاص کے ساتھ ہو مخلوق کی رضاء یا اپنی رضاء نفس شامل نہ ہو۔

اگر رضاء خلق کا شائبہ تک بھی شامل ہے عمل کے اندر تو وہ داخل شرک قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ثابت بالسند ہو اور بطریق صواب ہو یعنی اس نہج پر ہو کہ جس طرح شریعت نے بتلایا ہے، تو گویا عمل صالح کی دو بنیادیں ہو گئیں ایک اخلاص للہ کو جو کلمہ بیان کر رہا ہے وہ ہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہی برحق ہے۔ اسی کا حکم ماننے کے قابل ہے۔ اور اسی کی رضا پر چلنے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے اور اسی کلمہ کے دوسرے جز مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ سے نکلتا ہے اتباع سنت۔ اس لئے کہ بطریق صواب وہی ہے۔ جس کو سرکار

---

① پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۲-۱۔ ② پارہ: ۲۹، سورۃ الملک، الآیۃ: ۲۔

③ قال البغوی: قال فضیل فی تفسیرہ: اخلصہ و اصوبہ، ج: ۸، ص ۱۷۶، تفسیر البغوی، سورۃ الملک۔

دو عالمؐ نے کر کے دکھایا ہے یا جو آپ کے متبعین حضراتِ صحابہ کا تعامل ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس عمل میں لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ شامل ہوگا وہی عملِ صالح ہوگا۔

عمل صالح اسے کہتے ہیں کہ میں اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ فلاں نے بڑے اچھے کام کئے، رفاہِ عام کا کام کیا بہت ہی عمدہ کام کیا ہمارے اور آپ کے سمجھنے سے اور محض تخیل سے وہ عملِ صالح نہیں بنے گا۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے بلکہ عملِ صالح بنتا ہے دو بنیادوں سے اخلاص للہ اور دوسری بنیاد ہے اتباع سنت۔ جس کام میں اخلاص ہے اور اتباع سنت بھی ہے وہ عملِ صالح ہوگا۔

شرک و بدعت کی بُنیاد...... اب اگر اخلاص میں کمی آئی یعنی کسی کام میں رضا خداوندی کے ساتھ کچھ مخلوق کی رضا بھی شامل ہوگئی۔ یا نفس کی رضا مخلوط ہوگئی تو وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہ رہا، اس لئے جس درجہ اخلاص میں غیر اللہ کی رضا شامل ہوگی، شرک کی بنیاد پڑتی چلی جاوے گی اور شرک فی العمل ہو جائے گا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے معنی ہیں اتباع ہو رسالت خداوندی کا۔ اب جس درجہ اتباع میں کمی آتی جائے گی اسی درجہ اتباع اور بدعت کی بنیاد پڑتی جائے گی جو شرک تک پہنچائے گی۔ تو دین کی اصلاح کی دو بنیادیں ہیں اخلاص اور اتباع سنت۔ اور دین کے فساد کی دو بنیادیں ہیں شرک اور بدعت۔ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. میں کمی آنے سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ میں کمی آنے سے بدعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی کا کام ہے کہ اپنے ہر کام میں غور کرے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اس میں لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ شامل ہے یا نہیں؟ جس پر اس کا ایمان ہے، اگر ہے تو عملِ صالح ہے۔ نہیں تو پھر وہ عملِ طالح۔ تو ایک تو ہے صریح چیز جس کو شریعت نے صراحۃً ممنوع قرار دیا ہے اس کو اگر جائز کرنے کی فکر میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص تو پہلے ہی کھو دیا وہ کام رضا حق کے لئے نہ رہا اور ساتھ میں اتباع کو بھی خیر باد کہہ دیا کہ وہ ریاست کی پیروی نہ رہی تو اس عمل میں برکت کہاں سے ہوگی؟

اس سے جتنے بھی آثار پیدا ہوں گے وہ سب نجس اور ناپاک ہوں گے اس لئے کہ معدہ ہی درحقیقت حوض بدن ہے اس کا پانی گندہ ہوا تو ایک ایک عضو میں گندگی پہنچے گی۔ معدہ میں پاک چیز بھری ہوتی ہے تو ہر عضو میں پاک چیز پہنچے گی۔ ایمانی خوشبو پیدا ہوگی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب مرنے کا وقت قریب ہوتا ہے، ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ملائکہ ہاتھوں کو، پیروں کو، منہ کو ٹانگوں کو سونگھتے ہیں کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے؟ وہ جو قلب کا ایمان ہے جب وہ پھیلتا ہے تو ہاتھ پیر پر آتا ہے عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو ملائکہ اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پیر میں ایمان کی کس قدر خوشبو ہے؟

ابتدا سے لے کر انتہا تک اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف دو ہی چیزوں کی جانچ ہے وہ یہ کہ ہر عمل میں ایمان کا دخل ہو۔ اور ہر عمل میں اتباع کا دخل ہو۔ ایمان میں کمی آئی۔ شرک پیدا ہوا۔ اتباع میں کمی آئی تو بدعت پیدا ہوئی۔ اور یہ دونوں چیزیں دین کے فساد کی ہیں تو آدمی قومی ہمدردی کرے اور دین کو پہلے ہی خیر باد کہہ دے۔ یہ ہمدردی

کیا ہوئی، یہ تو نہ اپنی ہمدردی رہی نہ قوم کی ہمدردی رہی۔

قوم کے اخلاق کا تحفظ ...... محض قومی ہمدردی کے نام پر ہم قوم کو ناپاک غذائیں پہنچائیں اور ساری قوم کے اخلاق کو گندہ بنانا، کمینہ اخلاق قوم کے اندر پیدا کرنا یہ کون سی ہمدردی ہے؟ لہٰذا یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع کیا محض اس لئے کہ ہماری قوم کی خدمت ہو مگر اس جمع کے اندر دین بھی تو شامل ہونا چاہئے کہ تا کہ قوم کے اندر ناپاک اخلاق پیدا نہ ہوں اور قوم سے ناپاک افعال نہ سرزد ہوں۔

اگر اس کی غذا لقمہ صحیحہ ہے تو اخلاق صحیح ہیں، لقمہ ناپاک ہے تو اخلاق بھی ناپاک ہیں، اس لئے ہم نے اکابر کو یہ دیکھا ہے کہ بیعت کرتے وقت وہ پہلے پوچھتے تھے، کہ تمہارے پاس موروثی زمین تو نہیں ہے کچھ سود وغیرہ تو نہیں ہے جس کو تم کھاتے ہو، پہلے اس سے توبہ کرو، جب بیعت کریں گے۔ اس لئے کہ جب غذا ہی تمہاری مشتبہ ہوگی تو ذکر اللہ تمہارے اندر کیا اثر کرے گا، اگر اللہ کا نام لوگے تو اس کی تاثیر واقع نہیں ہوگی۔ اللہ کا نام جیسا پاک ہے وہ پاک ہی ظرف چاہتا ہے ناپاک ظرف کے اندر پاک چیز نہیں بھری جاتی۔ وہ بھی ناپاک بن جائے گی تو غذا پر اور اکل حلال پر دارومدار ہے اخلاق حسنہ کا۔

ظلمتِ اخلاق ...... اسلام نے سب سے زیادہ زور اکل حلال پر دیا ہے۔ اس لئے جتنی چیزیں ہیں کہ جس سے لقمہ میں کوئی حرمت پیدا ہو۔ کوئی ناجائز شکل پیدا ہو۔ ان سب چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دے دیا۔ سود کو حرام کر دیا۔ احتکار کو حرام قرار دے دیا۔ احتکار کے معنی ہیں، گرانی کی امید پر مال کو روک رکھنا، احتکار کی صورت میں مخلوق کو ستانا ہے اور مخلوق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ ضرورت ہوتے ہوئے مال کو اپنے نفع کے لئے روک کر رکھنا ایسی تمام چیزیں حرام قطعی ہیں اور کچھ "کرہی" ہیں۔ مگر ایسی تمام چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے کہ جن سے مال میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا ہو۔ کوئی حرمت پیدا ہو یا کوئی کراہت پیدا ہو۔

مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلم پیدا ہوا ہے دنیا میں اپنی آخرت بنانے کے لئے، دنیا اس کے لئے وسیلہ ہے، وسیلہ اس کا اگر گندہ بنا تو مقصد میں بھی گندگی آجائے گی وسیلہ اگر پاک ہے تو مقصد بھی پاک ہوگا۔ اسی لئے مقصودِ اصلی آخرت ہے۔ گو اس کے لئے دنیا وسیلہ ہے، اس کے قواعد بنا دیئے ہیں کہ جائز طریق پر کمائیں۔ جائز طریق پر خرچ کریں۔ ناجائز اور حرام، مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچیں، نہ بچنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوگی بلکہ برکت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظلمت بھی ہوگی اور اس کے آثار ناپاک ظاہر ہوں گے۔ عمل میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

قومی خدمت جائز ذرائع سے ہونی چاہئے ...... اگر ہم قومی خدمت کریں اور ہم اس کے اندر اشتباہ پیدا کریں یا کم از کم مکروہ چیزیں داخل کر دیں یا صریح حرام چیزیں داخل کر دیں تو اس سے برکت کیا ہوگی؟ بلکہ خود بھی مبتلا ہوں گے، غلاظت میں اور قوم کے قلب میں بھی غلاظت بھرنے والے ہوں گے۔ ان کے دل میں بھی خیر و برکت پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ سرمایہ جمع کیا تا کہ قوم کو فائدہ پہنچے۔

سرمایہ کے تحفظ کی صورت بجائے حرام کے، یہ شکل کیوں نہیں اختیار کر لیتے؟ مضاربت کی صورت کرلیں۔ دو چار افراد اپنی تجارت میں لگا دیں اور حسب رقم اس کا منافع دیتے رہیں۔ رقم بھی محفوظ رہے گی اور منافع بھی چلتا رہے گا اور ترقی بھی ہوتی رہے گی۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ مسلمان نفع کمائے تو اس کی طبیعت حرام اور مکروہات کی طرف کیوں جاتی ہے؟ جبکہ وہ اللہ اور رسول کو مانتا ہے۔ اس کی طبیعت اور فطرت کا تو تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ مشتبہ چیزوں سے بچے اور جائز اور حلال چیزوں کی طرف چلے تاکہ اپنا بھی نفع ہو اور دوسروں کا بھی نفع ہو تو بھید یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیا ہے کہ صاحب! سود سے کریں گے قوم کی خدمت کوئی فرعی چیز ہو یا کوئی اجتہادی چیز ہو تو اس میں کچھ گنجائش نکالیں بھی۔ ایک صریح اور قطعی حرام چیز اور آدمی اس سے فائدہ سوچے یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

حرام میں شفاء نہیں...... بیماری اور دواؤں کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَجْعَلْ شِفَآءَ کُمْ فِیْمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ'' ① اللہ نے ان دواؤں میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی، جو دوائیں حرام ہیں۔ شراب ہے، قمار کی چیزیں ہیں، جوا ہے، ان میں شفا نہیں ہے۔ اگر ظاہری طور پر شفا ہوئی بھی تو روح اتنی بیمار ہوگی کہ بدن پھر آخر غلیظ اور گندہ ہوگا۔ پھر بیمار پڑے گا جب مادی امراض کی شفا بھی حرام میں نہیں تو روحانی امراض کی شفا کیسے ہو جائے گی حرام کے اندر؟ اور وہ بھی قطعی حرام، اس لئے یہ سوال ہی آنا نہیں چاہئے۔ نیت نیک ہے۔ جذبہ نیک ہے۔ پھر قومی خدمت کرے۔ تو کوئی بینک ایسا قائم کرے جو شرعی جواز کے تحت ہو۔ ذرا سا تغیر کر دو وہی نفع رہے گا۔ مگر جائز بن جائے گا۔

متبادل صُورت...... تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کو باقی رکھنے کی صورت کو ذرا سا تبدیل کر کے حدِ جواز میں لے لیا جائے تاکہ حرام سے بچا جائے۔ تو مسلمان کا تو کام ہی یہ ہے کہ معاملہ ہو۔ اطاعت ہو، عبادت ہو، اس میں حرام و مکروہ سے بچ کر حدِ جواز کی طرف آئے، یہی معنی اس کے اسلام کے ہیں ورنہ تو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا رہ گیا۔ وہ بھی سود خور، تم بھی سود خور، وہ بھی حرام خور اور تم بھی حرام خور۔ تو ہم تمہیں حلال خور بھی نہیں بنانا چاہتے (بر سبیلِ لطیفہ فرمایا) اور حرام خور بھی نہیں بنانا چاہتے۔ آدمی اکلِ حلال پر رہے۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ نیت بھی نیک ہے، جذبہ بھی نیک اور قومی خدمت کا جذبہ مبارک ذرا سا تغیر کر کے اس کو حدِ جواز میں لے لیں۔ کیوں حرام کی طرف جا رہے ہیں؟ کہ قوم کی روح کو بھی گندہ کریں اور خود بھی گندے بنیں اور آخرت کا مواخذہ الگ کوئی بینک قائم کر دیں یا کوئی ایسی صورت قائم کر دیں کہ اپنی تجارت میں لگا لیں، یا کوئی کمپنی تجارت کی بنا دیں اور اس میں شرکاء ہوں نفع نقصان کے شریک رہیں اور پھر وہ رفاہِ عام کے لئے خرچ کریں تو اس سے راس المال بھی محفوظ رہے گا۔ اور بڑھتا بھی رہے گا۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں اور کس قسم کا وہ اسلام ہے جو اس پر آمادہ کر رہا ہے؟

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج:۱۷ ص:۱۵۲ رقم:۱۹۲۱۰.

مطالعہ کا علم لائقِ اعتماد نہیں......سوال: حضرت کہا جاتا ہے کہ اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ربوا ہے صرف ربوا حرام نہیں ہے۔اس پر حضرت نے دریافت کیا کہ یہ علماء کہتے ہیں۔یا تاجر کہتے ہیں۔سائل نے کہا کہ حضرت! یہ بات ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہی تھی۔رسالوں میں لوگوں نے دیکھ لی ہے اس کا بہانہ بنایا جارہا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ رسالوں میں تو بہت سے مضامین آتے رہتے ہیں۔اہل حق کے بھی اور اہل باطل کے بھی مُئَوِّلِیْن کے بھی اور مُکَذِّبِیْن کے بھی،کہیں ان میں سے چھان بین کر کے حق اور صواب کو نکالنا یہ تو متدین علماء کا کام ہے۔اور تاجر جو متہم ہوں پیسہ کمانے کی خاطر ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں وہ تو ایسی چیزوں میں حیلہ تلاش کریں گے کہ ان کا نفع ہاتھ سے نہ جائے وہ جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے۔یا تو فتویٰ لیا جائے ایسے علماء سے جو متدین ہوں۔ملک وقوم کو جن کے دین و دیانت پر اعتماد ہو اور ان کا علم مستند ہو۔قوت مطالعہ سے جو علم آتا ہے اس میں امام اپنا نفس ہوتا ہے جو چاہے کرے اور نفس ہے نا تہذیب یافتہ اس لئے یہ معتبر نہیں کہ فلاں وکیل صاحب نے یہ کہہ دیا اور فلاں ڈاکٹر منسٹر صاحب نے یہ کہہ دیا۔

تو جس کے آخر میں ''ٹر'' ہو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے۔(بر سبیلِ لطیفہ فرمایا) کوئی عالم متدین کہے یا فتویٰ دے یا مستند اداروں سے فتویٰ حاصل کیا جائے وہ اجازت دے دیں تو آپ بے تکلف کریں۔فلاں نے کہہ دیا،اس نے کہہ دیا یہ قابل اعتبار بات نہیں۔

مسلم وحربی کے درمیان سودی معاملہ......سوال:ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا حدیث لَا رِبٰوا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیْ کے تحت مسلم اور حربی کے درمیان سود کا معاملہ ہو سکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث لَا رِبٰوا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِیْ کہاں ہے؟ اور اس حدیث کے ساتھ جو دوسری حدیث ہے وہ آپ کے سامنے نہیں۔یہ ائمہ میں خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔قطعی بات یہ ہے کہ سود کسی حالت میں جائز نہیں،اب جو کہتے ہیں لا ربو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ربو جائز ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ربوا ہوتا ہی نہیں۔

مسلم اور کافر کے درمیان دار الحرب میں معاملہ اور ہوتا ہے اور پھر دار الحرب میں یہ بھی قید ہے کہ جنگ جاری ہو،حالت امن نہ ہو۔اس وقت کا یہ مسئلہ ہے،ایک دار الحرب کا یہ معنی ہیں کہ شعائر اسلام وہاں بلند نہ ہوں۔اس کے مسائل دوسرے ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر دار الحرب مان لیا جائے تو دار الحرب کے دوسرے احکام سامنے نہیں؟

دار الحرب کی آڑ میں پیسہ بٹورنا......دار الحرب جب ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے۔ملک چھوڑ کر دار السلام کی طرف جائے۔اس کی تو جرات نہیں کرتے کہ یہ دار الحرب ہے،اسے چھوڑ کر دار الامن اور دار الاسلام میں جانا چاہئے اس کا دھیان کسی کو نہیں آتا،جب دھیان جائے تو پیسہ کی طرف جائے۔تو دار الحرب کا حیلہ مل گیا ہے،پیسہ بٹورنے کو۔یہ حیلہ جوئی اور پیسہ بٹورنا ہے۔

اگر دار الحرب مانتے ہیں تو دوسرے مسائل پر کیوں نہیں عمل کرتے۔مثلاً تجارت ضروری ہے وہ قوت پیدا

کرنی ضروری ہے جس سے دارالحرب دارالاسلام بنے، کفار سے جنگ کرو اس کی تیاری کرو اور پیسہ اس میں لگاؤ جہاد کے لئے ہتھیار فراہم کرو، اس کے لئے کوئی صاحب تیار نہیں، کوئی صاحب آمادہ نہیں۔ دارالحرب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ سودی لین دین جائز ہو جائے اور اب تک کا سود جائز ہو جائے۔ اس وقت دارالحرب کے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ ہجرت بھی ہے۔ جہاد بھی ہے، قومی معاملات بھی ہیں۔ کتنے ہی مسائل دارالحرب کے متعلق ہیں تو پھر آخر پیسہ ہی کیوں سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ پیسے کا ہے اور دارالحرب حیلہ ہے اور جذبات دوسرے ہیں، دارالحرب کی آڑ لے کر پیسہ بٹورنا چاہتے ہیں سودی لین دین کر کے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ محدث دہلوی کا فتوی ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں ہے، پھر ان کا کیا جواب ہوگا، اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابر کا بھی فتوی ہے، تو کیا ان کا یہ بھی فتوی ہے کو سودی لین دین کرو، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فتویٰ دیا تھا اس زمانے میں جبکہ انگریز کا کامل تسلط تھا۔ لیکن کیا انہوں نے یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ سودی لین دین بھی شروع کر دو۔

سوُد پر دلچسپ مباحثہ...... حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثانیؒ اور حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحب چاندی پوریؒ لاہور تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت مولانا طفیل احمد صاحبؒ زندہ تھے اور علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے اور صحیح دین دار لوگوں میں سے تھے۔ بی اے بھی تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ سودی لین دین جائز ہونا چاہئے۔ بغیر اس کے قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا ''سودمند'' نام کا۔ سود کے جواز کے جتنے حیلے مل سکتے تھے اس میں وہ سب موجود تھے اور باقاعدہ اس کی اشاعت وطباعت کی گئی۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ حضرت تھانویؒ سے کسی نے ان کا ذکر کیا کہ حضرت! وہ سود کے جواز کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ لونڈے کی بات کا کیا اعتبار، ذکر کرنے والے نے کہا کہ حضرت! لونڈا ہے؟ وہ تو مولانا طفیل صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کا نام طفیل ہے (طفیل کے معنی ہیں چھوٹا سا بچہ) تو وہ لونڈا نہیں تو اور کیا ہے؟ تو خیر اس زمانے میں یہ قصہ چل رہا تھا اور یہ سب حضرات لاہور پہنچے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم (ایڈیٹر زمیندار) اور ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم اور دوسرے بڑے بڑے لوگ ملنے کی خاطر حاضر ہوئے۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خان صاحبؒ بھی کچھ اسی خیال کے تھے جو خیال مولانا طفیل احمد صاحبؒ کا تھا۔ انہوں نے سود کے جواز پر آدھ گھنٹہ بڑی مدلل تقریر کی اور اقتصادی دلائل وغیرہ سے ثابت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات ذرا کچھ مائل ہوں گے، ڈھیلے پڑیں گے سود کے سلسلے میں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو جواب دیا وہ تو صرف دو لفظوں کا تھا، ان کی بات تو ایسی تھی۔ فرمایا کہ: ''بھائی ہم پل نہیں بننا چاہتے۔ جسے جہنم میں جانا ہو خود جائے۔ ہماری گردن پر پیر رکھ کر نہ جائے''

یہ جواب سن کر سب چپ بیٹھے رہے۔ علامہ اقبال بھی مولانا ظفر علی خان صاحب بھی، کسی کو بولنے کی ہمت تک نہ ہوئی۔ پھر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے آدھ گھنٹہ بڑی مفصل تقریر کی جس میں انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سود ہر حالت میں حرام ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

حکم شرعی کے تحت قومی ہمدردی ہونی چاہئے...... یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے اور قومی ہمدردی کے نام پر چل رہا ہے۔ اور ایسے ہمدرد پیدا بھی ہوئے اور گزر بھی گئے۔ اور دوسرے بھی پیدا ہوئے اور بھی گزر گئے۔ اور بھی پیدا ہوں گے اور وہ بھی گزر جائیں گے۔ مگر مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا ہے اور رہے گا۔ اس سلسلہ میں اگر خلجان ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ جو معتمد اور مستند ادارے ہیں ان سے استفتاء کرلیں۔ اس میں منشاء ظاہر کردیں کہ ہم نے اتنی رقم جمع کی ہے اور ہمارا منشاء یہ ہے کہ قوم کی خدمت اور رقم محفوظ رہے۔ اس کے منافع سے قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس کی جائز صورتیں کیا ہوسکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود لیا جائے ایک صورت یہ ہے کہ تجارت میں لگا دیا جائے۔ تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ جو وہاں سے مستند فتویٰ آجائے اس پر عمل کیا جائے۔ اجر بھی ملے گا اور قوم کا فائدہ بھی ہوگا۔

مدارِ دین حجت ہے...... ایک صاحب نے پوچھا اگر جماعت کی اکثریت نے فیصلہ کردیا کہ سود کا روپیہ لے لیا جائے۔ اس میں کچھ حرج نہیں تو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ دین کا مدار مجاریٹی پر یا سروں کی گنتی پر نہیں۔ یہ کوئی کونسل یا اسمبلی کے فیصلے تھوڑا ہی ہیں۔ اسمبلی میں سر گنے جاتے ہیں۔ سروں کی تعداد پر فیصلہ ہوتا ہے۔ سروں کے اندر کی چیز نہیں دیکھی جاتی یعنی عقل بھی ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا بلکہ تعداد کی زیادتی پر فیصلے ہوتے ہیں اور دین کا مدار حجت پر ہے۔ اس کے بارے میں تو علامہ اقبال صاحبؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بترس از طرز جمہوری اسیرِ پیر دانا شو   کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسان نمی آید

کہ اس جمہوری طرز کو چھوڑ دو اور کسی پیر دانا کے قیدی بن جاؤ اگر دو سو گدھے جمع ہوجائیں تو انسانی فکر تھوڑا ہی ان کے دماغ سے نکلے گی۔ دو سو گدھے جمع ہوجائیں تو گدھے کا خیال ہی نکلے گا، انسانی فکر کہاں سے نکلے گا؟ انسانیت ہو تو جب ہی انسانیت کی بات ذہن سے نکل سکتی ہے اور انسانیت وہاں مفقود ہے۔ تو بے وقوفی کا خیال ذہن سے برآمد ہوگا۔

اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے: ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ① زمین میں بے وقوفوں کی جو اکثریت ہے اس کا اتباع مت کرو وہ تم کو گمراہ کررہے ہیں، حق کے راستے سے ہٹا کر چھوڑیں گے۔ اس لئے اگر اکثریت فیصلہ کرے تو وہ دینی حجت کے مقابلے میں کوئی کارگر نہ ہوسکے گا۔ خواہ پوری

① پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۱۱۶.

دنیا کے انسان فیصلے کو مل کر پاس کر دیں اور دینی حجت اس کے خلاف ہو۔ لہٰذا سود حرام ہی رہے گا، جیسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ کسی کے حلال یا جائز کرنے سے جائز نہیں ہوگا۔ پاخانے کو کتنا ہی دھولو۔ صاف کرلو وہ پاخانہ ہی رہے گا۔ پاک تو ہونے سے رہا۔ ناپاک ہی رہے گا۔ اور اس پانی کو بھی ناپاک کر دے گا۔ جس پانی سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تو ایسے ہی ایک حرام قطعی چیز خود تو حلال نہیں ہوگی۔ اوپر سے ان اذھان کو بھی اپنی رو میں بہا کر گندہ کر دے گی جن اذھان میں اس قسم کے تصورات ذہن میں نہ جمانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے ارادے کرنے چاہیں، جب کوئی شیئ حلال طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ تو اس کے حصول میں حرام طریقہ کو کیوں استعمال کریں؟ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں۔ اس قسم کے خیالات سے۔

مراتبِ عصمت...... سوال: ایک صاحب نے سوال کیا انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام باجماع امت معصوم ہیں۔ ان کی عصمت میں کسی کو کلام نہیں اور قبل البلوغ بچے از روئے شرع معصوم ہیں۔ کیونکہ شریعت نے قبل البلوغ ان کے کسی فعل شنیع پر داروگیر نہیں کی۔ لہٰذا ان کی عصمت بھی متفق علیہ ہے اور اولیاء اللہ بھی گناہ سے بہت بچتے ہیں، اس اعتبار سے وہ بھی معصوم ہو گئے تو اب حضور والا وضاحت فرما دیں کہ ان کی عصمت میں کچھ تفاوت ہے یا سب کی عصمت ایک ہی قسم کی ہے؟

جواب: اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہاں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کے اندر جو قوت ہے گناہ کی وہ اس وقت بیدار نہیں وہ ابھار جس کا تعلق فعل سے ہے وہ ابھری ہوئی نہیں ہے صرف مادہ موجود ہے۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں مادہ بھی موجود ہے اور نفس بھی موجود ہے اور پھر نفس کا مقابلہ کر کے گناہ سے بچتے ہیں۔ اور یہ کمال ہے۔

منشاءِ گناہ...... فرمایا کہ انسان میں گناہ کا منشاء صرف دو چیزیں ہیں: حب جاہ اور حب باہ۔ اسی لئے بعض گناہ تو سرزد ہوتے ہیں جاہ طلبی سے مثلاً آدمی اقتدار چاہتا ہے اس کے لئے دوسروں کی توہین کرتا ہے۔ تذلیل کرتا ہے، زبردستی دباتا ہے۔ جس کو اس زمانہ کی اصطلاح میں استحصال عوام کہتے ہیں۔ یعنی عوام کو حاصل کر کے ایک شخص لیڈر بنتا ہے۔ پھر چاہے دوسروں کا خون ہو مگر اسے کرسی ملی۔ اسے عزت ملی۔ ہزاروں مخلوق برباد ہوتی، کٹ جاتی ہے مگر اس کی لیڈری چمک جاتی ہے۔ اس کا منشاء ہوتا ہے حب جاہ اور حب اقتدار۔ ایک شخص اپنے کو بڑا جانتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے میں اپنے کو عار محسوس کرے گا، وہ چاہے گا کہ دوسرے مجھے سلام کریں۔ میں بڑا آدمی ہوں۔ یہ چھوٹے ہیں، ان کا فرض ہے کہ یہ میرے آگے جھکیں۔ تو کبر کے معنی فقط بڑا بننے کے نہیں ہیں بلکہ تحقیر ناس یعنی لوگوں کو حقیر سمجھنا اور ذلیل جاننا اور اپنے کو ان سے بالاتر اور بڑا جاننا۔ یہ حقیقت ہے کبر کی۔ اور یہ جذبہ انسان میں موجود ہے، اس سے سینکڑوں گناہ متعلق ہیں۔ لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ، مار پیٹ، قتل وغارت گری اور دنیا بھر کے سینکڑوں گناہ محض جاہ کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں، آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے تو اس قسم کے گناہ کا انسداد ہو سکتا ہے۔

ایک جذبہ انسان میں باہ کا ہے یعنی شہوانی قوت ہے، ہزاروں گناہ اس سے متعلق ہیں۔ یہ شہوتیں دو ہیں۔

ایک شہوتِ بطن کو پورا کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں جمع کرتا ہے۔ اور شہوتِ فرج سے اس کو نکالنے کی کوشش رتا ہے۔ تو ہزاروں گناہوں کا سرچشمہ یہ بھی ہے اس قسم کی شہوت کو پورا کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی پرواہ نہ کرے گا۔ چوری ہو، رشوت ہو، سود ہو، بہر حال کسی طرح سے پیسہ جمع ہوں اس سے نفس کے اندر وہ قوت بڑھے جس سے شہوانی جذبات پورے ہو سکیں تو شہوتِ بطن کا حاصل ہے۔ مرغوباتِ نفس کو بٹورنا اور جمع کرنا۔ مال ہو، لباس ہو، سامان ہو۔ آدمی اسے حاصل کرے جس طرح سے بھی ہو سکے۔ جب اس وقت میں آدمی غرق ہو جاتا ہے اس کے حرام وحلال کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ جیب کترے جیب کترتے ہیں۔ چوری کرنے والے چوری کرتے ہیں۔ ڈکیتی ڈالنے والے ڈکیتی ڈالتے ہیں۔

ایک خاص قسم کی ڈکیتی ہے قانونی جس میں قانون کی آڑ لے کر مال بٹورا جاتا ہے۔ خواہ ٹیکس لگا کر خواہ کسی کو ڈرا دھمکا کر جیسے پولیس والے کیا کرتے ہیں۔ کہ جرم ہو نہ ہوا سے ڈرایا دھمکایا اس نے کچھ رشوت دی اسے چھوڑ دیا۔ تو مال کی تحصیل میں آدمی حرام حلال کی پرواہ نہیں کرتا اور ہزاروں گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں ایک شہوت فرج یعنی شرم گاہ کی شہوت ہے۔ اس سے آدمی بدکاری، زنا کاری، فحش، عریانی وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جیسے شہوت بطن سے ہزاروں گناہ متعلق ہیں اسی طرح شہوت فرج سے بھی ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔

شیطان کا گناہ اور حضرت آدمؑ کی لغزش...... عالم ازل میں ایک گناہ شیطان نے کیا اور ایک لغزش حضرت آدم سے سرزد ہوئی۔ شیطان کے گناہ کا منشاء تھا جاہ طلبی جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدمی کو سجدہ کرو۔ تو اس نے کہا کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کیوں کروں؟ یہ حکم عدولی کی۔ اور یہ ہی نہیں کہ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کر دی ہو۔ بلکہ حق تعالیٰ کے حکم میں "مین میخ" بھی نکالی اور کہا کہ (معاذ اللہ) آپ کا یہ حکم خلاف فطرت ہے۔ ﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ ① آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے۔

اور آگ کی فطرت ہے سر اونچا کرنا۔ اور مٹی کی خاصیت ہے پست ہونا۔ تو آپ نے سربلند ہونے والے کو پست کے سامنے ذلیل ہونے کا کیوں حکم دیا میں اونچا ہونے والا اس پست کے آگے کیسے جھک جاؤں؟ یہ گناہ حکم عدولی کا سرزد ہوا ابلیس لعین سے جس کا منشاء تھا جاہ طلبی، عزت، حسد، کبر، رعونت فرعونیت۔ اور ایک لغزش سرزد ہوئی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ وہ حقیقتاً گناہ تو نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی اور وہ یہ کہ شجرہ ممنوعہ کے کھانے سے روکا گیا تھا اور باقی جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم تھا اور اس درخت کے پاس جانا تک ممنوع تھا۔ کھانا تو درکنار، وہ درخت حضرت آدم نے کھالیا لیکن حکم عدولی کا کوئی واہمہ بھی نہ تھا۔

تلبیس ابلیس...... حضرت آدمؑ کے ذہن میں شیطان نے اولاً وسوسہ ڈالا اور تدبیر سمجھائی اور تلبیس کر کے تاویل سمجھائی کہ اس کی ممانعت ابدی نہیں ہے۔ بلکہ خاص وقت تک تھی وہ وقت نکل گیا۔ اب تمہارا معدہ اس نعمت

① پارہ: ۲۳، سورۃ ص، الآیۃ: ۷۶.

کو ہضم کرنے کا متحمل ہے۔ اور اسکی خاصیت یہ ہے کہ جو اس درخت کو کھالے گا وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اس نعمت سے نہیں نکل سکے گا۔ جھوٹ بھی بولا اور دھوکہ بھی دیا اور قسم بھی کھائی۔ ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم کھالو گے تو ابدی طور پر جنت میں رہو گے۔ اور اگر اس کو نہ کھایا تو ممکن ہے کہ جنت سے نکال دیئے جاؤ اور ان کو سمجھایا کہ ابدی حکم نہیں، بلکہ ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب جنت کی آب وہوا آپ میں اثر کر گئی۔ پوری طرح رچ گئی ہے۔ اب آپ کھالیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ابتدائی حالت میں کھانے میں مضرت تھی۔ حالانکہ آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ میں کیسے کھاؤں اور حکم خداوندی کے خلاف کیسے کروں؟

مگر ادھر تو اس کمبخت نے قسم کھائی اور آدم علیہ السلام پاک قلب ہیں۔ سچے قلب والے ہیں۔ نہ دھوکے سے واقف نہ فریب۔ اور اللہ کا نام لے کر ایک شخص فریب کرے یہ تو گویا ان کے وہم میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی آدمی خدا کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ہی بات ہو اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اسے دھوکہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ وہ تو جھوٹ کو بہت بری چیز سمجھتا ہے۔ اس لئے سچا آدمی دوسروں کو بھی سچا سمجھتا ہے۔ اس کا وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ جھوٹ بول کر دھوکہ دے رہا ہے۔

اسی واسطے محدثین لکھتے ہیں۔ اِنَّ اَكْذَبَ الْحَدِیْثِ حَدِیْثُ الصّٰلِحِیْنَ کہ صوفیاء کی حدیثیں جھوٹی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (معاذ اللہ) وہ تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ اللہ کے رسول کا نام لے کر کوئی روایت کرے کہ اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا ہے۔ تو ان کو وہم بھی نہیں گزرتا کہ کوئی آدمی اللہ اور رسول کا نام لے کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ تو سچے آدمی بعض دفعہ دوسروں کے قسم کھانے کی وجہ سے اور یقین دلانے کی وجہ سے مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کا قلب دھوکہ سے، فریب سے پاک ہے تو ابلیس نے فقط تاویل ہی نہیں سمجھائی بلکہ قسم بھی کھائی۔ ادھر آدم پاک قلب ہیں۔ دھوکہ سے فریب سے واقف نہیں۔ اور پھر جنت میں رہ کر کوئی قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ تو حضرت آدم کا وہم بھی نہیں جھوٹ بولنے پر۔

ادھر تو ابلیس نے دھوکہ دیا۔ ادھر حضرت حوا نے کہا کہ اجی کھالو! ایک دانہ میں کیا حرج ہے۔ بیوی کی آدمی سنتا ہے اور جلدی سے اس کے خلاف بھی نہیں کرتا اتنا کہنے سننے سے حضرت آدمؑ کے قلب میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی کہ ممکن ہے یہ ہی بات ہو کہ اس کی ممانعت ابدی نہ ہو۔ ابتداء میں ہو اب جب کہ یہاں کی آب وہوا اثر کر گئی تو ایک آدھ دانہ کھا لینے میں کیا حرج ہے۔ اوپر سے شیطان لعین نے قسمیں کھائیں اور بیوی نے دیا سہارا تو کھالیا درخت۔

خطاء اجتہادی اور عصمت...... اس لئے حقیقتاً یہ گناہ نہیں تھا۔ گناہ کہتے ہیں جان بوجھ کر کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا۔ حضرت آدمؑ جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے سے پاک تھے۔ یہ سمجھے کہ ہوسکتا ہو کہ حکم خداوندی کے

---

① پارہ: ۸، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۲۱.

معنی اور مطلب یہی ہوں جو یہ شخص قسم کھا کر بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلط فہمی میں ہوں۔ اس قسم کے فریب میں آ کر مبتلا ہو کر وہ کھالیا۔ یہ لغزش ہوئی صورۃ اور حقیقتاً گناہ نہیں بلکہ غلط فہمی ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ خطا فکری ہے، یا خطاء اجتہادی ہے۔ یہ سرزد ہوگئی ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے خطاء اجتہادی ہوسکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کو غلطی پر باقی نہیں رکھ جاتا ہے فوراً حق تعالیٰ مطلع کر دیتے ہیں۔ دوسرا کوئی مجتہد خطاء اجتہادی کرے تو ہوسکتا ہے کہ عمر بھر اسے صواب سمجھتا رہے اور ہو وہ حقیقت میں خطاء تو غرض ان چیزوں میں مبتلا ہو کر حضرت آدمؑ نے وہ درخت کھالیا۔

لغزش اور گناہ کا فرق...... مگر اس کا منشاء کبر اور جاہ نہیں تھا۔ خود ہی کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کیسے کروں لیکن معنی حکم کے قسم کھا کر بیان کرنے والے نے غلط بیان کر دیئے اور چیز تھی کھانے پینے کی اور کھانے پینے کی چیزوں میں قوت باہ اور شہوانی قوت آگے بڑھتی ہے۔ کبر ونخوت اس میں نہیں ہوتا۔ شیطان کے گناہ کا منشاء کبر تھا اور تکبر تھا۔ اور آدم کی لغزش کا منشاء حرص تھا اور حرص آدمی کی چیز ہے اور کبر درحقیقت شیطان کی چیز ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کبر کا گناہ بہت سخت ہے وہ معاف نہیں ہوسکتا جب تک متکبر پوری توبہ نہ کرے۔ اس نے توبہ نہ کی ابدالاباد کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا اور ابدی جہنمی بنا دیا گیا اور آدم سے جو لغزش سرزد ہوئی اس میں کبر اور نخوت کا (معاذ اللہ) کوئی شائبہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ حرص تھی اور اوپر سے غلط فہمی اس لئے جو گناہ شہوت سے یا باہ سے سرزد ہو وہ شدید نہیں ہوتا ہے تو آدم کی خصوصیت ہے اور کبر سے سرزد ہوا تو وہ تکبر ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان ہے اس میں گویا اپنے کو اللہ کا شریک بنا رہا ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ لازمی بات ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ اس لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ "لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنَ الْكِبْرِ" [1] وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو، (جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے)۔

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشاء کبر ونخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کا منشاء حرص ہے۔ حرص سے سرزد ہونا یہ تو آدمی کی جبلت ہے اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے، کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا کہ آپ بڑے ہیں، میں بھی بڑا ہوں۔ اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں۔ اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔ اب نتیجہ نکالئے کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے؟ ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمت خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہوسکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے لہٰذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ ادھر اس کم بخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ ابدالاباد کے لئے ملعون ہوگیا اور ادھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جبکہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بے

[1] الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانه، ج:۱، ص:۲۴۷، رقم:۱۳۱۔

حد توبہ واستغفار کیا۔ حالانکہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی۔ بہرحال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔

عصمت اطفال...... بچوں میں جاہ طلبی اور باہ طلبی کی دونوں قوتیں بیدار نہیں ہوتی، نہ ان میں تکبر ہوتا ہے کہ وہ لیڈر بنیں صرف کھیل کود کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح سے شہوانی مادہ تو ہوتا ہے مگر ابھرا ہوا بیدار نہیں ہوتا۔ بلوغ سے قبل اس میں ابھار نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے کہ ان میں وہ قوت ہی ابھی ابھری ہوئی نہیں ہے جو گناہ کا منشاء ہے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام...... انبیاء علیہم السلام کی تمام قوتیں کامل ہوتی ہیں۔ پھر وہ بچتے ہیں نفس کی مخالفت کر کے اپنے صبر سے جبر سے، کمال نیت سے اور کمال استقلال سے اور کمال عظمت خداوندی سے۔ یہ بات نہیں کہ انبیاء علیہم السلام مجبور ہیں گناہ کرنے سے وہ گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ اگر مجبور ہوتے تو گناہ سے بچنا ان کے حق میں کوئی کمال نہ ہوتا کمال یہی ہے کہ ہر قسم کی قوت ہے اور پھر بچتے ہیں حکم خداوندی کی عظمت میں اور نفس کا مقابلہ کرنے کی ان میں اتنی قوت ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور بالکل عصمت ہی رہتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنی مجبور کے نہیں بلکہ ان میں سارے مادے بدرجہ اتم موجود رہتے ہیں۔ مگر سارے مادوں کو وہ کلیتہً تابع کر لیتے ہیں حق تعالیٰ کے کہ جہاں آپ فرمائیں گے وہاں ہم ان مادوں کو استعمال کریں گے اور جہاں سے آپ روک دیں گے وہاں سے ہم رک جائیں گے۔ تو انبیاء میں قوتیں اور مادے سب موجود رہتے ہیں پھر ان کا گناہ سے بچنا ارادی اور اختیاری ہے اس لئے ان کے حق میں کمال ہے اگر ان کا گناہ سے بچنا مجبوراً ہوتا تو یہ ان کے حق میں کوئی کمال نہ تھا۔

کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک نامرد ہو اور وہ یوں کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا۔ دوسرا کہے گا کہ کمبخت تیرے اندر جانے کی طاقت کیا ہے۔ تو مجبوری میں بچا ہوا ہے۔ تیرے اندر وہ مادہ ہے ہی نہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ شہوانی مادہ پورا موجود ہو۔ اور پھر آدمی خوف خداوندی کی وجہ سے بچے۔ ایک لنگڑا لولا آدمی جو چارپائی سے ہل بھی نہیں سکتا وہ یوں کہے کہ میں چوری نہیں کرتا۔ اس سے پاک ہوں۔ لوگ کہیں گے تو پاک کیا ہے تو تو مجبور ہے۔ تجھے آج قوت مل جائے تو ڈکیتیاں ڈالے گا۔ اب تیرے اندر طاقت ہی نہیں۔ تو تو کرے گا کیا۔ محض چارپائی پر بیٹھا رہے گا۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ طاقت موجود ہو اور کرتب پورا جانتا ہو اور پھر بچتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور تو ارادے اور اختیار سے سوچ سمجھ کر علم وعقل کی روشنی میں بچے اسے تو بچنا کہتے ہیں اور جہاں روشنی ہی نہ موجود ہو اور بچے اسے بچنا نہیں کہتے۔

عصمت انبیاء اور عصمت اطفال کا فرق...... بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی صرف مادہ موجود ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں۔ پھر

وہ معصوم ہیں ارادے سے، اختیار سے تو عصمت دونوں میں موجود ہے، مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے۔

یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم، وہ ناطاقتی سے معصوم اور انبیاء کمال طاقت اور قوت کے ساتھ معصوم۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل نہیں۔ اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے اس لئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ وہ قوت ہے۔ لہٰذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے۔ وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں۔ اس لئے وہ بیچارہ اپنے ارادے سے کچھ نہیں کرسکتا اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بچتے ہیں۔ یہ ہے کمال۔

باعث تعجب ایمان...... اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور موانع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے۔ اور ایک ہے یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور نیکی کرنے کے لئے دواعی موجود ہیں۔ تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں، زیادہ قابل قدر نہیں۔ اس قسم کی ایک حدیث ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بتلاؤ "وَاَیُّھُمْ اَعْجَبُ اِیْمَانًا" ① سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! سب سے زیادہ عجیب ایمان ملائکہ کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہوگیا جو وہ ایمان نہ لائیں؟ عرش ان کے سامنے کرسی ان کے سامنے، جنت ان کے سامنے وہ بھی ایمان نہ لائیں گے تو اور کون ایمان لانے والا ہوگا؟ یعنی ان کا مان لینا کوئی زیادہ کمال نہیں کیونکہ وہ اس چیز کو مان رہے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے نہ ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

پھر عرض کیا یارسول اللہ انبیاءؑ کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انبیاء کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لائیں گے؟ وحی ان کے اوپر آرہی ہے۔ فرشتے انہیں نظر آرہے ہیں۔ مشاہدہ حق میں وہ مشغول ہیں۔ جلال و جمال کا دروازہ ان پر کھلا ہوا ہے۔ تجلی حق ان کے سامنے ہے وہ بھی انکار کریں گے تو کون اقرار کرے گا اس لئے ان کا ایمان کیا عجیب؟ پھر عرض کیا گیا کہ ہمارا ایمان عجیب ہے فرمایا کہ تمہیں کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ؟ پیغمبر تمہارے سامنے موجود۔ وحی تمہارے سامنے اتر رہی ہے۔ معجزات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون ایمان لائے گا؟ اس لئے تمہارا ایمان بھی عجیب نہیں ہے۔ پھر عرض کیا کہ اللہ اور رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے جو تمہارے بعد میں آئیں گے نہ رسول ان کے سامنے، نہ معجزے ان کے سامنے، نہ ان کے سامنے وحی اتر رہی ہوگی بلکہ رکاوٹ اور موانع اتنے ہوں گے کہ کوئی ایمان میں شک ڈال رہا ہے۔ کوئی دل میں تردد پیدا کررہا ہے۔ کہیں کفار، کہیں

① المعجم الکبیر للطبرانی، ج: ١٠ ص: ٢٣٦. دلائل النبوۃ للبیہقی، جماع ابواب اخبار النبی ﷺ بالکوائن بعدهٗ، ج: ٨، ص: ٢. حدیث صحیح ہے۔ السلسلۃ الصحیحۃ (مختصرۃ) أول الکتاب ج: ٨ ص: ٢٣٠.

منافقین، کہیں نفس کے جذبات ہزاروں رکاوٹیں موجود اور داعی جو تھے ایمان کے کہ وحی اور رسول کا سامنے ہونا وہ ہے نہیں پھر بھی ایمان پر جمے ہوئے ہیں۔تو ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

جبری عصمت......اس سے معلوم ہوا کہ کثرت موانع اور رکاوٹوں کے اندر جو خیر کا کام کرے وہ زیادہ قابل قدر ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی رکاوٹ ہی نہیں بلکہ دواعی اور محرکات ہی موجود ہوں اور پھر خیر اور نیکی کرے تو رہے گی تو وہ خیر ہی اور نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں ہوں گی، تو بچے اگر گناہ سے بچتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتے بوجھتے ہیں اور نفس کا مقابلہ کر کے بچتے ہیں۔ایسا نہیں بلکہ نفس میں تو ان کے جذبہ ہی نہیں ہے گناہ کا۔نہ شہوت کا جذبہ ہے۔نہ کبر ونخوت کا جذبہ ہے۔لہٰذا اب جو وہ گناہ سے بچ رہے ہیں اسے بچنا نہیں کہتے ہیں وہ تو گناہ سے الگ تھلگ ہیں۔بچنا اس کو کہتے ہیں کہ قوت ہو۔ارادہ بھی ہو۔قوی کی اس پر قدرت بھی ہو کہ اس کام کو کر گزرے اور پھر بچے،تو بچوں میں عصمت ہے مگر مجبوری کی ہے اور وہاں انبیاء کے اندر عصمت ہے ارادی اور اختیاری۔تو معصوم دونوں ہیں مگر فرق رہے گا علم کا اور لاعلمی کا ارادے کا اور غیر ارادے کا خبر کا اور بے خبری کا۔

حفاظت اولیاء کرام......رہے اولیاء اللہ، صلحاء متقین جو گناہ سے بچتے ہیں۔ابھی عرض کیا گیا ہے کہ گناہ سے انبیاء بھی بچتے ہیں اور بچے بھی اور اولیاء اللہ بھی فرق اتنا ہے کہ انبیاء میں تو عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس معنی میں وہ معصوم ہیں۔اور بچوں میں مادہ موجود ہے مگر بیدار نہیں اس معنی پر کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت نہیں۔ لہٰذا وہ بھی معصوم ہیں۔اب رہے اولیاء اللہ ان سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔حتی الامکان وہ بچتے ہیں اس لئے ان کو معصوم تو نہیں کہیں گے بلکہ محفوظ کہیں گے۔منجانب اللہ ان کی حفاظت ہوتی ہے۔اور بناء حفاظت کی کثرت ذکر ہے۔رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور مشاہدہ رہتا ہے ان کو جلال وجمال کا قلب کا رابطہ اور نسبت اتنی قوی ہے کہ کسی وقت بھی حق تعالیٰ کا تصور اور دھیان ان سے اوجھل نہیں ہوتا۔اس واسطے وہ بچتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا اوجھل ہو جائے تو امکان ہے کہ لغزش کریں اور ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض اولیاء کبار میں بعض دفعہ غلبہ نفس ہوا اور معصیت سرزد ہو گئی۔خواہ حکمت اس کی کچھ ہی ہو مگر اس کا امکان ہے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا عبرتناک واقعہ......حضرت شبلیؒ اکابر اولیاء میں سے ہیں اور یوں کہنا چاہئے کہ سرداران اولیاء میں سے ہیں اور ہزاروں خانقاہیں حضرت شبلی کی خانقاہ سے آباد تھیں اور تقویٰ وطہارت کا ایک کارخانہ پھیلا ہوا تھا۔وقت کے تمام اولیاء ان سے استفادہ کرتے تھے۔ایک روز وہ مریدین کے ساتھ سیر وتفریح کو نکلے جب ایک بستی پر گزر ہوا جو نصاریٰ ومجوسیوں کی بستی تھی۔دیکھا کہ وہ لوگ خنزیر چرا رہے ہیں۔دل میں خیال آیا کہ "یہ کیا انسان ہیں۔نہ ان میں ایمان ہے نہ انہیں گندگی اور پاکی کی تمیز۔سور چرا رہے ہیں۔شراب پی رہے ہیں۔اصل میں مومن ہم لوگ ہیں کہ ہر برائی سے اللہ نے ہمیں بچالیا ہے اور ہم گناہ سے بچے ہوئے ہیں اور دین کے اندر ہم غرق ہیں"۔دل میں یہ خیال پیدا ہوا ایک وسوسہ کے درجہ میں تھا ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

کے اصول سے جو جتنا مقرب ہوتا ہے اسکے دل میں اگر خطرہ بھی آتا ہے تو اس پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ یوں کہئے کہ عمل پر اتنی گرفت نہیں ہوتی جتنی کہ مقربین کے خطرات پر ہوتی ہے اور عتاب ہوسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بستی میں جب یہ پہنچے تو دیکھا کہ کنویں پر چند لڑکیاں پانی بھر رہی ہیں۔ ان میں عیسائی کی ایک لڑکی بہت ہی حسین و جمیل تھی۔ شیخ کی طبیعت اس پر مائل ہوگئی اور اتنی مائل ہوگئی کہ ضبط نہ کر سکے جا کر اسے نکاح کا پیغام بھی دے دیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نکاح جب کروں گی جب میرا باپ اجازت دے دے۔ شیخ نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ گھر میں ہے۔ تو اس کے گھر پہنچے اس سے جا کر درخواست کی۔ اس نے کہا کہ میں ایک شرط پر نکاح کر سکتا ہوں وہ یہ کہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنی ہوگی۔

شیخ نے کہا منظور ہے اور اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی اور مرتد ہو گئے۔ معتقدین اور مریدین نے آ کر شیخ سے منت لجاجت کی لیکن شیخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور شیخ مبہوت سے رہ گئے۔ خدام نے پوچھا کہ فلاں آیت آپ کے ذہن میں ہے۔ شیخ نے کہا کہ میرے ذہن میں کوئی آیت نہیں گویا پورا قرآن ذہن سے نکل گیا کوئی آیت ہی یاد نہیں آتی۔ پھر مریدین نے احادیث کے حوالے دے کر سمجھانا چاہا۔ شیخ نے اس پر بھی یہی کہا کہ مجھے کوئی حدیث بھی معلوم نہیں۔ گویا حدیث بھی ذہن سے نکل گئی اور اس کے عشق میں مستغرق ہیں۔ حتیٰ کہ کل جس لکڑی سے سہارا دے کر جمعہ کا خطبہ پڑھتے تھے۔ آج دیکھا گیا کہ اسی لکڑی سے خنزیر چرا رہے ہیں۔ شیخ کی ایسی حالت دیکھ کر لوگ رو دیئے۔ چیخیں نکل گئیں اور پورے ملک میں خانقاہیں غیر آباد ہوگئیں اور جہاں جس مرید کو پتہ چلتا رہا وہیں وہ سکتے کے عالم میں رہ گئے بہت سے لوگ برداشت نہ کر سکے۔ خبر سنتے ہی اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ کچھ معمولی صدمہ نہ تھا کہ ایک شیخ وقت مرتد ہو گئے۔ فکر تھی کہ دوسروں کے ایمان کے کیا ہوگا۔ اس لئے سب لوگ دعا کر رہے ہیں۔ کہیں انفراداً کہیں اجتماعاً اور ایک خاص تعداد تو ہر وقت شیخ کے پاس ہی خدائے مالک الملک کے دربار میں دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

کچھ دن گزرنے کے بعد شیخ کو تنبہ ہونا شروع ہوا کہ میں کس حالت میں ہوں اور مریدین سے دریافت فرمایا کہ میں کس حالت میں ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ عیسائیت میں ہیں۔ شیخ نے کہا معاذ اللہ، استغفر اللہ، توبہ و استغفار کی اور اسی وقت کہا کہ مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان بناؤ۔ کلمہ تو تھا ہی ذہن میں بس ایک چیز غالب آ گئی۔ اب جو دھیان دیا تو پورا قرآن شریف ذہن میں موجود ہے۔ پوری احادیث محفوظ۔ کہا کہ میں یہاں آ کر کیسے پھنس گیا ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ واقعہ ہے فوراً توجہ کر کے وہاں سے واپس ہوئے اور استغفار میں مصروف رہے۔ تمام خانقاہوں میں خوشیاں منائی جانے لگی اور پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ اللہ نے شیخ کو پھر اسلام میں لوٹا دیا۔

ادھر تو یہ واقعہ ہوا اور ادھر یہ ہوا کہ اس عیسائی گھرانے پر یہ اثر ہوا کہ وہ خود اپنی لڑکی کو لے کر حاضر خدمت ہوا کہ حضرت اس کو مسلمان کر لیں اور اپنے نکاح میں قبول فرمالیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو نکاح کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو بیوی موجود ہے نہ وہ عشق، نہ وہ محبت۔ بعد میں جب سوچا تو معلوم ہوا کہ قلب میں جو خطرہ آیا تھا ایک زعم کا کہ ''اصل میں ہم ہیں انسان۔ یہ عیسائی کیا کرتے ہیں'' اس کا جواب دیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ بڑے سے بڑے ولی سے گناہ سرزد ہوسکتا ہے۔

حفاظت اولیاء کا طریق...... چونکہ اولیاء اللہ میں تقویٰ کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس غلبہ کی ہی وجہ سے حق تعالیٰ شانہٗ بہت جلد رجوع نصیب فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ ① جن لوگوں کی عادت تقویٰ اور طہارت کی ہے اور وہ تقویٰ دل میں جما ہوا ہے اور پھر شیطان کی کوئی جماعت ان کو ورغلا لیتی ہے تو تھوڑی دیر تو وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کے بعد اچانک وہ تقویٰ ابھرتا ہے اور فوراً وہ قوت ایمانی سامنے آتی ہے تو لاحول پڑھتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک گناہ تو وہ ہے کہ قلب میں اس کا مادہ جمع ہے اور مسلسل گناہ کرتا جارہا ہے۔ جیسے (معاذ اللہ) زنا کاری کا مادہ ہے اور وہ شخص مبتلا بھی ہے اس میں۔ اور ایک وہ ہے کہ قلب بالکل پاک ہے مادہ ہی نہیں گناہ کرنے کا۔ البتہ ماحول سے متاثر ہو کر گھر گھرا کر اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو وہ ہزار توبہ کرے گا اور وہ اتنی بڑی توبہ ہوگی کہ اگر وہ یہ گناہ نہ بھی کرتا اور ہزاروں نیکیاں کرتا تو شاید اتنے درجات بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ واستغفار سے بلند ہوئے۔ اولیاء کرام میں گناہ کا مادہ بھی موجود ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں اور کھلی معصیت سرزد ہو لیکن جب تک وہ توبہ نہ کرلیں چین نہیں آتا اور بہت بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے۔

وجوہ عصمت...... مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ نہیں کہ کھلی معصیت سرزد ہو جائے۔ ہاں خطاء فکری ہوسکتی ہے لیکن اس کے تقاضوں پر کوئی عمل ہو۔ اس سے وہ بری ہیں اور اس کی وجوہات بھی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو بدن تیار کیا گیا ہے اس میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہے۔ تو مٹی جب پاک شامل ہے تو خمیر بھی پاک۔ پہلی چیز تو پاکی کی یہی ہے کہ بدنوں کے مادے جب ان کے پاک پیدا کئے گئے ہیں اس سے جو طبیعت بنے گی قدرتی طور پر اس طبیعت میں پاکی ہوگی اور ظاہر بات ہے کہ جب طبیعت ایسی ہے تو بالطبع خیر ہی کی طرف جائیں گے۔ شر کی طرف کبھی نہ جائیں گے، لامحالہ اس میں خیر ہی خیر ہوگا اور کوئی گناہ سرزد تو کیا ہو کسی گناہ کا خطرہ تک بھی ان کے قلب پر نہ گزرے گا۔ تو مادہ پاک ہے۔ بدن بھی پاک ہے۔ لازمی بات ہے کہ ان بدنوں سے جو اعمال اور افعال صادر ہوں گے وہ بھی پاک ہی ہوں گے۔

جب ابدان ظاہرہ پاک مادے سے بنے ہیں تو ظاہر بات ہے ارواح بھی ان میں اتنی ہی مقدس ترین ہیں

---

① پارہ: ۹، سورة الاعراف، الآیة: ۲۰۱.

اوران روحوں کے اندر مشاہدہ ہے کمالات حق کا ہروقت حق تعالٰی کے سامنے حضوری ہے کوئی آدمی گھر میں بیٹھ کر گناہ کا تصور کرے یہ تو ممکن ہے لیکن بادشاہ کے دربار میں ہو۔اس کی عظمت،اس کا جلال دیکھ رہا ہو،وہاں ممکن نہیں کہ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔انبیاء علیہم السلام تو ہروقت مشاہدہ کی حالت میں ہیں۔ملائکہ ان کے سامنے وحی ان پر آرہی ہے۔تو وہ بیچارہ نفس کرے گا کیا۔گو مادے سارے موجود ہوں۔نفس مغلوب ہی رہے گا تو مادہ بھی پاک،روح بھی پاک اوراوپر سے احوال بھی پاک کہ مشاہدہ ہے عالم غیب کا اوروحی کا نزول اور علم الٰہی براہ راست اتر رہا ہے اوپر سے پھر حفاظت خداوندی بھی شامل ہے۔چونکہ ان سے دنیا کی ہدایت کا کام لینا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو معصوم رکھا گیا ہے کہ اگر ان سے ایک گناہ بھی سرزد ہوا تو مخلوق ان کی بات نہیں مان سکتی کہ جب آپ ہی ان چیزوں میں مبتلا ہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں۔اس لئے ان حضرات کو بری رکھا گیا ہے، ان کے مادے پاک،روحیں پاک،احوال پاک،ماحول پاک اوراوپر سے مشاہدات اور ہروقت حضوری شاہی دربار میں اس لئے وہاں عادتاً ممکن نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہو۔زیادہ سے زیادہ عقلی امکان رہ جاتا ہے۔

اولیاء اللہ سے صدور گناہ خلاف تقویٰ نہیں...... اولیاء اللہ سے عقلاً بھی گناہ کا امکان ہے اور عادتاً بھی اس لئے کہ جو رکاوٹیں انبیاء کو دی جاتی ہیں۔من جانب اللہ وہ نہ ان کے مادے میں ہیں نہ ان کی ارواح میں وہ چیزیں ہیں۔نہ ملائکہ ان کے سامنے حاضر ہیں۔اور نہ وحی ان پر اتر رہی ہے۔اس لئے گناہ کرنے کا امکان ہے اور بہتوں سے گناہ ہوا بھی ہے۔بعض ائمہ صحابہؓ سے گناہ سرزد ہوا۔جیسے ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں ان سے گناہ سرزد ہوا۔ اوران کو رجم کیا گیا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ قلب تو پاک ہے اور گناہ جڑ پکڑے ہوئے بھی نہیں۔ماحول سے متاثر ہوکر ایک حرکت سرزد ہوگئی۔

لیکن پھر اتنی توبہ کی اتنی توبہ کی کہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالکؓ نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر وہ توبہ عالم کے اندر پھیلا دی جائے تو سب کے گناہ معاف ہوجائیں (1) اس ایک توبہ کے اثر سے۔تو اولیاء کے اندر فقط امکان عقلی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ میں امکان عادی بھی ہے، کہ گناہ سرزد ہوجائے، مگر حفاظت خداوندی شامل ہوتی ہے، تو گناہ ہوتا نہیں۔اوراگر ہوجائے تو اتنی بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے کہ سو برس کی عبادت سے شاید وہ درجات بلند نہ ہوں جو اس توبہ سے ان کے بلند ہوتے ہیں۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ رات کو لیٹے اور شیطان نے کچھ اثرات پھیلا کر قلب اور دماغ میں پہنچائے۔تہجد کے لئے آنکھ نہ کھل سکی اور تہجد چھوٹ گیا۔حالانکہ ترک تہجد کوئی معصیت نہیں۔اس لئے کہ امتی کے اوپر نہ فرض ہے نہ واجب۔مگر جو اہل اللہ تہجد کے عادی ہوتے ہیں ان کا اگر ایک تہجد بھی قضا ہوجائے تو سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اکارت ہوگئی۔اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سر پر آپڑا۔تو حضرت امیر معاویہؓ اس تہجد کے قضا

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسة الزنی، ج: ۹، ص: ۶۸، رقم: ۳۲۰۷.

ہونے پر تمام دن روئے۔ استغفار کیا دعائیں مانگی اور کہا کہ یہ پہلی بار قضا ہوا ہے۔

غرض اگلے دن جب سوئے ہیں تو عین تہجد کے وقت ایک شخص نے انگوٹھا ہلایا کہ ''حضرت امیر! تہجد کا وقت ہوگیا ہے اٹھئے تہجد پڑھ لیجئے''۔ حضرت امیرؓ نے اجنبی آواز محسوس کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میری مجلس رائے میں تو کون اجنبی ہے جو مجھے میرے زنان خانے میں تہجد کے لئے اٹھانے آیا ہے؟ اس نے کہا کہ ''میں شیطان ہوں ''تہجد کیلئے اٹھانے آیا ہوں'' فرمایا کہ کم بخت تو اور تہجد کیلئے اٹھائے۔ اس نے کہا جی ہاں خیر خواہی کا جذبہ ابھرا اور مجھے گوارا نہ ہوا کہ آپ کا تہجد قضا ہو۔

فرمایا کہ تو اور خیر خواہی کرے۔ اللہ نے فرمایا ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ① شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ کبھی دوست نہیں بن سکتا ہے اس لئے تو اور دوستی کرے۔ یہ ناممکن ہے۔ سچ سچ بتا تو کیوں آیا ہے؟ ورنہ میں بھی صحابی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں کہ تیری گردن مروڑ دوں گا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تب وہ اصلیت کھلی۔ اس نے کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ میں نے ہی کل ایسی حرکت کی تھی کہ آپ کا تہجد قضا ہوگیا۔ میں نے کچھ ایسے وساوس اور آثار دماغ اور قلب پر ڈالے کہ آپ کو گہری نیند آ گئی اور وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ آپ نے سارے دن استغفار کیا تو تہجد سے اتنے درجے بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ سے بلند ہوئے۔ اسی لئے میں نے آپ کو اٹھایا کہ اگر آج قضا ہوگیا پھر توبہ کریں گے پھر درجے بلند ہوں گے۔ تو سو درجوں کے بجائے ایک ہی درجہ بلند ہو یہی اچھا ہے کچھ تو درجات میں کمی ہوگی۔ جب اتنی بات اس نے سچ کہہ دی تب حضرت امیرؓ نے اس کو چھوڑا۔ فرمایا کہ صحیح ہے یہ خباثت تیرے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ بہر حال اولیاء کاملین سے گناہ کے سرزد ہونے کا امکان بھی ہے اور عادتاً بھی ممکن ہے اور وہ تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ گناہ جڑ پکڑے ہوئے نہیں۔ وہ کچھ بیرونی اثرات سے گھر گھرا کر شاذ و نادر واقع ہوسکتا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السلام سے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔

مقام عصمت اور شیطان...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتے کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا مقام ہے۔ یہ خیر کے وعدے دیتا ہے۔ اور شیطان شر سمجھاتا ہے۔ دونوں کی جنگ ہوتی ہے۔ صدیقہ عائشہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ! کیا آپ کے قلب کے بائیں جانب بھی شیطان کا مقام ہے؟ فرمایا کہ ہاں لیکن وہ شیطان خود مسلمان ہوگیا۔

اس کا اثر مجھ پر کیا پڑتا میرا اثر اس پر یہ پڑا کہ اس کی ماہیت بدل گئی اور بعض روایتوں کے الفاظ ہیں کہ ہے وہ شیطان ہی، مگر میں اس سے بچالیا جاتا ہوں۔ اس کا کید و مکر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔ شیطان انبیاء علیہم السلام پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور ان کی صورت بھی اختیار نہیں کرسکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر خواب میں کوئی مجھے دیکھا

① پارہ: ۲۲، سورۃ الفاطر، الآیۃ: ۶.

تو اس نے مجھے ہی دیکھا۔ شیطان کو قدرت نہیں کہ میری صورت میں آئے اور میرا نام لے کر کہے کہ میں ہوں۔ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ صورت بھی نہیں بنا سکتا۔ چہ جائیکہ ان کے حقائق میں اثر انداز ہو سکے۔

حفاظت اولیاء اور شیطان...... شیطان اولیاء اللہ کے قلوب میں اثر ڈال سکتا ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ کسی وقت بہک جائیں۔ اور امکان ہے کہ کوئی معصیت بھی ان سے کسی وقت سرزد ہو جائے، لیکن چونکہ تقویٰ غالب ہے اس واسطے وہ غالب آ کر یا تو اس گناہ سے بچا دیتا ہے اور اگر سرزد ہو جائے تو عظیم الشان توبہ نصیب ہوتی ہے کہ وہ سو عبادتوں سے بڑھ کر عبادت ہوتی ہے۔

حاصل کلام اور درجات عصمت...... مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ عصمت اختیاری کے ساتھ۔ اولیاء اللہ محفوظ ہیں، حفاظت خداوندی کے ساتھ۔ اور حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ عادتاً ممکن ہے اور انبیاء علیہم السلام میں عادتاً ممکن نہیں۔ صرف عقلی امکان ہے مگر ان سے گناہ ہوگا نہیں اگر ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ خطاء فکری ہے۔ جس پر ان کو بہت جلد متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ ان کو اس پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے اور بچے معصوم ہیں۔ عصمت اضطراری کے ساتھ کیونکہ ان میں مادہ ہی ابھرا ہوا نہیں ہے جو سرچشمہ ہے گناہ کا، نہ شہوانی قوتیں ابھری ہوئی ہیں کہ شیطانی حرکت کریں۔ صرف ایک طبیعت کی شوخی ہوتی ہے۔ کھیل کود کرتے ہیں لیکن کوئی ارادی چیز نہیں ہوتی کہ ارادے سے کچھ مکر وفریب کر کے دنیا کو دھوکہ دیں۔ بچوں کی طبیعتیں بالکل سادہ ہوتی ہیں۔ تو عصمت دونوں میں ہے ایک میں خلقی عصمت ہے ایک میں ارادی عصمت ہے، ایک میں علم کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں ناواقفی کے ساتھ عصمت ہے۔ ایک میں قوت وتمام وکمال کے ساتھ عصمت ہے اور ایک میں قوتوں کی ناتمامی اور خامی کے ساتھ عصمت ہے۔ تو عصمت دونوں میں ہے بچوں میں بھی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام میں بھی مگر یہ فرق ہے اور اولیاء اللہ معصوم نہیں بلکہ محفوظ ہیں۔

بندۂ حکم پر انکشافِ اسرار ہوتا ہے...... ایک صاحب نے اسی مجلس میں ایک پرچہ پر ایک سوال لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے اس پرچہ کو پڑھا۔ سوال یہ تھا کہ کفار ومشرکین کی نابالغ اولاد جو انتقال کر جائے ان کا کیا حشر ہوگا۔ آخر وہ بھی تو معصوم ہیں۔ اس میں شریعت کا کوئی فیصلہ ہو تو مع اسرار وحکم بیان کیجئے۔

سوال کا آخری جز ''مع اسرار وحکم بیان کیجئے''۔ حضرت کو ناگوار معلوم ہوا۔ اس لئے تلخ مزاجی کے ساتھ جواب ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیا لفظ ہے ''مع اسرار وحکم بیان کیجئے''۔ اسرار وحکم ہم پر کب ضروری ہیں ہم تو ناقل ہیں احکام کے، حکم بیان کر دیں گے۔ یہ اسرار وحکم کا مطالبہ ہی غلط ہے۔ طالب اسرار کو اسرار کبھی نہیں مل سکتے۔ خادم اور مطیع پر اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

اگر بادشاہ کے سامنے کوئی جا کر یوں کہے کہ حضور اپنی سلطنت کے سارے راز مجھے بتلا دیجئے۔ اور بیگمات

شاہی کا پردہ بھی اٹھا دیجئے۔ اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں کتنے جواہرات ہیں؟ تو حکم یہ ہوگا کہ اس نامعقول کو کان پکڑ کر نکال دو۔ یہ کون ہے ہمارے اسرار پوچھنے والا؟ اور ایک شخص بادشاہ کا مطیع وفرماں بردار ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا۔ حکم دیا کہ بیٹھ جاؤ وہ کہتے بہت اچھا۔ حکم دیا کہ گھر چلے جاؤ وہ کہتے بہت اچھا حکم ہوا کہ فلاں وقت حاضر ہو جاؤ۔ وہ کہے بہت اچھا۔ ہر کام اور ہر بات کو ہر وقت ماننے کو تیار ہے۔ بس حکم کا بندہ ہے۔ سال بھر اطاعت کرتے کرتے جب بادشاہ کو اعتماد قائم ہوگا تو کہے گا کہ بڑا مخلص ہے۔ بڑا مطیع ہے۔ تو حکم دیا جائے گا کہ آج سے تم شاہی محل سرائے میں ہر وقت آ سکتے ہو۔ تم معتمد علیہ ہو کوئی روک ٹوک نہیں۔ تو لیجئے بیگمات کا پردہ اٹھ گیا۔

اگر وہ گھروں میں آ رہا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح کی جاری ہے اور بالکل حکم کا بندہ ہے۔ اسی طرح دو برس گزر گئے تو بادشاہ کو پورا اطمینان ہو گیا کہ بڑا مخلص اور مطیع ہے۔ اس پر بادشاہ خوش ہو کر کہے گا کہ آؤ آج ہم تمہیں اپنے خزانے دکھلائیں گے، خزانہ کھول کر اس کو اندر لے جائے گا اور دکھلائے گا کہ یہ جواہرات ہیں یہ سونا ہے، یہ چاندی ہے لیکن اس کی اطاعت پھر اسی طرح جاری وساری ہے، چار پانچ برس بعد بادشاہ کہے گا کہ آؤ ہم تمہیں اپنی حکومت کی پالیسیاں سمجھائے دیتے ہیں۔ ایک پالیسی حکومت کی یہ ہے اور ایک یہ ہے اور یہ بھی ہے، اور یہ حکمت عملی ہے تو خادم اور مطیع پر ساری چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں اور جو طلب کرے کہ جناب پردہ اٹھا دیجئے بیگمات کا تو بادشاہ کہے گا کہ اس کو کان پکڑ کر باہر نکال دو، اس کو پھانسی دے دو یہ کون ہے اسرار طلب کرنے والا؟

تو اسرار کی طلب نہیں کی جاتی اسرار تو آثار ہیں جو اطاعت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ حکم معلوم کرے یہ کیا سوال ہے کہ اس کی حکمت بھی بتاؤ! اس کا راز بھی بتاؤ؟ آپ کون ہیں راز پوچھنے والے؟ جب اللہ کا حکم آ گیا تو اس سے بڑھ کر راز اور کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حکم نہ مانیں گے جب تک راز معلوم نہ ہو۔ تو آپ اللہ کے مطیع نہیں بلکہ اپنی عقل کے مطیع ہو گئے کہ عقل سے راز مجھ میں آ گیا تو مان لیا نہ سمجھ میں آیا تو رہ گئے۔ یہ نہایت لغو سوال ہے کہ اسرار بتائیے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ حکم کیا ہے اور بس۔ اسرار معلوم کرتے ہیں تو پہلے اطاعت کیجئے۔ دین پر مضبوطی سے قائم رہئے۔ فرائض وواجبات ادا کر کے ثابت کر دیجئے کہ ہماری طبیعت بھی خادم، عقل بھی خادم اور ارادہ بھی اللہ کا غلام، مشیت بھی غلام، پھر اسرار منکشف ہوں گے۔ اسرار تو آثار ہیں اور آثار کی طلب نہیں کی جاتی ہے۔ احکام کی طلب کی جاتی ہے۔ تو حکم پوچھئے کہ مشرکین کی نابالغ اولاد کا حکم کیا ہے؟

مشرکین کی نابالغ اولاد جنتی ہے یا جہنمی؟ ...... اولاد مشرکین کا شرعاً جو حکم ہے اور جس میں محدثین ذراری مشرکین کے الفاظ سے باب باندھتے ہیں کہ مشرکین کی نابالغ اولاد آیا جنتی ہے یا جہنمی؟ اس میں علماء کے آٹھ مذہب ہیں۔ ایک مذہب یہ ہے کہ ان کی فطرت پر حکم لگا دیا جائے گا۔ چونکہ یہ بڑے نہیں ہوئے۔ فطرتوں میں سادگی تھی اور عمل واقع نہیں ہوا اور جنت ونار عمل کے اوپر ہے اور وہاں عمل ہے نہیں اس لئے فطرت پر حکم لگا کر داخل

جنت کریں گے مگر وہ داخلہ سزا یا جزا کے طور پر نہ ہوگا بلکہ محض انعام و تکریم کے طور پر ہوگا اور انہیں خدمہ بنا دیا جائے گا اہل جنت کا۔ وہ داخل تو رہیں گے جنت میں مگر اصل باشندوں کے خادم بن کر بطور خادم کے رہیں گے اور یہ ہی ان کے حق میں بڑے اعزاز کی بات ہوگی کہ انہیں جنت میں خدمہ بنا کر داخل کرلیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں توقف کیا جائے یعنی حکم مت لگاؤ اس لئے کہ روایات مختلف ہیں اور قطعی حکم لگا دینا کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی ہیں۔ ٹھیک نہیں، اس لئے سکوت اختیار کیا جائے معاملہ کو تفویض کیا جائے حق تعالیٰ کے اور کہا جائے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوگا بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ ان کو تابع کیا جائے گا۔ ان کے آباؤ اجداد کے یعنی ملحق کر دیا جائے گا۔ اگر آباؤ اجداد جہنمی ہیں تو وہ بھی جہنمی ہیں۔ اور اگر آباؤ اجداد جنتی ہیں تو وہ بھی جنتی ہیں۔ تو وہ بھی جنت میں جائیں گے۔ اس دنیا میں جب مردم شماری ہوتی ہے تو نابالغ بچوں کو بھی گنتے ہیں۔ مسلمانوں کے بچوں کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ انہیں اسلام کی خبر ہے نہ دوسری چیزوں کی خبر ہے مگر ماں باپ کے تابع بنا کر مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ تو گویا وہ اہل مذہب قیاس کرتے ہیں قرآن کی اس آیت پر ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ① جو لوگ ایمان لائے مگر عمل ان کے زیادہ صحیح نہیں تھے تو ان کے آباؤ اجداد کی کرامت کی وجہ سے درجہ ان کا بھی بلند کر دیا جائے۔ گو عمل ان کے ٹھیک نہیں۔ تو جب مومن کی کرامتوں کی وجہ سے ان کے بچوں کے درجات بلند ہو سکتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کی خباثتوں کی وجہ سے وہ بھی ان کے تابع ہو جاویں گے لہذا وہ بھی جہنمی۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بچہ جب تک نابالغ رہے اور بالخصوص شیر خوار۔ وہ حقیقت میں نفس کا جز ہوتا ہے ماں باپ کے۔ ماں دودھ پلا رہی ہے اس لئے ماں کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا نفس مستقل نہیں اور باپ کما کے کھلاتا ہے۔ اس لئے وہ باپ کے نفس کے تابع ہے۔ جب وہ عاقل بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب کہا جائے گا کہ اب اس میں استقلال پیدا ہوا ہے اور جب تک عقل میں بلوغ نہ ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہی سمجھا جائے گا وہ مسلم ہیں تو یہ بھی مسلم وہ کافر ہیں تو یہ بھی کافر۔ اس کا کفر و اسلام جب ہی معتبر ہوگا جب وہ عقل و ارادے اور اختیار سے قبول کرے گا۔ تو نابالغ اولاد ماں باپ کے توابع ہیں لہٰذا جو ان کا حکم ہے وہ ہی ان کے نابالغ بچوں کا حکم ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ نہ وہ جنتی ہیں نہ وہ دوزخی بلکہ وہ بیچ میں اعراف کے اندر رکھ دیئے جائیں گے کہ وہ جنت ہے نہ دوزخ۔ ایک مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی آزمائش کی جائے گی اور ایک آگ روشن کی جائے گی اور حق تعالیٰ کی جانب سے ان بچوں کو کہا جائے گا کہ آگ میں کود پڑو تو جن کے مزاج میں سلامتی ہوگی فطرتوں کی وہ کود پڑیں گے۔ وہ آگ حکم خداوندی سے باغ و بہار بن جائے گی۔ اور بعضے تامل کریں گے کہ ہم آگ میں کیسے چلے جاویں۔ ڈریں گے جھجکیں گے ادھر سے حکم ہے کہ آگ میں کودو اور وہ کودتے نہیں۔ معلوم

① پارہ: ۲۷، سورۃ الطور، الآیۃ: ۲۱.

ہوگا کہ اگر یہ جوان ہوتے تو یہی سرکشی ان کے اندر ہوتی۔ ان کی فطرت ہی کے اندر سرکشی داخل ہے۔ ان کی فطرت میں سلامتی نہیں۔ ایک مذہب یہ ہے اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہاں امتحان لیا جائے گا عمل سرزد نہیں ہوا۔ صرف جانچ کرلی جائے گی کہ فطرتوں کا رخ کیا ہے؟ اسی اعتبار سے وہ جنتی یا جہنمی ہوں گے۔

اسلم ترین مذہب...... بہرحال اس میں آٹھ مذہب ہیں لیکن جو اسلم ترین مذہب ہے وہ صرف توقف کا ہے کہ ہم حکم نہیں لگاتے۔ حق تعالیٰ جانتے ہیں چاہے وہ فطرت پر حکم لگادیں۔ چاہے وہ عمل پر حکم لگادیں ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ شریعت ظواہر پر حکم لگاتی ہے اور وہاں ظاہر کچھ ہے نہیں تو کا ہے پر حکم لگادیں۔ رہی فطرت تو وہ باطنی چیز ہے اور باطن کی ہمیں خبر نہیں کہ ہے کیا۔ اور ہم حکم لگانے والے۔ تو اسلم طریق یہ ہی ہے کہ توقف کیا جائے۔ یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہو جو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اہل جنت کے خدمہ بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔

نس بندی......سوال: آج کل مسلمانوں میں ضبط ولادت اور نس بندی کا رجحان پایا جارہا ہے۔ شرع میں اس کی کیا گنجائش ہے؟ نس بندی شرعی اصول کے تحت ممنوع ہے اس لئے کہ شریعت کا منشاء تکثیر اولاد ہے۔ اسی بناء پر آپ ؐ نے ارشاد فرمایا۔ "تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ" ① یعنی ایسی عورتوں سے نکاح کروجن سے اولاد زیادہ پیدا ہوتا کہ قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں۔ اس لئے قانون عام تکثیر نسل ہے اور اسلام چونکہ جامع اور معتدل مذہب ہے اسی لئے اس نے دوسری جانب کی بھی رعایت رکھی وہ یہ کہ اگر خاوند اور بیوی اتنے کمزور ہوجائیں کہ اولاد ہوگی تو جان کا خطرہ ہے اور وہ آپس میں طے کرلیں اور اولاد نہ ہونے کی دوا کھالیں تو وہ کرسکتے ہیں۔

استثنائی حکم......استثنا کو کوئی قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے نس بندی کو جائز قرار دیا ہے تو یہ خیانت ہوگی۔ اور یہ ایسے ہوگا، جیسے کہ شراب ہے اور نجس العین ہے اور نص قطعی سے اس کی حرمت ثابت ہے لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کی جان بچ نہیں سکتی جب تک یہ شراب نہ پی لے۔ تو شراب پلانے کی اجازت ہے اس لئے کہ جان بچانا فرض ہے۔ یہ ایک استثنائی حکم ہے لیکن اگر کوئی اس کو قانون عام کی شکل میں پیش کر کے یہ کہے کہ اسلام نے شراب جائز قرار دی ہے۔ یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہوگی۔ اسی وجہ سے قانون عام اپنی جگہ ہوتا ہے اور استثنائی حکم اور ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں موجود ہے کہ اپنی زبان سے کلمہ کفر مت نکالو اس قسم کا کلمہ اپنی زبان سے نکالنا شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن آگے فرماتے ہیں۔ کہ اکراہ کے وقت کلمہ کفر کہنے کی اجازت ہے۔ مثلاً دل میں اطمینان کے ساتھ ایمان موجود ہو اور کسی نے گلے پر تلوار رکھ دی اور کہنے لگا یا تو کفر کا کلمہ زبان سے کہہ دو ورنہ ابھی ذبح کردوں گا تو قرآن اجازت دیتا ہے کہ کفر کا کلمہ کہہ دو اور دل میں ایمان رکھو اور مطمئن رہو تمہاری کوئی گرفت نہ ہوگی۔

اب کوئی کہے کہ اسلام میں کفر کا کلمہ کہنا جائز ہے اور قانون عام بنا کر پیش کرے تو سراسر خیانت ہے یہ

---

① السنن لابی داؤد، کتاب النکاح، باب النھی عن تزویج من لم یلد من النساء، ج:۵، ص: ۵۳۱ .رقم: ۱۷۵۴ .

صرف ایک استثنائی حکم ہے۔ خاص حالت میں اس کی اجازت ہوگی اسی بناء پر حکم عام اور قانون عام اور ہوتا ہے اور استثنائی احکام الگ ہوجاتے ہیں۔ استثناء کو استثناء رکھا جائے گا اور قانون کو قانون عام رکھا جائے گا۔ اسلام میں فرض ہے کہ نماز کھڑے ہوکر پڑھو۔ اگر بیماری غالب ہے اور کھڑے ہوکر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھو۔ اب اگر اس کو کوئی قانون کے طور پر یوں کہہ دے کہ اسلام کا قانون ہے کہ نماز بیٹھ کر پڑھ لیا کرو۔ تو یہ خیانت ہوگی۔ حکم عام وہی رہے گا کہ کھڑے ہوکر پڑھو اور اگر کوئی خاص حال پیش آ جائے تو اس کی وجہ سے اجازت ہے مگر وہ شخصی بات ہوگی عام حکم نہ ہوگا یہی صورت یہاں بھی ہے کہ ایک تو تکثیر نسل ہے یہ تو قانون عام ہے۔ اور ایک ہے استثناء وہ شخصی حالت کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی فتویٰ ہوتا ہے اور اگر مفتی اجازت دے دے تو وہ حکم عام سے نکل کر اجازت شخصیہ کے اندر آ جاتا ہے۔ قانون عام اپنی جگہ پر برقرار رہے گا۔ یہ تھی واقعہ کی قانونی بحث!

منظّم فساد سے روٹی کی بچت...... میرے پاس سہارنپور کے دو ڈپٹی کلکٹر آئے اور نس بندی کے سلسلے میں گفتگو کرنی شروع کی۔ اس بارے میں انہوں نے سوال کیا جس کا ایک جواب میں نے ہنسی کا دیا اس سے وہ بے حد شرمندہ ہوئے۔ وہ یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ فکر لاحق ہے کہ اولاد اور آبادی بڑھتی جارہی ہے اور روٹی گھٹتی جارہی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط بہر حال آپ کو فکر آبادی کے بڑھنے اور روٹی گھٹنے کی ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کو یہ مصیبت جو پیش آ رہی ہے۔ موجودہ نسل ہی سے پیش آ رہی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ آنے والوں کا راستہ تو بعد میں روکنا۔ ان کی پہلے (موجودہ) میں کمی شروع کردو۔ اس کی عمدہ صورت یہ ہے کہ جو ملک میں فسادات پیش آ رہے ہیں ان کو منظّم اور باقاعدہ کر دیجئے۔ ہر ایک شہر میں روزانہ ایک دو فساد ہوتے رہیں اور معتد بہ افراد قتل ہوتے رہے تو دس برس میں انشاء اللہ کافی کمی ہوجائے گی اور آپ کی روٹی بچ جائے گی اس جواب سے وہ جھینپ گئے۔

تقسیم دولت میں عدم توازن...... اس کے بعد میں نے کہا کہ جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ تو اصل میں آپ لوگ کرتے نہیں۔ اور نہ کرنے کے کاموں میں آپ لوگ چل رہے ہیں۔ روٹی کی کمی اس لئے نہیں کہ آبادی بڑھ رہی ہے۔ آج تو زمینوں میں اتنی کاشت ہورہی ہے جتنے افراد بڑھ رہے ہیں رزق بھی بڑھ رہا ہے۔

پھر بھی جو کمی ہے اس کی بناء یہ ہے کہ آپ کے ملک میں دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ جو غریب ہے وہ بے حد غریب ہے۔ اور جو امیر ہے وہ بے حد امیر ہے۔ ملک کے وہ خاندان جو اربوں کھربوں کے مالک ہیں قانون پر ان کا قبضہ ہے۔ پارلیمنٹ کے ممبران ان کے ممنون ہیں وہ قانون ایسا بنواتے ہیں کہ ان کا سرمایہ بڑھتا رہے۔ اور غریب فٹ پاتھ پر پڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دولت کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ دولت کی تقسیم صحیح کر دیں کہ امیر اور سرمایہ دار کو ذرا نیچے اتار دیں۔ اور غریب کو ذرا اونچا اٹھائیں۔ اس سے توازن

پیدا ہو جائے گا اور یہ شکایت رفع ہو جائے گی۔ یہاں ہزاروں بورے غلے سمندر میں ڈالے جاتے ہیں۔ جب وہ غلہ پرانا ہو جاتا ہے۔تو معلوم ہوا کہ غلہ اور رزق کی کمی نہیں بلکہ نیتوں کی خرابی ہے۔یا طرز عمل کی خرابی ہے۔آپ ان دولت مندوں پر اور سرمایہ داروں پر پابندی عائد کر دیں اور ان کی دولت میں ایسے راستے نکالیں کہ غرباء پلیں اور ملک میں ایک بھی فٹ پاتھ پر پڑنے والا نہ رہے۔

آج بمبئی کے فٹ پاتھ پر آٹھ لاکھ آدمی سوتے ہیں جن کا نہ گھر ہے نہ در ہے وہیں ان کے بچے روتے رہتے ہیں بارش ہوتی ہے تو ایک طرف کو سکر جاتے ہیں کوئی کھلی اوساتھ لیتا ہے کوئی کسی کا سہارا لیتا ہے تو ایک ایک شہر میں آٹھ آٹھ لاکھ آدمی فٹ پاتھ پر پڑنے والے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ملک میں غرباء کتنے ہیں ان کی کیا حالت ہے؟ نہ ان کے پاس روٹی نہ کپڑا نہ گھر نہ در۔اور دوسری طرف دیکھو، برلا، ٹاٹا، باٹا وغیرہ کو کہ یہ بھی یاد نہیں کہ دولت کتنی ہے۔ وہ بڑھ رہے ہیں دولت میں۔اور یہ بڑھ رہے ہیں غربت میں۔ یہ نظم کی خرابی ہے آپ اس خرابی کو ڈالنا چاہتے ہیں ماؤں کے پیٹوں پر کہ آنے والوں کو روک دو، اس کا ان سے کیا تعلق اپنا نظم صحیح کیجئے۔اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں وہ چاہتے تھے کہ مجھ سے کچھ بیان حاصل کریں۔ میں ان کو بیان تو کیا دیتا، مگر وہ وہاں سے چپ ہی ہو کر اٹھے، میں نے ان سے کہا کہ بس دو ہی صورتیں ہیں یا فسادات کو منظم کرو۔ اچھے خاصے افراد ہر روز قتل ہوتے رہیں دس بارہ سال میں کمی آ جائے گی۔اور یہ نہیں کرتے تو نظام صحیح کرو، دولت کی تقسیم صحیح کرو۔

سرمایہ دار کا طریق واردات......اور میں نے یہ بھی کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان سرمایہ داروں نے اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے یہ شوشے چھوڑ رکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نس بند کرو یہ کرو اور وہ کرو تاکہ ان کی دولت پر زور نہ آئے اور ان کے پیسے میں کمی نہ آئے۔ یہ اس کو چھپانے کے لئے چالاکی کرتے رہتے ہیں تاکہ پبلک دھوکہ میں مبتلا رہے۔ہم دھوکہ میں آنے والے نہیں۔اپنا نظم درست کیجئے آپ کا نظام صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایسا ہی کیا تو بیس برس کے بعد سر پکڑ کر روئیں گے جب اولاد کی کمی ہوگی' نہ فوج میں آدمی ڈھنگ کا ملے گا اور نہ پولیس میں پھر بعد از خرابی بسیار اضافہ نس پر سوچیں گے۔

کثرت اولاد پر انعام......میں نے کہا کہ آپ یہاں رزق کی کمی کی وجہ سے آنے والوں پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں اور بعض ملکوں میں یہ قانون ہے کہ جتنی اولاد زیادہ ہوگی اتنا ہی والدین مستحق انعام سمجھے جاتے ہیں۔یعنی اگر کسی کے یہاں دس بچے ہیں تو اتنے فی صد انعام دیا جائے گا۔اور بارہ ہیں تو اتنا۔ یہ رزق کی کمی وہاں کیوں نہیں؟ وہاں لوگ کیوں فاقے نہیں بھرتے۔ اس لئے کہ دولت کی تقسیم میں نابرابری نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس مصیبت سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔

استثنائی اجازت......سوال: استثنائی شکل میں نس بندی کرا سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب: استثنائی شکل دوسری بات

ہے اس میں نس بندی ہی کیا بعض دوائیں ایسی ہیں جن کے کھانے سے اولاد نہیں ہوتی جب آدمی اس حال پر پہنچ جائے کہ بیوی اس قابل نہ ہو اور اس کی جان کا خطرہ ہو اور وہ کہے کہ مجھے تحمل نہیں اور آئندہ بچہ پیدا ہونے کی تکلیف سے جان جانے کا اندیشہ ہے تو اسے شریعت کی جانب سے اجازت ہے کہ کوئی ایسی دوائی کھالے جس سے بچہ پیدا نہ ہو مگر استثنائی حکم رہے گا اور اس کو قانون عام کی شکل نہیں دی جاسکتی ہے۔

انٹرویو

ضبط وتحریر..... حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

علامہ قاری محمد طیّب صاحب قاسمی قدس اللہ سرہٗ سے ایک ملاقات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام

دعوت وتجدید، علمی، سیاسی، معاشرتی اور تجدیدی کارنامے

① پچھلے دنوں جب حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے سفر پاکستان کے دوران اپنی خاص محبت اور تعلق کی بناء پر دارالعلوم حقانیہ کو بھی اپنی تشریف آوری سے نوازا اور دارالعلوم کی فضائیں حضرت کی آمد کی وجہ سے پرنور مجالس اور محافل سے سراپا نور بن گئیں۔ تو اچانک دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ماہنامہ ''الحق'' کے لئے مرکز اسلام کے مدبر شہیر اور حضرت حکیم الاسلام مولانا نانوتوی کے علوم واسرار کے امین سے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا جائے۔ ادھر یہ خواہش ادھر حضرت کی مصروفیات اردگرد پروانوں کا ہجوم اور پھر حضرت کی علالت اور تکان سفر کے ساتھ ساتھ تازہ زکام اور نزلہ اس پر مستزاد، مگر خدا کی خاص دستگیری تھی کہ رات کے گیارہ بجے کے بعد اس مقصد کے لئے کچھ یکسوئی کا وقت نکل ہی آیا۔

دارالعلوم کا مستقبل..... حضرت والا سے پہلا سوال دارالعلوم دیوبند کے مستقبل کے بارے میں تھا۔ بھارت سے مسلمانوں کی ثقافت، پرسنل لاء اور ثقافتی مراکز کے متعلق جو خبریں آتی ہیں وہ اگرچہ مبالغہ آمیز ہی سہی۔ لیکن پریشان کن ضرور ہوتی ہیں۔ اور پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں۔ کہ:

عشق ست و ہزار بدگمانی

جس شجرہ طوبی کے لئے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہا اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہم اللہ تعالی اجمعین اور شہدائے بالاکوٹ نے زمین ہموار کی جس کی داغ بیل حجۃ اسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ اسلام مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے سراپا اخلاص وعمل بزرگوں نے رکھی؛ پھر جس کی آبیاری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام

① حضرت مولانا سمیع الحق صاحب زید مجدہم نے یہ انٹرویو حاصل کیا۔ عنوانات کا اضافہ مرتب کی طرف سے ہے۔ ماہنامہ ''الحق'' کے شکریہ کے ساتھ اسے جزو کتاب بنایا جارہا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالی اجمعین جیسے اساطین امت نے اپنی زندگی تج دی۔ آج انوار و معارف کے امین اور بانی دارالعلوم کے حفید رشید مولانا محمد طیب قاسمی سے پہلا سوال اسی دارالعلوم دیوبند کے بارے میں تھا۔ جسکی تعمیر و تشکیل سے خود حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی کی داستان وابستہ ہے۔ حضرت نے پورے اعتماد، مضبوط ایمان اور توکل سے بھر پور انداز میں جواب دیا۔

"جی ہاں، اللہ بہتر کرے، بنیاد تو اس کی ایسی ہی ہے کہ مستقبل روشن ہے ان شاءاللہ۔ اور یہ اس لئے کہ بڑی بڑی گھاٹیاں آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا۔ بڑے بڑے مخالف پیدا ہوئے مگر اللہ کا فضل ہے وہ بڑھتا ہی رہا"۔

اطمینان اور تسلی کے لئے یہی کچھ کافی تھا، مگر یکا یک دھیان مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر اول دارالعلوم دیوبند کے ایک مکاشفہ یا پیشین گوئی کی طرف گیا جسے کہیں پڑھا یا سنا تھا، اور پھر جب یہ بھی خیال آیا کہ دارالعلوم اپنی زندگی کے سو سال پورے کر چکا ہے، تو گویا دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوندی اور سائل نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارہ میں پوچھا کہ "حضرت! کسی بزرگ غالبا مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ سننے میں آیا ہے کہ سو سال تک تو اس دارالعلوم کا خدا محافظ ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ، کی شان بے نیازی کا جو فیصلہ ہو"۔

حضرت نے اس کا جواب دیا اور یکا یک فکر و اضطراب کی گھٹائیں اطمینان اور امید کی قندیلوں سے روشن ہوگئیں۔ حضرت نے فرمایا۔ "نہیں اتنا میں نے سنا ہے کہ یہ مدرسہ چلتا رہے گا، چلتا رہے گا یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب ہو اور یہ مدرسہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس پیشین گوئی سے ہم تو بڑی امید باندھے ہوئے ہیں"۔ پھر حضرت نے فرمایا "یہ ایک عجیب بات ہے اور اب تک پوری ہوتی چلی آرہی ہے"۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ وضاحت فرمارہے تھے اور چشم تصور نے دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہراتا دیکھا۔ کانوں نے اس کی سرسراہٹ محسوس کی اور مسلمانوں کی عظمتوں کی امین سرزمین پر شوکت اسلام کے تصور ہی سے جھوم اٹھا، مگر کیا خبر کہ یہ سنہرا خواب بھی زندگی کی اور حسرتوں کی طرح شرمندہ تعبیر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس امید و بیم میں راقم الحروف نے اپنی بات دوسری پیرائے میں دہرائی۔

تجدید دین کا مظہر اتم...... حضرت! تجدید دین کا زمانہ تو اشخاص و افراد کے لحاظ سے سو سال کا ہوتا ہے۔ تو یہ تو دین اور علوم دین کا ایک مجددادارہ ہے تو اس کی عمر تو ہزاروں سال ہونی چاہئے۔ ابھی میں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ کہ حضرت نے ایسا امید افزاء اور ایمان پرور جواب دیا کہ دل و دماغ میں فکر و اضطراب کے بجائے خدا کی رحمت اور وعدہ حفاظت دین کے یقین کی شمع فروزاں ہوئی۔ حضرت نے فرمایا۔ "میں نے اپنے بزرگوں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات سے کئی بار سنا ہے کہ مجدد کے لئے شخص واحد کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ جماعت بھی ہوسکتی ہے اور ان حضرات نے فرمایا کہ یہ جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی

رحمۃ اللہ علیہ اوران اکابر کی جماعت ہے یہ سب مجدد ہیں۔ جنہوں نے سنت بدعت میں معروف اور منکر میں تمیز پیدا کی، اوراس کے بعد فرمایا کہ ان حضرات کی تجدید کا مظہراتم یہ دارالعلوم ہے۔ اسی کو مجدد کہا جائے اور مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جوعمل ہے تجدید دین کا اس کی نسبت اور قیام کا مرکز ہے دارالعلوم، اور ہندوستان میں یہ دارالعلوم قطب الرحٰی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسے چکی کے پاٹوں کے بیچ میں کلی ہوتی ہے۔ تو اس کے اردگرد چکی کے پاٹ گھومتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے نہ صرف دینی معاملات بلکہ ملکی معاملات بھی اس کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ اس کے اندر کچھ قوت اور مقناطیسی طاقت خدا نے رکھی ہے اور تیسری بات جس سے ڈھارس بندھتی ہے، وہی مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ کہ یہ دارالعلوم چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں انقلاب آ جائے اور یہ پھر اسلامی حکومت کے ہاتھ میں چلا جائے''۔

ظرافت آمیز شکوہ...... حضرت ابھی اپنی بات سمیٹ رہے تھے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب (۱) رحمہ اللہ مجلس میں تشریف لائے اور حضرت کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہوکر انٹرویوں نگاروں کی ستم کاری کا شکوہ اس ظرافت آمیز انداز میں فرمایا کہ ''ان لوگوں کا منشاء یہ ہے کہ تم رات کو بھی جاگو گے دن کو بھی نہیں سونا چاہئے آج بھی جاگنا چاہئے اور کل کو آٹھ گھنٹے کا سفر ہے جاگ کر چلے جانا تاکہ مجاہدہ مکمل ہو جائے''۔ بزرگوں کی شفقت سے طبیعت میں جو گستاخی اور شوخی آ گئی ہے، اس کی بناء پر عرض کیا گیا کہ حضرت پورے سفر میں ہماری ''قدرشناس میزبان حکومت'' نے آپکے تقریر و بیان پر پابندی لگا کر آپ کو بڑی راحت پہنچائی ہے۔ اب ہم کل سے اس کی کسر یہاں دارالعلوم حقانیہ میں نکالنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے جن کی طبیعت کو خدا نے شکوہ وشکایت کی بجائے صبر وتمکنت اور تحمل کی نعمت سے بڑی فروانی سے نوازا ہے۔ ہماری اسلامی حکومت کے اس سراسر نامناسب اقدام پر احتجاج یا افسوس کے بجائے احسان مندی کے لہجے میں فرمانے لگے کہ ''جی ہاں یہ تو واقعی یہاں کی حکومت کا میرے ساتھ نادانستہ احسان ہے یا پھر میرے ضعف، بڑھاپے، اور علالت پر خداوند کریم کا غیبی کرم، ورنہ تقریر پر پابندی نہ ہوتی اور ہر جگہ دوستوں کے تقاضا پر مجھے بولنا پڑتا تو شاید میری طبیعت اس کی متحمل نہ ہو سکتی۔ گو میں تو وہاں سے یہ ارادہ کر کے آ رہا تھا کہ تقریر و بیان سے حتی الوسع علالت کی وجہ سے پہلو تہی کروں گا''۔ عالم اسلام کے ایک جلیل القدر عالم دین سے اور مسلمانوں کے قابل فخر بزرگ کی اپنے ملک میں اس ''پذیرائی'' کا ذکر چھیڑ کر مجھے خود ندامت اور خفت محسوس ہونے لگی مگر حضرت کی زبان سے ایسا تبصرہ سن کر اپنے اکابر کی شرافت نفس اور علوم اخلاق کا ایک پہلو تو سامنے آ ہی گیا۔

اس کے بعد گویا اصل انٹرویو شروع ہوا ایک ایک پرزہ جس پر عجلت میں چند سوالات لکھے گئے تھے حضرت کی طرف بڑھایا۔ حضرت نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر گویا ہماری طفلانہ خواہش اور تنگی دامن کو دیکھ کر مسکرانے

(۱) شیخ الحدیث حضرت محترم مولانا عبدالحق صاحب نوراللہ مرقدہ بانی دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک (پشاور)

لگے۔"ارے بھائی! یہ تو بڑے لمبے سوال ہیں اس میں سے کسی ایک سوال کے ایک گوشہ پر گفتگو کے لئے بھی یہ پوری رات ناکافی ہے"۔ مگر ایک سدا بہار گلشن سے گزرنے والے کسی سراپا شوق کی نظر تو اپنی تنگ دامنی سے زیادہ انواع واقسام کی زیبائش اور رعنائی پر ہوتی ہے۔ اس کے دامانِ نگاہ میں تو پورا چمن سمیٹ لینے کی چیز ہے کہ پھول ہے تو یہی اور سرسبز وشاداب گوشہ ہے تو بس یہی۔

امام دعوت وعزیمت...... سب سے پہلا سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں تھا جن کے سر پر خدا تعالیٰ نے ظلمت کدہ ہند میں حفاظت دین کا سہرا باندھا۔ اور جن کی مومنانہ بصیرت، مجاہدانہ جدوجہد، حکیمانہ علوم اور جدید علم کلام کی وجہ سے خداوند کریم نے دور غلامی میں اسلام اور اسلامیان ہند کے علوم وتہذیب کو محفوظ رکھا۔ بلاشبہ اس امام کبیر کی نظیر قرون اولی ہی میں مل سکتی ہے۔ علم میں، عمل میں، جہاد اور ریاضت میں، تدبر اور سیاست میں، تصوف اور سلوک میں حضرت حجۃ الاسلام یکتائے روزگار تھے۔

ایک نقاد عالم نے بالکل صحیح کہا کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ذات ستودہ صفات انیسویں صدیں کے نصف آخر میں بے شبہ آیت من آیات اللہ تھی۔ آپ کے علمی، اخلاقی، اور روحانی کارنامے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے رازی کا فلسفہ، شعرانی کا علم الکلام غزالی کا سوز وگداز، ابن تیمیہ کا صولت بیان، ولی اللہ کی حکمت ودانش، احمد سرہندی کی غیرت وحمیت اسلامی اور ٹیپو کی شجاعت یہ سب چیزیں کس فیاضی سے ایک شخص میں جمع کردی تھیں۔ اور بقول حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔"ہمارے اکابر تو وہ ہیں کہ اگر ان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرادیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی اور غزالی ہی سمجھیں گے"۔ اور آج حضرت قاری صاحب سے اسی امام دعوت وعزیمت، سرخیل ارباب صدق وصفا' علمبردار جہاد حریت اور نابغہ روزگار شخصیت کے مقام دعوت وعزیمت پر کچھ روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اور حجۃ الاسلام کے پوتے فرما رہے تھے کہ۔

تین بڑے کام...... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی میں جو کام انجام دیئے وہ بہت زیادہ ہیں لیکن بنیادی طور پر تین بڑے کام انجام دیئے۔ سب سے پہلا کام دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے۔ یہ اتنا عظیم کام ہے کہ پوری دنیا پر اس نے اثر ڈالا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ خلافت اسلامیہ کی تائید میں ہمہ وقت منہمک رہے۔ سلطان عبدالحمید خان خلیفہ تھے۔ گو وہ خلافت نام کی رہ گئی تھی مگر حضرت چاہتے تھے کہ وہ نام ہی قائم رہے۔ اس سے تمام ممالک اسلامیہ میں ایک مرکزیت قائم رہے گی اس لئے حضرت نے خود بھی سلطان کی حمایت میں قصیدے لکھے۔ مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ سارے بزرگ رطب اللسان رہے۔ اور جب بھی ترکوں سے کسی کی جنگ ہوئی یہ حضرات ترکوں کی حمایت میں کھڑے ہوئے، کہیں چندہ جمع کررہے ہیں، کہیں رائے عامہ پیدا کررہے ہیں۔ غرض ہمہ وقت مصروف رہتے۔

تو مقصد یہی تھا کہ خلافت کا نام قائم رہے۔ اور تیسری چیز یہ انجام دی کہ دیوبند اور نواح دیوبند میں نکاح

بیوگان کو انتہا درجہ کا عیب سمجھا جاتا تھا اور یہ چیز ہندوؤں سے آئی تھی، اگر کسی نے نام بھی لیا تو تلواریں نکل آتی تھیں۔ حضرت نے لطیف پیرایہ میں اس کی تحریک شروع کی جب اندرونی طور پر خواص کو اپنا ہم خیال بنایا تو اس کے بعد جلسہ عام کیا۔

ہمارے یہاں دیوان کا دروازہ جو ہے وہ نواب لطف اللہ خان مرحوم کا محل ہے۔ جو اورنگ زیب کے وزیر خارجہ تھے اور دیوبند میں عثمانیوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ اس میں حضرت نے وعظ فرمایا بہت بڑا مجمع تھا۔ درمیان میں ایک شخص اٹھا اور کہا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فراست سے سمجھ گئے تھے کہ کیا کہتا ہے؟۔ جواب میں فرمایا کہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ ایک ضرورت پیش آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ استنجاء وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔

حضرت گھر میں گئے۔ حضرت کی بڑی بہن بیوہ تھی، ۹۵ برس کی عمر میں نہ نکاح کے قابل نہ کچھ، مگر اعتراض کرنے والے کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ آپ دنیا کو نصیحت کرتے ہیں مگر آپ کی بہن تو بیٹھی ہے۔ گھر میں گئے تو بڑی بہن کے پیروں پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھبرا کر کہا کہ بھئی تم عالم ہو یہ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا میں بہرحال آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ آج ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمت کریں تو آپ پر موقوف ہے۔ فرمایا کہ میں ناکارہ اور سنت رسول کی احیاء میری وجہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ آپ نکاح کر لیجئے۔ فرمایا کہ بھئی تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ منہ میں دانت نہیں کمر جھک گئی۔ ۹۵ برس میری عمر ہے۔ کہا یہ سب میں جانتا ہوں۔ مگر اعتراض کرنے والے اس چیز کو نہیں دیکھتے تو فرمایا کہ اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے زندہ ہو سکے تو میں جان قربان کرنے کو بھی تیار ہوں۔

تو ان کے دیور کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اور انکے خاوند کا وہاں پر جو چودہ پندرہ آدمی تھے خاندان کے انہی کے سامنے نکاح پڑھایا گیا۔ گواہ بنا دیئے گئے اس میں کچھ دیر لگ گئی۔ پھر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ باہر آئے اور مجمع میں دوبارہ تقریر شروع کی، وہی سائل پھر کھڑا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا کہیے اس نے کہا آپ دنیا کو نصیحت کر رہے ہیں اور آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہے تو ہم پر کیا اثر ہوگا؟

فرمایا: کون کہتا ہے؟ ان کے نکاح کے تو شاید گواہ بھی یہاں موجود ہوں گے۔ دو تین آدمی درمیان میں کھڑے ہوئے اور کہا کہ ہمارے سامنے نکاح ہوا ہے۔ اصلاح معاشرت اور رسومات مٹانے کے لئے حضرت نے خود اپنے گھر سے قربانی پیش کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ستر اسی نکاح پڑھے گئے اور پھر یہ سنت ایسی کھلی کہ ہزاروں بیواؤں کا نکاح ہو گیا۔

روح دار العلوم...... تو پہلی چیز تو دار العلوم کے قیام پر زور دیا۔ اس کی روح فی الحقیقت یہ تھی کہ علوم نبوت اگر عام ہوئے اور ایمان سنبھل گئے تو پھر مسلمان سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایمان ہی نہ رہا تو پھر کچھ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جب شوکت اور حکومت جا چکی تو کم از کم دین تو محفوظ رہ جائے وہ رہ گیا تو آگے سب کچھ ہو جائے گا۔

اس لئے سفر میں جہاں بھی گئے تو مدارس قائم کرتے چلے گئے، مراد آباد میں مدرسہ شاہی، امروہہ میں مدرسہ عربیہ، بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم، انبیٹھ اور تھانہ بھون میں دینی مدرسے اور اگلاوٹی میں مدرسہ قاسمیہ قائم کیا۔ اور جتنے متوسل تھے خطوط لکھتے رہے کہ جہاں ہو مدرسہ قائم کرو۔ اور یہ حضرت کی ایک بڑی سیاست تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ قوم کو علم کے راستے سے تیار رکھنا کہ وہ مضبوطی سے قائم رہے اور جب دین ہوگا تو آئندہ ممکن ہے کہ ان میں شوکت اور قوت بھی آجائے۔

اصلاح معاشرہ اور خلافت اسلامیہ...... ادھر معاشرت کو درست کیا۔ معاشرت کی سب سے بڑی خرابی نکاح بیوگان کی طرف توجہ دی۔ تیسری چیز یہ تھی کہ خلافت اسلامیہ کی طرف لوگوں کو مائل کیا۔ ہر وقت اس کا دھیان جس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی کوئی نہ کوئی بود نبود قائم رہے۔ اگر ہندوستان میں اسلامی حکومت نہیں ہے تو کم سے کم کسی اسلامی حکومت سے تو مربوط رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی امیدوں کا مرکز بہت دنوں تک افغانستان رہا۔

افغانستان سے رابطہ...... اور برطانیہ کو یہ شکایت رہتی کہ یہ جماعت شورش کر رہی ہے اور افغانستان سے مل کر برطانوی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتی ہے مگر ان حضرات کو اس کی کیا پرواہ تھی؟ افغانستان سے برابر اپنا ایک رابطہ قائم رکھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ”جب امیر نادر خان کا انتقال ہوا اور ظاہر شاہ تخت سلطنت پر بیٹھ گئے تو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے مجھے نمائندہ بنا کر بھیجا کہ امیر مرحوم کی تعزیت اور امیر موجود کی تہنیت کروں۔ میں افغانستان حاضر ہوا اور میں نے یہ تحریر لکھ کر پیش کی کہ ہمارا مقصد کوئی مالیہ اور چندہ لینا نہیں۔ بلکہ ان روابط کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے اکابر رحمۃ اللہ علیہ کے تھے جس پر صدر اعظم نے مجھے بلایا۔ امیر بڑی عنایت وشفقت سے پیش آئے جب میں قصر صدارت میں پہنچا تو ہم لوگ بیٹھ گئے اور یہ خیال تھا کہ شائد ملاقات کے کمرہ میں بلایا جائے گا۔ لیکن یکا یک دیکھا کہ خود صدر اعظم وہیں آرہے ہیں۔ ہم سب لوگ کھڑے ہوئے آگے بڑھے تو وہی افغانی طریقہ پر معانقہ دایاں بایاں مونڈھا چومنا، پوری محبت کا اظہار انہوں نے کیا۔ اس کے بعد فرمایا ”بفرمائید“ آپ آگے چلیں۔ میں نے کہا ”نے نے خلاف ادب است“ فرمایا نہیں نہیں آپ کو آگے چلنا ہوگا اور میں اس کی وجہ بتاؤں گا۔ اب ہم اس شان سے چلے کہ میں آگے آگے میرے پیچھے صدر اعظم صاحب ان کے پیچھے سردار نعیم خان اور ان کے پیچھے مولانا محمد میاں صاحب (منصور انصاری رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے پیچھے غازی صاحب۔ اس ترتیب سے ہم آگے بڑھے تو وہ جو رسمی کرسی تھی، اس پر مجھے بٹھلایا اور خود دوسری کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اب میں وجہ بیان کرتا ہوں، اور وجہ مختصر یہ ہے کہ۔ کابل کی یہ حکومت ہمیں آپ بزرگوں کی دعاؤں سے ملی ہے اور یہ اشارہ تھا اس طرف کہ امیر نادر خان صاحب کے چچا تایا سردار محمد یوسف خان اور سردار محمد آصف خان یہ دونوں بیعت تھے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے، اور برطانیہ نے انہیں ڈیرہ دون میں نظر بند کر رکھا تھا۔ تو یہ حضرات شکار کے حیلے

سے گنگوہ آ کر حضرت کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور حضرت کوئی نصیحت فرمادیتے۔ آخری دفعہ جب ملاقات ہوئی تو حضرت نے فرمایا "جاؤ کابل کی حکومت تمہارے خاندان میں آئے گی اور عدل سے کام کرنا"۔ انہیں حیرت ہوئی کہ کابل کی حکومت سے ہمارا کیا تعلق؟

امان اللہ کی حکومت تھی یہ لوگ بنی اعمام میں سے تھے، تو انہیں عہدے وزارتیں وغیرہ تو ملتی تھی۔ مگر حکومت کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ حضرت نے حوصلہ افزائی کے طور پر ایک کلمہ کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بچہ سقہ کی حکومت آئی۔ امان اللہ خان معزول ہوئے۔ کیونکہ اسی نے مظالم ڈھائے تو قوم متوجہ ہوئی کہ امیر نادر خان کو فرانس سے بلایا جائے۔ وہ آئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور پھر شہید ہو گئے۔ تو صدر اعظم کا اشارہ اسی طرف تھا۔ پھر صدر اعظم نے فرمایا کہ

"ہمارے پاس کچھ تبرکات آپ کے بزرگوں کے محفوظ تھے۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ٹوپی تھی جو میری والدہ کے پاس تھی اور ہمیں جب کوئی بیماری ہوتی تو والدہ ہمیں وہ ٹوپی اوڑھاتی تھی اور ہمیں شفاء ہو جاتی۔ آج ڈاکٹر رفقی بے (جو ترک ہے) کو ہم چھ ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں مگر اس کے نسخوں سے وہ شفا نہیں ہوتی جو ان تبرکات کی وجہ سے ہوتی اور فرمانے لگے۔ کہ بچہ سقہ کے زمانے میں ہمارا گھر لوٹا گیا، لاکھوں روپیہ کا سامان چوری ہو گیا، لیکن ہمیں صدمہ ہوا تو تبرکات کا جس کا آج تک ہمارے اوپر اثر ہے۔ پھر صدر اعظم افغانستان نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو آگے بڑھا رہا ہوں"۔

ترکوں سے روابط...... یہ تو افغانستان سے روابط تھے اور سلطان عبدالحمید خان ترکوں سے تعلق کا حال معلوم ہوا جس سے ان حضرات کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ یوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اسلامی حکومت بازیافت ہو جائے، مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی تحریک تھی وہ چاہتے تھے کہ عالم اسلام متحد ہو کر ترک اور افغانستان سب مل کر ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریک تھی اور وہ ہوئے بھی حملہ آور۔ مگر کچھ تو یہ ملک تیار نہ تھا، کچھ مجاہدین ناتربیت یافتہ تھے، نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا اور یہ خواہش انہیں ورثہ میں اپنے استاذ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں تو گویا حضرت جوش جہاد میں غرق تھے اور بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جان دے دوں، شاملی میں تلواروں سے مقابلہ بھی کیا۔ الغرض حضرت کی زندگی کے کارناموں میں ایک عملی کارنامہ تو دارالعلوم ہے، جس کا فیض اطراف عالم میں پہنچا، دوسرا معاشرتی کارنامہ ہے، اور تیسرا سیاسی اور اجتماعی کارنامہ کہ تہذیب و تعلیم ہی کے سلسلہ میں سہی مگر ممالک اسلامیہ میں کوئی نہ کوئی ربط قائم رہے۔

انگریزی دور میں محکمہ قضاء کا قیام...... اس سلسلہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں محکمہ قضاء قائم کیا اور مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کو قاضی بنایا تو ہزاروں مقدمات جو برس ہا برس سے الجھے ہوئے تھے، منٹوں میں طے ہوئے۔ لوگوں کا وقت اور مالیہ بچا، یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر انگریز نے آخر میں توڑ دیا۔ دیوبند میں ایک

تھانیدار کو بھیجا جو بڑا سخت قسم کا آدمی تھا چنانچہ وہ آیا۔ رمضان شریف کا آخری عشرہ تھا۔ اس نے آ کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کیا اور بہت جرات کے ساتھ کہا کہ کیا آپ ہندوستان میں شرع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا آپ نے محکمہ قضاء قائم کیا؟

حضرت نے بڑی نرمی سے کہا کہ "یہ تو ہم لوگ گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے مقدمات فیصل کرتی ہے۔ ہم نے منٹوں میں فیصل کر دیئے"۔ مگر اس نے کہا نہیں آپ پورا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں رپورٹ کروں گا اس پر حضرت کو غصہ آیا اور کہا کہ "کان پکڑ کر اسے نکال دو"۔ طالب علموں نے دھکے دے کر اسے نکالا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ "جا ہم تیری رپورٹ کریں گے، نکال دو اس شیطان کو یہاں سے"۔

بہر حال عید کا دن آیا، تھانیدار کے ہاں دودھ کے بالٹے بھرے تھے، کپڑے تیار خوشیاں منائی جا رہی تھیں کہ اچانک گورنمنٹ کا حکم پہنچا کہ اس کی رشوتوں کی انتہا ہو گئی ہے۔ اس کو فوری برخاست کیا جائے۔ اور بازار میں دکان دکان پر جہاں سے اس نے رشوت لی۔ پیروں میں رسی ڈال کر اسے پھرایا جائے۔ تو اس حالت میں اسے گھمایا گیا کہ یہ روتے ہوئے کہتا جا رہا تھا کہ "افسوس میں نے تو رپورٹ نہیں کی، مگر مولوی جی نے میری رپورٹ کر دی"۔

تو اس کا خمیازہ جلد اس نے بھگت لیا۔ اس کی جگہ دوسرا آیا۔ اس کے بعد ان بزرگوں کی وفات ہو گئی اور وہ محکمہ نہیں چلا۔ تو حضرت کا چوتھا منصوبہ یہ تھا کہ اسلامی پرسنل لاء اور مخصوص قانون شریعت کے مطابق طے ہو۔

اسی کے تحت دار العلوم کے اکابر رحمۃ اللہ علیہ نے جب لنڈن سے مسٹر مانٹیگو وزیر ہند آیا اور جارج کا زمانہ تھا' تو میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ) علماء کا ایک وفد لیکر ان سے ملنے کے لئے گئے اور درخواست یہ کی کہ "ہندوستان میں محکمہ قضاء قائم کر دیا جائے۔ جس میں شریعت اسلام سے مخصوص چیزیں نکاح، طلاق، عدت، میراث، اوقاف وغیرہ طے ہوں"۔ خیر اس نے ظاہر میں تو کہا اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اور پارلیمنٹ میں بھی۔ لیکن یہ وقتی بات تھی نہ اس نے پیش کیا نہ ایسا ہوا۔

تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ..... مگر ان بزرگوں کا جذبہ برابر یہی تھا کہ اسلامی اقتدار مسائل کے درجہ میں سہی، قائم ہو جائے۔ تحفظ خلافت اور روابط اسلامیہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک یہ کیا کہ لوگوں کو بہت زیادہ حج کے لئے مائل کرتے تھے اور فرمایا کہ اول تو عبادت ہے اور عبادت بھی اجتماعی وہاں جا کر مکہ والوں سے بھی سابقہ پڑے گا۔ وہاں اسلامی حکومت دیکھیں گے تو ان کے قلوب پر اثر پڑے گا تو شوکت اسلامی کے جذبات لے کر آئیں گے، تو علم و معاشرت، سیاست اور خلافت یہ چند چیزیں ایسی ہیں جو حضرت کی تمام خدمات کی محور ہیں۔

رات آدھی گزر چکی تھی شرکاء مجلس ذکر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ میں ایسے محو کہ گویا ایک حسین خواب دیکھ رہے ہوں اور زمانہ پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہو کہ یکا یک حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بساط لپیٹنی چاہی، سننے والے چونک

پڑے اور حضرت کے ضعفِ نقاہت کے باوجود ان کی توجہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مخصوص شان ''علمی کمالات'' کی طرف مبذول کرنا چاہی کہ ابھی ذکرِ محبوب کچھ دیر اور چلتا رہے کہ اصحابِ غرض کو تو اپنی مطلب برآری سے ہی کام ہوتا ہے ورنہ عقل اور ادب دونوں حضرت کو مزید تکلیف دینے سے روک رہے تھے مگر دل بضد تھا کہ

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید...... حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شان تجدید کا ذکر آیا تو حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ گویا یکدم تازہ دم ہوئے اور فرطِ نشاط میں محو ہو کر فرمانے لگے کہ علوم و معارف میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بالکل مجددانہ انداز ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جو تصانیف ہیں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ بہت تھی تصانیف پر اور یہ جملہ فرمایا کرتے تھے کہ ''سو برس تک فلسفہ کتنے روپ بدل کر آئے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت قلعی کھولنے کے لئے کافی ہوگی۔ سو برس تک کوئی اسلام کا مقابلہ اور اسلام پر حملہ حجت سے نہیں کر سکتا۔ اتنی حجتیں جمع فرما دیں، تو گویا ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال دی، جس سے اسلامی حقائق اور دقائق پورے واضح ہوتے ہیں''۔ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں اپنی نظر کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ سلف میں بھی بہت کم لوگ ملیں گے جنہوں نے اس قسم کی حکمت جمع کی ہو۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کا حصہ ہے''۔ ''حضرت کی ہر چیز بیچ کی نہ تھی بلکہ آخری کنارے پر لگی ہوئی تھی''۔

علم کے بارہ میں ایک بات مجھے اور یاد آئی کہ مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، اور انکے ہاں اخفاء تھا نہیں، جو واردات ہوتی صبح طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتے کہ یہ رات کو کشف ہوا، یہ الہام ہوا، یہ عادت تھی۔ تو ایک دن فرمایا کہ ''بھئی آج صبح کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بال بال بچ گیا۔ میرے مرنے میں کسر نہیں تھی''۔ طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! کیا بات پیش آئی؟ فرمایا کہ قرآن کریم کے علم کا ایک اتنا بڑا دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا اور غنیمت یہ ہے کہ وہ گزرتے ہی نکل گیا، ورنہ میں تحمل نہیں کر سکتا تھا''۔ اس کے بعد خود فرمایا کہ ''میں مراقب ہوا کہ یہ کیا چیز تھی تو منکشف یہ ہوا کہ میرے بھائی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں میری طرف متوجہ ہوئے، ان کی توجہ کا یہ اثر کہ علم کا ایک عظیم دریا میرے قلب پر گزرا''۔ اور اس کے بعد خود فرمایا کہ ''جس شخص کی توجہ کا یہ اثر کہ اتنا بڑا علم گزر جائے کہ برداشت نہ ہو سکے، تو وہ شخص خود اتنا بڑا علم کس طرح اٹھائے پھر رہا ہے''۔

اس میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اساتذہ دار العلوم نے جن میں اساتذہ بھی ائمہ فنون تھے۔ مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام معقولات سمجھے جاتے تھے۔ ان سب نے مل کر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھا دیں تاکہ قرآنی علوم ہم بھی سیکھیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ علوم تھے۔ مولانا یعقوب تو صدر مدرس تھے۔

علوم کا عروج...... تو حضرت نے منظور فرمایا: چھتہ کی مسجد میں حضرت نے درس شروع کر دیا۔ الٓمٓ سے شروع فرمایا تو حروف مقطعات پر کوئی دو ڈھائی گھنٹہ تقریر فرمائی اور عجیب و غریب علوم و معارف ارشاد فرمائے۔ اور یہ عجیب بے نفسی کا دور تھا کہ سارے اساتذہ سبق پڑھ کر باہم کہنے لگے کہ بغیر تکرار کے یہ علوم محفوظ نہ ہوں گے۔ لہٰذا تکرار کیا جائے۔ نو درہ میں بیٹھ کر تکرار شروع ہو گیا، مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر شروع کی۔ بیچ میں ایک جگہ رکے، بات یاد نہیں رہی کسی اور کو بھی یاد نہ آئی۔ تو کہا میں مولانا سے پوچھ کر یہ تقریر کروں گا۔ تو صبح کی نماز پڑھ کر حضرت جب اپنے حجرے میں آ رہے تھے تو مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت تقریر کا فلاں حصہ یاد نہیں رہا۔ تو کھڑے کھڑے حضرت نے تقریر شروع کی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نہ لفظ اس عالم کے تھے نہ معنی اس عالم کے ایک حرف بھی سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کیا فرما رہے ہیں۔ تو عرض کیا حضرت ذرا نازل ہو کر فرمایئے کہ کچھ سمجھ جاؤں۔ اب دوبارہ تقریر شروع کی تو الفاظ سب سمجھ میں آئے مگر معانی نہیں۔ تو پھر عرض کیا کہ حضرت کچھ اور نازل فرمایئے ہم وہاں تو نہیں پہنچے۔ تو فرمایا کہ مولانا دوسرے وقت آیئے گا۔ تو اس وقت کہوں گا۔ تو علوم میں اس وقت کتنا عروج ہو گا کہ ادھر کہہ رہے ہیں اور ادھر سمجھ میں نہیں آ رہا تو علم کا یہ حال تھا اور عمل تو ظاہر ہے۔

راقم نے عرض کیا کہ حضرت! ایسے علوم و معارف کی تسہیل اگر ہو جائے تو اس میں بہت سے فتنوں کا علاج ہے۔ فرمایا۔ ہاں! ہم نے مجلس معارف القرآن سے اسے شروع کیا اور ایک آدھ رسالہ چھاپا بھی تسہیل بھی کی، لیکن یہ سلسلہ چلا نہیں۔ اس لئے کہ علماء کی توجہ نہیں وہ کہتے کہ یہ مغلق مضامین ہیں۔ میں نے کہا بھئی حمد اللہ اور ملا حسن، اور قاضی تو سمجھ لو تو ان علوم میں کیا دقت ہے، تو ارادہ نہیں سمجھنے کا۔ عرض کیا گیا کہ کاش مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں علوم قاسمی کا جو منصوبہ پیش کیا، اس کے مطابق کام کرنے کی صورت نکل آئے، حضرت قاری صاحب فرمانے لگے کہ وہ منصوبہ میں نے ہی مولانا گیلانی مرحوم کے سامنے رکھا تھا کہ آپ نے تین جلدوں میں سوانح لکھی مگر اصل سوانح تو حضرت کے علوم ہیں۔ آپ اس پر تبصرہ کریں۔ مگر افسوس کہ اس کام سے پہلے مولانا گیلانی کی وفات ہو گئی، پانچ ہی صفحات مقدمہ کی شکل میں لکھ پائے تھے۔ الغرض بڑے عجیب و غریب علوم و حقائق ہیں۔

کچھ اپنی زندگی کے بارے میں...... حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے سراپا نور زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب اگلا سوال خود حضرت حکیم الاسلام کی زندگی کے بارے میں تھا، اور ڈرتے ڈرتے حضرت سے کچھ اپنی زندگی کے بارے میں ارشاد فرمانے کی جرات کی گئی۔

پیدائش کا پس منظر...... حضرت مسکرا کر فرمانے لگے۔ میری زندگی کیا جو میں بیان کروں۔ ہاں ایک تو پیدائش کا قصہ ہے جو مجھے یاد آیا اور جسے اپنے بڑوں سے میں نے سنا۔ وہ یہ کہ میرے والد صاحب (مولانا حافظ محمد احمد مرحوم) کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی، جو شادی خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے کرائی تھی۔ تو سارے بزرگوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تمنا تھی کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل چلے، تو دوسری

شادی دیوبند میں کرائی۔اس سے میرے تین بھائی مجھ سے پہلے پیدا ہوئے لیکن وہ کمسنی میں پیدا ہوتے ہی مر گئے۔تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی تڑپ تھی کہ کوئی زندگی کی اولاد ہو۔

تو فتح پورہ سو میں ایک بزرگ تھے جو اولاد کے بارے میں مستجاب الدعوات مشہور تھے۔تو حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھیجا کہ وہاں جا کر دعا کراؤ، کہ مولانا حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب اولاد ہوں۔وہ سفر کر کے گئے۔جا کر عرض کیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا بھیجا ہوا ہوں اور یہ درخواست ہے۔انہوں نے فرمایا کہ ''رات بیچ میں ہے کل صبح اس کا جواب دوں گا''۔

مولانا ان کے مکان میں ٹھہر گئے، صبح آئے اور خوش ہوئے۔فرمایا کہ میں نے دعا کی اور جب تک منظور نہ کرائی سجدہ سے سر نہیں اٹھایا۔اور مجھے وعدہ دیا گیا کہ حافظ صاحب کا لڑکا ہوگا۔جو حافظ اور قاری بھی ہوگا، مولوی بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔مجھے یہ واقعہ اس وقت معلوم ہوا جب پہلا حج ہوا اور میں جا رہا تھا تو طلبہ اساتذہ سب اسٹیشن گئے۔اس تانگے میں مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اور میں تھا۔مولانا نے کہا کہ بھئی! میں تجھے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔اور یہ واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ ''جب تو حافظ قرآن ہو گیا تو میں نے کہا ایک جز تو الحمدللہ قبول ہو گیا۔پھر تو نے قرات کی تکمیل کی تو میں نے کہا دوسرا جز پورا ہوا۔پھر تو نے فراغت تحصیل کی تکمیل کی تو میں نے کہا، الحمدللہ اس بزرگ کے کشف کا تیسرا جز بھی مکمل ہوا۔آج تو حج کو جا رہا ہے۔تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے چوتھا جز بھی پورا ہو رہا ہے''۔آگے چل کر حضرت قاری صاحب نے فرمایا۔میری پیدائش کے بعد کان میں اذان دینے کے لئے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا گیا جو اکابر دیوبند اور مشائخ میں سے تھے اس وقت حیات تھے اور میری عمر کے آٹھ نو برس تک حیات تھے، ان کی صورت مجھے یاد ہے اور میں خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، انہوں نے کان میں اذان دی۔حضرت حافظ محمد ضامن شہید کے صاجزادے حافظ محمد یوسف صاحب بھی اکابر بزرگوں میں سے تھے۔وہ دیوبند تشریف لائے اس وقت میری عمر مہینہ ڈیڑھ مہینہ تھی تو میری دادی صاحبہ مرحومہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اس کے لئے دعا کریں۔انہوں نے ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے میں لے چکا ہوں، دعا کیا کروں، قبول کر چکا ہوں۔اب اللہ جانے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ظاہر صورت تو یہ پیش آئی کہ میری شادی رامپور میں ان کے خاندان میں ہوئی۔ان کی عزیزہ میرے گھر میں آئی ممکن ہے یہ مطلب ہو یا اور کوئی۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی بسم اللہ......اس کے بعد جب مجھے الف با تا پڑھنے کے لئے بٹھلایا گیا تو بہت بڑا جلسہ دارالعلوم میں منعقد کیا گیا۔دور دور سے مہمان آئے۔تو مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت شیخ الہند کے والد نے بسم اللہ کرائی اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک قصیدہ پڑھا جو بہت بڑے شاعر تھے۔اس قصیدہ کا مجھے ایک مطلع یاد رہا اور ایک مقطع۔مطلع تو یہ تھا ۔

حبذا مکتب طیب کے مبارک تقریب ۔۔۔ کچھ عجب طرح کا جلسہ کچھ عجب طرح کی سیر

اور مقطع یہ تھا جو تاریخ کو بھی سمیٹے ہوئے تھا۔

ربِّ یسّر جو کہا اس نے تو بے روئے رہا فضل تاریخ میں بول اٹھا کہ تمّم بالخیر

ناز برداری...... بہرحال ان اکابر کی توجہات تھیں، میں نے اپنی زندگی ایسی گزاری جیسے شہزادے گزارتے ہیں۔ ہر طرف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام لیوا بڑے بڑے اکابر، حضرت شیخ الہند وغیرہ حضرات بس اس طرح ناز برداری کرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ زادہ ہو، اب بھی جو یہ حضرات کچھ لحاظ پاس کرتے ہیں، غلط فہمی میں نہیں کہ میرے اندر کوئی قابلیت ہے۔ اصل میں نسبت ہے ان بزرگوں کی جس کی وجہ سے یہ سارا اکرام ہے۔

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب...... یہاں تک حضرت کہہ گئے تھے کہ رفیق مجلس قاری سعید الرحمٰن صاحب (راولپنڈی) نے ایک تلخ موضوع چھیڑ دیا۔ ''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب'' ایک ایسا موضوع جس پر بحث وفکر تو مدتوں سے ہو رہی ہے مگر مرض کا علاج صرف نایاب اور بیش قیمت نسخوں کے معلوم کرنے سے کب ہو سکا ہے جب تک مرض کے ازالہ کے لئے علمی قدم نہ اٹھایا جائے۔ آج مسلمانوں کے تنزل کے اسباب ومحرکات پر بلامبالغہ ضخیم سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی اہم دینی یا سماجی تقریب ان اسباب پر زور بیان صرف کرنے سے خالی نہیں جاتی، منبر ومحراب کو لیجئے یا میدان صحافت وانشاء وہ کون سا انداز ہے جو مسلمانوں کے جگانے اور مرض کی تلافی کرنے کے لئے اختیار نہیں ہو رہا۔ مگر جمود اور تعطل کی تہیں جمتی ہی جا رہی ہیں اور جب سقوط بیت المقدس کے واقعہ ہائلہ اور قیامت صغریٰ نے بھی ہماری خواب غفلت کو نہ جھنجھوڑا تو شاید صور اسرافیل ہی ہم غفلت شعاروں کو بیدار کر سکے۔ مگر۔ ہائے وہ بیداری جو سوائے افسوس اور کف ندامت ملنے کے کسی کام کی ثابت نہ ہو سکے۔ یہی تصور حضرت قاری صاحب مرحوم کے سامنے آ چکا ہوگا کہ جب انہوں نے سوال سنا تو ایک دلگداز سانس بھر کر خود ہی سوال دہرایا۔

''مسلمانوں کے تنزل کے اسباب؟'' اور پھر اہل سیاست پر ایک بھرپور نشتر چبھوتے ہوئے فرمایا اس میں تو سیاسی لوگوں کی رائے معتبر ہے، ایک ملا کی رائے کیا معتبر ہوگی۔ وہ سیاست جو مسلمانوں کے عروج وزوال کے خدائی قوانین سے بے خبر ہو کر بھی صرف مادیت کے گھمنڈ میں تاریخ کے ہر واقعہ پر رائے زنی اپنا حق سمجھتی ہے۔

حضرت قاری صاحب کے اس مختصر سے جملہ میں واقعی اس سیاست پر یہ ایک بھرپور وار تھا۔ تنزل کے اسباب کا ذکر شروع کرتے ہوئے قاری صاحب نے اصول اور کلیات پر گفتگو کے بجائے اپنے معاشرہ کی چند جزئیات سے اس پر روشنی ڈالنا چاہی۔ ایک صاحب بصیرت شخصیت اور صاحب نظر کا ہی کام ہے کہ علمی اور نظری چیزوں کی بجائے وہ جزئیات اور عملی مثالیں سامنے رکھ دے جن سے نظریات اور کلیات تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔ مگر انسانی فہم ہمیشہ عملی مثال اور نمونوں ہی سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

تنزل کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے حضرت نے نہ تو فلسفیانہ موشگافیوں کی آڑ میں پناہ لینی چاہی، اور

نہ پیچیدہ عقلی اور نظری طول طویل محرکات کی فہرست مرتب فرمائی۔ بلکہ موجودہ معاشرہ کی ایک ایسی دھندلی سی تصویر نگاہوں میں رکھ دی، جس کے ساتھ ہم سب اپنا موازنہ کر سکیں اور پھر خود ہی سوچیں کہ اس سارے تنزل اور بربادی کے ذمہ دار اگر ہم خود نہیں تو اور کون ہے؟

افسوس ان لوگوں کی بے بصیرتی پر جن کی نظر اسباب تنزل سے بحث کرتے ہوئے موجودہ مسلم معاشرہ کی بے اعتدالیوں پر تو نہیں جاتی، مگر رہ سہ کر ان کی ساری غور و فکر یورپی تہذیب اور مغرب کے سسکتے ہوئے فلسفہ حیات کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے تنزل کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ ابھی دو تین برس کا وقعہ ہے، میرٹھ کے ہندو کمشنر تھے سانوال۔ دارالعلوم آئے اور بہت متاثر ہوئے۔ یہ جنگ ستمبر شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولانا! ملک کے حالات بہت نازک اور خراب ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں! اخبارات سے تو ہم بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔ کہا کوئی سبب بھی ہے اس پستی اور پریشانی کا۔ میں نے کہا: ہاں! سبب ہے۔ کہا: کیا سبب ہے؟ میں نے کہا: بالکل غیر ضروری ہے اس کا بتلانا اس واسطے کہ میں ہوں ایک مذہبی آدمی، تو ہر حادثے کو مذہب کے نقطہ نگاہ سے سوچتا ہوں۔ آپ ہیں سیاسی اور بر سر اقتدار انسان۔ آپ ہر چیز کو سیاسی نقطہ نظر سے سوچتے ہیں۔ میرا نقطہ نظر آپ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اس لئے بتانا غیر ضروری ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ کچھ تو کہئے گا اور میرا منشاء بھی یہی تھا کہ یہ زور دے تو بتاؤں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے اسباب تنزل......تو میں نے کہا سن لیجئے۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی نہ دولت سے چاہے ارب پتی بن جائے۔ اور نہ کوئی قوم عددی اکثریت سے ترقی کر سکتی ہے کہ افراد اس کے پاس زیادہ ہوں۔ اور نہ کوئی قوم محض سیاسی جوڑ توڑ سے ترقی کر سکتی ہے۔ دنیا کی اقوام کردار اور اخلاق سے ترقی کرتی ہیں تو اس وقت ہمارے ملک کی اخلاقی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے حالات نازک نہ ہوں گے تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے بالکل صحیح بات ہے۔ لیکن یہ تو ایک اصول بیان کیا آپ نے، اس کی مثال بھی ہے؟ میں نے کہا مثال کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے جب ایک ہندو عورت باہر پھرتی تھی تو گز بھر کا گھونگھٹ اس کے منہ پر ہوتا اور حیاء کی وجہ سے بچتی ہوئی چلتی اس وقت عورت نہ صرف گھونگھٹ سے باہر ہے بلکہ لباس سے بھی۔ اور اس سے بھی ایک قدم بڑھ کر آپے سے باہر ہوگئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایسی عورتوں کی کوکھ سے جو اولاد پیدا ہوگی کیا اس میں شرم و حیاء اور غیرت ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ریلوں میں ہمیں سفر کرنے کی نوبت آتی ہے تو اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے کسی ڈبہ میں اگر آجاتے ہیں تو ہمیں یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ آدمی ہیں جانور۔ اس قدر بے ہودہ اور رکیک حرکتیں کرتے ہیں کہ کوئی بھلا آدمی نہ کر سکے۔ اگر ان لوگوں کے کندھے پر ملک کا بار آگیا تو سوائے بداخلاقی کے یہ اور کیا پھیلائیں گے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ریلوں میں سفر کرتے دیکھا کہ جہاں کہیں شوگر ملز آیا، گاڑیاں گنوں سے بھری کھڑی ہیں۔ سو پچاس اترے کسی نے سو گنے، کسی نے دوسو گنے کسی نے پچاس، کسی نے گٹھڑی باندھ لی، اور قطعاً انہیں یہ احساس نہیں کہ یہ ہماری چیز ہے یا غیر کی۔ تو اگر ملک کا باران کندھوں پر آیا تو سوائے لوٹ کھسوٹ کے یہ کیا کریں گے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ تاجروں کا طبقہ ہے اور تجارت پر ملک کا دارومدار ہے۔ اس طبقہ میں بلیک الگ ہے، نفع خوری الگ ہے۔ ذخیرہ اندوزی الگ ہے۔ تو جب تاجروں میں خیانت آ جائے تو ملک کی برقراری کیسے ہوسکتی ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ جب حکام کو دیکھا جائے تو رشوت ستانی، جانب داری، اقرباء پروری، یہ ایک عام چیز بن گئی ہے اور رشوت تو ایسا ہے جیسا حق ہو گیا۔ تو جب حکام میں خیانت آ جائے تو بھلا وہ ملک کیسے برقرار رہے گا؟ میں نے کہا یہ حالات ہیں۔ کہنے لگا بالکل بجا ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر گورنمنٹ کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک کی اخلاقی حالت درست کرے۔ آپ دولت اور بیرونی کرنسی جمع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں لیکن اس کی فکر کسی کو نہیں۔ کہنے لگا کہ یہ ناممکن ہے کہ اخلاقی حالت درست ہو سکے۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا حکومت یہ نہیں چاہے گی کیونکہ اخلاق درست ہوتے ہیں مذہبی تعلیم سے اور حکومت سیکولر یعنی لامذہب ہے۔ وہ آ نہیں سکتی بیچ میں۔

نقطۂ نظر کا اختلاف...... تو میں نے کہا کہ میرے اور آپ کے نقطہ نظر میں یہاں سے فرق ہو گیا۔ آپ کے نزدیک سیکولر کا معنی لامذہبیت ہے اور میرے نزدیک سیکولر کا معنی ہمہ مذہبی حکومت ہے کہ ہر مذہب حکمران ہو۔ اور گورنمنٹ کا فرض ہے کہ ہر طبقے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم پائے۔ تاکہ اس کا اخلاق صحیح ہو۔ کہنے لگے یہ ہو نہیں سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ خود چاہتے ہیں کہ اس ملک میں چور اور ڈاکو پیدا ہوں۔ کہنے لگا آپ جو چاہیں مطلب نکال دیں، باقی یہ ہوگا نہیں، میں نے کہا ایک تدبیر میں بتلا دوں، کہا کیا؟ میں نے کہا ملک ہمارے سپرد کر دیجئے، سب حالات درست کر دیں گے۔ اس پر وہ بہت ہنسا۔ تو بہر حال ملک اور قوم کی ترقی ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سے، جب یہ ختم ہو جائے تو سب سے بڑا تنزل کا سبب یہی ہے۔

راقم السطور نے کہا حضرت! ہمارے تنزل میں مغربیت کا بھی حصہ ہے؟ فرمایا اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ مغربی اخلاق اختیار کئے جائیں۔ اسلامی اخلاق چھوڑ دیں، تعلیم مغربی غالب ہو اور دینی تعلیم مغلوب، دینی افراد مغلوب ہوں اور بے دین افراد غالب ہوں۔ بنیاد سب کی ایک ہی ہے کہ مذہب سے رشتہ توڑ دو۔

برسر اقتدار طبقہ کی اصلاح کا طریق...... اب اس کے بعد اصلاح کی کیا صورت ہو؟ تو حضرت نے اپنے تجربہ اور بصیرت کی بناء پر فرمایا کہ آپ حضرات بحمد للہ مذہب کی خدمت کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اس لپیٹ میں آ گئے ان کا دین درست ہو رہا ہے۔ لیکن برسر اقتدار طبقہ بالکل دوسرے رنگ میں ہے مگر اس میں بھی میری ایک رائے ہے کہ کسی سے تقابل کی ٹھان کر کسی کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ آپ چاہیں تو ایجی ٹیشن کریں یا مقابل بن کر اصلاح کرنا چاہیں، یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کی صورت تو یہ ہے کہ مستغنیانہ طریق سے ان

لوگوں کے دلوں میں کچھ چیزیں ڈالی جائیں اور اپنا غرض مطلب کچھ نہ رکھا جائے، نہ عہدہ نہ دولت، بلکہ انہیں آپ یقین دلا دیں کہ اقتدار تمہارا رہے گا اور ہم بھی اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم اقتدار نہیں چاہتے۔ مگر اتنی بات کر واور ایسا کرنا ملک اور قوم دونوں کے لئے نافع، ورنہ اس سے ملک قوم اور تمہارے اقتدار سب کو خطرہ ہے۔ اس انداز سے کام کرنا چاہئے۔ سیاسی رنگ کے لوگ سیاسی انداز سے اور دینی رنگ کے لوگ دینی انداز سے جب تک خواص کو متوجہ نہیں کریں گے۔ کام نہیں چلے گا۔ اب عوام کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ایجی ٹیشن کی صورت اختیار ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اشتعال میں آ جائے حکومت، تو وہ پھر چڑ آتی ہے، تو نہ صرف یہ کہ وہ آپ کی نہیں مانے گی بلکہ گرانے کی کوشش کرے گی۔ تو اصلاحی رنگ میں چند افراد اپنی زندگی اس مقصد کے لئے وقف کر دیں اور جو اوپر کا طبقہ ہے ان میں رسوخ حاصل کر کے اس کے کانوں میں باتیں ڈال دی جائیں اور اس انداز سے کہ فلاں بات تیرے مفاد کے خلاف ہے۔

حکومت سے کام لینے کا طریق!...... حضرت! پاکستان کے علماء کے لئے کوئی مخصوص پیغام؟

''پیغام کا مجھے حق بھی نہیں۔ غیر ملک کا آدمی پیغام کیا دے؟ مگر یہ میں نے صبح کی مجلس میں بھی تفصیل سے کہا تھا کہ جو مفکر قسم کے لوگ چند علماء ہیں اور باا ثر بھی ہیں وہ ایک یادداشت کے طور پر کچھ بنیادی چیزیں حکومت کو پیش کریں اور اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہم آپ کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں۔ ہمارا پورا تعاون رہے گا۔ تقویت اور نصرت کریں گے۔ مگر اتنی چیز ہے کہ دین کے لئے اور ملک کی بقاء کے لئے فلاں فلاں کام کرو۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو ملک وقوم میں خرابی ہوگی اور آپ کی بنیاد بھی اس سے قائم ہے''۔

اس یادداشت اور ملاقاتوں میں جزئیات کو پہلے نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ اصولی اور کلی رنگ میں یہ لوگ کچھ مانوس ہو جائیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ جزئیات سود وغیرہ جیسے مسائل کان میں ڈال دیئے جائیں۔ مگر پہلے ارباب اقتدار کے ذہن کو اصول میں لے آیا جائے۔ میں تو واقعی اگر یہاں کا باشندہ ہوتا اور بازیابی کا موقع مل جاتا تو صدر ایوب سے کہتا مجھے آپ اپنا خادم اور خیر خواہ سمجھیں مگر دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تعلیم قرآن اور دینی علوم کو عام قرار دیں اور یہ کام مستند علماء سے کرائیے۔ ہر اس عالم کو عالم نہ سمجھیں جو علم کا لبادہ پہن کر آئے اور علم اس کا محض مطالعہ یا اخبار بینی کا ہو، نہ اس کے پاس سند ہو نہ استناد ہو، نہ بزرگوں کے پاس رہ کر اس نے علم حاصل کیا ہو، ایسے علماء کو اختیار کر کے ان سے ہر کام میں مشورہ نہ کریں۔ ہر مدعی علم کو عالم نہ سمجھیں بلکہ اس کی تلاش کر کے کام کریں۔

کوئی طبیب بھی اگر ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ مریض ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جا کر ہاتھ دے دے گا۔ اور نبض دکھلا دے گا بلکہ وہ پہلے ڈھونڈتا ہے کہ طبیب طبیہ کالج کا فارغ ہے یا کہاں کا؟ اس کا بورڈ یا سند دیکھتے ہیں۔ اس کے پاس آنے والے مریضوں کی اکثریت کو دیکھتے ہیں کہ شفایاب ہو کر جاتے ہیں یا نہیں۔ تو جان بچانے کے لئے آپ انتخاب کریں تو ایمان بچانے کے لئے کیا ضروری نہیں کہ صالحین روحانی اطباء صحیح علماء کا انتخاب کیا جائے؟

اور دوسری بات ان سے یہ عرض کرتا کہ آپ معروفات کو یکدم جاری نہیں کرتے تو نہ سہی مگر کم از کم منکرات کا راستہ تو بند کر دیں۔ اس سے اخلاق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو مقدم چیز ہے دفع مضرت اور جلب منفعت موخر ہے۔ اور دفع مضرت میں یہ ہے کہ کم از کم پہلے وہ منکرات تو ختم کر دیں جو عقلی منکرات ہیں اور دنیا کی ہر قوم اسے برا سمجھتی ہے۔ اس کے بعد منکرات شرعیہ کو لیں۔ جب اس سے فارغ ہوں تو معروفات شرعیہ کو لیں، مگر کم از کم منکرات تو ختم کر دیں اور یہ بھی تدریجاً سہی رفتہ رفتہ اس لئے کہ آپ کی مجبوریاں ہیں۔ آپ کے روابط اور مراسم سیاسی ان اقوام سے ہیں کہ ان کے ہاں یہ منکرات جزوتمدن ہیں تو اگر یکدم آپ کامیاب نہ ہوں تو راستہ تو منکرات مٹانے کا ڈال دیں۔ دوسری چیز یہ عرض کرتا کہ خلفاء راشدین یا سلاطین عادل جو گنے چنے ہیں، ان کے علاوہ عامتہ وہی سلاطین ہیں جنہیں اپنی اقتدار کی فکر ہے لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے جس بادشاہ کے ساتھ کوئی عالم ربانی لگ گیا۔ اس کی حکومت نہایت اعلیٰ گزری حالانکہ وہ عالم عہدہ دار نہیں تھا۔ ہارون الرشید کے ساتھ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ لگے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر علماء سے مشورہ لیتا رہا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مرحوم نوابزادہ لیاقت علی خان نے مجھ سے کہا کہ جب ہم کسی مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں تو مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ تو جب آپ اسلام کے نام پر حکومت کر رہے ہیں اور ملک اسلام کا ہے تو اسلام کے حاملین سے کب صرف نظر کیا جا سکتا ہے، تو جو قدم اٹھائیں تو کم از کم دو چار علماء کی بات تو سن لیا کریں، آپ انہیں نہ جاگیر دیں، نہ عہدہ نہ وہ طلب کریں گے۔

حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور کرنے کے لئے تجویز...... حضرت حکیم الاسلام اصلاح احوال کی تجویز پر اپنی بصیرت اور فراست ایمانی کی روشنی میں گفتگو فرما رہے تھے، اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر عصر حاضر کی اسلامی قیادت مصطفیٰ کمال کے نقش قدم پر اسلام کو فرسودہ اور زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہونے کا عقیدہ دل و دماغ میں راسخ کر چکی ہو۔ دین کی ترجمانی کے لئے کسی صلاحیت اور استحقاق کو اجارہ داری سمجھا جا رہا ہو اور جب رعایا کی اکثریت بھی اعجاب رائی (اپنی رائے پر گھمنڈ اور غرور) میں مبتلا ہو چکی ہو۔ پھر جب خوشامدی، خود غرض اور لالچی قسم کے علماء نے حکام کے ساتھ روابط کو رعیت کی نگاہ میں دین فروشی کے ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ اور خالص مصلحانہ کوششوں پر بھی سیاست کا رنگ چڑھ گیا ہو، تو حکام اور اہل دین کے درمیان خلیج دور ہونے کے لئے اور دینی اقتدار کی خاطر اس خلا کو پاٹنے میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خیر خواہانہ تجویز کس حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ اس راہ کی مشکلات کو ایک خاص رخ سے پیش کرتے ہوئے میں نے عرض کیا "حضرت! جب حکام سمجھ بیٹھے ہوں کہ اسلام عصر حاضر کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تو انہیں حاملین اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ہو جانا کب ممکن ہے۔؟ حضرت نے فرمایا! ان کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے کہ اسلام موجودہ دور کی ترقیات میں حارج ہے۔ بلکہ ان کے دل میں ڈال دینا چاہئے کہ زمانہ کی کوئی چیز بھی جو کسی درجہ میں واقعی صحیح اور کار آمد ہو۔

اسلام اس کا مخالف نہیں مگر وہ منکرات جو دنیا کے ہر قوم میں منکرات عقلی ہیں۔ زنا کاری، جواء، سود، شراب نوشی قسم کی چیزیں جس کی قباحت مسلمات عقلیہ میں سے ہے۔ ان چیزوں کو ترقی کا معیار بنا کر اسے اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ البتہ جو چیزیں منکر نہیں ہیں اور اخلاق و معاشرت پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اسلام کبھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ سیاسی اور ملکی تدابیر میں ہمیشہ توسیع سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو اجتہادی امور ہیں اس کی اسلام میں گنجائش ہے اور ان کی اچھائی برائی کی جانچنے کے لئے ایسے لوگوں کو مشیر بنائیں جنہیں فقہ اور شریعت پر عبور ہو"۔ پھر قاری صاحب نے فرمایا۔ مقصد اصلاح حال ہے اور یہ کہ حالات سدھر جائیں۔ اخلاص اور جذبہ خیر خواہی کے ساتھ ایسا راستہ اختیار کیا جائے، ایک دوسرے کو دور کرنے کی بجائے نزدیک کر دے۔

تعمیری انداز میں اصلاح...... رات ڈھل رہی تھی۔ وقت تیزی کے ساتھ دل و دماغ پر اپنے حسین نقوش ثبت کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔ ایسے نقوش جو مجلس میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کے فیتہ پر ثبت ہونے والی ارتعاشی اور صوتی حرکات سے کہیں زیادہ پائیدار اور دیرپا تھے۔ وقت بجائے خود ایک ایسی مشین ہے، جو ایک ایسے نامہ اعمال کے اوراق میں سب کچھ محفوظ کر رہی ہے۔ جس کی پنہائیوں اور گہرائیوں پر "الساعۃ" اور زلزلۃ الساعۃ کی ہلاکت انگیزیاں بھی اثر انداز نہ ہو سکیں گی اور جب کرتا دھرتا سب کچھ مجسم بن کر سامنے آ جائے گا تو پکارنے والا پکار اٹھے گا۔ ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ ①...... ایسی صحبتیں کب بار بار نصیب ہوتی ہیں۔ حضرت کو مزید تکلیف دینا دل و دماغ پر کتنا ہی گراں گزر رہا تھا، مگر بے اختیار جی چاہا کہ اس مجلس سعید میں کچھ ذکر الحق اور دارالعلوم حقانیہ کا بھی آ جائے اور پوچھ بیٹھا کہ "الحق" کے لئے کون سا طریقہ کار پسندیدہ ہے؟ فرمایا وہی پالیسی میں نے جو عرض کر دی۔ توافق سے کام چلے گا، تقابل سے نہیں۔ تعمیری انداز میں اصلاح کی سعی تقابل کے انداز سے آپ کی باتیں کسی مخالف پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گی۔

حضرت! جب الحاد اور بے دینی غالب ہو چکی ہے، پھر کیسی موافقت۔؟ برجستہ فرمایا۔ اسی کی اصلاح کے لئے تو توافق کی ضرورت ہے۔ اور یہ توافق الحاد اور بے دینی سے نہیں ہوگا۔ ان افراد سے توافق ہوگا تاکہ ان لوگوں کو الحاد سے ہٹا دیا جائے۔

حضرت! کچھ لوگوں پر تو مایوسی کی فضا چھا گئی ہے۔ اصلاح کی مساعی بار آور معلوم نہیں ہو رہیں؟ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

کام کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ مایوس نہ ہوا جائے آپ تو ورثہ انبیاء ہیں۔ انبیاء کبھی مایوس نہ ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے اس قوم کو عذاب دینا ہے۔ تب حضرت نوح نے بددعا دی کہ کسی کافر کو بھی زندہ نہ چھوڑ ورنہ ساڑھے نو سو برس تک نصیحت فرماتے رہے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ الکہف، الآیۃ: ۴۹۔

دیگر بلادِ اسلامیہ تو دہریت، مغربیت اور بے دینی کی لپیٹ میں آ ہی گئے اور ہو گئے تو ایسے حالات میں اہل دین کب تک شکستہ خاطر نہ ہوں گے؟

حضرت نے جواب دیا کہ ایسی چیزوں کو تو ملک کے سامنے بطور نظیر پیش کیا جانا چاہئے کہ آج بلادِ اسلامیہ باوجود قوت کے تباہ ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی اخوت اور مسلمانوں کے عام اتحاد کو خیر باد کہہ دیا وطنیت کو آگے رکھا۔ اسلامیت کو پیچھے رکھا تو اتنی نظیروں کے ہوتے ہوئے بھی تمہاری آنکھ نہ کھلے تو تباہی سے کیسے بچ سکو گے؟

ورثہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ...... حضرت! قوم اور ملک کی اصلاح تو اربابِ عزیمت اور اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہم جیسے عامیوں کے لئے بھی کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ورثہ چھوڑا ہے کتاب اللہ اور سنت رسول کا۔ فرمایا تم جب تک انہیں پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے۔ ''تَرَکْتُ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَبَدًا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا'' ①

دارالعلوم کی ترقی ...... حضرت! اس مدرسہ دارالعلوم حقانیہ کے بارے میں کوئی نصیحت؟

فرمایا! آپ لوگ جو اختیار کئے ہوئے ہیں، بحمد للہ مدرسہ چل رہا ہے۔ غالب ہو رہا ہے۔ مولانا موجود ہیں۔ ہر وقت ''قَالَ اللّٰهُ '' اور ''قَالَ الرَّسُوْلُ '' ہے۔ اس سے زیادہ کیا روحانیت اور معنویت ہوگی۔ خدا نے مدرسہ کو ایسے بزرگ اور اساتذہ دیئے ہیں جو الحمد للہ دین مجسم ہیں۔

حضرت! مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی رفتارِ ترقی کیا ہے اور بجٹ؟ ...... فرمایا! انقلاب کے وقت سوا لاکھ تھا اور اب ساڑھے دس لاکھ ہے، انقلاب کے بعد کچھ فکر بھی تھا کہ کیسے چلے گا، مگر اللہ نے بڑھایا اور تمام شعبے بڑھتے ہی گئے، پہلے آٹھ شعبے تھے اب چوبیس شعبے ہیں۔ اسی طرح پہلے اساتذہ اڑتیس تھے، اب ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح عمارات دگنی تگنی ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے طلبہ ڈیڑھ ہزار کے قریب ہیں۔ آخری سوال تھا کہ حضرت! نئی پود سے مستقبل میں دارالعلوم دیوبند کے لئے کیسی توقعات ہیں؟ فرمایا اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس دور کی سب سے بڑی مشکل قحط الرجال کی ہے۔ مگر ہمیں توقع ہے کہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنے والے نئی پود میں بھی ہیں، چاہے گنے چنے ہی ہوں مگر اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔

دورانِ گفتگو ایک دفعہ حضرت نے موجودہ زمانہ کی سیاست پر بھی اپنی رائے ظاہر کی اور کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس زمانے کی سیاست اور دین میں بیر ہے۔ اس سیاست اور ڈپلومیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ نفاق گندم نما جو فروشی۔ اس میں دین باقی نہیں رہ سکتا وہ تو صرف اسلامی سیاست ہے جو دین کے ساتھ چلتی ہے اور وہ تو جوہر ہے اسلام کا۔ اور ایک ہے عصری سیاست، یہ بالکل تقابل پر ہیں دین کے جو چیز دین میں حرام ہیں۔ اس کے ہاں

---

① الحديث اخرجه الامام مالک فی "المؤطا" ولفظه: ترکت فيکم امرين لن تضلوا ماتمسکتم بهما کتاب الله وسنة نبيه، کتاب القدر، باب النهی عن القول بالقدر ج: ۲ ص: ۸۹۹.

واجب ہیں۔ جو یہاں محمود ہیں وہ وہاں مذموم۔ اور صرف یہ میرا مقولہ نہیں بلکہ مولانا اصغر حسین مرحوم نے بھی یہی الفاظ ارشاد فرمائے کہ۔ ''مولوی صاحب! آج کی سیاست اور دیانت میں بیر ہے''۔

اب رات کا ایک بج چکا تھا اور بادل ناخواستہ اس پرلطف محفل کی بساط لپیٹنی ہی پڑی۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ